رجسٹرڈ نشان ٹپہ سرکار آصفیہ (۶۵)

رجسٹرڈ نشان ٹپہ سرکار انگلشیہ (.........)

مجلۂ مکتبہ

جلد (۶) شمارہ (۱)

بابتہ ماہ آذر ۱۳۴۰ف م اکتوبر ۱۹۳۰ء

تصاویر

(۱) حضرت امجد حیدر آبادی (۲) محمد سراج الدین صاحب بی، ایس سی آنرز انجنیری

(۳) سید یسین علی خان صاحب، بی، اے (عثمانیہ) بی، ایس، سی (آنرز) لندن

فہرست

شذرات

اگرچہ مکتبہ ابراہیمیہ کی بنیاد اب سے پندرہ برس قبل رکھی گئی تھی مگر وہ ابتدأً مولوی حاجی مظفر بیگ صاحب کا ذاتی کاروبار تھا اور صرف ان کی تنہا کوشش اور سرمائے سے ترقی پذیر طریقے پر چل رہا تھا۔ بعد کو موصوف نے اپنے نفع کثیر کا ایثار کرکے علم کی خدمت گزاری کے شوق میں اس کو انجمن امداد باہمی (کواپریٹیو سوسائٹی) کی صورت میں بدل دیا۔ اس کی دوسری زندگی کا بحمداللہ چوتھا سال ختم ہوگیا اور اب اس نے پانچویں سال میں قدم رکھا ہے۔ اس وقت اس کے کاروبار تین شعبوں پر منقسم ہیں :- (۱) شعبہ تجارت (۲) شعبہ طباعت (۳) شعبہ اشاعت۔

شعبہ تجارت میں مکتبے کی اپنی مطبوعات کے علاوہ اردو کی تقریباً مطبوعہ قدیم و جدید کتب کتب درسی اور آلات تعلیمی وغیرہ کا اسٹاک رہتا ہے اور اس کا بک ڈپو اپنی ظاہری اور باطنی خوبیوں، کتابوں کی کثرت اور سربراہی کے معقول انتظام کی وجہ سے اس وقت نہ صرف حیدرآباد بلکہ سارے ہندوستان میں بھی اپنی نوعیت کا واحد اردو بک ڈپو ہے اور شہر کے ایسے پر رونق آباد اور موقع کی جگہ واقع ہے کہ اہل علم بہ آسانی آکر اس کا معاینہ کرسکتے اور اپنی مطلوبہ کتب حاصل کرسکتے ہیں۔

شعبہ طباعت میں اس وقت چند دستی پریس اور برقی پریس جاری ہیں اور جلدبندی اور شیرازہ بندی وغیرہ کا کام بھی ہوتا ہے۔ مکتبے کی اپنی مطبوعات کے علاوہ بیرونی طباعت کا بھی بہت کچھ کام ہوتا ہے۔ اور کثرت فرمایشات کے مدنظر موجودہ پریس ناکافی معلوم ہوتے ہیں۔ قریب میں امید ہے کہ اور مشین پریس اور کتب تراشی اور بلاک سازی کی مشینیں بھی آجائیں گی شعبہ اشاعت جس سے یہ ماہوار رسالہ شایع ہوتا ہے، اس وقت تک تقریباً ایک سو علمی، ادبی اور درسی کتابیں شایع کرچکا ہے۔ سال گزشتہ اس نے حسب ذیل کتابیں شایع کیں۔ ان میں سے ایک کتاب جغرافیہ ریاست حیدرآباد کا چھٹا ایڈیشن ہے اور باقی سب پہلی دفعہ چھپی ہیں :-

(۱) اردو شہ پارے جلد اول مولفہ ڈاکٹر زور (۲) قدیم افسانے مرتبہ سروری (۳) کردار اور افسانہ مولفہ سروری (۴) قاموس الاغلاط مولفہ مولانا مختار احمد صاحب و مولانا غلام مصطفیٰ صاحب ذہین۔ (۵) گلشن گفتار مرتبہ سید محمد ام، اے (۶) نیلگری مولفہ مولوی حمید اللہ صاحب ام، اے ال ال بی، (۷) قاعدہ فارسی مولوی محسن خان صاحب متین (۸) عمل ہندسہ علمی مولفہ مولوی نیرالدین صاحب بی، اے (۹) جبر و مقابلہ مولفہ مولوی سید انوار حسین صاحب بی، اے (۱۰) طریقہ املا نویسی مولفہ مولوی مظفرالدین صاحب (۱۱) حل پرچہ جات ریاضی مرتبہ مولوی نیرالدین صاحب بی، اے (۱۲) جغرافیہ ریاست حیدرآباد مولفہ مولوی غلام قادر صاحب بی، اے و مولوی غلام رسول صاحب (۱۳) جغرافی گر مولفہ مولوی غیاث الدین صاحب۔

سال حال جو کتابیں زیر طبع ہیں ان میں سے بعض کا ذکر ہم قبل ازیں شذرات میں کر چکے ہیں اور بعض ایسی ہیں جن کے متعلق آیندہ اشاعتوں میں ذکر کیا جائے گا۔

اس نمبر میں ہم حیدرآباد کے مشہور صوفی شاعر حضرت امجد کی لایف اور شاعری پر مولوی ظفریاب خان صاحب کا جو حیدرآباد کے ایک کہنہ مشق اہل قلم اور مشہور جرنلسٹ ہیں ایک سیر حاصل مقالہ شایع کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ حضرت امجد کی تصویر بھی دی جا رہی ہے حضرت امجد کا دل پذیر کلام ہندوستان کے تقریباً تمام چوٹی کے رسالوں میں شایع ہوتا رہتا ہے لیکن آپ کی تصویر آج تک کسی رسالے میں شایع نہیں ہوئی۔ یہ امتیاز اس وقت صرف مجلہ مکتبہ کے اس نمبر کو حاصل ہو رہا ہے کہ وہ آپ کی تصویر اور آپ کے حالات و مقالات کے ساتھ شایع ہو رہا ہے۔

دوسری دو تصویروں میں ایک سید یسین علی خان صاحب، بی، اے (عثمانیہ) بی، ایس، سی، (آنرز) (لندن)، کی ہے۔ جو چار سال قبل سرکار عالی سے وظیفہ یورپ پاکر انجنیری کی تعلیم کے لئے لندن گئے تھے انہوں نے جامعہ لندن کے سیول اور بلدیاتی (میونی سی پل) انجنیری کے آخری امتحان میں فرسٹ کلاس آنرز کی ڈگری حاصل کی اور بارہ مضامین میں (۹۲) فی صد نمبر لیے اور جامعہ لندن کا امتیازی انعام اور تمغہ (شیڈوک میڈل اور پرایز) کے مستحق قرار پائے۔ وائی کونٹ چمسفورڈ نے جو صدر ہیں

اس کامیابی پر حیدرآباد کو مبارک باد دی۔ دوسری تصویر محمد سراج الدین صاحب ام، ایس سی (طبیعیات)، بی، ایس سی آنرز (انجینیری) اے، آر، سی، پی، کی ہے جو ڈاکٹر محی الدین شریف صاحب وظیفہ یاب سیول سرجن کے فرزند اور نواب رحمٰن یار جنگ مرحوم معتمد دفتر ملکی کے برادرزادہ ہیں۔ یہ اب سے کوئی اٹھارہ برس قبل یورپی وظیفہ لیکر انجینیری کی تعلیم کے لیے لندن گئے کامیابی کے بعد حیدرآباد آکر پھر مزید تحقیقات کے لیے عازم یورپ ہوے اور اس وقت کیمبرج کے ایک مشہور کارپوریشن میں ریسرچ فزسٹ (محقق طبیعیات) کی حیثیت سے مامور ہیں۔ طبیعیات اور انجینیری پر ان کے متعدد مقالے یورپ کے مشہور رسالوں میں شایع ہوتے رہتے ہیں۔ ادارہ میکانکی انجینیری لندن (انسٹی ٹیوشن آف میکانیکل انجینیرس لندن) سے ٹامس ہاکسلے کا موسومہ اعزاز ملا اور ان کے سوا غیرانگریزوں میں یہ اعزاز ساری سلطنت برطانیہ میں صرف ایک اور صاحب کو ملا ہے جو اس وقت جامعہ مدراس میں انجینیری کے پروفیسر ہیں۔ یسٰین علی خان صاحب و سراج الدین صاحب دونوں حیدرآباد کے مایۂ ناز فرزند ہیں ان کی کامیابی و اعزاز ملک کے لیے باعث صد فخر و مباہات ہے۔

گزشتہ نمبر میں جو علامہ بحرالعلوم حضرت شمسی مرحوم کے متعلق بسلسلہ مقالات شایع ہوا ہے وہ عجلت اور جلدا جلدی میں مرتب ہوا تھا مولانا سعادت اللہ خان صاحب کے مضمون میں ایک جگہ ایک سرخی طلب کی بالکل زاید اور غلط چھپ گئی۔ ناظرین تصیحح فرمالیں۔

ششماہی پنجم کی مجموعی فہرست مضامین جو اس نمبر کے ساتھ شایع ہونی چاہیئے تھی، عدم گنجایش کی وجہ سے نہ دی جاسکی، اگلے نمبر میں اس کو شریک کردیا جائے گا۔

حضرت امجد حیدرآبادی

از

جناب مولوی محمد ظفریاب خان صاحب سابق مدیر رسالہ ادیب حیدرآباد

حضرت امجد اُن مشاہیر ملک سے ہیں جن کو زمانہ آسانی کے ساتھ پیدا نہیں کرسکتا۔

"دورہا باید کہ تا یک مردِ حق پیدا شود
بوسعید اندر خراساں یا اویس اندر قرن"

میرے اکثر احباب ایک زمانہ سے اس بات کے متقاضی تھے کہ حضرتِ موصوف کے مختصر حالات اور اُن کے پُر از حقایق و معارف کلام کا انتخاب عامۃ الناس کے استفادہ کی غرض سے کسی مقامی پرچہ میں شایع کیا جائے خیال تھا کہ اس پر قلم اُٹھانے کے لئے کسی ایسی بزرگ ہستی کو آمادہ کیا جائے جس کا پایہ ادب و شاعری کے علاوہ فلسفۂ الٰہیات میں بھی بلند ہو لیکن جب اس میں ناکامی ہوئی تو مجبوراً مجھے اپنے ہی آپ کو مجبور کرنا پڑا۔

نام و نسب ابو الاعظم کنیت، سید احمد حسین نام، امجد تخلص، صوفی سید رحیم علی مرحوم حیدرآبادی کے اکلوتے فرزند ہیں۔ ابھی آغوشِ مادر ہی میں تھے کہ قضا و قدر نے محبتِ پدری سے محروم کردیا اور شفیق باپ کا سایہ سر سے اٹھالیا۔ شفیق ماں نے ہمتِ مردانہ سے کام لیا اور محنت و مشقت برداشت کرکے اس دُرِّ یتیم کی پرورش کی۔ سنِ ولادت غالباً سنہ ۱۳۰۴ھ ہے۔

حلیہ رنگ گندم گوں، متوسط القامت، فراخ پیشانی، مختصر سی خشخاشی ڈاڑھی جسیم اوسط درجہ کا عمر تخمیناً ۴۸ سال۔

تعلیم و تربیت ہوش سنبھالنے پر گھر ہی میں ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوا اور قرآن مجید ختم کرنے پر مدرسۂ نظامیہ میں شریک کئے گئے جہاں تعلیم کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ بانی مدرسہ مولوی محمد امیر الدین مرحوم اور سرپرستوں میں کچھ اختلافات پیدا ہوگئے نتیجہ یہ ہوا کہ

مدرسہ دو حصوں میں منقسم ہوگیا۔ کچھ طلبہ مولانا انوار اللہ خان بہادر (فضیلت جنگ مرحوم) کی سرپرستی میں شبلی گنج چلے گئے اور کچھ بدستور مدرسۂ قدیم میں رہے۔ موخر الذکر مدرسہ میں حضرت امجد[1] شریک رہے بانی مدرسہ جیسے مجسم ایثار اور فدائے ملت بزرگ کی بے وقت موت نے مدرسہ کے تمام انتظامات درہم و برہم کردئے جس کی وجہ طلبہ کو بھی منتشر ہونا پڑا۔ اس کے بعد حضرت امجد نے اپنے طور پر سلسلۂ تعلیم جاری رکھا۔ مدرسہ میں مولوی سعید الدین صاحب سہارنپوری اور مولوی عبدالوہاب صاحب بہاری سے اور بیرون مدرسہ بعض مشاہیر ملک یعنی مولنا نادر الدین[2] اور نواب سناد الملک آقا سید علی[3] شوستری جیسے اسنادان کامل سے عربی اور فارسی میں بہت کچھ بصیرت حاصل کی۔

شادی

سنِ رشد کو پہنچنے پر شفیق ماں نے ایک شریف گھرانے میں ان کی شادی کی۔ شادی کے دو سال بعد لڑکی تولد ہوئی جس کا نام اعظم النسا رکھا گیا۔ اس معصومہ نے ابھی تیسرے ہی سال میں قدم رکھا تھا کہ ۱۹۰۸ء میں طغیانیِ رود موسیٰ کا مشہور ہولناک اور قیامت خیز حادثہ پیش آیا جس میں دیگر افرادِ خاندان کی طرح ننھی معصومہ بھی نذرِ سیلاب ہوگئی۔

---

[1] خدا بخشے محمد امیر الدین مرحوم کو بانی مدرسۂ نظامیہ قصبۂ پونیر تعلقہ منجلے گاؤں ضلع بیڑ کے قاضی اور بڑی خوبیوں کے آدمی تھے ان کو مسلمانوں کی تعلیم سے خاص دلچسپی تھی بغیر کسی ذریعہ اور وسیلہ کے محض تائیدِ غیبی کے بھروسہ پر محلہ چارمحل میں مدرسۂ نظامیہ کی بنیاد ڈالی جس میں اکثر نادار اور مفلوک الحال یتیم لڑکے تعلیم پاتے تھے لڑکوں کے کھانے اور رہنے سہنے کا انتظام منجانب مدرسہ ہوا کرتا تھا۔ مدرسہ کا انتظام ایک انتظامی کمیٹی کے زیرِ نگرانی تھا جس کے سرپرست مولنا انوار اللہ خان بہادر فضیلت جنگ مرحوم تھے۔ [2] مولنا نادر الدین مرحوم درۂ کلکان یا کاگان علاقہ افغانستان کے باشندے تھے چھوٹی عمر میں وطن سے نکل کر ریاست رام پور آئے اور یہیں رہ پڑے مولنا عبدالحق خیر آبادی کے شاگرد رشید تھے۔ دار العلوم میں منطق و فلسفہ کے پروفیسر تھے۔ مولنا عبدالقدیر پروفیسر جامعہ عثمانیہ۔ مولنا جمال الدین نوری مرحوم اور مولنا مرتضیٰ مرحوم کے استاد تھے تبحر علمی کے ساتھ انتہا درجہ کے نیک اور صوفی منش انسان تھے ۱۳۴۳ھ میں وفات پائی۔ [3] نواب سناد الملک آقا سید علی مرحوم شوستر کے باشندے تھے ان کو اعلیٰحضرت غفراں مکان کی استادی کا بھی شرف حاصل تھا۔ بڑے سخی فیاض اور علم دوست انسان تھے۔ دامنِ کوہ مولا میں قیام تھا۔ اکثر تشنگان علم استفادہ کی غرض سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آپ کے تبحر علمی سے سیراب ہوا کرتے تھے دسترخوان نہایت وسیع تھا۔ عمر طبعی کو پہنچکر انتقال فرمایا۔ عربی اور فارسی کے لاجواب ادیب اور شاعر تھے۔ نواب اختر جنگ اور نواب نیر جنگ بہادر آپ کے فرزند ہیں۔

طغیانی رود موسی

طغیانی کے ایام میں حضرت امجد اور اُن کے سسرال کے لوگ محلّہ چار محل میں رہتے تھے جو ندی کے قریب واقع تھا اور جس کے ایک حصّہ میں اب عثمانیہ ہائی کورٹ کی عالیشان عمارت ہے۔ گو دن ہی سے پانی بڑھنا شروع ہو گیا تھا لیکن اس خیال سے کہ ہمیشہ کی طرح اب کی دفعہ بھی اس کا زور بتدریج کم ہو جائے گا کسی کو تخلیہ کا خیال نہیں ہوا۔ رات کی تاریکی میں بارہ بجے کے بعد جب پانی کا سیلاب فصیل توڑ کر گھر میں گھس آیا تو سب کے حواس غائب ہو گئے اور ایسے وقت بھاگنے کی سوجھی جب ہر طرف سیلاب نے قبضہ جما لیا تھا حضرت امجد بھی دوسروں کی طرح اس مصیبت سے نجات پانے کے لئے اپنے ساتھ ضعیف والدہ، بیوی اور کمسن لڑکی کو لیکر نکلے۔ پانی ہر لمحہ بڑھتا چلا جاتا تھا۔ موسلا دھار بارش اور گھٹا ٹوپ اندھیرے میں راستہ سجھائی نہ دیتا تھا بریں ہم کئی گھنٹوں کی جدوجہد کے بعد ٹوٹے ہوے مکانوں کے سہارے ان مصیبت زدوں نے چار محل کے سنگ بستہ نالہ تک پہنچنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے آگے راستہ مسدود نظر آیا کیونکہ پانی قدِ آدم سے زیادہ اور اس کی رفتار غیر معمولی طور پر تیز تھی جس کی وجہ سے یہ بیکس اور بے بس خاندان ایک معصوم لڑکی کو گود میں لئے ہوے اس امید میں کئی گھنٹہ گلے برابر پانی اور موسلا دھار بارش میں نالہ کی منڈیر پر کھڑا رہا کہ شاید طغیانی کم ہو جائے اور نجات کی کوئی راہ نکل آئے لیکن موسلا دھار بارش اور سیلاب میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہی ہوتا رہا۔

"اب بھی گریہ سے نہیں فرصت مجھے فواد وار گو کہ میں ڈوبا کھڑا ہوں تا بہ گردن آب میں"

صبح ہوتے تمام سہاروں نے جواب دیدیا اور پانی سر سے گزرنے کی نوبت آئی تو دور سے ایک چھپر بہتا ہوا نظر آیا اور جب وہ قریب پہنچا تو ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہوا اور اس پر سب نے اس خیال سے پناہ لی کہ شاید اس بیچارگی میں یہ کشتیِ نوح ثابت ہو اور طوفان سے باہر نکال دے لیکن افسوس ہے کہ دو تین منٹ کے بعد اس نے سرد مہری دکھائی اور اپنے ساتھ تین انسانی ہستیوں کو لے ڈوبا اسی سلسلہ میں حضرت امجد ڈوبتے تیرتے زنانہ شفاخانہ کے قریب پہنچے۔ عمارت کی چھت پر شفاخانہ کی عورتیں پناہ گزین تھیں انہیں دیکھ کر رحم آیا اور ان میں سے بعض نے ان کی طرف دوپٹہ پھینکا اور اس کے سہارے اوپر کھینچ لیا۔ طغیانی کا زور کم ہونے پر خستہ اور پر اندوہ حالت میں نیچے اُترے اور ایک عزیز کے مکان میں پناہ لی۔

اس اندوہناک اور قیامت خیز داستان کا فوٹو حضرت امجد نے اپنی ابتدائی اور مشہور نظم "قیامتِ صغریٰ" میں جس کا اقتباس درج ہے اس طرح کھینچا ہے :-

میں موردِ حرماں و گرفتارِ بلا ہوں　　ماں باپ سے بچھڑا ہوا بچوں سے جدا ہوں
گہ محوِ فغاں ہوں کبھی مصروفِ بکا ہوں　　معلوم نہیں خود مجھے میں کون ہوں کیا ہوں

بیہوش کبھی ہوں کبھی ہو جاتا ہے سکتا
وہ عالمِ حیرت ہے کہ کچھ کہہ نہیں سکتا

جو ہم نے سہا ہے نہ سہا ہوگا کسی نے　　دیکھا ہے جو کچھ ہم نے وہ دشمن بھی نہ دیکھے
کچھ ایسے دئے چرخِ ستمگار نے چرکے　　یک لخت ہوئے قلب و جگر کے کئی ٹکڑے

لختے برد از دل گذرد ہر کہ زپیشم
من قاشِ فروشِ دلِ صد پارۂ خویشم

اے واہ رے تقدیر میں دنیا میں جب آیا　　چالیسویں دن ہی نہ رہا باپ کا سایہ
جو باقی تھے دریا نے کیا ان کا صفایا　　کمبخت نے اک دم میں عزیزوں سے چھڑایا

زخمِ دلِ صد چاک ہم اب کس کو دکھائیں
افسانۂ شوریدہ سری کس کو سنائیں

وہ رات کا سناٹا وہ گھنگھور گھٹائیں۔　　بارش کی لگاتار جھڑی سرد ہوائیں
گرنا وہ مکانوں کا وہ چیخوں کی صدائیں　　وہ مانگنا ہر ایک کا رو رو کے دعائیں

پانی کا وہ زور اور وہ دریا کی روانی
پتھر کا کلیجہ ہو جسے دیکھ کے پانی

تاریکی میں دریا نے اک اندھیر مچایا　　سیلابِ فنا بن کے کیا سب کا صفایا
پاؤں سے گزرتا ہوا پھر سینہ تک آیا　　آگے جو بڑھا موت نے بس حلق دبایا

شب بھر رہے سب پانی میں فوارے کے مانند
ہوتے ہی سحر ڈوب گئے تارے کے مانند

مادر کہیں اور میں کہیں با دیدۂ پُر نم　　بی بی کہیں اور بیٹی کہیں توڑتی تھی دم

عالم میں نظر آتا تھا تاریکی کا عالم   کیوں رات نہ ہو ڈوب گیا نیر اعظم[1]
سب سامنے آنکھوں کے نہاں ہو گئے پیارے
وہ غم تھا کہ دن کو نظر آنے لگے تارے

کس جا سے میں ڈوبی ہوئی نعشوں کو لے آؤں   بیٹی کا پتا کیا ہے۔ کہاں بی بی کو پاؤں
دوں کس کو کفن کس کا میں تابوت بناؤں   ہے قبر کہاں پھول کہاں جا کے چڑھاؤں
ہے ہے ہدف رنج و محن کر گئیں اماں
افسوس کہ بے گور و کفن مر گئیں اماں

جب انجمن عیش و طرب ہو گئی برباد   افسردہ بھلا کیوں نہ رہے خاطر ناشاد
تنہائی میں آتی ہے عزیزوں کی اگر یاد   بے ساختہ کرتا ہے دل غمزدہ فریاد
اشک آنکھوں سے جاری ہیں کبھی لب پہ فغاں ہے
مرنے کے لئے مرتے ہیں پر موت کہاں ہے

للہ یہ بگڑی ہوئی تقدیر بنا لو..   میں خاک پہ گرنے کو ہوں لو! جلد سنبھالو
امجد کو بھی۔ اعظم کی طرح پاس بلالو   اک بار ذرا پھر مجھے چھاتی سے لگا لو
دل میں مرے اب صبر کی طاقت نہیں اماں
دنیا میں بغیر آپ کے راحت نہیں اماں

حضرت امجد کو بیوی اور لڑکی سے زیادہ شفیق اور مہربان ماں کے ڈوبنے کا صدمہ ہوا مندرجۂ بالا نظم کے علاوہ ایک رباعی میں بھی اپنے دردِ دل کا اظہار اس طرح کیا ہے :۔

طاقت نہیں دست و پا میں بے زور ہوں میں
پامالِ زمانہ صورتِ مور ہوں میں
اماں نہ سمجھنا کہ جہاں میں خوش ہوں
تم ہو بے گور، زندہ در گور ہوں میں

---

[1] مراد از اعظم النساء، دختر حضرت امجد۔

طغیانی کے بعد کا زمانہ طغیانی کے بعد بلدہ کے مشہور شیخ طریقت حضرت سید محمد اصغر حسینی مرحوم سجادہ درگاہ حضرت شاہ خاموش علیہ الرحمہ نے حضرت امجد کو اپنے فرزند حضرت سید محمد صابر حسینی سجادۂ درگاہ موصوف کی جو اس زمانہ میں کم سن تھے تعلیم و تربیت سپرد فرمائی۔

حضرت امجد پر خانہ برباد طغیانی کا اس قدر صدمہ تھا کہ آپ ایک مدت تک حالتِ خود فراموشی میں رہے۔ اسی حالت میں سرکاری فرائض کی انجام دہی کے بعد فرصت کے وقت مولانا نادر الدین مرحوم سے کچھ پڑھ لیا کرتے تھے۔

عقدِ ثانی آخر چھ سال کے بعد مولانا ے مرحوم ہی کی تحریک پر ان کی بڑی صاحبزادی جمال النساء سے جو حسن صورت اور حسن سیرت میں فرد روزگار تھیں ۲۵ ہر جمادی الآخرہ ۱۳۳۳ھ روز جمعہ کو عقد ہوا۔ حضرت امجد نے انہیں سلمیٰ کا لقب دیا۔ عقد کے بعد چھ سال معمولی حالات میں گزرے، اس کے بعد جو کیفیت ہوئی وہ حضرت امجد ہی کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:-

شریک زندگی کے علمی اور روحانی کمالات "پانچ چھ برس بعد ہماری کسی خاص کوشش اور محنت کے بغیر ہماری زندگی کا دور بدلنے لگا۔ نہ کہیں جانے کی ضرورت ہوئی نہ آنے کی۔ وقت آگیا۔ رحمت الٰہی کے دروازے آہستہ آہستہ کھلتے گئے۔ مولانا مرحوم کی دعا کا اثر شروع ہو گیا، خدا اور رسول کی محبت کے آثار سلمیٰ کے اوضاع و اطوار سے ظاہر ہونے لگے۔ سر و سینہ میں دل و دماغ کے دبے ہوئے بیج ایک طاقتور پودے کی طرح پھولنے پھلنے لگے۔ غیر معمولی دوربینی، دقیقہ رسی، ذہانت، ادراک، غور و فکر کا ملکہ ترقی کرتا چلا۔ دماغ کی مخفی لہروں میں بڑھتے بڑھتے سمندر کی سی طوفان خیز، حیرت انگیز طاقت پیدا ہوتی چلی۔ منہ سے جو بات نکلتی، عجیب ہوتی۔ جو گفتگو ہوتی حیرت خیز ہوتی وہ کہنے کے لئے تھیں ہم سمجھنے کے لئے تھے۔"

ہماری حیرانی، اُن کی مسرت کا سبب، ہمارا تعجب ان کے انبساط کا موجب ہوتا تھا۔

اے جان تو شاد از گراں جانیِ ما
اے جمع دل تو از پریشانیِ ما

ہر جلوۂ تو بہ بحر حیرت افگند
آخر غرضت چیست ز حیرانی ما

اگر ہم یہ کہیں یہ کوئی بیرونی چیز نہیں تھی بلکہ ہماری ہی قوت دماغی کا انعکاس تھا، جو دوسری طرف مرتسم ہو رہا تھا اور یہ ہماری ہی تقدیروں کا اثر تھا جو نئے رنگ میں ظہور پذیر تھا تو صحیح نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ لطائف و نکات جو کبھی اور کسی وقت خود ہمارے وہم و خیال میں بھی نہ آئے تھے ان کی زبان سے بلا تکلف ادا ہوتے تھے۔

اکثر ایسا ہوتا تھا کہ انہوں نے کوئی بات کہی اور ہم نے حیرت سے منہ کھول دیا، وہ تقریر کرنے لگیں ہم مبہوت سے بنے ہوئے سنتے رہے، کبھی کبھی انہیں بحثوں اور مکالموں میں آدھی آدھی رات گزر جاتی۔ کبھی کبھی پکانے کے لئے بھی وقت نہ ملتا، بازار سے روٹی لاکر کھاتے۔ اکل و شرب کی تمام لذتیں، روحانی اور مذہبی مسرتوں پر قربان تھیں، اکثر کہا کرتیں۔

زندگی باید مرا نام و نشاں در کار نیست
لذتِ جاں باید م ذوق زباں در کار نیست

افسوس ہے کہ اس فردِ روزگار ہستی یعنی جمال النسا سلمیٰ[۱] کا وصال حج سے واپسی کے ڈھائی مہینے بعد ۳۳ سال کی عمر میں ۲۲ ربیع الاول ۱۳۴۷ھ روز جمعہ کو صبح کے وقت ہوا۔ اور احاطۂ درگاہ حضرت شاہ خاموش علیہ الرحمۃ میں حضرت امجد ہی کے مزار میں جسکو انہوں نے اپنے لئے تیار کرایا تھا پیوند خاک ہوئیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون! ان کے علمی اور روحانی کمالات کی تفصیل "جمال امجد" میں ملاحظہ ہو۔

---

[۱] علامہ نادر الدین مرحوم کی نور نظر ہونے کے لحاظ سے مرحومہ جمال النسا سلمیٰ میں جو روحانی اور علمی کمالات تھے اس کے مجمل واقعات ملاحظہ فرما چکے۔ ان کے علاوہ کبھی کبھی عالم خاص میں ان کی زبان پر اشعار بھی جاری ہو جایا کرتے تھے جن کا نمونہ ذیل میں ملاحظہ ہو:۔

غزل

نہ ہو کوئی ہمرہ یہی ہمرہی ہے	رہوں بے خبر میں یہی آگہی ہے
کبھی ہے قیام اور کسی وقت سجدہ	کبھی سرکشی ہے کبھی عاجزی ہے
کبھی ٹیس دل میں کبھی لب پہ آہیں	مری جان کو اک نہ اک دل لگی ہے

(بقیہ بر صفحہ آیندہ)

شاعری کی ابتدا حضرت امجد میں شاعری کا ذوق فطری ہے، جب کچھ ہوش سنبھالا اور تھوڑی بہت تعلیم حاصل کی تو شاعری کی جانب غیر معمولی رجحان پیدا ہوا۔ غزل سے ابتدا ہوئی اور دلی جذبات کا اظہار اردو، فارسی زبانوں میں ہونے لگا ان کے قلم سے سب سے پہلے یہ اردو شعر نکلا:-

نہیں غم گرچہ دشمن ہو گیا ہے آسماں اپنا　　مگر یارب نہ ہونا مہرباں وہ مہرباں اپنا

اور فارسی میں یہ شعر:-

بسان سایۂ نصف النہارم پیش پا افتد　　اگر خورشید محشر را نظر بر داغ ما افتد

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱

نہ میری سنیں گے نہ بولیں گے مجھ سے　　عجب بیکسی ہے عجب خامشی ہے

عجب ہے کہ نشاخیں تو ہیں آسماں پر　　جو جڑ ہے وہ مٹی کے اندر دبی ہے

نہ معلوم جب تجھ کو دیکھوں تو کیا ہو　　ترے نام ہی میں مجھے بیخودی ہے

ہے سلمیٰ دل و جان سے امجد کی لونڈی

اور امجد غلامِ غلامِ نبی ہے

متفرق اشعار

کبھی حسن ہے تو کبھی عشق ہے تو　　کبھی کھنچتا ہے کبھی کھنچ رہا ہے

ایک مدت سے پڑی ہے مری سونی نگری　　اپنی بستی مری ہستی میں بسالے آجا

نشاں راہیں کیں نشاں بے نشان است　　مکان صد ہزار و مکین لامکان است

قطعہ

زندگی کی موت سے تکمیل ہے　　موت کیا ہے حکم کی تعمیل ہے

حکم کیا روح و روانِ زندگی　　زندگی کیا اپنے رب کی بندگی

مخمس

وہ یوسف گم گشتہ کس جائے نہاں ہوگا　　کس پہلو میں پوشیدہ وہ راحت جاں ہوگا

یہ عالم کثرت کب توحید نشاں ہوگا　　اس جسم کی مسجد میں کب شورِ اذاں ہوگا

مرا عربی آقا اللہ! کہاں ہوگا۔

کچھ دنوں اردو غزل کی حد تک حضرت حبیب[۱] کنتوری سے اور فارسی میں جناب ترکی[۲] سے مشورت کرتے رہے لیکن تھوڑی مدت میں اس سے بے نیاز ہوگئے اور اپنے کلام پر خود ہی نظر ثانی کرنے لگے۔ حضرت امجد کا کلام ان کے شاگرد یا احباب شہر کے مشہور اور نامی مشاعروں میں سنا کر حاضرین سے خراج تحسین حاصل کیا کرتے تھے۔ ایک مشاعرہ میں ان کی غزل کے اس مقطع کی۔

منہ کھولتا ہے تا کہ پلادے کوئی شراب | امجد جمائیاں نہیں لیتا خمار میں

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲

جنگل میں بھٹکتی ہوں اب راہ دکھا دیجئے | ہاں دامن سلمیٰ کو کانٹوں سے چھڑا دیجئے
بچھڑی ہوئی لونڈی کو آقا سے ملا دیجئے | یا سید الصدیق کچھ آپ بتا دیجئے

مرا حسرتی آقا اللہ کہاں ہوگا

رباعیات

خالی ہے مکاں مکین پیدا کردے | دل میں میرے دل نشین پیدا کردے
اے مردہ دلوں کے زندہ کرنے والے | شکی دل میں یقین پیدا کردے

تن میرا تراریں بسیرا ہوجائے | سونی نگری میں ایک پھیرا ہوجائے
میں اپنے لئے ذرا بھی باقی نہ رہوں | میرا سارا وجود تیرا ہوجائے

جب راکھ نکل گئی دہک کر اٹھے | سورج کی طرح چمک دمک کر اٹھے
یوں موت نے صاف کردیا دامن روح | جس طرح کوئی گرد جھٹک کر اٹھے

اب روح قدم قدم پہ اتراتی ہے | ہر سانس میں تازہ زندگی پاتی ہے
اک روز قدم حضور کے چومے تھے | اب تک میرے منہ سے بوئے عطر آتی ہے

---

[۱] مشہور شاعر ہیں۔ سید محمد کاظم نام حبیب تخلص تھا کنتور کے رہنے والے تھے۔ مکرمی حضرت ضامن کنتوری کے والد ماجد اور مولانا تصدق حسین مرحوم مہتمم کتب خانہ آصفیہ کے بہنوئی۔ غالباً دفتر صوبہ داری ضلع ورنگل کی سررشتہ داری پر مامور تھے قیام بلدہ میں ان کے گھر ماہانہ مشاعرہ ہوتا تھا جس میں اساتذۂ وقت اپنا کلام سناتے تھے انتقال کو (۲۰، ۲۲) سال ہوئے بلدہ میں ان کے اکثر شاگرد ہیں۔ صاحب دیوان ہیں۔

[۲] ترک علی شاہ نام ترکی تخلص تھا نور محل (پنجاب) کے رہنے والے تھے۔ مولانا غلام قادر گرامی مرحوم

حضرت میکش[علہ] تھانوی مرحوم نے بہت داد دی اور فرمایا امجد کی جگہ میکش ہوتا تو اس میں اور چار چاند لگ جاتے۔

راقم اور حضرت امجد سے ۱۳۱۲ف سے ملاقات ہے۔ ملاقات کے تھوڑے ہی دنوں بعد ایک موقع پر مولانا نے چند اردو، فارسی رباعیاں سنائیں جو اخلاقی اور فلسفیانہ مضامین پر مبنی تھیں۔ میں نے اشاعت کی غرض سے اور رباعیاں کہنے کی جانب توجہ دلائی جس کا اثر یہ ہوا کہ تھوڑی سی مدت میں اردو اور فارسی رباعیوں کا مجموعہ ترتیب پا گیا جسے میں نے مطبع شمسی آگرہ میں طبع کرا کے شائع کیا۔ اس مجموعہ کو ملک نے قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔ مقامی اخبارات اور مشاہیر ہند علی الخصوص شمس العلما مولانا حالی، شمس العلما مولانا شبلی نعمانی اور مولوی محمد عزیز مرزا مرحوم نے دکن کے ایک نوجوان شاعر کا کلام نہایت تعجب سے پڑھا اور اس پر حوصلہ افزا تقریظیں لکھیں۔ سررشتۂ تعلیم نے بھی اس کے متعدد نسخے خرید کئے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳) ان کے برادر نسبتی تھے۔ حضرت ترکی درباری شاعر اور مہاراجہ بہادر کے مصاحبِ خاص تھے۔ مشاعرہ میں غزل سنانے وقت کئی کئی گز آگے نکل جاتے تھے۔ آدمی نہایت زندہ دل تھے۔ اردو اور فارسی میں صاحب دیوان ہیں عمرِ طبعی کو پہنچکر انتقال کیا۔

علہ تھانہ بھون کے رہنے والے تھے۔ ان کا نام پنڈت سورج بھان اور میکش تخلص تھا۔ بلدہ میں آنے کے بعد تھانہ بھون کے ایک صوفی بزرگ حضرت شاہ امداد علی علوی خلیفہ حضرت مرزا سردار بیگ رحمتہ اللہ علیہ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی، پہلے نام کی مناسبت سے اسلامی نام شمس الحق رکھا گیا۔ بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔ حیدرآباد کے اکثر نوجوان ان کے شاگرد تھے۔ حضرت کیفی حیدرآبادی مرحوم کو بھی ابتدا میں انہیں سے تلمذ تھا بعد ازاں حضرت داغ دہلوی کے شاگرد ہوئے۔ حضرت میکش مشاعرہ میں اپنی غزل نہایت دردناک لہجہ میں سناتے تھے۔ پندرہ سال ہوئے سرزمین حیدرآباد میں پیوندِ خاک ہوئے۔

تصانیف

حضرت امجد کی نظم و نثر میں متعدد تصانیف ہیں جس کی تفصیل ذیل میں درج ہے:

(۱) "ریاض امجد" حصہ اول ۔ اس مجموعہ میں چھوٹی بڑی (۴۲) نظمیں ہیں جو مختلف اصنافِ سخن پر مشتمل ہیں اور جس میں بقول مولانا سید عبدالغنی وارثی مرحوم "جوش رحمت" "دُنیا اور انسان" "ماں اور بچی" "میری قمری" "اسنو ہیلنا" اور "قیامت صغریٰ" خصوصیت کے ساتھ قابل تحسین اور لایق داد ہے"۔

(۲) "ریاض امجد" حصہ دوم ۔ اس میں بھی مختلف عنوانوں کے تحت چھوٹی بڑی (۴۴) نظمیں ہیں اور سب کی سب پسندیدہ اور شاعری کا اعلیٰ نمونہ ہیں ۔

(۳) "خرقہ امجد" (سی پیوند) جیسا کہ اس کے عنوان سے ظاہر ہے اس میں ایک مقدمہ کے علاوہ جو حضرت امجد کی انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے فلسفہ الہیات پر (۳۰) نظمیں ہیں جو مختلف عنوانوں کے تحت لکھی گئی ہیں اور اکثر و بیشتر رباعی کے وزن پر ہیں ۔ ان نظموں میں جن اعلیٰ خیالات کا اظہار ہوا ہے ان کے سمجھنے کے لئے لیاقتِ علمی کے علاوہ فلسفہ تصوف سے دلچسپی اور معلومات کی بھی ضرورت ہے ۔ الغرض یہ نہایت بلند پایہ تصنیف ہے۔

(۴) "نذر امجد" اس میں ہجرت کے واقعات شستہ زبان، بہترین اسلوب اور والہانہ جذبات کے ساتھ نظم کئے گئے ہیں ۔ اس مسدس کے (۴۳) بند ہیں حیدرآباد اور بیرونِ ملک کے اکثر خاندان کی مسلمان لڑکیاں اس کو خوش الحانی کے ساتھ مزے لےلیکر پڑھتی اور قلوب کو نور ایمان سے منور کرتی ہیں ۔

(۵) "رباعیات امجد" حصہ اول ۔ اس میں (۶۸) اردو اور (۳۰) فارسی رباعیات ہیں ۔ اس پر مولانا عبداللہ العمادی ناظر مذہبی و رکن دار الترجمہ نے اپنے خصوصی انداز میں مقدمہ لکھا ہے ۔ فرماتے ہیں :-

معراج سخن میں شاہدِ معنی کو بہ ہفت دیکھنا ہو تو "رباعیات امجد" کو دیکھیے جس کے جلووں میں خدا کی شان نظر آتی ہے اور جس کی حکیمانہ ابداع اس مبدعِ اعظم کی قدرت کاملہ کا نشان بتاتی ہے ۔ . . . .

یہ واحدِ وحید یہ فردِ فرید ابوالاعظم سید احمد حسین صاحب امجد کی آیتِ کمال ہے

جن کی تلاوتِ کلام پر عجب نہیں اہلِ حال سجدہ جائز سمجھیں اور جبینِ سجود حبابِ الٰہی میں عرضِ خضوع کرے کہ :-

قایم بہ عبادت تو کہسار بدشت مصروف رکوع و سجدہ اشجار بدشت
دریا ز حباب سبحہ درکف دارد انگشت شہادت است ہر خار بدشت

ان رباعیوں میں قرآن کریم کی کسی نہ کسی آیت یا حدیث شریف کے کسی نہ کسی مفہوم کی جانب ایک خاص دل آویز و دل نشیں انداز میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس حصہ کی اکثر رباعیاں شاعری کے ابتدائی زمانہ کی ہیں۔

(۶) "رباعیات امجد" حصہ دوم (۷۶) اردو اور (۴) فارسی رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں ایک دلچسپ مقدمہ کے ساتھ "معلومات امجد" کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اور یہ (۲۰) رباعیات کا مجموعہ ہے۔

(۷) "جمال امجد" - یہ دلچسپ کتاب (۱۱) نوشتوں اور (۲۸۴) صفحات پر مشتمل ہے اور حضرت امجد کی اعلیٰ اور انوکھی نثر نگاری کا نمونہ ہے اس میں حضرت امجد نے اپنے اور اپنی شریک و رفیق زندگی جمال النسا (سلمیٰ بنت مولانا نادر الدین مرحوم) کے حالات و حکیمانہ اقوال نہایت دلچسپ انداز میں بیان کئے ہیں اور موقع و محل پر رباعیات اور قطعات کا جوڑ سونے پر سہاگہ ہو گیا ہے۔

(۸) "حج امجد" اس میں حضرت امجد نے سفرِ حجاز کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ یہ سفر جو فریضۂ حج کی تکمیل پر مبنی تھا حضرت امجد نے ۱۳۴۷ھ میں اپنی رفیقِ زندگی سلمیٰ مرحومہ کے ساتھ کیا تھا۔ اس کے مختلف عنوان ہیں اور ہر ایک کی تکمیل نہایت والہانہ انداز میں ہوئی ہے اور لفظ لفظ سے اسلامی اور مذہبی جذبات عیاں ہوتے ہیں۔

کلام پر ایک نظر

حضرت امجد کی حقیقی شاعری کا اظہار ان کی رباعیوں سے ہوتا ہے وہ پبلک میں روشناس بھی زیادہ تر رباعی گو شاعر کی حیثیت سے ہیں۔ اگرچہ وہ مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کر چکے ہیں لیکن قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ وہ عمر خیام، سحابی نجفی اور اور سرمد کا سا دل و دماغ رکھ کر غزل گو شعرا کی صف میں جگہ پائیں

اور اُن کے قدیم طرز کے کلام کا کچھ وجود بھی دنیا میں باقی رہے چنانچہ اردو فارسی مجموعہ غزلیات اور متفرق کلام جس قدر بھی تھا سب کا سب نذر سیلاب ہوگیا۔

حضرت امجد چونکہ رباعی گو شاعر ہیں اور اس صنف میں انہیں خاص ذوق ہے لہذا ناظرین کی دلچسپی کے لئے سب سے پہلے اسی صنف کو لیا جاتا ہے۔

رباعیات پر مشاہیر ہندو دکن کے خیالات

قبل اس کے کہ رباعیوں کا انتخاب ہدیۂ ناظرین کیا جائے ان کی اہمیت کے لحاظ سے بعض مشاہیر ہند کے خیالات درج کئے جاتے ہیں :-

علامہ عمادی ناظر دار الترجمہ ۔ "معراجِ سخن میں شاہدِ معنی کو ہر ہفت دیکھنا ہو تو رباعیاتِ امجد کو دیکھیے۔

موللنا عبد القدیر پروفیسر ۔ "ہر رباعی سے ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے اور ہر عنوان سے حیرت"۔

موللنا جمال الدین نوری مرحوم ۔ "رباعیات امجد بے مثل ہیں"۔

موللنا عبد الواسع پروفیسر ۔ "ہر رباعی مضامین کا ایک دفتر ہے اور ہر مصرعہ دلکشی کا ایک بے بہا گوہر"۔

موللنا علی حیدر طباطبائی ۔ "رباعیاتِ امجد کی داد دینا سخن شناسی کا اقتضا ہے"۔

موللنا مناظر احسن گیلانی ۔ "حضرت امجد ہندوستان کے اُن شعرا میں ہیں جن کو زمانہ صدیوں کے بعد پیدا کرتا ہے۔

ڈاکٹر سر اقبال ۔ "ہر رباعی قابل داد ہے ان کے پڑھنے سے روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے"۔

مولوی محب الحق پٹنہ ۔ "ہر رباعی ضرب المثل ہونے کے قابل ہے"۔

مولوی عبد الماجد بی، اے ۔ "رباعیات امجد معنویت کی بلندی اور طرز ادا دونوں حیثیت سے قابل داد ہیں۔

مولوی عظمت اللہ خان بی، اے مرحوم ۔ "رباعیات امجد زندگی کی اعلیٰ ترین رخ کی تفسیر ہیں اور نہ بلحاظِ ادب اظہار خیال کا بہترین نمونہ ہے"۔

مولوی وحیدالدین سلیم مرحوم ۔ "امجد صاحب قدرتی شاعر ہیں ۔ مبصرین کی رائے میں اس وقت ہندوستان میں ان کی ٹکر کا رباعی کہنے والا کوئی شاعر نہیں ہے"
مولوی الیاس برنی پروفیسر "ایسے ہی کلام سے یقین ہوتا ہے کہ "شاعری جزویست از پیغمبری"

مولنا غلام قادر گرامی مرحوم :۔

"امجد بہ رباعی است فرد امجد | کلک امجد کلید گنج سرمد
گفتم کہ بود جواب سرمد امروز | روح سرمد بگفت امجد، امجد"

نمونہ رباعیات اس مضمون کو، کہ تمام کائنات اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تہلیل میں مصروف ہے ذیل کی رباعی میں کس قدر دلنشیں انداز میں ادا کیا گیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں :۔

قایم بہ عبادت تو کہسار بدشت | مصروف رکوع و سجدہ اشجار بدشت
دریا زحباب سبحہ درکف دارد | انگشت شہادت است ہرخار بدشت

یہ مشہور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ نہ تھا اس کی توجیہات قدیم و جدید شعراء نے مختلف طریقہ پر کی ہیں اور اس بارہ میں بہت کچھ نازک خیالی سے کام لیا ہے۔ اس مضمون کو حضرت امجد نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے:۔

اے آنکہ خیال تست پیدا در دل | آثار محبتت ہویدا در دل
وانی کہ چہ شد سیاہی سایۂ تو؟ | درچشم سواد شد سویدا در دل

دنیا میں اکثر ایسے لوگ دیکھے جاتے ہیں کہ جن کو اپنے زہد پر ناز اور عبادت پر غرور ہوا کرتا ہے اور بجائے اس کے کہ زہد و ریاضت تزکیہ نفس اور صفائی قلب کا باعث ہو اس سے اُلٹی تاریکی چھا جاتی ہے ۔ اس واقعہ کو پیش کرتے ہوئے مثال میں جبر کا عمل بتاتے ہیں کہ ایک ہی سجدہ میں اس پر سے تو سیاہی دور ہو جاتی ہے لیکن تعجب ہے کہ نماز کے سیکڑوں سجدے بھی انسانی قلب کی صفائی کا موجب نہ ہوں!

در مسکن جان ہست مکین تاریکی | شد در دل تیرہ دل نشین تاریکی

دل صاف نشد بصد نماز م افسوس یک سجدہ ببرد از نگین تاریکی

اس خیال کو کہ حریص انسان دولت پانے سے اور زیادہ حریص ہوتا اور حرص کے چکر میں پڑجاتا ہے کس قدر قریب الفہم اور عمدہ مثال دے کر قوی کر دیا گیا ہے۔

ممسک سپے مال چون گدا می گردد برزر، بہزار جان فدا می گردد

طامع، زحصول مال، طماع شود چون دانہ بیاید آسیا می گردد

وعظ سننے سے مقصد یہ ہے کہ غفلت اور جہل و نادانی دور ہو جائے لیکن جو انسان فطرۃً بدخصلت ہو اس پر اس کا اچھا اثر مترتب نہیں ہوتا بلکہ اس کی غفلت اور بڑھ جاتی ہے جس طرح کہ گہوارے کا ہلنا بچہ کے لئے نیند کا باعث ہوتا ہے۔

نادان بہ شنا، در تہ گرداب رود خودسر بے رہ چونیر پرتاب رود

بدخو از وعظ، بیش غفلت ورزد از جنبش مہد، طفل در خواب رود

بخیل کا وجود سوسائٹی کے لئے سب سے بڑی مصیبت ہے اس کا مال نہ اس کی ذات کے لئے مفید ہوتا ہے اور نہ سوسائٹی کے کام آتا ہے۔ انسان کے لئے یہ مصیبت بھی کچھ کم قابل افسوس نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اپنے بندوں کو مال و دولت سے بہرہ ور فرمائے لیکن بخل اس کو اس کے استفادہ سے محروم رکھے اس کی مثال اس سے بہتر نہیں ہو سکتی کہ سانپ خزانہ پر مسلط رہنے کے باوجود اس سے استفادہ نہ کر سکے اور صرف خاک پر قناعت کرے۔

ممسک، ہمہ خونِ دل صد چاک خورد یک لقمہ بصد نالۂ غمناک خورد

بدبخت، زکسب مال نفعے نہ برد افعی، بر گنج ماند و خاک خورد

وہ مذہبی پیشوا جنہوں نے محض دنیا طلبی کی خاطر قبا و عبا اختیار کر رکھی ہے اور تسبیح کے ذریعہ سے اپنے تقدس کا سکہ عوام کے دلوں پر بٹھا کر اُلّو سیدھا کیا کرتے ہیں ان کا راز اس طرح فاش کیا گیا ہے۔

سررشتۂ ننگ و نام در کف دارند این مقتدیان امام در کف دارند

منگر بہ لباس دلق پوشان کاینان از دانۂ سبحہ دام در کف دارند

فی زمانہ ہندوستان اور خاص کر دکن میں قبر پرستی کا جس قدر زور ہے اور اکثر مسلمانوں نے اس میں احکام شریعت کے خلاف جیسا کچھ مسلک اختیار کر رکھا ہے ان کی اصلاح کی بیحد ضرورت ہے۔ حضرت امجد نے اس کی روک تھام کے لئے مثال میں نماز میت کو پیش کر کے بتایا ہے کہ اس نماز میں سجدہ اسی لئے ممنوع ہے کہ عوام اس کو قبر پرستی کا بہانہ نہ بنالیں۔

از جادۂ شرع پیش دستی نہ کنند در محفل دین پاک مستی نہ کنند
سجدہ بہ نماز میت آمد ممنوع تا مردہ دلان قبر پرستی نہ کنند

کمینہ اور سفلہ منش لوگوں کے عروج پاجانے سے شریف اور نیک نہاد لوگوں کو جیسی کچھ مشکلات پیش آتی ہیں ان کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ حضرت امجد نے روزمرہ پیش آنے والے واقعات میں سے ایک ایسے واقعہ کو مثال میں پیش کرتے ہوئے اس فتنہ سے بچنے کا مشورہ دیا ہے اور بتایا ہے کہ جس طرح گرد کے بلند ہونے پر اس سے بچنے کے لئے انسان کو آنکھیں بند کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے اسی طرح کسی سفلہ کے صاحب جاہ ہونے پر اس کی طرف سے آنکھیں بند کرلینا یا دور بھاگنا مناسب ہے۔

از دہر اگر دست دہد چشم بہ بند تا چشمت اجل بند کند چشم بہ بند
گر سفلہ رسد بجاہ۔ بگریز از و چون گرد بر آسمان رود چشم بہ بند

خادمِ قوم مخدوم اور بیکسوں کی ہمدردی کرنے والا کبھی نہ کبھی مراتبِ اعلیٰ پر فائز ہوتا ہے اس فلسفہ کو ذیل کی رباعی میں ایک عمدہ مثال کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہے:-

از خدمت خلق بندہ اعلیٰ گردد مستوجب فضل حق تعالیٰ گردد
ہمدردی بیکسان رساند بہ شرف آتش چو بہ خس گرفت بالا گردد

شبان عہد موسیٰ علیہ السلام کے اُن دلی جذبات کو جو جناب باری میں عرض کئے گئے تھے اور جو مثنوی مولنا روم کے صفحات کی زینت ہیں جس اختصار کے ساتھ رباعی کے قالب میں ڈھالا گیا ہے وہ حضرت امجد ہی کا حصہ ہے۔ ملاحظہ ہو:-

جان را بہ سر زلف تو بستن ہوس ست دل را سر راہ تو شکستن ہوس ست

سر بر قدمت نہادہ با عجز و نیاز پائے تو ز آب دیدہ شستن ہوس ست

فارسی کی چند رباعیوں کو بطور نمونہ درج کرنے کے بعد اب ہم ------

------ اردو کی رباعیوں کا انتخاب پیش کرتے ہیں جو ہندوستانی قوم کی مشترکہ زبان ہے، عرض و طول ہند میں ہر جگہ بولی یا سمجھی جاتی ہے اور دیگر بلاد ایشیا و یورپ میں اس کے قدر داں موجود ہیں۔

اردو زبان نے جب سے کہ جنم لیا ہے رباعی گو شعراء میں صرف دو ہی شاعر انیس و دبیر گزرے ہیں جنہوں نے شاعری کی اس اعلیٰ صنف کو اوجِ کمال پر پہنچایا۔ نصف صدی کے بعد اب اس کے مرد میدان صرف حضرت امجد ہی ہیں جن کی سحر طرازیوں اور معجز نمائیوں کا اعتراف اس دورِ ترقی کے جملہ اکابر کرتے اور ہر مصرعہ پر سر دھنتے ہیں۔ ذیل کے انتخاب میں ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے بھی روحانی مسرتوں کا خوان بچھایا جاتا ہے:۔

جب انسان حصول مقصد کے لئے دربدر گردش اور غیر معمولی کوشش کر کے تھک جاتا اور ناکام رہتا ہے تو اپنے معاملات کو حوالۂ تقدیر کر کے صبر اختیار کر لیتا ہے۔ ذیل کی رباعی میں کس موثر انداز سے اس مضمون کو ادا کیا گیا ہے:۔

ناحق پھر پھر کے سر پھرایا میں نے اپنی کوشش سے کچھ نہ پایا میں نے
طوفان میں ہے کشتیِ امید مری لے تو ہی سنبھال ہاتھ اٹھایا میں نے

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہم معجزات میں دیگر معجزات کے علاوہ حضور کی ذات اقدس کا بے سایہ ہونا، چاند کا ٹکڑے ہونا اور معراج کا ہونا بھی داخل ہے لیکن حضور اقدس کے علو مرتبت کے مقابل ان حیرت خیز امور کو معمولی باتیں قرار دے کر فرماتے ہیں:۔

حیرت نہیں، بے سایہ اگر ذات ہوئی ٹکڑے کیا چاند کیا کرامات ہوئی
دن رات تھا جلوۂ خدا پیش نظر معراج ہوئی تو کیا نئی بات ہوئی

اکثر انسانوں کی دعائیں جو تقویٰ اور طہارت کے باوجود بیکار جاتی اور کوئی اثر

نہیں دکھاتی ہیں حضرت امجد کے خیال میں اس کی بڑی وجہ اکل حلال کا فقدان ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی مریض دوا تو کھائے لیکن بد پرہیزی کرکے امید صحت رکھے اس قسم کے انسانی اعمال کا ذیل کی رباعی آئینہ ہے :-

لے لے کے خدا کا نام چلاتے ہیں — پھر بھی اثر دعا نہیں پاتے ہیں
کھاتے ہیں حرام لقمہ پڑھتے ہیں نماز — کرتے نہیں پرہیز دوا کھاتے ہیں

وحدۃ الوجود تصوف میں ایک معرکتہ الآرا مسئلہ ہے اور اس پر بڑی بڑی تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ حضرت امجد نے اس مسئلہ کو جس آسان اور دل نشین پیرایہ میں نہایت اختصار کے ساتھ بیان فرمایا ہے انہیں کا حصہ ہے ملاحظہ ہو :-

واجب سے ظہور شکل امکانی ہے — وحدت میں دوئی کا وہم، نادانی ہے
دھوکہ ہے نظر کا۔ ورنہ ہر شئے ہمہ اوست — گرداب، حباب، موج سب پانی ہے

انسان کے لئے یہ بڑی بات ہے کہ وہ متمول ہونے یا جاہ و مرتبت حاصل کرنے کے بعد اپنے ہم جنسوں کے ساتھ انکسار و شرافت سے پیش آئے اور اس عارضی کامیابی پر فراعنہ کی روش اختیار نہ کرے لیکن تجربہ اس کا شاہد ہے کہ بخت و اتفاق سے جب کوئی کم مایہ شخص دولتمند یا صاحب جاہ ہو جاتا ہے تو وہ فوراً اکڑنا شروع کرتا اور اپنے ہم جنسوں کے لئے مصیبت ہو جاتا ہے۔ ذیل کی رباعی ایسے ہی لوگوں پر حرف بہ حرف صادق آتی ہے:-

کم ظرف اگر دولت و زر پاتا ہے — مانند حباب ابھر کے اتراتا ہے
کرتے ہیں ذرا سی بات میں فخر خسیس — تنکا تھوڑی ہوا سے اُڑ جاتا ہے

انسان اور اس کی کائنات یہ ہے کہ وہ دنیا میں ننگا آتا۔ راحت یا تکلیف سے زندگی کے دن گزارتا اور مرنے پر صرف چند گز کفن میں لپٹا ہوا آخری منزل کی راہ لیتا ہے۔ حضرت امجد نے ذیل کی رباعی میں دنیا کو بازار فنا قرار دیتے ہوئے بتایا ہے کہ اس میں انسان صرف کفن لینے کے لئے آیا ہے :-

بحر متلاطم میں بہا جاتا ہوں — ہر دم طرف لحد کھنچا جاتا ہوں
بازار فنا میں کیا ٹھہرتا ہے مجھے — میں صرف کفن لیکے چلا جاتا ہوں

انسان کا مآل زندگی یہ ہونا چاہیئے کہ اس کا جینا اور مرنا دونوں خدا کے لئے ہو اور اس کا کوئی قدم حق کے خلاف نہ اٹھے۔ اللہ اکبر ذیل کی رباعی کتنے بڑے مضمون کی حامل ہے:۔

غم میں ترے زندگی بسر کرتا ہوں زندہ ہوں، مگر تیرے لئے مرتا ہوں
تیری ہی طرف ہر اک قدم اٹھتا ہے ہر سانس کے ساتھ تیرا دم بھرتا ہوں

وحملها الانسان انه کان ظلوماً جهولا کی تفسیر جس نرالے انداز میں ذیل کی رباعی میں کی گئی ہے وہ حضرت امجد ہی کا حصہ ہے۔ پڑھئے اور روحانی لذت حاصل کیجئے۔

اس سینہ میں کائنات رکھ لی میں نے کیا ذکر صفات، ذات رکھ لی میں نے
ظالم سہی، جاہل سہی، نادان سہی، سب کچھ سہی، تیری بات رکھ لی میں نے

ذیل کی رباعی میں مسئلہ وحدۃ الوجود اور لا موجود الا اللہ کو جس متانہ انداز اور دل کش پیرایہ میں حضرت امجد نے بیان فرمایا ہے حق یہ ہے کہ انہیں کا حصہ تھا اور انہیں جیسے بزرگ کے لئے جائز بھی ہے۔ مضمون کے علاوہ زور بیان کا یہ حال ہے کہ پڑھنے والا بیخود ہو جاتا ہے:۔

ہیں مست مے شہود تو بھی میں بھی ہیں مدعی نمود، تو بھی میں بھی
یا تو ہی نہیں جہاں میں یا میں ہی نہیں ممکن نہیں دو وجود، تو بھی میں بھی

وجود باری تعالیٰ کے ثبوت میں ذیل کی رباعی ملاحظہ ہو:۔

خالق ہے کوئی ارض و سما شاہد ہے انت کے لئے اپنا انا شاہد ہے
اس پر بھی اگر کوئی نہ مانے نہ سہی خود، اپنے وجود پر، خدا شاہد ہے

افراد قوم میں بحالت موجودہ جو دنائت اور فرومایگی پائی جاتی ہے اور اپنی خود داری کے خلاف محض چند ٹکے سیدھے کرنے کی خاطر جیسے ناقابل بیان طریقے اختیار کئے جاتے ہیں ان سے احتراز کرنے اور صرف اسی ذات واحد کی طرف رجوع ہونے اور اس سے لو لگانے کے لئے جو ارض و سما کا مالک ہے ذیل میں کیسا اچھا سبق دیا گیا ہے:۔

ہر چیز مسبّب سبب سے مانگو منّت سے خوشامد سے ادب سے مانگو

کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو
بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو

نفی و اثبات میں ذیل کی رباعی سے بہتر اردو میں کوئی رباعی دیکھی نہیں گئی۔

اس پھول کا رنگ اُڑ کے بو رہ جائے
سر جائے تو جائے آبرو رہ جائے
ثابت ہو مری نفی سے تیرا اثبات
میں اتنا مٹوں، کہ صرف تو رہ جائے

ذیل کی صدا کس درد بھرے دل سے کیسے مستانہ انداز میں نکلی ہے کہ پڑھنے والے پر بیخودی طاری ہو جاتی ہے :-

جھولی بندہ کی بندہ پرور بھر دے
کشکول میں مقصود کے گوہر بھر دے
صدقہ تیرے میخانے کے میخواروں کا
اے ساقی کوثر مرا ساغر بھر دے

حضرت انسان کی کوتہ بینی ذیل کے دل کش الفاظ میں کس خوبی سے ظاہر کی گئی ہے :-

یاں جو آتا ہے بے ہنر آتا ہے
ہر فرد بشر ہمرہ شر آتا ہے
میری آنکھوں کی تنگ چشمی دیکھو
صورت میں فقط خال نظر آتا ہے

ہر ایسے درد میں راحت مل سکتی ہے جس کے زخم میں رخ مقصود کی جھلک دکھائی دے مصائب زندگی کو آسان بنانے کے لئے یہ کیا خوب فلسفہ ہے۔ ذیل کی رباعی اس درد راحت کا آئینہ ہے :-

غم میں، رخ مقصود نظر آتا ہے
جلتی ہوی شاخ میں ثمر آتا ہے
ہے زخم جگر میں تیری ہنستی صورت
ہر چوٹ کے ساتھ تو اُبھر آتا ہے

ایسا شکستہ دل کس قدر قابل رشک ہے جس میں عرش نشین کی منزل ہو۔ اس جام میں بقول حضرت امجد یہ عجیب بات ہے کہ وہ ٹوٹ کر بھرتا ہے۔

ٹوٹا ہوا دل یاد خدا کرتا ہے
عاشق ہی ادائے ناز پر مرتا ہے
رہتا ہے دلِ شکستہ میں عرش نشیں
یہ جام عجب ہے ٹوٹ کر بھرتا ہے

خاموش مقابلہ میں ظالم ہمیشہ ناکام رہتا ہے اور مظلوم کامیاب۔ ایسی شکست کا نتیجہ ہمیشہ فتح و ظفر کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ دنیا کی تمام مظلوم قوموں کی داستانیں

ایسی ہی فتح وشکست سے بھری پڑی ہیں۔ اس خاموش مقابلہ کا سماں ذیل کی رباعی میں دیکھیے:۔

جی اس کا بھی بھر آیا رُلا کر مجھ کو ٹھنڈا نہ رہا خود بھی، جلا کر مجھ کو
خود مل گیا، خاک میں ملا کر آخر کیا فتح ہوئی شکست پا کر مجھ کو

دل کی حرکت کا لطف ذیل کی رباعی میں اُٹھائیے :۔

تن کی رگ رگ سے جوئے خوں جاری ہے اک عالمِ کرب روح پر طاری ہے
ہر وقت کھٹک دل کی چلی جاتی ہے اللہ، اللہ، اس کو بیماری ہے

کنتُ کنزاً مخفیاً کی لوٹ کے لئے شاعر نے ان الفاظ میں صلائے عام دی ہے:۔

وہ پردہ سے حسن جاودانہ نکلا دل ہاتھ میں لیکے اک زمانہ نکلا
اے جوہریانِ عشق لوٹو، لوٹو برسوں کا دبا ہوا خزانہ نکلا

ذیل کی رباعی میں عقدِ محبت کی کشش کو دیکھئے کن الفاظ میں اس کی بندش ہوئی ہے :۔

بجتا ہے شکستہ ہو کے ارگن میرا شاداب خزاں میں بھی ہے گلشن میرا
کھنچنا ترا اور کھینچتا ہے مجھ کو دامن سے ترے بندھا ہے دامن میرا

خودنمائی کی مسابقت کا فوٹو اس رباعی میں کس عمدگی سے کھنچا ہے :۔

گیسو میں ہے بل کہ میرے خم کو دیکھو رخ ہنستا ہے کہ اس ستم کو دیکھو
اظہارِ کمال میں ہر اک کامل ہے سب کی یہی خواہش ہے کہ ہم کو دیکھو

ذیل کی رباعی مقصدِ زیست پر موزوں کی گئی ہے :۔

ہر وقت ہے لب پہ گفتگوئے مقصود لیکن نظر آتا نہیں روئے مقصود
کیا تم کو بتاؤں زندگی کا مقصد ہے مقصدِ زیست، جستجوئے مقصود

انسان کی بقا صرف سانس کے آنے جانے پر ہے لیکن اس کو اس کا بھی علم نہیں کہ جو سانس جا رہی ہے وہ واپس آئے گی بھی یا نہیں :۔

کب تک ہے بقائے تن فنا کو معلوم کب تک ہے یہ زندگی قضا کو معلوم
ہر سانس یہ کہہ رہی ہے آتے جاتے جاتی تو ہوں واپسی خدا کو معلوم

ہر شئے کی لم دریافت کرنا اور بات بات میں چوں و چرا سے کام لینا انسان کی فطرت میں داخل ہے حالانکہ بقول حضرت امجد اس کو ہمیشہ منہ کی کھائی پڑتی ہے۔ ایسے ہی قماش کے لوگوں پر یہ رباعی صادق آتی ہے :-

کھیتی مرے فلسفہ کی پکتی ہی نہیں — تدبیر سے تقدیر چمکتی ہی نہیں
کھاتی ہے ہمیشہ منہ کی لیکن پھر بھی — یہ کیا، وہ کیوں سے عقل تھکتی ہی نہیں

ذیل کی رباعی میں اسلام کے حسن معنی کو ظاہر کیا گیا ہے :-

بندہ ہے تو بندگی پہ قایم ہو جا — مخدوم نہ بن کسی کا خادم ہو جا
مومن ہے تو ڈھونڈھ لے کوئی امن کی جا — مسلم ہے تو سر جھکا کے نادم ہو جا

اس مادہ پرستی کے دور میں جب کہ بندے خدا سے دور ہوتے جا رہے ہیں حضرت امجد نے ذیل کی رباعی میں اس حالت کے دور ہونے اور اپنے دوستوں کے لئے خالق سے لو لگانے کی کیسی مخلصانہ دعا فرمائی ہے :-

لَو تجھ سے لگائے میرا ملنے والا — عالم کو بھلائے میرا ملنے والا
مولا ! مرے ہر دوست کو اپنا کر لے — تجھ سے ملجائے میرا ملنے والا

"معلومات امجد" کے تحت بیس رباعیوں کا مجموعہ ہے چند قابل ملاحظہ ہیں :-

تعریفِ شب فراق معلوم نہیں — کیفیت اشتیاق معلوم نہیں
کس طرح پسند عام ہو میرا کلام — ہر اک کا مجھے مذاق معلوم نہیں

دونوں موجود کوئی معدوم نہیں — دونوں ہیں یقینی کوئی موہوم نہیں
ہے ایک وجود باوجودِ من و تو — تو مجھ میں ہے ؟ میں تجھ میں ہوں معلوم نہیں

کس متن کی تفسیر ہوں معلوم نہیں — کس ہاتھ کی تحریر ہوں معلوم نہیں
میں ہوں کہ مرے پردے میں ہے اور کوئی — صورت ہوں کہ تصویر ہوں معلوم نہیں

عالم کا حساب کیا ہے معلوم نہیں
اس فن کا نصاب کیا ہے معلوم نہیں
کہتی ہے ہمیشہ عقل یہ کیوں، وہ کیوں
اس کیوں کا جواب کیا ہے؟ معلوم نہیں

میں کس لئے مسرور ہوں معلوم نہیں
کس بات پہ مغرور ہوں معلوم نہیں
بندہ ہوں تو مجھ میں کبریائی کیوں ہے
کس نشہ میں مخمور ہوں معلوم نہیں

مختلف اصناف سخن

حضرت امجد اگرچہ رباعی گو شاعر کی حیثیت سے طول و عرضِ ہند میں مشہور ہیں لیکن ان کی نظمیں، قطعات، مخمس، مسدس، اور تضمینیں بھی کچھ کم قابلِ تحسین اور لایقِ داد نہیں ہیں۔ ان میں سے بعض کا اقتباس کیا جاتا ہے ذیل کی نظم ہند و دکن کی مجالسِ سماع میں الاپی اور گلی کوچوں میں گائی جاتی ہے:۔

(۱)

کس بات کی کمی ہے مولا تری گلی میں
دنیا تری گلی میں عقبیٰ تری گلی میں
جامِ سفال اُس کا تاجِ شہنشہی ہو
آجائے جو بھکاری داتا تری گلی میں
دیوانگی پہ میری ہنستے ہیں عقل والے
تیری گلی کا رستہ پوچھا تری گلی میں
اک آفتاب وحدت ہے جلوہ بخشِ کثرت
بکلی ہوئی ہیں گلیاں صدہا تری گلی میں
ہے فیض کی تجلی گہری اندھیریوں میں
بکتا ہے رات ہی کو سودا تری گلی میں
سورج تجلیوں کا ہردم چمک رہا ہے
دیکھا نہیں کسی دن سایہ تری گلی میں
موت اور حیات میری دونوں ترے لئے ہیں
مرنا تری گلی میں جینا تری گلی میں
امجد کو آج تک ہم ادنیٰ سمجھ رہے تھے
لیکن مقام اس کا پایا تری گلی میں

---

(۲)

سوز مٹا دیا گیا میرے شکستہ ساز سے
نغمہ کی آتی ہے صدا نالہ دل گداز سے

اب تو مری نظر میں ہے حسن ہی حسن ہر طرف — خلعت عشق مل گیا بارگہ حجاز سے
حاصل عمر مل گیا قلب فسردہ کھل گیا — پڑ گئی زندگی میں جاں ان کی نگاہ ناز سے
برسوں کے بچھڑے مل گئے داغ دلوں کے دھل گئے — لپٹی ہے ان کی خاکِ پا مرے سرِ نیاز سے
بیٹھے تھے اک زمانہ سے نورِ قدم کے منتظر — نکلے ہیں سجدے سینکڑوں اب تو سرِ نیاز سے
صلّ کانّک تراہ ہو گیا قابل عمل — رفع یدین کر سکے، کون اب اس نماز سے
دل کی شکستگی نے آج جوڑ دیا کسی کے ساتھ — دیکھ لیا رخ حسین اس درِ نیم باز سے
حالتِ وجد ذوق میں دل سے یہ کہہ رہا ہے درد — ہم نے ملا دیا تجھے لے ترے چارہ ساز سے

امجدِ نیم جاں کی جاں، جانِ جہاں کو پا گئی
بربط روح بھر گیا نغمۂ دل نواز سے

---

(۳) طالب و مطلوب

مثل و مثال سے بری حدِّ مثال میں بھی آ — جاہ و جلال کے خدا شانِ جمال میں بھی آ
خسرو بارگاہ ناز لطف نیاز بھی تو دیکھ — اے مرے شاہباز حسن عشق کے جال میں بھی آ
قسمت بد کو نیک کر ظاہر و باطن ایک کر — تو مرے قال میں بھی آ تو مرے حال میں بھی آ
تو ہے جہاں میں ہر جگہ پھر بھی نہیں کسی جگہ — نورِ زمین و آسمان چشم خیال میں بھی آ
مردہ دلی نکال دے۔ جان میں جان ڈال دے — چشمۂ آب زندگی جامِ سفال میں بھی آ

جواب

صبح سرور کے حریص شامِ ملال میں بھی آ — طالبِ ملک سروری شانِ سوال میں بھی آ
ذوقِ شنید تا کجا دید کا لطف بھی تو دیکھ — لذت قال ترک کر عالم حال میں بھی آ
نقد شکستگی یہاں لعل و گہر سے ہے گراں — بامِ کمال سے اتر حدِ زوال میں بھی آ
رشتۂ عبدیت نہ توڑ شیوۂ عاجزی نہ چھوڑ — بو لہبی بہت ہوئی رنگِ بلالؓ میں بھی آ
جامۂ کبر چاک کر، خود کو خودی سے پاک کر — امجد بمنزلت طلب صف نعال میں بھی آ

(۴)

یوں تو کیا کیا نظر نہیں آتا کوئی تم سا نظر نہیں آتا
ڈھونڈتی ہیں جسے مری آنکھیں وہ تماشا نظر نہیں آتا
اپنی آنکھوں سے اس کو دیکھوں گا جسے مجھے ایسا نظر نہیں آتا
ہو چلی ختم انتظار میں عمر کوئی آتا نظر نہیں آتا
جھولیاں سب کی بھرتی جاتی ہیں دینے والا نظر نہیں آتا
جو نظر آتے ہیں، نہیں اپنے جو ہے اپنا نظر نہیں آتا
زیرِ سایہ ہوں اُس کے اے امجدؔ
جس کا سایہ نظر نہیں آتا

دنیائے شاعری میں بعض اشعار ایسے بھی پائے جاتے ہیں کہ جو بیت الغزل ہی نہیں بلکہ دیوان کا جواب کہلانے کا استحقاق رکھتے ہیں چنانچہ غنی کشمیری کے اس شعر کے متعلق :-

حسن سبزے بخط سبز مرا کرد اسیر دام ہمرنگ زمیں بود گرفتار شدم

میرزا صائب کہا کرتے تھے کہ میرے تمام اشعار کے معاوضہ میں اس ایک شعر کو دیدیا جائے تو میں بطیبِ خاطر منظور کرلوں گا۔ اسی طرح مومن کے اس شعر کی نسبت :-

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

غالب فرمایا کرتے تھے کہ ایک دیوان کا جواب ہے۔

محفل احباب میں کسی نے جناب ذوق کا یہ شعر پڑھا :-

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

میرزا غالب نے پوچھا کس کا شعر ہے۔ کہا ذوق کا، مکرر پڑھوایا اور دیر تک سر دھنتے رہے۔

غفران مکان حضرت آصف نے اس مضمون کو کہ جنت میں جا کر بھی جی نہ بہلے تو پھر کیا ہوگا ؟ کس خوبی سے ادا فرمایا ہے ۔ اس میں لطف یہ ہے کہ ایک فرماں روا کی شانِ تمکین کا بھی اظہار ہوتا ہے ۔ فرماتے ہیں :-

پھر کہاں جائیں گے الٰہی ہم　　خلد میں بھی اگر بسر نہ ہوئی

اسی طرح حضرت امجد کی مندرجہ بالا غزلوں سے بھی حضرت امجد کی قادر الکلامی کا اظہار ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے اصلی رنگ کے ساتھ خوبیٔ بندش ، بلندیٔ مضمون اور کمالِ شاعری کو بھی ہاتھ سے نہیں دیا ہے ۔ ان میں کے بھی بعض اشعار ایسے ہیں کہ ایک دیوان کا جواب ہو سکتے ہیں چنانچہ یہ شعر :-

جو نظر آتے ہیں، نہیں اپنے　　جو ہے اپنا نظر نہیں آتا

اور یہ شعر بھی :-

دیوانگی پہ میری ہنستے ہیں عقل والے　　تیری گلی کا رستہ پوچھا تری گلی میں

حضرت بیان و یزدانی میرٹھی مرحوم کی مشہور نعتیہ غزل پر ذیل کی تضمین جو افکار نوجوانی کا نتیجہ ہے کس قدر جذبات سے لبریز ہے :-

راحت دل دلِ بیتاب میں جالے آجا　　بخت خفتہ کو بھی اک بار جگالے آجا
اے مرے چاند مرے گھر کے اجالے آجا　　خواب میں زلف کو مکھڑے سے ہٹالے آجا
بے نقاب آج تو اے گیسوؤں والے آجا

شدت درد سے اب لب پہ ہیں نالے آجا　　دیکھ تو زخم جگر ہو گئے آلے آجا
داغ فرقت سے پڑے جان کے لالے آجا　　بیکسی پر مری خون روتے ہیں چھالے آجا
راہ میں چھوڑ گئے قافلے والے آجا

رحمت عالمیاں کون ہوا تیرے سوا　　کس کی تعریف میں ہے آیۂ لولاک لما
چاند دو ٹکڑے بھلا کس کے اشارے سے ہوا　　کون ہے ماہ عرب ، کون ہے محبوب خدا
اے دو عالم کے حسینوں سے نرالے آجا

طاقت و ہوش تپ غم نے اڑا رکھا ہے　　عقل کو طاق پہ نسیاں کے اٹھا رکھا ہے

بس سوا سانس کے اب جسم میں کیا رکھا ہے
دم تری دید کو آنکھوں میں لگا رکھا ہے
لے رہے ہیں ترے بیمار سنبھالے آجا

نوک کی لے رہے ہیں خار مغیلانِ صحرا
پاؤں کٹ کٹ کے ہوئے جاتے ہیں قربانِ صحرا
دو قدم طے نہیں ہو سکتا ہے میدانِ صحرا
دیکھتے ہیں تجھے پھر پھر کے ضعیفانِ صحرا
ڈگمگاتے ہیں قدم کون سنبھالے آجا

تیری کیا بات ہے کیا شان ہے اللہ غنی
تو ازل سے ہوا گنجور رموزِ احدی
گنج اسرار کی ہے ہاتھ میں تیرے کنجی
وقف ہے تیرے لئے دولتِ کنزِ مخفی
کھل گئے ہفت سماوات کے تالے آجا

گھر سے وہ ماہِ عرب جب شبِ معراج چلا
راہ میں آنکھیں بچھائے تھے فرشتے ہر جا
کر کے سب منزلیں طے جب بمقامِ ادنیٰ
پہنچا محبوب، تو مشاطۂ رحمت نے کہا
خلوتِ راز میں اے ناز کے پالے آجا

تری تسلیم کو خم گردنِ افلاک ہوئی
فخر کے ساتھ زمین نے تری پابوسی کی
ہاتھ میں تیرے دو عالم کی حکومت دیدی
ہم نے خوش ہو کے تجھے ساری خدائی بخشی
اپنے بندوں کو کیا تیرے حوالے آجا

اس بیاباں میں نہیں خارِ من و تو کا نشاں
کفر سے کوئی غرض ہے نہ خیالِ ایماں
یاں نہ کثرت کی جگہ ہے، نہ دوئی کا امکاں
رنگ وحدت ہے یہاں غنچۂ خلوت ہے یہاں
اے گلِ گلشنِ لولاک لما، لے آجا

دھیان میں میرے گناہوں کو اگر لاتے ہیں
کاتبِ نامۂ اعمال بھی شرماتے ہیں
کیا کفن خاک احبا مجھے پہناتے ہیں
ہوں سیہ کار مرے عیب کھلے جاتے ہیں
کملی والے! مجھے کملی میں چھپا لے آجا

دیکھیں کب تک ابھی قسمت میں ہے آنسو پینا
اے مسیحا نفس اب ہو گیا مشکل جینا
ٹکڑے ٹکڑے دلِ امجد ہے برنگ مینا
صورتِ لالہ ہے پُر داغ بیاں کا سینا
پڑ رہے ہیں تیرے بیمار کے لالے آجا

چند بند مسدس کے بھی ملاحظہ ہوں اس میں غیر قانع انسانوں کی تنبیہ کے لئے کیسے اعلیٰ اور حکیمانہ خیالات ظاہر کئے گئے ہیں:-

مبتلائے حرص بیجا آج خاص و عام ہے فکر جمع مال و زر کمبخت صبح و شام ہے
مفت بیچاری ضرورت ہر جگہ بدنام ہے ابن آدم اپنے ہاتھوں مورد آلام ہے
در فضائے تنگ دنیا حاجت بسیار نیست
انچہ ما در کار داریم اکثرش در کار نیست

اپنے ہاتھوں آپ اے نادان ذلیل و خوار ہے کچھ بھی غیرت ہے تجھے ناداں ذرا بھی عار ہے
جس قدر ہے، وہ بھی جان ناتواں پر بار ہے اے ہوس پیشہ تجھے اب اور کیا درکار ہے
در فضائے تنگ دنیا حاجت بسیار نیست
انچہ ما در کار داریم اکثرش در کار نیست

لیمپ برقی چاہیئے نازوں کے پالے کیلئے بیکسوں کو چاندنی بس ہے اجالے کے لئے
کملی والو! مر رہے ہو کیوں دوشالے کے لئے ہے جو کچھ وہ بھی بہت ہے مرنے والے کیلئے
در فضائے تنگ دنیا حاجت بسیار نیست
انچہ ما در کار داریم اکثرش در کار نیست

اے حریص مال و زر اے صاحب صد گونہ زور تنگ چشمت را قناعت پر کند یا خاک گور
تا کجا حرص و ہوائے مالک اسپ و ستور دانہ دانہ می کنی انبار تا کے مثل مور
در فضائے تنگ دنیا حاجت بسیار نیست
انچہ ما در کار داریم اکثرش در کار نیست

ذیل کے قطعہ میں کیسا اچھوتا خیال ظاہر کیا گیا ہے:-

مطلق ہوا مقید واجب ہوا ہے ممکن میں لامکان والا قید اس مکان میں ہوں
زندہ نہ سمجھو مجھ کو دنیا کے رہنے والو تن کا کفن پہن کر دفن اس جہان میں ہوں

ذرا مثنوی کا بھی رنگ ملاحظہ ہو۔ ذیل کی نظم "فریاد مجنوں" کے عنوان کے تحت لکھی گئی ہے

جیسا عنوان ہے ویسے ہی پر درد اشعار ہیں :-

عرض کی مجنون نے حق سے ایک رات — اے مرے مالک خدائے شش جہات
اپنی نظروں سے گرایا کیوں مجھے — عاشق لیلیٰ بنایا کیوں مجھے
سوز غم نے دل مرا خوں کر دیا — قیس کو الفت نے مجنون کر دیا
کوئے جاناں عرش ہے میرے لئے — خار صحرا فرش ہے میرے لئے
جامۂ دل شرک سے میلا ہوا — تیرا بندہ ، بندۂ لیلیٰ ہوا
مل گئیں سب آرزوئیں خاک میں — رہ گئی الفت دل صد چاک میں
اے مرے فریاد رس پروردگار — رحم کے قابل ہے میرا حالِ زار
اشک خون کب تک بہاؤں آہ آہ — خاک میں کب تک اڑاؤں آہ آہ
تجھ کو بھاتی ہے پریشانی مری — ہے تجھے منظور حیرانی مری
زندگانی کیوں مری برباد کی — داد بھی کچھ ہے مری فریاد کی؟
ناگہاں اک غیب سے آئی ندا — میرے مجنوں بس نہ کر اتنا گلا
تو سراپا کشتۂ بیداد ہے — رحم کے قابل تری فریاد ہے
وصل لیلیٰ سے تجھے گر یاس ہے — غم نہ کر رب تیرا تیرے پاس ہے
رہتے ہیں ہر وقت ہم تیرے قریں — سنتے ہیں ہم تیری آواز حزیں
سوز تیرا ایک دل کش ساز ہے — درد کی آواز میں انداز ہے
ہے اثر تیرے دل ناشاد میں — لطف ملتا ہے تری فریاد میں

خوش نماید نالۂ شبہائے تو
ذوقہا دارم بہ یارب ہائے تو

مولوی عظمت اللہ خان مرحوم سے حضرت امجد کے مخلصانہ تعلقات تھے ان کی جواں مرگی پر (۱۶) بند کا ایک پر درد مستزاد کہا ہے ۔ چند بند ملاحظہ طلب ہیں :-

تقدیر نے دکھلایا عجب واقعہ جانکاہ — العظمت للہ
بجلی سی گری خرمن امید پہ ناگاہ — العظمت للہ

رخصت ہوا دنیا سے عجب دوست ہمارا — تھا آنکھ کا تارا
ہر دوست کا دل شدت غم سے ہوا پارا — العظمت للہ
وہ جس کو کبھی چیں بہ جبیں ہم نے نہ دیکھا — اخلاق کا پتلا
کیا آن تھی، کیا شان تھی، کیا صورت زیبا — العظمت للہ
رو دھو کے تجھے کردیا مولا کے حوالے — اے خوبیوں والے
اللہ تجھے کیوں قرب میں اپنے نہ بلالے — العظمت للہ

مرحومہ جمال النسا سلمٰی کے انتقال کے بعد جب میں حضرت امجد کے مکان پر گیا جو محلہ میں "چمن" کے نام سے مشہور ہے تو منزل گاہ سلمٰی میں یہ شعر جلی قلم سے لکھا ہوا دیکھا جس کے لفظ لفظ سے حقیقی واقعات اور دلی صدمات کا اظہار ہوتا ہے۔

وہ گھر جو کل تک تھا چمن اب کوئی دیکھے قبر ہے — پہلے محل شکر تھا اور اب مقام صبر ہے

نثر کا نمونہ

شعراء میں عموماً یہ کمزوری پائی جاتی ہے کہ نظم میں غیر معمولی انہماک کی وجہ سے فن انشا و ادب میں وہ ترقی نہیں کرسکتے لیکن حضرت امجد اپنے ذہن خداداد سے اس میں بھی بازی لے گئے ان کی نثر میں خاص قسم کی فصاحت و بلاغت ہے۔ ان کی مختلف تصانیف سے بطور نمونہ چند سطریں پیش کی جاتی ہیں:-

شعر ہو یا راگ جب تک سامع کو بیخود نہ کردے، بارد فطرت میں حرارت نہ پیدا کردے، قدیم کافر کو مسلمان نہ بنادے، کثیف مادے میں لطیف روح نہ پھونکدے، فنون لطیفہ میں شمار نہیں کئے جاسکتے۔ ہر شعر ایک مکمل راگ یا تصویر ہوتا ہے جس طرح تصویر میں مصور کو ہر عضو اپنی اپنی جگہ خوبی اور موزونیت کے ساتھ بنانے کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح شاعر کو بھی ہر لفظ اپنے اپنے مقام پر بغیر کسی تعقید کے رکھنا پڑتا ہے۔ اس ترتیب کے قطع نظر تناسب اور توازن بھی ضروری اور لازمی ہے اگر ناک کی جگہ ناک تو بنائی جائے مگر اصل صورت کے اعتبار سے بڑی یا چھوٹی کردی جائے تو تعداد اجزا کے اعتبار سے تصویر مکمل تو ہوگی مگر مضحکہ خیز۔ اسی طرح موزوں نظم بھی اپنی بد نظمی اور غیر مناسب

اور ثقیل الفاظ اور دور از فہم استعارات و تلمیحات کی وجہ سے "شعر گفتن چہ ضرور بود"
کا مصداق ہو جاتی ہے ....

مست کی نشان یہ ہے کہ سرود ستار سے بے خبر رہے جس قدر سرود ستار کی
طرف توجہ ہوگی اس کے کمال مستی میں اسی قدر فرق آجائے گا۔ یہ بالکل صحیح
ہے کہ ایک شاعر بشرطیکہ وہ شاعر ہو اظہار جذبات میں مجذوب صفت ہو جاتا ہے
اس میں ایک خاص جوہر ہوتا ہے جس کو وہ خود بھی نہیں سمجھتا کیونکہ ان کی معانی کی
مبیّن کوئی اور ہی قوت ہوتی ہے جو اسے ایسا کہنے پر مجبور کرتی ہے۔ وہ کوئی فرشتہ
ہوتا ہے جو اپنی کیفیت کو ایک انوکھے راگ میں گاتا ہے اور اپنے دُکھ درد کو
ایک مبہم زبان میں ادا کرتا ہے ....

....

صورت گر پتھر تراش کر بت نہیں بناتا بلکہ بت اس میں پہلے سے موجود ہوتا ہے
مجسمہ ساز پتھر کی عارضی چادر کو اس کے چہرہ سے اٹھا دیتا ہے اسی طرح خرقۂ امجد
میں بھی کوئی فلک اطلس کا پیوند نہیں ہے علی العموم وہی پھٹے پرانے، بوسیدہ، گرے
پڑے ٹکڑے ہیں جن کو جوڑ جوڑ کر میں نے گدڑی بنالی ہے ایمان کی سردمہری کے وقت
کبھی اوڑھ لیتا ہوں کبھی بچھا لیتا ہوں اور اپنے سچے دوستوں کو بھی اس میں سمٹنے
کی کوشش کرتا ہوں کہ "دہ درویش در گلیمے بخسپند، محبت اور صداقت کا ایک
سوکھا ٹکڑا بھی تکلف کے الوان نعمت سے کہیں زیادہ لذیذ ہوتا ہے اور مصنوعی
اظہار محبت کی بہ نسبت ایک خاموش مایوس نگاہ بہت گہرا اثر ڈالتی ہے"

(ماخوذ از مقدمہ خرقۂ امجد)

سگان طیبہ "کتے ہر شہر میں ہوتے ہیں اور یہاں بھی ہیں مگر کیسے کتے کہ بر شیران شرف
دارند، اسی وجہ سے، جامی، خسرو، حافظ، جیسے باکمال انسان بھی، سگ مدینہ ہونے کی
آرزو کرتے رہے، جب کبھی یہاں کے کتوں کو دیکھتا حافظ کا یہ شعر ضرور یاد آتا۔

شنیدہ ام کہ سگان را قلادہ می بخشی چرا بہ گردن حافظ نمی نہی رسنے

یوں تو اس مضمون میں بہت شعر سنے ہیں، مگر حافظ کے اس شعر سے دل پر جو اثر ہوتا تھا اس کی کیفیت بیان میں نہیں آسکتی کتے بھی عجب صفت کے ہیں، تمام دن سڑکوں پر ایسی گہری نیند سوتے ہیں کہ کوئی اُن پر قدم ہی کیوں نہ رکھ دے، کاٹنے کا تو کیا ذکر آنکھ تک کھول کر نہیں دیکھتے۔ جہاں رات ہوئی سب شب بیدار کیا مجال کہ صبح ہونے تک ذرا بھی پلک جھپک جائے۔ نہیں معلوم ہوتا کیا کھاتے ہیں کیا پیتے ہیں، کسی کے گھر جاتے نہیں، کوئی کھلاتا نہیں، ہمیشہ فرش خاک پر، سڑکوں پر، راستوں پر اطمینان قلبی کے ساتھ مستو کی طرح پڑے رہتے ہیں۔ ہزاروں اجنبی روز آتے ہیں، مگر کوئی کتا کسی کو بھونکتا نہیں۔ کسی لباس میں آئیں، کسی رنگ میں آئیں مگر وہ یہ خوب سمجھتے ہیں کہ عاشق مدینہ آیا ہے کوئی غیر نہیں ہے۔

اپنے مولا کے در کا دربان تو ہو — کچھ بھی نہ سہی، سگ صفت انسان تو ہو
ہر رنگ میں پہچانتا ہے مالک کو — امجد! بندے میں اتنا عرفان تو ہو

. . . .

ہم نے بھی چاہا تھا کہ کتا بن کر یہیں کسی کے گھر پڑ رہیں، مگر جواب ایسا ملا کہ کتا بننے کی ہمت نہ ہوئی:۔

میں نے کہا مجھ کو رکھ لے ایجاں گھر میں — مل جائے گا اک تابع فرماں گھر میں
کتا ہی سمجھ لے اپنے گھر کا، تو کہا — کتا رکھتے نہیں مسلماں گھر میں"

(حج امجد)

طائران حرم

حرم کعبہ میں نہیں معلوم کتنے ہزار کبوتر ہیں اور کب سے ہیں حرم میں پانی کا ایک قطرہ نصیب نہیں ہوتا غلہ کا ایک دانہ نہیں ملتا۔ مگر اطمینان سے ہر وقت صحن حرم میں کبک دری کی چال سے چلتے پھرتے رہتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ کبوتر ہزاروں مہجوروں اور مشتاقوں کے بھیجے ہوئے قاصد ہیں، جو آب لیکر واپس جانے کی جگہ، اطمینان اور سکینت بخش جگہ دیکھ کر یہیں کے ہو رہے ہے۔
اتنے کثیر تعداد میں کبوتر ہیں کہ جب ایک ساتھ مل کر اڑتے ہیں۔ دھوپ میں نماز

پڑھنے والے نمازیوں پر تھوڑی دیر کے لئے سایہ ہوجاتا ہے ۔عید الفطر کی نماز میں تو یہ حالت تھی کہ ہزاروں نمازی جگہ کی تنگی کی وجہ سے دھوپ میں نماز پڑھ رہے تھے، طائران حرم آہستہ آہستہ چکر لگاتے ہوئے تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے نمازیوں پر اپنے پروں کا سایہ ڈالتے جاتے تھے۔

ان کبوتروں کا یہ قصہ بھی عجیب ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں رات دن حرم ہی میں رہا کرتے ہیں مگر ان کی بیٹ کہیں نظر نہیں آتی ۔تمام حرم ہمیشہ پاک صاف رہتا ہے ۔

باب الکعبہ کے پردے پر جو نصف پردہ لپٹا ہوا رہتا ہے ہمیشہ دو کبوتر ضرور رہا کرتے ہیں لوگ کہتے ہیں کہ فرشتے ہیں، شاید یوں ہی ہو۔حج کے زمانے میں مکے والوں کے ساتھ ان کی بھی عید ہوتی ہے حجاج کثرت سے دانہ ڈالا کرتے ہیں دانہ دیکھ کر سارے حرم کے کبوتر سمٹ کر ایک جگہ جمع ہوجاتے ہیں دانہ ڈالنے والے کو ہر طرف سے گھیر لیتے ہیں ۔کچھ سروں پر منڈلاتے ہیں کچھ پاؤں میں لپٹتے ہیں کچھ بائیں طرف سے حملہ کرتے ہیں کچھ داہنی طرف سے آتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر میں جھولی چھین لیں گے ۔

اگرچہ سب جنگلی کبوتر ہیں مگر وحشت کا نام نہیں، سمجھتے ہیں کہ حرم کعبہ میں کوئی ہم کو ستائیگا نہیں من دخلہٗ کان "امنا پر پورا یقین ہے ہماری طرح نہیں کہ ذرا سی گھبراہٹ میں حرم سے بھاگ کھڑے ہوئے ۔ ؎

اس دل میں ذرا یقین کی شان نہیں　　　کہنے کو تو زندہ ہیں مگر جان نہیں
ہے اور نہیں، کے درمیاں ہے دن رات　　　جگنو کی چمک ہے، مرا ایمان نہیں"

(حج امجد)

نظم و نثر کا جو اقتباس ہدیۂ ناظرین کیا گیا ہے اُس کو "مشتے نمونہ از خروارے" سمجھنا چاہیئے ورنہ تفصیل کی صورت میں ایک ضخیم کتاب مدون ہوسکتی ہے ۔

ان مختصر حالات سے آئندہ نسلیں یہ سبق حاصل کرسکتی ہیں کہ ایک یتیم و بیکس لڑکا جس کے سر سے باپ کا سایہ دنیا میں آنے کے کچھ دنوں بعد ہی اُٹھ گیا ہو اور جس کی تعلیم و تربیت کا انتظام بظاہر بالکل ہی معمولی ہو محض اپنی خداداد قابلیت اور ذاتی سعی و کوشش سے دنیا میں کس طرح ایک نامور انسان اور قوم کا مایۂ ناز فرزند ہوسکتا ہے ۔

طفلی

از

جناب سیّد علی اختر صاحب اخترؔ

رواں ہے کنج میں پھولوں کے چشمۂ شیریں
تبسم لبِ گلشن، رباب موج صبا
نشاط روح کا اک دل نشیں پیام لئے
کسی کے خندۂ نازک کی شہد بار صدا
بہشتِ حسنِ سماعت، وہ نغمۂ بیدار
کہ نہ سے ساز کی اُٹھا دلوں میں ڈوب گیا
ہجومِ فکر میں، یک لمحہ فرصتِ آزاد
غمِ خمار میں، یک جرعہ، لرزشِ صہبا
عجیب چیز ہے اخترؔ جمالِ طفلی بھی
ضیائے محفلِ ہستی خلاصۂ دنیا

از

جناب غلام رسول صاحب (سٹی کالج)

(۱)

شام کا وقت تھا ، افریقہ کے ڈربن شہر میں دو آدمی ایک بڑی دکان کے سامنے برآمدہ میں کھڑے باتیں کر رہے تھے ۔ ایک ہندوستانی تھا ، رام لال ۔ دوسرا جو لو تھا جیکب ۔

رام لال کہہ رہا تھا ۔ جیکب کل سویرے ہندوستان کا جہاز جائے گا ۔

جیکب بولا ۔ ہاں جائے گا تو ، پھر ؟

"میں بھی جاؤں گا"

جیکب نے حیرت سے پوچھا ۔ کیسے جاؤ گے ؟ پاسپورٹ تو ہے نہیں ۔

"چوری سے جاؤں گا"

"اور جو پکڑے گئے ؟"

"پکڑے گئے تو دیکھا جائے گا"

"رام لال ، یہ کام ٹھیک نہیں ہے"

رام لال بولا ۔ جیکب میں اب یہاں نہیں رہ سکتا ۔ میں ہندوستان جاؤں گا ۔

"تم نہیں جاسکو گے رام لال !"

"یقینی جاؤں گا ۔ میں نہیں جاسکوں گا تو میری روح جائے گی"

جیکب استعجاب کی نظر سے رام لال کی طرف دیکھنے لگا ۔ رام لال جیکب کا ہاتھ پکڑ کر بولا جیکب تم میرے دوست ہو نا ؟ جیکب رام لال کا ہاتھ محبت سے دبا کر بولا ۔ بے شک !

"اس وقت میری کچھ مدد کرو گے ؟"

"کل کوئی ایسی ترکیب نکال سکتے ہو کہ صاحب دن بھر مجھے نہ پوچھیں ۔ اگر کل کا دن

نکل جائیے، تو پھر میں ہندوستان پہنچ جاؤں گا ،،

"وکل کیا، میں ایسی چال چل سکتا ہوں کہ صاحب تمھیں دو تین دن تک نہ پوچھیں، لیکن اس سے کیا ہوگا؟ تم جا نہیں سکو گے۔ پکڑے جاؤ گے ،،

"خیر وہ جو کچھ ہوگا، دیکھا جائے گا، مگر میں کوشش ضرور کروں گا ،،

"رام لال، تم غلطی کر رہے ہو ،،

"اس طرح یہاں وطن کی یاد ہی تڑپ تڑپ کر مرنے سے وطن پہنچنے کی کوشش میں جان گنوانا کہیں طمانیت بخش ہوگا۔ تمھارا وطن گو یہاں ہے، پھر بھی تمھیں اس کی یاد کبھی کبھی کتنی بے چین کئے دیتی ہے۔ جیکب! ،،

جیکب جو لولینڈ میں رہنے کے باوجود اپنے وطن کو یاد کرتے ہوئے بولا۔ ٹھیک کہتے ہو رام لال! وطن کی یاد آدمی کو پاگل بنا دیتی ہے ،،

"اور پھر ایسی حالت میں جب کہ میرے باپ کا انتقال ہو چکا ہو اور میری ماں میری یاد میں تڑپ رہی ہو ،، اتنا کہتے ہوئے رام لال کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ جیکب رام لال کی بات سے متاثر ہو کر بولا۔ "اچھی بات ہے، کوشش کرو۔ رام لال مجھ سے جو امداد چاہو وہ میں دینے کو تیار ہوں ،،

"بس، میں اتنی ہی مدد چاہتا ہوں جتنی میں کہ چکا ہوں ،،

(۲)

رات کے دس بجے کے قریب جیکب اپنے چھوٹے سے مکان میں رام لال کا انتظار کر رہا تھا۔ اس مکان میں صرف دو کمرے تھے۔ ایک میں سونے کے لئے جگہ تھی اور دوسرے میں کھانا کھانے، بیٹھنے اٹھنے کے لئے اس دوسرے کمرے کے بیچ میں ایک ٹوٹی میز اور اس کی چاروں طرف چار پانچ پرانی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک کرسی پر جیکب بیٹھا تھا۔ دوسری کرسی پر اس کی بیوی۔ اس کے سامنے میز کی دوسری طرف ایک اور جو لو بیٹھا تھا۔ اس شخص کی پوشاک ڈھیلی ڈھالی ایک عجیب قسم کی تھی۔ اس کے سر پر ایک ٹوپی تھی جس میں پرندوں کے کچھ پر اور بیل کے دو لمبے سینگ لگے ہوئے تھے۔ جیکب بیچ بیچ میں دروازے کی طرف

دیکھتا تھا۔ تھوڑی دیر میں رام لال کمرے کے اندر آیا۔ جیکب اُسے دیکھتے ہی خوش ہو کر بولا۔ آ گئے!

رام لال جیکب کے بغل میں کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا "ہاں۔ اپنے ہم وطنوں سے رخصت ہو کر آیا ہوں"

جیکب نے اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر کہا "کھانا لاؤ!"

جیکب کی بیوی اٹھ کر کھانے کا انتظام کرنے لگی۔ ادھر جیکب رام لال سے بولا "رام لال تمھارے کام کے لیئے میں نے اپنے اس دوست کو ٹھیک کیا ہے"

یہ کہ کر اُس نے سامنے بیٹھے ہوئے جُوٗٹو کی طرف اشارہ کیا۔ رام لال اس کی طرف دیکھ کر بولا "اچھی بات ہے"

جیکب نے کہا "یہ رکشا چلاتا ہے۔ بس سویرے یہ صاحب سے جا کر کہے گا۔ کہ رام لال بیمار ہو گیا ہے۔ آج نہیں آسکے گا"

رام لال خوشنودی کا اظہار کر کے بولا "یہ ترکیب تم نے اچھی سوچی۔ اب میں بے فکر ہو گیا"

اُسی وقت جیکب کی بیوی نے چینی کی ایک رکابی لا کر تینوں آدمیوں کے سامنے رکھ دی، تینوں کھانا کھانے لگے۔

جیکب بولا "میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ تم خیر و عافیت سے اپنے وطن پہنچ جاؤ۔ گو مجھے شک ہے کہ تم نہ پہنچ سکو گے"

"جو کچھ بھی ہو۔ کوشش پوری کروں گا"

"آخر تم نے کیا انتظام کیا ہے؟"

رام لال بولا "میں رات میں جہاز پر جا کر چھپ رہوں گا۔ میرا ایک ہم وطن ہندوستان جا رہا ہے وہ مجھے چپکے سے کھانا پہنچاتا رہے گا۔ یہ جہاز کراچی جائے گا۔ وہاں بھی رات میں جہاز سے نکل کر کنارے پر پہنچ جاؤں گا۔ بس پھر کوئی کھٹکا نہیں"

"خدا تمھاری مدد کرے"

کھانا کھا چکنے کے بعد رام لال بولا "اچھا تو دوست جیکب اب مجھے اجازت دو۔ میں تمھارا یہ احسان عمر بھر نہیں بھولوں گا"

جیکب نے رام لال کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ "احسان یاد رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں لیکن مجھے یاد ضرور رکھنا۔ بھول نہ جانا۔"

رام لال نے کہا "جیکب تم میرے ساتھ وہ نیکی کر رہے ہو کہ میں تمھیں اگر بھولنا بھی چاہوں گا تو نہ بھول سکوں گا۔ اور تم مجھے نہ بھولو، اس کے لیے میں تمھیں یہ دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر رام لال نے اپنی انگلی سے سونے کی انگشتری اتار کر جیکب کے ہاتھ میں دے دی۔

رام لال آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا "جیکب میں غریب آدمی ہوں۔ یہ مت سمجھنا کہ میں تمھیں اس امداد کے عوض کوئی انعام دے رہا ہوں۔ میں تمھیں اپنی نشانی دیتا ہوں۔ اس سے تمھیں میری یاد آتی رہے گی۔" اتنا کہہ کر رام لال جیکب سے ہاتھ ملا کر جلدی سے مکان کے باہر ہو گیا۔ جیکب بت کی مانند کھڑا اس کی طرف تکتا رہا۔

(۳)

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ اسی وقت رام لال ڈیک پر پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں موم جامہ میں لپٹی ہوئی ایک گٹھڑی تھی۔ ڈیک پر مختلف چھوٹے بڑے جہاز کھڑے تھے۔ رام لال ہندوستان جانے والے جہاز کو دن میں دیکھ گیا تھا۔ رام لال اس جہاز کے روبرو جا کر پہلے کچھ لمحوں تک اسے دیکھتا رہا۔ جہاز کے ڈیک پر اس وقت سناٹا تھا۔ صرف کیبوں میں روشنی ہو رہی تھی۔ رام لال گٹھڑی کو پیٹھ سے باندھ کر چپ چاپ پانی میں اتر پڑا۔ بہت ہی آہستہ آہستہ تیر کر وہ جہاز کی دوسری طرف پہنچا۔ اس طرف دو تین موٹے موٹے رسّے لٹک رہے تھے۔ انھیں میں سے ایک کو پکڑ کر رام لال چڑھ گیا اور ڈیک پر پہنچ گیا، وہاں پہنچ کر اس نے پہلے گٹھڑی کھول کر خشک کپڑے نکالے اور پہن لیے۔ بھیگے کپڑے اس نے موم جامے میں لپیٹ کر پانی میں پھینک دیئے۔ اس کے بعد وہ چھپنے کی جگہ ڈھونڈھنے لگا۔ ڈیک پر سٹرن (پچھلے حصہ) کی طرف بہت سے لکڑی کے بکس اور پیپے رکھے ہوئے تھے۔ رام لال نے ان کو غور سے دیکھا۔ پہلے تو اس کا خیال ہوا کہ انہیں کے بیچ میں چھپ رہے مگر پھر اس نے سوچا کہ دن میں وہ اس مقام پر بخوبی محفوظ نہ رہ سکے گا۔ یہ سوچ کر وہ دبے پاؤں زینے سے نیچے اترنے لگا۔ کئی زینے اترنے کے بعد وہ جہاز کے ہولڈ، (اسباب رکھنے کا مقام)

میں پہنچا۔ ہولڈ میں بالکل اندھیرا تھا۔ رام لال نے اپنے کوٹ کی جیب سے موم بتی اور دیاسلائی نکال کر روشنی کی۔ ہولڈ میں لکڑی کے مختلف اقسام کے صندوقوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ رام لال انہیں صندوقوں کے بیچ میں چھپ کر بیٹھ گیا اور موم بتی بجھا دی۔ رام لال پڑا سو رہا تھا۔ یکایک کھٹ پٹ کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا کہ ہولڈ میں بجلی کی روشنی ہو رہی ہے اور کچھ قلی بکس اور ٹرنک وغیرہ لاکر رکھ رہے ہیں۔ رام لال سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے سمجھ لیا کہ اوجالا ہوگیا۔

تھوڑی دیر تک وہ قلیوں کی آمد و رفت دیکھتا رہا۔ وہ ان کا تماشا دیکھنے میں اتنا محو ہوگیا کہ یکایک اُسے ایک زور کی چھینک آگئی۔ قلی بکس رکھ کر لوٹ رہے تھے۔ لیکن چھینک کی آواز سنتے ہی ٹھٹک گئے۔ ایک نے پوچھا۔ یہ کس نے چھینکا؟ سب نے چھینکنے سے انکار کیا۔ پہلا قلی بولا۔ تب تو یہاں کوئی آدمی چھپا ہوا ہے۔ اس کی تلاش ہونی چاہیئے۔ جاؤ۔ ایک آدمی میٹ یا کپتان صاحب سے جاکر بولو۔ ہم سب یہیں کھڑے ہیں۔ ایک آدمی اوپر چلا گیا۔ باقی سب وہیں کھڑے رہے۔

ادھر رام لال کا لہو پانی ہوگیا۔ خوف کے مارے اس کا دماغ چکرانے لگا۔ وہ دم سادھ کر چپ چاپ دبک رہا۔ اپنے بچاؤ کے لئے خدا سے التجائیں کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد ایک یوروپین معمولی پوشاک میں نیچے آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹارچ (مشعل) تھا۔ اُس نے آتے ہی پوچھا۔ کیا ہے؟

ایک قلی بولا۔ صاحب، یہاں کوئی آدمی چھپا ہوا ہے۔

"ٹھیک بولتے ہو؟ تمھیں شک تو نہیں ہوا؟"

"نہیں صاحب، شک نہیں ہوا۔ آدمی یہاں ضرور ہے"

"اچھا ہم ابھی ڈھونڈھ لیتے ہیں"

اتنا کہہ کر یوروپین ملاح اپنی ٹارچ لے کر آگے بڑھا۔ اور چاروں طرف ٹارچ کی روشنی ڈال کر دیکھنے لگا، اگرچہ بجلی کی بتی جل رہی تھی، مگر اس کی روشنی بکسوں کے پیچھے نہیں پہنچتی تھی۔ یہاں پر رام لال چھپا ہوا تھا۔ وہاں پر بھی بالکل اندھیرا تھا۔ ملاح اور قلی

ڈھونڈھتے ہوئے اس مقام پر آئے ۔ یکایک ٹارچ کی چمکدار روشنی رام لال کے چہرے پر پڑی ۔ بول اٹھا ۔ یہ بیٹھا ہے ۔ اس کے بعد اس نے رام لال سے کہا ۔ چلو نا ۔ نکلو ۔ تمھارا کھیل ختم ہوگیا ۔

رام لال کی آنکھوں تلے اندھیرا آگیا ، وہ چپ چاپ اٹھ کر کھڑا ہوگیا ۔ صاحب کے اشارہ کرنے پر دو قلیوں نے اس کی دونوں باہیں پکڑلیں اور اُسے گھسیٹتے ہوئے اوپر لے چلے ۔ پیچھے پیچھے یوروپین بھی چلا ۔ سب لوگ ڈیک پر آئے ڈیک پر سورج کی روشنی پھیلی ہوئی تھی ۔ ایک طرف جہاز کا کپتان کھڑا ہوا دو یوروپین مسافروں سے گفتگو کر رہا تھا ۔ رام لال کپتان کے سامنے لایا گیا ۔ کپتان نے رام لال کو دیکھ کر یوروپین ملّاح سے پوچھا ۔ کیا معاملہ ہے ؟

"یہ آدمی ہولڈ میں چھپا ہوا تھا ۔"

کپتان نے رام لال کو سر سے پاؤں تک دیکھا ۔ بعد ازاں مسکرا کر پوچھا ۔ کیوں ۔ آفریقہ چھوڑنے کا ارادہ ہے کیا ؟

پاس کھڑا ہوا ایک یوروپین مسافر بولا ۔ ہاں ۔ آفریقہ گرم ملک ہے ۔ اس پر سب نے قہقہہ لگایا ۔ رام لال بیچارا چپ چاپ سر جھکائے کھڑا تھا ۔ اُسے اپنے تن بدن کا ہوش نہ تھا ۔ کپتان نے یوروپین ملاح سے کہا ۔ اسے پولیس کے حوالہ کرو ۔

(۴)

شام ہوچکی ہے ۔ رام لال ایک چھوٹے سے کمرے میں پڑا ہوا ہے ۔ اس کے پاس ایک ہندی عورت بیٹھی ہے اس کی آنکھیں بند ہیں ۔ کبھی کبھی اس کے منہ سے کراہنے کی آواز نکلتی ہے ۔ اسی وقت ایک ہندی کمرے کے اندر آیا اور کپڑے اتار کر ایک کھونٹی پر ٹانگتے ہوئے بولا ۔ کہو ہوش آیا ؟

عورت بولی ۔ کبھی کبھی آنکھ کھول دیتے ہیں ۔ ہوش میں نہیں ہیں ۔ ڈاڑھی والے نے اس بری طرح سے مارا ہے کہ ہڈی پسلی چور ہوگئی ہے ۔ بچنا مشکل معلوم ہوتا ہے ہندی ایک لمبی سانس چھوڑ کر بولا ۔ کیا کریں ۔ یہاں ہم لوگوں کی فریاد سننے والا ہے کون ؟ خون کا

گھونٹ پی کر رہ جانا پڑتا ہے ۔ اور میں نے اسے منع کیا تھا کہ یہ کام نہ کرو ۔ یہ کام تمہارے بوتے کا نہیں ہے ۔ پر نہ مانا !

"کیا کرے بچارا ۔ اُدھر باپ مر گیا ۔ ماں اکیلی تڑپ رہی ہے ۔ اس لئے جان پر کھیل گیا ۔ اپنے ہی کو دیکھ لو ۔ جب دیس کی یاد آتی ہے تو کتنے بے کل ہو جاتے ہو "

"ہاں بات تو یہی ہے ، جس وقت ہندوستان کی یاد آتی ہے ۔ اس وقت دل بڑا بے چین ہونے لگتا ہے ۔ مگر کیا کیا جائے ۔ جانا اپنے ہاتھ کی بات تھوڑے ہی ہے "

"بھلا یہ بھی کوئی بات ہے ! کوئی اپنے وطن جانا چاہے ۔ تو اسے جانے کیوں نہیں دیتے ؟"

"بد معاشی ! ہم ہندوستانی غلام ملک کے آدمی سمجھے جاتے ہیں ہماری کوئی قدر ہے ؟ ہمیں تو کتے بلی سے بھی بدتر سمجھتے ہیں ۔"

اسی وقت رام لال نے آنکھیں کھول کر کہا ۔ پانی !

عورت نے جھٹ پٹ پانی کا گلاس اوٹھا کر اس کے منہ سے لگایا ۔ رام لال نے پانی پیا ۔ بعد ازاں پھر آنکھیں بند کر لیں ۔

دوسرے شخص نے اُس کے سرہانے جا کر پکارا ۔ رام لال !

رام لال نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا ۔ اُس شخص نے پوچھا ۔ کیا حال ہے ؟

رام لال بڑی مشکل سے بولا ۔ اچھا نہیں ہے ۔ چھاتی میں بڑا درد ہے ۔ عورت آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی ۔ بڑی چوٹ لگی ہے ۔ بچارے کو بڑی تکلیف ہے ۔ اسی وقت جیکب کمرے کے اندر داخل ہوا ۔ اُس نے آتے ہی پہلا سوال یہ کیا ۔ کیوں ، ہوش آیا ؟

ہندی نے جواب دیا ۔ ہاں کچھ ہوش تو آیا ہے ۔ لیکن تکلیف بہت ہے ۔

جیکب بولا ۔ مار ابھی کیا تھوڑا ہے ۔ ہم لوگ بچا نہ لیتے ۔ تو وہیں مر جاتا ۔

یہ کہہ کر وہ رام لال کے سرہانے آکر بیٹھ گیا ۔ اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا ۔ "رام لال"

رام لال نے آنکھیں کھول کر دیکھا ۔ جیکب کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ایک خشک مسکراہٹ دوڑ گئی ۔

جیکب بولا ۔ رام لال میں نے تمہیں منع کیا تھا ۔ پر تم نہ مانے ۔ میں جانتا تھا کہ تم

پکڑے جاؤ گے ۔ آخر وہی ہوا۔
رام لال بولا ۔ بھائی جیکب جو قسمت میں بدا تھا ۔ وہ ہوا۔ اس طرح نہیں جا سکا تو اب دوسری طرح جاتا ہوں ۔ میرے جسم کو انہوں نے جانے نہیں دیا۔ لیکن میری روح کو جانے سے کون روک سکتا ہے ؟ اُسے پاسپورٹ اور جہاز کی ضرورت نہیں ہے ۔جیکب !
جیکب کے آنکھوں میں آنسو بھر آئے ۔ اُس نے کہا ۔ ایسی باتیں مت کرو بھائی ۔ تم ! جیسے اچھے ہو جاؤ گے ۔ اور اب کے تم جسم سمیت جاؤ گے ۔ اب کے میں تمھیں اپنے وطن جو ولینڈ کی طرف سے بھیجوں گا ۔ وہاں سے تم آسانی سے نکل جا سکو گے ۔
"نہیں جیکب ۔ میری روح ہندوستان ۔ اپنے پیارے وطن ۔ کے لئے تڑپ رہی ہے اب وہ نہیں رکیگی ۔جیکب تم نے ہندوستان نہیں دیکھا ۔ ایسا ملک دنیا کے پردے پر کوئی نہیں ہے ۔ میں نہیں سمجھتا کہ میں نے اُسے کیوں چھوڑا تھا ! ہوش سنبھالنے کے بعد سے سیر و سیاحت کی چاٹ میں چلا آیا ۔ گھر سے لڑکر آیا تھا ، اسی کا پھل آج ملا ۔ اس وقت اس کی مٹی تک کو دل تڑپ رہا ہے ۔ اگر جسم اسی مٹی میں مل سکتا ہے ۔ تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آہ ! ایسی قسمت کہاں ؟ "
رام لال چپ ہو گیا ۔ ادھر تینوں آدمیوں کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے ۔
رام لال پھر بڑبڑانے لگا ۔ میرے گھر پر مہوے کا درخت ہے ۔ اس کے لال لال پتے شام کے وقت کے ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنوں کے پڑنے سے کس قدر خوبصورت دکھائی دیتے ہیں ۔ جب وہ پھولتا ہے ۔ تو اس کی بھینی بھینی خوشبو ، آہ ! کیا بتاؤں ۔ اس کے پھول کتنے خوش آیند ہوتے ہیں ۔ ایسا مزہ میں نے کسی چیز میں نہیں پایا ۔ وہاں اس کی شراب بنتی ہے وہ ہندوستان کا انگور سمجھا جاتا ہے ۔ آہ ! پانی ۔ ۔ ۔ ۔
عورت نے پانی کا گلاس رام لال کے منہ سے لگایا ۔ پانی پی کر رام لال کچھ دیر خاموش رہا اس کے بعد پھر بولا ۔ ہمارے گاؤں سے گنگا دو کوس ہے ۔جیکب ایسا دریا دنیا میں نہیں ہم لوگ اُسے دیوی کی طرح پوجتے ہیں ۔ اُس کا پانی کتنا ٹھنڈا ، کتنا ذائقہ دار ! مہینوں بند کر کے رکھو کبھی نہیں سڑے گا ۔ سڑے کیسے ، وہ تو دیوی کا پانی ہے آہ ! اگر یہ ہڈیاں گنگا ماتا کی گود

میں پہنچ سکتیں، تو...... رام لال کی دونوں آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔

بارہ بجے رات تک رام لال کی یہی حالت رہی۔ کبھی کبھی بڑبڑانے لگتا۔ بارہ بجے کے بعد اُس نے پانی مانگا۔ پانی پینے کے دو منٹ بعد وہ اُٹھنے کی کوشش کرتا ہوا بولا ـــ ماں میں آتا ہوں ...... آتا ہوں ...... آہ! ہندوستان ......"

اتنا کہہ کر وہ پھر گر پڑا۔ جیکب اور ہندی نے اس کو سنبھال کر اٹھانا چاہا۔ لیکن رام لال کی روحِ قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ (ہنس بنارس)

مرقع عبرت

از
جناب مولوی میرزا علی رضا صاحب ماہر لکچرار فارسی سٹی کالج

ہاں اسے دلِ نخوت بیں کیوں ہوتا ہے دیوانہ دنیا جسے سمجھا ہے عبرت کا ہے کاشانہ
یاں عشرتِ صد سالہ اک خواب ہے دوشینہ ہر بات یہاں کی ہے بھولا ہوا افسانہ
ہو قصرِ فریدوں میں اسے دل جو گزر تیرا پڑھ فاعتبروا غافل اور چھوڑ دے اترانا
ہاں پریوں کی جھرمٹ میں تھا ایک سلیماں وش اندر کا اکھاڑا تھا دربار تھا شاہانہ
گھیرے ہوئے رہتے تھے اس ماہ کو سب تارے سرداروں کی چہلیں تھیں بر وقت ظریفانہ
کوس لمن الملکی بجتا تھا یہاں ہر دم دربار کی فردیں تھیں سب عاقل و فرزانہ
ہر ایک زمانے کا بقراط و ارسطو تھا افعال کریمانہ اقوال حکیمانہ
تھی مد نظر ان کے بہبود و فلاحِ ملک مالک پہ فدا ہوتے جوں شمع پہ پروانہ
ہمت میں دلیری میں ایک ایک سے بڑھکر تھا چوٹیں تھیں برابر کی آپس میں حریفانہ
آئیں جو سخاوت پر حاتم کو بھی شرمائیں بھڑ جائیں تہمتن سے وہ ہمت مردانہ
فردوس کا دھوکا تھا ہر کاخ شبستاں پر مہ رویوں سے ہر دم تھا آباد پریخانہ
جاں سوز ادائیں تھیں دلدوز نگاہیں تھیں دنیائے تمنا تھی ہر جلوۂ جانانہ
میخواروں کا مستی میں خوش وقت ترنم تھا آباد رہے ساقی دائم ترا میخانہ
آزاد ہوائیں تھیں سر سبز تھا سب گلشن دن عید تھی اور راتیں عشرت کی تھیں روزانہ
گل رویوں کے بازو تھے گل تکیہ بچھونے پر صہبائے تنعم سے لبریز تھا پیمانہ
پھولوں کو کبھی چوما غنچوں کو کبھی چھیڑا ہر سمت ہواؤں میں انداز تھے مستانہ
کی چرخ ستمگر نے آخر کو تنک ظرفی نظروں میں کھٹکتی تھی وہ محفل رندانہ
گردش نے زمانے کی کام اپنا کیا پورا پامال ہوئے گلشن سب ہو گیا ویرانہ

مٹی میں ملے سارے ارمان خود آرائی
اندھیرے مرقد میں ہے گوشۂ تنہائی
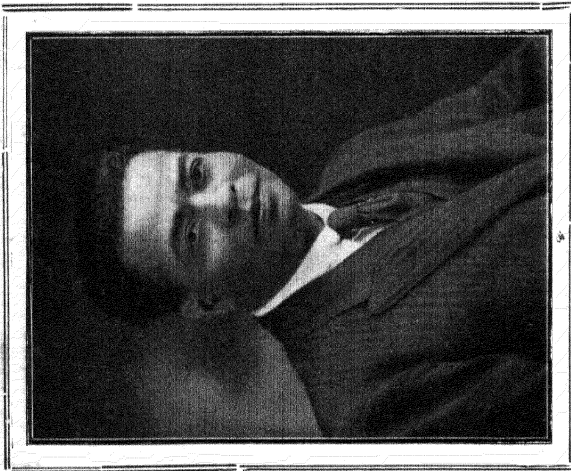
سید یسین علی خاں بی-اے (عثمانیہ) بی-ایس-سی
(آنرز) (لندن)

محمد سراج الدین بی-ایس-سی (آنرز)
(انجنیری)

مردوں کی سرپرستی میں عورتوں کے حقوق اور تعلیم

جناب غلام رسول صاحب متعلم بی - اے ، جامعہ عثمانیہ

انسان ہمیشہ قوت ہی کا احترام کرتا اور قوت ہی کے سامنے سر جھکاتا رہا ہے اور یہ اس کا ایک طبعی خاصہ ہے - چونکہ عورت کمزور تھی اس لئے مرد نے اس کے تمام حقوق پامال کر ڈالے اور نہایت تحقیر اور توہین کے ساتھ اس سے برتاؤ کرنے لگا - ہمارے ہاں کی تمام عورتیں اپنے خاندان کے مردوں کی مطیع اور فرمانبردار رہنے پر صرف اس وجہ سے مجبور ہیں کہ وہ مرد ہیں اور یہ عورتیں - مردوں کی ہستی کے مقابلہ میں انہوں نے اپنی ہستی کو بالکل فنا کر دیا ہے اور تمام مخلوقات اور کائنات میں صرف گھر کی چار دیواری ان کی قسمت میں لکھی ہے جس میں وہ دوامًا محبوس اور جہالت و تاریکی کے پردوں میں مخفی رہتی ہیں - مردوں نے ان کو لذت نفس کے حصول کا سامان تصور کر لیا ہے - اور جب چاہتے ہیں ان کے ساتھ لہو و لعب میں مشغول ہو جاتے ہیں - مردوں کے لئے آزادی ہے اور عورتوں کے لئے غلامی - اُن کے لئے علم اور ان کے لئے جہالت - ان کے لئے فراست اور ان کے لئے حماقت - اُن کے لئے امر و نہی کے احکام صادر کرنے کا اختیار اور ان کے لئے اس کا اتباع اور صبر غرض ان کے لئے دنیا کی تمام چیزیں ہیں اور ان جملہ چیزوں میں سے ایک چیز عورت بھی ہے جس کے وہ مالک ہیں -

یہ عورت کی تحقیر ہے کہ مرد گوری یا کالی لونڈیوں سے گھر بھر لیتا اور متعدد بیویاں کر لیتا ہے جب کہ اس میں عدل و انصاف کا مادہ بہت کم ہوتا ہے - اگر وہ عادل اور منصف مزاج ہو تو بھی وہ چار سے زیادہ کا مستحق نہیں جب کہ ضرورت شدید لاحق ہو - لیکن اس سے وہ خواہش نفسانی کا مطیع و منقاد ہو کر عیش پرستی میں مستغرق اور منہمک ہو جاتا ہے - اور میانہ روی اور انصاف کی جس کو مذہب نے فرض گردانا ہے بالکل پروا نہیں کرتا -

یہ بھی عورت کی تحقیر ہے کہ شوہر اپنی عورت کو بے سبب طلاق دے کر اس کی آئندہ زندگی

کو تلخ بنا دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عورت کے ماتھے پر مطلقہ کا ٹیکہ ہمیشہ کے لئے لگ جاتا ہے۔
یہ بھی عورت کی تحقیر ہے کہ اکثر مرد علی الاعلان کہتے ہیں کہ عورتوں کی امانت داری پر ہرگز بھروسہ نہ کرنا چاہیئے۔
یہ بھی عورت کی تحقیر ہے کہ اس کو عام زندگی اور ان تمام کاموں سے جو اس کے متعلق ہوں روکا جاتا ہے، نہ معاملات میں اس کی کوئی رائے ہے اور نہ فنون کا اس کو مذاق ہے۔ نہ مذہبی اعتقادات میں اس کو کچھ دخل ہے اور نہ قومی معاملات سے اس کو کچھ سروکار۔ اس میں شک نہیں کہ بعض ممالک میں مردوں کو اپنی عورتوں پر بھروسہ اور ان کی امانت داری پر اطمینان حاصل ہو گیا ہے جو عورتوں کے لئے باعث عزت ہے۔ گو یہ تغیر و تبدل جو بالفعل ان کی حالت میں نمودار ہوا ہے وہ اعتراض اور نکتہ چینی سے محفوظ نہیں رہ سکتا اور نہ اس نکتہ چینی کا باعث نفس تغیر ہو سکتا ہے بلکہ اس کے گرد و پیش کے حالات ہیں جن کی بنیاد نکتہ چینی ہو سکتی ہے۔ اور انہی حالات میں سے ایک تربیت کا نقص اور پردہ کی رسم کا استحکام بھی ہے، بخلاف اس کے اگر عورتوں کی مذہبی اور اخلاقی تربیت درجہ تکمیل کو پہنچ جائے اور پردہ کے رواج کو اس حد اعتدال پر لایا جائے جو اسلامی مذہب میں مقرر کیا گیا ہے تو یہ اعتراضات اور نکتہ چینیاں رفع ہو سکتی ہیں اور قوم اپنے تمام افراد (عورتوں اور مردوں) کی متحدہ قوت سے فائدہ اٹھا سکتی ہے۔

عورتیں بھی مردوں کی طرح انسان کی جنس میں داخل ہیں اگر دونوں کی جسمانی ساخت پر غور کرو تو صاف معلوم ہوگا کہ اعضا، حواس، عقل و فکر، جذبات اور خیالات نیز ان تمام خیالات کے لحاظ سے جو انسان ہونے کے لئے درکار ہیں دونوں میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔

موجودہ حالت میں جسمانی اور روحانی قوتوں کے لحاظ سے مردوں کو عورتوں پر جو فوقیت اور فضیلت حاصل ہے اس کا سبب یہ ہے کہ مرد ہزاروں برس سے علمی اور عملی ترقیوں کے میدان میں برابر دوڑ رہے ہیں اور عورتیں ان قوتوں کے استعمال سے ہمیشہ محروم رہی ہیں۔ اور ایسی پست حالت میں رہنے پر مجبور کی گئی ہیں جو بلحاظ مختلف زمانوں اور ملکوں کے مختلف رہی ہے۔

کوئی عورت گھر کا انتظام نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کو عقلی اور اخلاقی علوم میں ایک خاص حد تک دستگاہ نہ ہو اس لئے ضروری ہے کہ اس کو ابتدا میں کم سے کم اتنی تعلیم دیجائے جتنی کہ لڑکوں کو ابتدائی تعلیم دیجاتی ہے تاکہ علوم سے سرسری واقفیت اس کو حاصل ہو جائے اور جب کبھی وہ چاہے اپنے مذاق کے موافق کسی علمی شعبہ کو پسند کر کے اس کو درجہ کمال تک پہنچا سکے۔

جو لوگ عورتوں کو تربیت دینا چاہیں ان پر فرض ہے کہ بچپن سے ان کو ایسے عمدہ اور پاکیزہ اخلاق کا خوگر بنائیں جن کا اثر انسان کی ذات پر خاندان کے لوگوں پر اور تمام قوم پر ہوتا ہے تاکہ وہ اخلاق ان کے دل میں جگہ پکڑیں اور ان کا نقش گہرا بنجائے ۔ یہ مطلب زبانی ہدایتوں کے سننے، عمدہ اور نیک مثالوں کے دیکھنے سے حاصل ہوسکتا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ گھر کی عورتیں تربیت یافتہ ہوں ۔ اور بچپن ہی وہ زمانہ ہے جب کہ بہت جلد اس کے دل میں بہترین صفات گھر کرلیتی ہیں اور پاکیزہ عادات و اخلاق کی جڑیں مضبوط ہوجاتی ہیں اور آئندہ یہی شجر بہترین اور عمدہ ثمر پیدا کرتے ہیں عورت بغیر اس قسم کی تربیت کے ان فرائض کو ہرگز ادا نہیں کرسکتی جو قومی اور خانگی لحاظ سے اس کی گردن پر ڈالے گئے ہیں ۔

ہر شہر میں عورتیں کم از کم نصف آبادی کے برابر ہیں ان کے جاہل رہنے کا نتیجہ یہی ہے کہ قوم کے آدھے افراد کے کام کرنے سے جو فائدے پہنچ سکتے ہیں ان سے قوم بالکل محروم ہے اور صریح طور پر ہم کو نقصان عظیم برداشت کرنا پڑتا ہے ۔ اگر ہم ان کا ہاتھ پکڑ کر ان کو زندوں کے مجمع میں لائیں ۔ زندوں کے سے کام کرنا سکھائیں ۔ ان کی جسمانی اور عقلی قوتوں میں جنبش پیدا کریں تو وہ بھی مردوں کی طرح جاندار اور کام کرنے والی نظر آئیں ۔ وہ جس قدر قوم کی دولت کو برباد کرتی ہیں اسی قدر پیدا کرنے لگیں اور دوسروں کے سہارے اور امداد پر زندگی بسر کرنا چھوڑ دیں ۔

ہماری مثال آج کل ایسی ہے جیسے کوئی شخص مال کثیر پیدا کرے اور اس کو صندوق میں بند کرکے رکھ چھوڑے اور ہر روز صندوق کھولکر سونے اور چاندی کو دیکھا کرے اگر وہ اقتصادی اصول سے واقف ہوتا تو اس دولت کو استعمال میں لاتا اور اس سے نفع اٹھاتا ۔ لیکن اس کو یہ اندیشہ لگا رہتا ہے کہ کہیں اس کو نقصان اٹھانا نہ پڑے اور یہی ایک ایسا خیال ہے جو اس کو کثیر نفع سے روکتا ہے بالکل اسی طرح ہمارے ہاں مرد، عورتوں کو تعلیم دلانے کے خیال ہی سے چونکتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ کہیں عورتیں تعلیم پاکر بد اطوار اور بدکردار نہ بنجائیں ۔ لکھنے کا فن تو عورت کے حق میں سم قاتل خیال کیا جاتا ہے کیونکہ اگر کوئی عورت لکھنا جانتی ہے تو اس کے قطعی معنی یہ ہونگے کہ وہ ضرور غیر مردوں سے خط و کتابت کے ذریعہ راہ و رسم پیدا کرے گی یا یوں کہئیے کہ ان سے معاشقہ شروع کردے گی ۔ غالباً آپ خیال کریں گے کہ شاید یہ معاشقہ یورپین طرز پر ہوتا ہوگا، نہیں بلکہ

صرف خطوط کی حد تک۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے مان لیں کہ اس قسم کی کوئی زندہ مثال موجود ہے تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ بداطواری اور بد چلنی کے اثرات صرف لکھنے اور پڑھنے سے پیدا ہوئے ہیں۔ مزید برآں یہ بھی فرض کر لیا جائے تو ہم کو اس کے دوسرے پہلو پر بھی غور کرنا چاہئیے اور دیکھنا چاہئیے کہ ایسے واقعات غیر تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی موجود ہیں یا نہیں؟ تو معلوم ہوگا کہ مشاہدات اس قسم کے سینکڑوں واقعات ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ لیکن ان میں فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ میں پیام وسلام کا ذریعہ ایک مُردہ اور بے حس شئے خط ہے اور غیر تعلیم یافتہ طبقہ اس حصول کے لئے حیوان ناطق میں سے کسی مرد منقطع یا اپنے ہی میں سے کسی کو بطور پیامبر کے مقرر کر لیتا ہے۔ بہر حال نفسانی خواہشات کی تحریک دونوں طبقوں میں ہوتی ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شئے دونوں میں پہلے سے موجود تھی لیکن ایک نے تعلیم پا کر اس کو مہذب طریقہ سے ظاہر کیا اور دوسرے نے اسی کو غیر مہذب طریقہ سے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ تعلیم نے اس خواہش کو پیدا نہیں کیا۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک شخص اپنا ہاتھ آگ سے جلا کر آگ کو برا بھلا کہتا ہے اور اس پر نفریں اور لعنت ملامت بھیجتا ہے اور پھر اس کا یہ کہنا کہ آگ بری اور مضرت رساں شئے ہے۔ کیا یہ درست ہے؟ ہرگز نہیں! یہ قصور آگ کا نہیں بلکہ اس شخص کا ہے جس نے اس کا استعمال ٹھیک طور پر نہیں کیا۔ بلکہ اگر وہ آگ کا ٹھیک استعمال جانتا یعنی غذا (جو اُس کی زندگی کے لئے نہایت ضروری ہے) اور شیرینیوں کی تیاری کی غرض سے جلانے میں استعمال کرتا تو بجائے اس کے اس کو نقصان پہنچے اس کو ہزار گنا زیادہ فائدہ پہنچتا۔

سب سے بڑا سبب قوم کی پستی اور تباہی کا یہ ہے کہ اس کے افراد کا ایک بڑا حصہ عضو معطل، بیکار اور قوم کے ذمہ بار ہو۔ وہ اپنی ضروریات زندگی کے لئے کوئی کام نہ کرتا اور اگر کوئی کام کرے بھی تو مثل ایک بے زبان جانور یا بے شعور مشین کے یہ بھی نہ جانتا ہو کہ وہ کیا کرتا ہے، اور اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟

ہماری قوم میں عورتوں کی حالت اس قدر زبون اور پست ہوگئی ہے کہ جب ہم اس کا تصور کرتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی خیال بھی ہمارے ذہن میں گذرنا لازمی ہے کہ اس کا کوئی ولی اور سرپرست ایسا ہو جو اس کی حاجتوں کو پورا کرے اور اس کی ضرورتوں اور خواہشوں کو انجام دے

گویا ولی اور سرپرست کا ہونا ایک ایسا امر ہے جو ہر حال میں ضروری ہے حالانکہ واقعات بتاتے ہیں کہ بہتیری عورتوں کے لئے کوئی ولی یا سرپرست نہیں ہوتا مثلاً وہ لڑکی جس کے رشتہ دار نہ ہوں یا جو نا کتخدا ہو ۔ وہ عورت جو مطلقہ ہو ۔ وہ عورت جس کا شوہر دنیا سے گذر گیا ہو وہ ماں جس کی اولاد میں کوئی لڑکا نہ ہو اور اگر ہو تو کم سن اور نابالغ ہو ۔ یہ سب صورتیں ایسی ہیں جن میں عورتوں کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے تاکہ وہ اپنی اولاد یا خود اپنی زندگی کے لئے معاش پیدا کر سکیں ۔ اگر وہ تعلیم یافتہ نہ ہوں گی تو وہ معاش کے ناجائز ذریعے اختیار کریں گی ۔ یا ان کو کسی فیاض خاندان کے سہارے زندگی بسر کرنی ہوگی ۔

اگر ہم اس بات کی تلاش کریں جس سے رات کی تاریکی میں بیکس اور نادار عورتوں کو شیطان سیرت نوجوانوں کے جذبات کا شکار ہونا پڑتا ہے تو معلوم ہوگا کہ اکثر صورتوں میں اس ذلت کے قبول کرنے اور ایک گناہ کبیرہ کے بے تھاہ گڑھے میں گرنے کا باعث لذائذ نفسانی کے حاصل کرنے کی امنگ نہیں بلکہ وہ چیز ہے جس کی نسبت مولانا روم فرماتے ہیں

آنکہ شیران را کند روباہ مزاج　　احتیاج است احتیاج است احتیاج

اکثر خاندان ایسے ہیں جن کے ذمہ ان کثیر التعداد عورتوں کا نان ونفقہ ہے جو زمانہ کی گردش سے مفلس ہوگئی ہیں اور اپنی معاش پیدا کرنے کے لئے کوئی کام کرنا نہیں جانتیں ۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اکثر خاندان اسی باعث کفایت شعاری کے پابند نہیں رہ سکتے ۔ یہی سبب ہے کہ اکثر خاندانوں کی مالی حالت اچھی نہیں ہے ۔ جب ایک شخص جو اپنی ذات اور اولاد کے لئے محنت کرتا ہے ۔ تو وہ اپنی کمائی کا ایک حصہ اپنے رشتہ داروں یا دوستوں یا ایسے شخص پر صرف کرتا ہے جن سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے انسانی ہمدردی اس کو مجبور کرتی ہے کہ اپنی کمائی میں سے تھوڑا سا ان لوگوں پر بھی صرف کرے تاکہ وہ بھوک سے نہ مر جائیں ۔ مگر وہ یہی سمجھتے ہیں کہ ہمارا حق اس کی گردن پر ہے اور وہ اس حق کو پورا کرتا ہے ۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی محنت کر کے معاش پیدا کریں مگر مشکل یہ ہے کہ وہ ان قوتوں کو استعمال کرنا نہیں جانتیں جو قدرت نے ان کو عطا کی ہیں اس کا باعث صرف یہی ہے کہ وہ تربیت سے محروم ہیں ۔

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ کسی عورت کا شوہر یا سرپرست بھی موجود ہے جو اپنی کمائی سے

اس کو مدد دے سکتا ہے۔ تاہم یہ کون کہہ سکتا ہے کہ اس کو تربیت کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اگر عورت تربیت یافتہ ہو اور اس کا شوہر یا سرپرست محتاج ہو تو وہ اس کی مدد کر سکتی ہے اور اس کے بوجھ کو ہلکا کر سکتی ہے

اگر عورت بذات خود مالدار ہو (اگرچہ ایسا شاذونادر ہی ہوتا ہے) اور اس کے پاس جائداد ہو تو کیا اس جائداد کا انتظام کرنے اپنی دولت کو محفوظ رکھنے اور اس کو ترقی دینے کے لئے اس کو تعلیم کی ضرورت ہو گی ؟ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سی عورتیں اپنا روپیہ کسی رشتہ دار یا غیر آدمی کے سپرد کر دینے پر مجبور ہوتی ہیں اور ان کو اپنے معاملات میں مختار کر لیتی ہیں۔ یہ مختار بہ نسبت ان کے معاملات کے اپنے کاموں میں زیادہ مشغول رہتے ہیں اور ان جائدادوں کی پروا نہیں کرتے یا مالک جائداد کو نااہل سمجھ کر خوب روپیہ بٹورنے لگتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مختار چند روز میں مالدار ہو جاتے ہیں اور صاحب جائداد عورتیں افلاس میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ اور بعض دفعہ اپنے شوہر یا رشتہ دار یا مختار کی چالاکی اور مکاری سے اپنے قانونی حقوق سے محروم ہو جاتی ہیں۔ اگر وہ پڑھی لکھی ہوتیں تو ایسا واقعہ ظہور میں نہ آتا۔

بہر حال تعلیم بذات خود ایک ایسی چیز ہے جس کی ہر حالت میں ضرورت ہے کیونکہ وہ آج کل انسانی زندگی کی ضروریات میں شامل ہو گئی ہے اور جس قوم میں تمدن اور شائستگی نے قدم رکھا ہے اس کی سب سے مقدم ضرورت علم ہے۔ علم ہی وہ اعلیٰ مقصد ہے جس کے لئے ہر انسان مصروف کوشش ہے اور اسی پر روحانی اور جسمانی ترقیوں کا مدار ہے۔ تنہا علم ہی اس بات کا ذریعہ ہے کہ انسان پستی اور تنزل کے درجہ سے گذر کر فضیلت اور شرافت کے بلند مرتبہ تک ترقی کرے اور ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنی فطری قوتوں کو اس حد تک پہنچائے جہاں تک اس کی قابلیت اجازت دے۔

تمام ربانی شریعتیں اور انسانی قوانین مردوں اور عورتوں سے یکساں طور پر خطاب کرتی ہیں کہ۔ فنون لطیفہ، فلسفہ عالیہ۔ ایجادات و اختراعات کا دروازہ ہر عورت کے لئے اسی طرح کھلا ہے جس طرح مردوں کے لئے ایسا کون انسان ہے جو علوم وفنون کے مطالعہ کا شوق نہیں رکھتا اور دنیا و آخرت کی کامیابی اور حقائق کا سراغ لگانیکے لئے قدرت کے خزانوں سے

مستفید ہونا نہیں چاہتا ؟ یہ امنگ جو قدرتی طور پر ہر انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہے اس کے لحاظ سے مرد اور عورت میں کیا فرق ہے ؟ ایسا کون جاندار ہے جس میں روح اور عقل ہو اور وہ اس بات پر راضی ہو کہ اس کے بازو توڑ دئے جائیں اور اس کو ایک پنجرے میں بند کر دیا جائے اور وہ سر جھکائے آنکھیں بند کئے اُس میں پڑا رہے اور اس کے سامنے ایک وسیع اور پر فضا میدان ہو جس کی کوئی انتہا نہیں۔ اس کے سر پر آسمان کا نیلگوں شامیانہ ہو۔ ستارے اس کی نظروں کے سامنے کھیلتے اور اپنا جلوہ دکھا دکھا کر اوجھل ہو جاتے ہوں۔ کائنات کی روحیں اس کو امیدوں اور آرزوں کی طرف کھینچے لئے جاتی ہوں حالانکہ قدرت نے اپنے خزانے کھول دئے ہیں کہ وہ ان پر قبضہ کرے اور ان سے متمتع ہو۔ ؟

شریعت نے مرد اور عورت دونوں کو یکساں طور پر مکلّف قرار دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو عقل و دانش مرد کو عطا کی گئی ہے وہی عورت کو عطا کی گئی ہے کیا کوئی شخص جس کو خود غرضی نے اندھا نہ کیا ہو خیال کر سکتا ہے کہ خدا نے جو عقل و درایت انسان کو عطا کی ہے وہ بیکار ہے اور جو حواس اور جو قوتیں اس کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہیں وہ اس لئے ہیں کہ ان کو کام میں نہ لایا جائے بلکہ ان کو ہمیشہ معطل رہنے دیا جائے ؟ اس خیال کے مطابق عورتوں کو جاہل رکھنا گویا آدھی دنیا کے قوائے دماغی کو بیکار کرنا اور اس حکیم صانع کی صنعت کو لغو ٹھیرانا ہے۔

مسلمان کہتے ہیں کہ عورتیں پردہ نشین اور گھر کی زینت ہیں ان کے فرائض گھر کی حد تک محدود ہیں مگر یاد رہے کہ یہ خیال صرف ان لوگوں کا ہو سکتا ہے جو خیالی دنیا میں رہتے ہیں اور جن کو حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ اگر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ سب سے پہلا فرض جو عورت کے ذمہ ہے یہ ہے کہ وہ بذات خود اپنی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کر سکے جس کے نہ ہونے سے اس کے حقوق پامال کئے جاتے ہیں۔ جب تمام خانگی معاملات میں مرد ہی جواب وہی کرتا ہے اور اسی سے باز پرس کی جاتی ہے تو اس کی نظر میں عورت کی اتنی ہی وقعت ہو گی جتنی کسی جانور کی ہوتی ہے۔ جس طرح کسی جانور کا مالک اس کے لئے چارہ مہیا کرتا ہے اسی طرح مرد عورت کے لئے معاش کا بندوبست کرتا ہے۔

صدیوں سے عورتیں مردوں کے حکم کے سامنے گردن جھکاتی اور ان کے ظلم و ستم کا شکار ہوتی رہی ہیں۔ مردوں نے ان کی آزادی چھین لی۔ ہے اور عورتوں کے لئے یہی بات ہمیشہ پسند کی ہے کہ وہ ان کی خدمت کرتی رہیں۔ ان کے اشاروں پر چلتی رہیں۔ طرفہ یہ کہ ان پر روزی حاصل کرنے اور معاش پیدا کرنے کے تمام دروازے بند کر دئیے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اب بذات خود معاش پیدا کرنے سے عاجز ہیں اور اس بات پر مجبور ہیں (بلکہ عادی ہوگئے ہیں) کہ شوہر کی کمائی پر گذر کریں یا ناجائز طریقوں سے معاش پیدا کریں۔

عورتوں کے دماغ کے لئے چونکہ غور و فکر کا کوئی میدان باقی نہیں رہا ہے اس لئے زندگی کے مفید کاموں کی ذرا بھی وقعت ان کی نظر میں نہیں رہی۔ ان کا مشغلہ لے دے کے یہی رہ گیا ہے کہ وہ مردوں کی دلجوئی کریں اور مرد جس طرح چاہیں ان کو اپنے نفسانی خواہشات کا تختۂ مشق بنائیں۔ اسی لئے عورتوں نے اپنی تمام قوتیں اس کوشش میں صرف کردی ہیں کہ شوہر کی دلجوئی کے نئے نئے طریقے ایجاد کریں اور ان کی خواہشوں اور ارادوں کا پتا چلا کر کٹ پتلیوں کی طرح ان کے اشاروں پر چلیں۔

تیرا بھکاری

(از جناب پنڈت ونشی دھر ودیا النکار لکچرار اورنگ آباد کالج)

(۱)

محلوں سے لے کر جھونپڑ تک　　نیچے سے لے کر اوپر تک
کیا پھولوں میں کیا کانٹوں میں　　گھور تمر[1] میں یا تاروں میں
اس دنیا میں کیا ہے میرا　　سب کچھ تیرا، سب کچھ تیرا
میں ہوں ایک بھکاری تیرا

(۲)

جو دیتا ہے لے لیتا ہے　　اور کسی کو دے دیتا ہے
سب کچھ ویسا ہی رہتا ہے　　نہیں خزانہ یہ گھٹتا ہے
کہوں کسے پھر یہ ہے میرا　　سب کچھ تیرا، سب کچھ تیرا،
میں ہوں ایک بھکاری تیرا

(۳)

اپنے سارے ساتھی سنگی　　وسودھا[2] جن سے پیاری لگتی
ان کی سمرتی[3] بھی مٹ جاتی　　انت شونیے[4] میں مل جاتی
موہ[5] بند ہے کہ دیتے میرا　　سب کچھ تیرا، سب کچھ تیرا
میں ہوں ایک بھکاری تیرا

(۴)

خالی آئے خالی جاتے　　سب جیسے تھے ویسے ہی جاتے
جب آتے ایسے ایسے ہی جاتے　　لے کر ساتھ نہ کچھ بھی جاتے
کیا ہے میرا، کیا ہے میرا　　سب کچھ تیرا، سب کچھ تیرا
میں ہوں ایک بھکاری تیرا

---

[1] اندھیرا۔ [2] زمین [3] نشانی - یادگار [4] فنا [5] محبت والے دنیادار۔

شکسپیر کا ایک شاہکار ڈراما

(بسلسلہ سابقہ)

از جناب سید صغیر حسن صاحب میرٹھی

چودھواں سین

اسکندریہ۔ کلیوپیٹرا کے محل کا دوسرا کمرہ

اینٹنی اور ایراس کا داخلہ

اینٹنی۔ ایراس کیا تجھ کو یقین ہے کہ اب بھی تو مجھ کو میری اصلی شکل میں دیکھ رہا ہے۔

ایراس۔ جی ہاں حضور۔

اینٹنی۔ بسا اوقات ایک بادل کے ٹکڑے کو ہم بصورت اژدر دیکھتے ہیں۔ کبھی بجا بشکل خرس یا شیر ببر نظر آتا ہے۔ کبھی سربلند قلعہ مینار دار۔ کبھی ایک معلق چٹان کبھی متعدد چوٹیوں والا پہاڑ یا آسمانی رنگ کی راس جس پر درخت اُوگے ہوں جو دنیا کی طرف تعظیماً خمیدہ ہوتے ہیں اور ہماری آنکھوں کو یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ تمام اشجار ہوا سے جُھکے ہوئے ہیں۔ تو نے ایسے علامات کا مشاہدہ کیا ہے؟ ایسے منظر اکثر شام کے دُھندلکے میں پیش نظر ہوتے ہیں۔

ایراس۔ جی ہاں حضور۔

اینٹنی۔ ابھی جو بادل کا ٹکڑا گھوڑے کی شکل میں ہمارے پیش نظر ہوتا ہے۔ بسرعت خیال کرۂ بالا کی ہوائیں اس کو مٹا دیتی ہیں اور ایسا ناقابل شناخت بنا دیتی ہیں جیسے سمندر میں قطرہ۔

ایراس۔ حضور ایسا ہی ہوتا ہے۔

اینٹنی۔ میرے اچھے خدمتگار ایراس اس وقت تیرا سردار بھی بعینہ یہی صورت رکھتا ہے

اس وقت میں تجھ کو انیٹنی معلوم ہوتا ہوں لیکن یہ ظاہری شکل تادیر قایم نہیں رہ سکتی۔ ملکۂ مصر کا طرفدار ہوکر میں نے اس جنگ میں حصہ لیا۔ وہ ملکہ جس کا دل مجھ کو خیال تھا کہ میرے دام محبت میں گرفتار ہے کیونکہ میرا دل اُس کے پاس تھا اور جب وہ میرا تھا اس سے لاکھوں دوسرے قلوب وابستہ ہو گئے تھے مگر اس وقت سب جدا ہو گئے ہیں۔ ایراس اسی ملکہ نے قسمت کے گنجفہ کی تقسیم اس طرح پر کی کہ جان بوجھکر بڑے بڑے پتے سیزر کو دیدیئے اور مجھ کو دھوکہ دیا۔ میں نے اپنی شان وشوکت بازی میں لگادی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دشمن کو فتح ہوتی۔ نہیں اے نرم دل ایراس اشکباری نہ کر۔ اپنی زندگی کا خاتمہ کرلینا تو ابھی ہمارے اختیار میں ہے

(مارڈین کا آنا)

انیٹنی۔ افسوس ہے تیری ذلیل مالکہ پر۔ اُس نے مکروفریب سے میری تلوار کو بیکار کردیا۔

مارڈین۔ نہیں انیٹنی۔ میری مالکہ کو آپ سے عشق تھا اور ان کی تقدیر آپ کی قسمت میں قطعی طور پر مخلوط تھی۔

انیٹنی او دریدہ دہن خواجہ سرا دور ہو۔ مگر سُن۔ اُس نے مجھ کو دھوکہ سے شکست دلوائی اس لئے اس کا قصاص اس کو اپنے خون سے دینا ہوگا۔

مارڈین۔ ایک شخص کی موت کا خون صرف ایک ہی مرتبہ دیا جاسکتا ہے اور کلیوپیٹرا اس کو ادا کرچکی۔ آپ کی تمنا اسی طرح برآئی جس طرح آپ خود یہ کام کرتے۔ آخری جملہ جو ان کے منہ سے نکلا "انیٹنی نہایت شریف انیٹنی" تھا اور جس وقت یہ الفاظ وہ کہہ رہی تھیں ایک آہ جگرخراش نے انیٹنی کے نام کو پورے طور پر ادا کرنے سے قاصر رکھا اور دل وزبان کے درمیان اس کو قطع کردیا۔ انہوں نے آپ کے نام کو اس طرح پر اپنے دل میں دفن کیا اور جان بحق تسلیم ہوگئیں۔

انیٹنی۔ تو وہ مرگئی۔

مارڈین۔ جی ہاں ختم ہوگئیں۔

انیٹنی۔ ایراس میرے اسلحہ جنگ اتار دے۔ طول طویل دن کا کام ختم ہوچکا۔ اب ہم کو سونا چاہیے

(مارڈین سے) جا تیری زحمت کا یہی کافی صلہ ہے۔ کہ تو یہاں سے صحیح سلامت واپس جاتا ہے۔

(مارڈین کا جانا)

اتارو۔ اسلحہ نوچ کر پھینکدو۔ ایجکس کی ہفت تہ سپر بھی میری حرکت قلب کو نہیں روک سکتی۔ اے میرے پہلوؤ شگافتہ ہو جاؤ۔ اے قلب ایک بار اس قدر مضبوط ہو جا کہ اس ناپائدار صندوق کو توڑ دے جس میں تو بند ہے۔ جا۔ ایراس۔ جا۔ اب میں سپاہی نہیں رہا۔ اے میری زرہ کے زخم خوردہ ٹکڑو۔ خدا حافظ۔ اب تک تم بڑی شان کے ساتھ میرے زیب جسم رہے ہو۔ ایراس تھوڑی دیر کے لئے میرے پاس سے چلا جا۔

(ایراس کا جانا)

کلیوپیٹرا! میں ابھی تیرے پاس پہنچتا ہوں اور عفو تقصیر کے لئے گریہ وزاری کروں گا بس اب ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ زندگی کی مزید طوالت اب عذاب جان ہوتی جاتی ہے۔ چونکہ تیری راہ نما مشعل خاموش ہوگئی اس لئے انٹنی تو بھی آرام کر اور تاریکی میں اِدھر اُدھر ٹھوکریں کھاتا نہ پھر۔ اب تو جو کام بھی محنت شاقہ سے کیا جاتا ہے وہی بگڑتا ہے۔ اس لئے مجھے ان تمام جھگڑوں کو سربمہر کر کے ختم کر دینا چاہیئے۔ ایراس کو پکارتا ہے) ایراس! (ملکہ کی روح سے) اے میری ملکہ میں ابھی حاضر ہوا (ایراس! (پھر ملکہ کی روح سے) میرا انتظار کرو۔ ہم دونوں دست بہ دست اس مقام پر چہل قدمی کریں گے۔ جہاں روحیں پھولوں کے فرش پر آرام کرتی ہیں۔ او ہم اپنی شاندار رفتار سے ان کو مجبور کریں گے کہ وہ ہم کو بہ نظر حیرت دیکھیں۔ عالم ارواح میں ڈائیڈو اور اینیس کے چاہنے والے گروہ ان کو چھوڑ دیں گے اور تمام روحیں ہماری گرویدہ ہو جائیں گی۔ ادھر آ۔ ایراس! ایراس!!

(ایراس کا آنا)

ایراس۔ میرے آقا کیا حکم ہے۔

انٹنی۔ جب سے کلیوپیٹرا کا انتقال ہوا ہے میں ایسی بے وقعت زندگی بسر کر رہا ہوں کہ دیوتا

میرے کمینہ پن کو حقارت کی نظر سے دیکھ رہے ہیں میں جس نے حسب دلخواہ اپنی شمشیر آبدار سے دنیا کے ٹکڑے کر دئیے اور سبز سمندروں پر جہازوں میں شہر کے شہر آباد کر دئیے اپنے آپ کو ایک عورت کے برابر بھی جرأت نہ رکھنے کا مجرم قرار دیتا ہوں میرا دماغ اس کے دماغ سے کہیں زیادہ ننگ ہے جس نے خودکشی کر کے سیزر سے کہدیا کہ "میں ہی اپنی فاتح ہوں" ایراس تو نے قسم کھائی تھی کہ جب کوئی وقت آن پڑے گا اور جب میں اپنے پس پشت رسوائی اور خوف کا ناگزیر تعاقب دیکھوں گا جو درحقیقت اس وقت آگیا ہے تو اس وقت تو میرا حکم پاتے ہی مجھ کو قتل کر دے گا۔ پس اپنا کام کر۔ وہی وقت آگیا ہے۔ تو مجھ کو قتل نہیں کرے گا۔ بلکہ سیزر کو ناامید کرے گا۔ اپنے چہرہ پر اس اہم کام کی ہمت اور استقلال کے خون کی جھلک پیدا کر لے۔

ایراس۔ دیوتا مجھے باز رکھیں۔ کیا حضور مجھ سے وہ کام لینا چاہتے ہیں جو تمام پارتھیا کے تیر نہ کر سکے اور باوجود دشمن ہونے کے نشانے خطا کر گئے۔

اینٹنی۔ ایراس کیا تو یہ چاہتا ہے کہ عظیم الشان روم کے کسی محل کی کھڑکی میں کھڑا ہو اور اپنے آقا کو اس طرح بحالت مایوسی سینہ پر اپنے بازوؤں کو تہہ کئے ہوئے، اپنی کبھی نہ جھکنے والی گردن خم کئے ہوئے اور اس کے چہرہ سے روح فرسا شرم کی ترجمانی ہوتے ہوئے دیکھے۔ جب کہ خوش نصیب سیزر کے جلوس کی پیش روگاڑی اپنے پیچھے پیچھے آنے والے کی پوری پوری ذلت پر مہر شہادت لگا رہی ہو۔

ایراس۔ میں ہرگز یہ دیکھنا نہیں چاہتا۔

اینٹنی۔ بس تو آ۔ کیونکہ اب میرے درد کا درمان ایک ہی زخم سے ہونا لازمی ہے۔ اپنی راست باز شمشیر کو میان سے کھینچ جس کو افادۂ ملک کے لئے تو نے نہایت کارآمد طریقہ پر ہمیشہ زیب کمر رکھا ہے۔

ایراس۔ افسوس حضور مجھ کو فرمائیں۔

اینٹنی۔ جب میں نے تجھ کو آزاد کیا تھا تو کیا تو نے میرا حکم بجالانے کی قسم نہیں کھائی تھی چل

فوراً میرے حکم کی تعمیل کرو ورنہ میں تیری تمام گذشتہ خدمات کو محض اتفاقی اور بے مقصد تصور کروں گا۔ تلوار کھینچ اور میرے قریب آ۔

ایراس۔ اچھا تو میری جانب سے یہ شریف چہرہ پھیر لیجئے جس میں وہ تمام باتیں پائی جاتی ہیں۔ جن کی کل جہان پرستش کرتا ہے۔

اینٹنی۔ اچھا لے۔ (ایراس کی طرف پشت کرکے کھڑا ہوتا ہے)

ایراس۔ میری تلوار کھنچ چکی ہے۔

اینٹنی۔ تو فوراً اس کو وہ کام کرنے دے جس کے لئے تو نے اسے میان سے نکالا ہے۔

ایراس۔ میرے پیارے آقا۔ میرے سردار اور میرے شہنشاہ مجھ کو اجازت دیجئے کہ یہ بے رحم ضرب لگانے سے پیشتر میں وداعی خدا حافظ کہہ لوں۔

اینٹنی۔ ارے بس کہہ چکا۔ اچھا خدا حافظ۔

ایراس۔ عالیشان سردار خدا حافظ۔ کیا اب میں وار کردوں۔

اینٹنی۔ ہاں ایراس۔ اسی وقت۔

ایراس۔ اچھا یہ لیجئے۔ اس طور پر میں اینٹنی کی موت کے غم سے بچتا ہوں۔

(خودکشی کر لیتا ہے)

اینٹنی۔ تو مجھ سے سہ چند عالی منش ہے۔ اے بہادر ایراس تو مجھ کو ایسے کام کی تعلیم دیتا ہے جو مجھ کو کرنا چاہیئے تھا۔ اور میں نہ کرسکا۔ میری ملکہ اور ایراس اپنی بہادری کی مثال پیش کرکے کارناموں کی فہرست میں میری شرافت پر سبقت لے گئے۔ مگر میں بھی اسی خوشی سے جان دوں گا جو ایک نوشاہ کو ہوتی ہے اور آغوش مرگ میں اس انبساط سے دوڑ کر جاؤں گا جیسے کوئی معشوق کے بستر پر جاتا ہے۔ اچھا لے۔ ایراس تیرا مالک تیرے شاگرد کی حیثیت سے مرتا ہے۔ یہ کام اس طرح پر انجام دینا میں نے تجھ سے سیکھا ہے

(اپنی تلوار پر گر جاتا ہے)

پہلا نگہبان۔ یہ شور کیسا ہے؟

اینٹنی۔ دوستو میں نے اپنا کام بری طرح انجام دیا۔ آہ جس کام کا میں نے آغاز کیا اسے تم لوگ

اختتام کو پہنچا دو۔
دوسرا نگہبان ۔ ستارہ ٹوٹ گیا۔
پہلا نگہبان ۔ اور زمانہ اپنے اختتام پر ہے۔
تمام نگہبان ۔ افسوس، ہزار افسوس۔
اینٹنی ۔ جس کو مجھ سے محبت ہے وہ میرا کام تمام کر دے۔
پہلا نگہبان ۔ مجھ سے تو یہ نہ ہوگا۔
دوسرا نگہبان ۔ اور نہ مجھ سے۔
تیسرا نگہبان ۔ کوئی نہیں کر سکتا۔

(سب نگہبان بھاگ جاتے ہیں)

ڈرکیٹاس ۔ تیری موت اور تیری بدبختی کو دیکھ کر تیرے ہمراہی فرار ہو رہے ہیں۔

(اینٹنی کی تلوار لے کر)

اس خبر کے ساتھ سیزر کو اس تلوار کا محض دکھلا دینا مجھ کو اس کا مقرب بارگاہ ہونے کے لئے کافی ہے۔

(ڈالومیڈیز کا آنا)

ڈالومیڈیز ۔ اینٹنی کس طرف ہیں؟
ڈرکیٹاس ۔ ادھر دیکھو۔ ڈالومیڈیز اس طرف۔
ڈالومیڈیز ۔ کیا وہ زندہ ہیں؟ اے شخص کیا تو جواب نہ دے گا۔

(ڈرکیٹاس کا جانا)

اینٹنی ۔ ڈالومیڈیز کیا تو ہے؟ اپنی تلوار کھینچ اور میرا خاتمہ کر دینے کے لئے کافی ضربیں لگا
ڈالومیڈیز ۔ اے مختار کل سردار میری مالکہ کلیوپیٹرا نے مجھے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔
اینٹنی ۔ انہوں نے کس وقت بھیجا تھا؟
ڈالومیڈیز ۔ حضور ابھی اسی وقت۔
اینٹنی ۔ وہ کہاں ہیں؟

ڈالومیڈیز۔ مقبرہ میں پناہ گزیں ہیں۔ جو کچھ ظہور پذیر ہوا ہے اس کا ان کو پہلے ہی سے کچھ اندیشہ ہوگیا تھا کیونکہ جب انہوں نے دیکھا کہ آپ کو شک ہوگیا ہے کہ انہوں نے سیزر سے سازش کرلی کہ جو بالکل بے بنیاد ہے اور کبھی پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ سکتا۔ اور نیز یہ کہ آپ کا غصہ فرو نہ ہوگا تو انہوں نے کہلا بھیجا کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ لیکن یہ اندیشہ کرکے کہ خدا جانے اس سے آپ پر کیا اثر ہوا ہو انہوں نے مجھ کو اظہار حقیقت کے لئے بھیجا ہے مگر مجھے خوف ہے کہ میں بعد از وقت آیا ہوں۔

اینٹنی۔ نیک دل ڈالومیڈیز بے شک تو بعد از وقت پہنچا۔ مہربانی کرکے میرے نگہبانوں کو آواز دے۔

ڈالومیڈیز۔ اے شہنشاہ کے نگہبانو ادھر آؤ۔ پہرہ دارو کدھر ہو۔ تمہارا مالک تم کو طلب کرتا ہے۔

اینٹنی۔ میرے اچھے دوستو مجھ کو اٹھاکر کلیوپیٹرا کی قیام گاہ پر لے چلو۔ یہ آخری خدمت ہے جس کا میں تم کو حکم دیتا ہوں۔

پہلا سپاہی۔ حضور ہم لوگ بدبخت اور منحوس ہیں کہ آپ اپنے جان نثاروں کو خدمت سے کر چور چور کرنے کے لئے شاید اب زندہ نہ رہیں۔

سب سپاہی۔ آج سے زیادہ رنج و الم کا دن کوئی نہ ہوگا۔

اینٹنی۔ نہیں اے میرے نیک دل رفیقو بے رحم تقدیر کو اپنے بیش بہا تاسفات سے عزت بخش کر خوش نہ کرو۔ اگر کوئی چیز ہم کو نقصان پہنچانے کی غرض سے آئے اور ہم نہایت خندہ پیشانی سے اس کا خیر مقدم کریں تو گویا اس کی آمد کو ہم بے اعتنائی کی نظر سے دیکھتے ہیں جس سے خود اس کو شرمندہ کرکے نقصان پہنچاتے ہیں۔ مجھ کو اٹھاؤ۔ میں تم لوگوں کو بارہا میدانوں میں لے گیا ہوں جس کے معاوضہ میں استدعا کرتا ہوں کہ اس وقت تم مجھ کو لے چلو اور اپنی زحمتوں کے صلہ میں میرا شکریہ قبول کرو۔

(سب لوگوں کا اینٹنی کو لے کر جانا)

تنقیدیں

انتخاب سودا مرتبہ مولوی سید ابو محمد صاحب ثاقب کانپوری چھوٹی تقطیع ضخامت (۲۲۴) صفحات قیمت (عہ) سکہ کلدار یا (عہ) سکہ حالی بکتبہ جامعہ ملیہ دہلی یا مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد سے طلب فرمائیے۔

عام ادبیات اور بالخصوص شاعری میں انتخاب کو جو اہمیت حاصل ہے، اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا آج انگریزی شاعری محض انتخابات کی بدولت خاص وعام پر روشن ہے۔ بدقسمتی سے اردو شاعری میں عمدہ انتخابات بہت ہی کم پائے جاتے ہیں۔ ہر شاعر ایک بڑے دیوان کا مالک ہے جو مختلف اصناف سخن پر مشتمل ہوتا ہے اس میں رطب ویابس جواہر پارے اور خذف ریزے ایک ساتھ شریک ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ کرنے اور اس کے محاسن کو پر کھنے والوں کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ چند سال سے شعرا کے دیوان شایع کرنے کی بجائے ان کے پورے کلام سے پاکیزہ انتخابات پیش کرنے کا شوق زیادہ ہو گیا ہے اور اب کئی شاعروں کے انتخابات کلام کے چھوٹے چھوٹے مجموعے تیار ہو گئے ہیں جو نہ صرف درسی ضروریات بلکہ عام قارئین کیلیے بھی مفید ہیں اور غیر ضروری گراں باری سے خالی ہوتے ہیں انتخاب سودا بھی ایک ایسا پاکیزہ مجموعہ ہے اس کے شروع میں مرزا جعفر علی خان صاحب اثر لکھنوی کا ایک دلچسپ مقدمہ ہے جس میں سودا کی لایف کے علاوہ ان کی شاعری کی خوبیاں اور خصوصیات واضح کی گئی ہیں۔ یہ انتخاب صرف غزلیات اور رباعیات کا ہے قصاید اور مثنویاں اس میں شریک نہیں غزلیں تقریباً تمام منتخب اور چیدہ غزلیں ہیں اور مرتب کے حسن مذاق کا ثبوت ہیں۔ مناسب ہوتا کہ اس میں "علمیات" کا اضافہ کر دیا جاتا ہے جس سے سودا کے متعلق تمام متعلقہ کتابیں "انتخاب سودا" کے پڑھنے والے کے افادے کا باعث ہوتیں نیز سودا کی تصویر سے بھی اس کو مزین کیا جاتا تو کیا اچھا ہوتا۔

چار یار مولفہ مولوی احمد الیاس صاحب مجیبی چھوٹی تقطیع ضخامت (۶۰) صفحات قیمت (۳؍) سکہ کلدار یا (۴؍) سکہ حالی ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی اور مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

یہ خلفائے راشدین کی مفید اور سبق آموز سوانح عمریوں کا مجموعہ ہے جو کم سن بچوں کے مطالعے کے لیے لکھا گیا ہے۔ اس کا طرز بیان نہایت سلیس اور دل پذیر ہے۔ واقعات و روایات ثقہ اور مسلمہ پیش کی گئی ہیں اور حتی المقدور ایسی کوئی بات اس میں درج نہیں کی گئی کہ کمسن قاریوں کو متنازع مسائل میں الجھا دے۔ مسلمان بچوں کے لیے اس کا مطالعہ بہت مفید ثابت ہوگا

دو نئے رسالے اس مہینے میں تبصرے کے لیے دو رسالے وصول ہوئے ہیں جو ہمارے ہی شہر حیدر آباد سے شایع ہونے لگے ہیں۔ "ایک کاشتکار" ہے اور دوسرا "حیات سخن"۔ اول الذکر حیدر آباد کے مشہور اہل قلم مولوی عبدالرزاق صاحب بسمل کا مرتبہ اور ملک کی زراعتی اغراض و مفاد کو فروغ دینے کی غرض سے جاری کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی طرح حیدر آباد بھی ایک زراعتی علاقہ ہونے کے باوجود اب تک اس طرف کوئی خاطر خواہ کوشش ایسی نہیں کی گئی کہ ملک کی زراعت میں بڑی تبدیلی پیدا ہو جائے۔ اگرچہ ہمارے ہاں محکمہ زراعت قایم ہے اور عرصہ سے قایم ہے لیکن اب تک اس کی نوعیت زراعتی مشیر کی سی ہے۔ ابھی چند دنوں کا ذکر ہے کہ کچھ طلبہ زراعت کے لیے بیرون ملک بھیجے گئے ہیں اور خود سررشتے کی طرف سے بھی مظاہراتی مزرعے وغیرہ قایم کر کے تشویق زراعت و توفیر پیداوار کی کوشش کی جانے لگی ہے۔ ہنوز ملک میں کوئی زراعتی کلیہ یا فوقانیہ مدرسہ بھی وجود میں نہیں آیا مگر اب کیا سرکار اور کیا رعایا دونوں پہلے سے زیادہ متوجہ ہیں۔ اس سے قبل ایک رسالہ ریاست ہی سے "مشیر اہل دہ" کے نام سے جاری ہوا اور بفضلہ چل رہا ہے۔ بسمل صاحب کی یہ نئی کوشش ملک کی ضروریات کے مدنظر قابل حوصلہ افزائی ہے۔ رسالے کی طباعت و کتابت بڑی پاکیزہ ہے۔ زراعت سے متعلق تصاویر بھی ہیں۔ ایک اور بات جو خاص اس رسالے سے مخصوص ہے وہ یہ ہے کہ "کاشتکار" کا ایک حصہ تلنگی میں ہے جو ملک کی بہت وسیع آبادی کی زبان ہے۔ "کاشتکار" کا سالانہ چندہ (للعہ) ہے اور ایک سال سے کم مدت کے لئے جاری نہیں ہو سکتا۔ بسمل صاحب بیرون دبیر پورہ سے مراسلت کی جائے۔

"حیات سخن" ایک ماہوار رسالہ ہے اردو فارسی شاعری کا اگرچہ اس کے ایڈیٹر حکیم عرشی صاحب اور معتمد محمد جہانگیر صاحب مجید ہیں لیکن ان کے علاوہ (۱۱) مشہور و معروف شاعر و ادیب اس کی مجلس ادارت کے ارکان ہیں جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ (۱) علامہ مفتی ضیا یار جنگ بہادر (۲) حیدر یار جنگ بہادر طباطبائی (۳) فصاحت جنگ بہادر جلیل (۴) عزیز یار جنگ بہادر۔ (۵) اصغر یار جنگ بہادر (۶) ادیب یار جنگ بہادر (۷) اختر یار جنگ بہادر (۸) مولوی عبداللہ صاحب عمادی (۹) مولوی مسعود علی صاحب محوی بی اے (۱۰) نواب منور علی خان بہادر عالی رفاعی (۱۱) آغا محمد علی صاحب پروفیسر فارسی نظام کالج۔ پہلا پرچہ جو ہمارے پیش نظر ہے اس میں اردو میں ع ملی ہے عرش کی زنجیر سے زنجیر میخانہ اور فارسی میں ع صدائے قلقل بنا شدہ تکبیر میخانہ طرحیں دی گئی ہیں۔ اردو میں (۱۳۸) اور فارسی میں (۴۴) اچھے، برے، چھوٹے بڑے، سب ہی شاعروں کی غزلیں ہیں۔ بعض شاعر وہ پختہ کار اور مسلم الثبوت ہیں کہ جن کی سارے ہندوستان میں شہرت ہے اور بعض ایسے نومشق اور خام ہیں کہ ان کے پختہ ہونے کے لیے "بسیار سفر" کی ضرورت ہے۔ ان طرحی غزلوں کے علاوہ "عطر میخانہ" کے عنوان سے ایک مشاعرے کی غزلوں کا نچوڑ دیا گیا ہے جو اب سے پندرہ سولہ برس قبل حیدر آباد کے رسالہ "نظارہ" میں شایع ہوا تھا۔ اس کے بعد مولوی عمادی صاحب کا مضمون "شعر العرب" کی سرخی سے شروع ہوتا ہے مگر دو ورق بھی نہیں صرف دو سرے

کتب موصولہ

ان مطبوعات پر آئندہ نمبروں میں ریویو کیا جائے گا۔

(۱) تاریخ مغربی یورپ۔ (۲) سیرت نبوی اور مستشرقین۔ (۳) دیوان اثر (۴) الکشافہ (۵) طائر خیال (۶) بشارات مولود۔ (۷) رسالہ روح ادب (۸) کانفرنس گزٹ

جو حضرات مکتبہ ابراھیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا ساٹھ روپے کی عام علمی اور دوسری کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائینگے اُن کے نام رسالہ سال بھر کے لئے بلاقیمت جاری رہے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی دوسری کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خرید کرینگے اُن کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلہ بلاقیمت حاضر ہوگا۔ یکمشت خریدنے والے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کردیا جائے گا۔ جو حضرات بدفعات کتابیں خریدینگے اُن کو ایک رسید دیجائیگی جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔ خریدار صاحبین کو چاہیئے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب اجمالا رقم معینہ کی تکمیل ہوجائے وہ رسیدیں منتظم مجلہ مکتبہ کے پاس بھیجدیں رسالہ انکے نام جاری کردیا جائے گا۔ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہوسکتی ہیں اس طرح سے کئی اشخاص مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

مطبوعہ مطبع مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

حیدرآباد دکن
کا
ماہوار علمی و ادبی مجلہ
مکتبہ
مدیر
عبدالقادر سروری ایم اے ال ال بی

مطبوعہ مطبع مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

ماہوار علمی و ادبی مجلہ

مکتبہ

مدیر

عبدالقادر سروری ایم اے ایل ایل بی

شرکاء

سید محمد ایم اے

عمر یافعی

رجسٹرڈ نشان ٹپہ سرکار آصفیہ (۶۵)

رجسٹرڈ نشان ٹپہ انگلشیہ (........)

مجلّہ مکتبہ

جلد (۶) بابتہ ماہ دی ۱۳۴۰ف م نومبر ۱۹۳۰ عیسوی شمارہ (۲)

تصاویر:۔ نواب بہادر یار جنگ بہادر ۔ جناب ابوالفاضل راز چاندپوری

فہرست مضامین

شذرات

یہ امر کارپردازان انجمن امداد باہمی مکتبۂ ابراہیمیہ کے لیے خاص طور پر باعث مسرت و مباہات ہے کہ پیشگاہ عالم پناہ سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ سے اس کے ہر دلعزیز صدر نواب محمد بہادر خان صاحب کو بہادر یار جنگ بہادر کے معزز خطاب سے سرفراز فرمایا گیا۔ نواب صاحب مکتبے کے علاوہ مجلس تشریعی حیدرآباد (لیجسلیٹو کونسل) میں طبقہ جاگیرداران کے نمایندے اور انجمن جاگیرداران کے سرگرم معتمد ہیں۔ آپ حیدرآباد کے ایک قدیم جاگیردار خاندان کے چشم و چراغ، خاندانی امیر اور موروثی جمعدار (کماندار فوج) اور صاحب علم و فضیلت نوجوان ہیں۔ آپ کی قومی سرگرمیوں اور معاشرتی خدمتوں سے حیدرآباد کا ہر شخص واقف ہے۔ حیدرآباد کے مذہبی جلسے، تعلیمی کانفرنس، مجلس تشریعی، اصلاح امرا و جاگیرداران کے کاموں میں آپ کی پرزور تقاریر اور پرجوش سرگرمی نے آپ کو سارے ملک میں ہر دلعزیز بنا دیا ہے انہی اعلیٰ خدمات اور علمی فضیلت کے صلے میں ہمارے علم پرور اور معارف نواز آقائے ولی نعمت نے آپ کو بتقریب سالگرہ مبارک خطاب سے سربلند فرمایا ہے۔ ہم نواب صاحب معز کو اس اعزاز پر مبارک باد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ آپ کی توجہ اصلاح ملک و خدمت مالک میں بیش از بیش ہو جائے گی۔

کلیہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کی یادگار ہر سال اساتذہ و طلبہ کلیہ بہت دلچسپ طریقے پر منایا کرتے ہیں۔ اب کی دفعہ بھی یوم کلیہ منایا گیا اور بڑے اہتمام کے ساتھ منایا گیا۔ انگریزی اردو تقاریر کی مسابقتوں، کھیلوں کے مقابلوں کے علاوہ بڑے پیمانہ پر معاشرتی جلسے، نمایش سائنس سالانہ جلسہ تقسیم انعامات، عصرانے اور ڈنر کا انتظام بھی کیا گیا اور ہر ایک تقریب خوش اسلوبی کے ساتھ اختتام کو پہنچی۔ مشاعرے میں طرحی غزلوں کے علاوہ "شباب" کے رومانوی عنوان پر نظمیں بھی پڑھی گئیں۔ کالج کے "جوان سال" قدیم طالب علم جناب بدر الدین صاحب بدر کی نظم بہت پسند کی گئی۔ ان کے علاوہ طلبہ قدیم میں سے بعض شاعروں نے اچھی اچھی

نظمیں سنائیں اور خوب لطف محفل رہا ۔ سائنس کی نمائش بھی قابل دید تھی ۔ موجودہ زمانے کی متعدد سائنٹیفک نیرنگیوں اور ایجادوں کا بہت اچھا مظاہرہ کیا گیا تھا ۔ کالج کے صدر جناب مولوی عبدالرحمٰن خان صاحب اور دیگر اساتذہ اور طلبہ حال و قدیم کے تعاون و اشتراک عمل سے یہ سالانہ تقریب بہت کامیاب ہوئی۔

سال حال طبیعیات کے لیئے نوبل انعام جو ایک عالمگیر شہرت کا اعزاز اور بین الاقوامی اعتراف فضیلت علمی ہے ایک ہندی عالم سائنس سر سی وی رامن کو عطا ہوا ہے ۔ سر رامن موجودہ نسل کے بہت بڑے سائنس داں اور ہندوستان کے قابل صد فخر و مباہات فرزند ہیں ۔ گزشتہ سال انہیں اسی علمی فضیلت کے صلے میں سر کا خطاب دیا گیا ۔ نوبل انعام کے ساتھ ملک معظم نے رایل سوسایٹی کی جانب سے ہیوز انعام بھی مرحمت فرمایا ۔ سر رامن غالباً سب سے کم عمر ہندوستانی ہیں جنہیں (۴۱) برس کی عمر میں سر کا خطاب اور (۴۲) میں نوبل انعام ملا ہے انہوں نے پریذیڈنسی کالج مدراس میں تعلیم پائی اور امتیازات کے ساتھ جامعہ کے امتحان پاس کرکے ۱۹۰۷ء میں مالیاتی سیول سرویس میں داخل ہوے ۔ سائنس سے ان کے طبعی لگاؤ اور سائنٹیفک رسالوں میں ان کے بلند پایہ و محققانہ مضامین نے سر آسوتوش مکرجی آنجہانی کو جو بنگال کے مشہور عالم علم دوست گزرے ہیں ، اپنی طرف اس طرح متوجہ کیا کہ آنجہانی نے انہیں دولت و ثروت کے ایثار سے علم کی شمع برداری کی ترغیب دی اور ان کے اصرار پر بیش مواجب سیول سروس چھوڑ کر جامعہ کلکتہ میں پروفیسر ہوے ۔ یہاں طبیعیات میں تحقیقات کا خوب موقع ملا اور چند ہی سال میں ان کی علمی فضیلت نے نہ صرف سارے ہندوستان بلکہ یورپ و امریکہ میں اپنا سکہ بٹھا دیا ۔ ۱۹۲۴ء میں جامعات کناڈا (امریکہ) کی دعوت پر وہاں گئے ۔ پھر اٹلی کا سفر کیا ۔ ۱۹۲۸ء میں ہندوستانی سائنس کانگرس کی صدارت فرمائی ۔ ہندوستان کی متعدد جامعات نے بہ حیثیت خصوصی پروفیسر ان کی علمی فضیلت سے فیض پایا ۔ اور وہ اس وقت جامعہ کلکتہ میں پروفیسر طبیعیات ہیں ۔ اس کے علاوہ اعزازی طور پر جامعہ ہندو بنارس میں بھی اس مضمون کی پروفیسری کے فرایض ادا کرتے ہیں ۔

پیوستہ اور گزشتہ نمبروں میں علامہ شمسی مرحوم اور حضرت امجد کے متعلق جو دلچسپ اور مفید مضامین اور تصاویر مجلہ مکتبہ میں شایع ہوئے انہیں قارئین کرام نے بہت پسند کیا اور ہماری کوششوں کو بہ نظر استحسان دیکھا۔ ہمارا ارادہ ہے کہ سرزمین حیدرآباد کی متعدد دیگر علمی شخصیتوں کو جن کے کارنامے بلحاظ افادہ و عظمت ہر طرح لائق تعارف و مستحق تحسین ہیں، اسی طرح روشناس کرائیں۔ حیدرآباد میں ایسی کئی ہستیاں پیدا ہوئیں، جنہوں نے اپنے علم و کمال سے ملک کو فائدہ پہنچایا مگر اہل ملک کی غفلت و بے توجہی سے پھر بھی گوشہ گمنامی میں رہے۔ ہم ان کے متعلق ضروری مواد اور ان کی تصویریں فراہم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور امید ہے کہ بہت جلد ہماری یہ مساعی بار ور ثابت ہوں گی۔

اس نمبر میں ہم صدر مکتبہ ابراہیمیہ نواب بہادر یار جنگ کی جو تصویر شایع کر رہے ہیں وہ قدیم خاندانی درباری لباس میں ہے جو نواب صاحب معز کا فوجی امتیاز ہے۔ دوسری تصویر جناب راز چاندپوری کی ہے جو اس دور کے ایک خوش گو اور مقبول خاص و عام شاعر ہیں۔ آپ کے کلام کا ایک خوبصورت مجموعہ "دنیائے راز" کے نام سے ابھی شایع ہوا ہے۔ اس نمبر میں اس پر تبصرہ بھی ہے۔

ذاتی اخلاق

(مسٹر سالٹر کے مضمون PERSONAL MORALITY کا ترجمہ)

از جناب رشید احمد صاحب حیدرآبادی

ذاتی ذمہ داری سے بڑھکر کوئی حیرت انگیز خیال نہیں۔ اس خیال کا تعلق خاص ہماری ذات اور ہمارے ارادے سے ہے۔ ایک آواز غیب ہم سے کہتی ہے کہ اے انسان تجھے ایک کام سپرد کیا گیا ہے۔ تو اوروں کے ساتھ شامل نہیں۔ تو علیحدہ ہے۔ تیری ہستی وہ ہے جس کے مثل دنیا میں دوسری ہستی نہیں۔ تجھے وہ کام کرنا ہے جو دنیا میں دوسرا شخص نہیں کرسکتا۔ دنیا کے پردہ پر تیری ذات برگزیدہ ہے۔ پس تو آپ اپنا احترام کر اور اپنا فریضہ بجا لا۔ بغیر تیرے تیرا فریضہ کوئی نہیں بجا لاسکتا۔

ذاتی اخلاق کا اولین سبق اپنی آپ عزت کرنا ہے۔ اخلاق کی تعریف بعض اوقات دوسروں کی ہمدردی اور خیال پر مبنی ہے لیکن جیسا کہ ماں، باپ، بہن، بیوی، اور دوست احباب کا احترام ہم پر فرض ہے ویسا ہی اپنا احترام بھی ہم پر فرض ہے۔ اور جو وجوہ ان کے احترام و عزت کی تائید میں پیش کئے جاسکتے ہیں وہی ہمارے اپنے احترام و عزت کی تائید میں پیش کئے جاسکتے ہیں مجھے یہ توقع نہ رکھنی چاہئے کہ کوئی میری عزت کرے جبکہ میں اپنی عزت آپ نہ کروں اور اپنے رکھ رکھاؤ اور آداب سے یہ ظاہر نہ کروں کہ مجھ پر اپنی ذمہ داری کس قدر ہے۔ یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ہم دوسروں کے ساتھ کس طرح برتاؤ کرنا چاہیئے اس کو ملحوظ رکھیں اور اپنی ذات کے متعلق اس امر کو نظر انداز کردیں اور یہ سمجھ لیں کہ ہم اپنی ذات کی حد تک جو چاہیں کرسکتے ہیں کیونکہ اپنا ذاتی معاملہ ہے۔ جو شخص اپنی ذات کے متعلق ایسا خیال کرتا ہے کچھ عجب نہیں اویر سویر دوسروں کے متعلق بھی ایسا ہی خیال کرے کیونکہ دوسرے بھی تو اس کے مثل انسان ہیں اور جب وہ اپنی ذات کو فرائض سے بری الذمہ خیال کرتا ہے تو دوسروں کی ذات کو بھی ایسا ہی سمجھے حقیقت الامر یہ ہے کہ تمام انسان واجب الاحترام ہیں۔ ہر شخص کو ایک فریضہ سپرد کیا گیا ہے۔ بیشک ہر شخص کو انفرادی اور خصوصی طور پر اور اس طرح پر کہ کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں، یہ فریضہ بالکل علیحدہ اور انفرادی طور پر انجام دینا ہے۔

سوال یہ ہے کہ وہ کیا امور ہیں جن کے لئے ہم اپنی ذات سے ذمہ دار ہیں اور جو خاص ہمارے

منشا کے تحت ہیں پہلی چیز ہماری اپنی عادات ہیں اور ان عادتوں سے سوائے ہمارے کوئی دوسرا واقف نہ ہو لیکن ہم ان کے لیے ایسے ہی ذمہ دار ہیں جیسے تمام دنیا ان سے واقف ہو۔ ہماری ذمہ داری محض اس لئے نہیں ہے کہ ان کے اثرات دوسروں پر پڑتے ہیں بلکہ اس لئے کہ خود ہم ان کے زیر اثر ہو جاتے ہیں۔ ہم کو چاہیئے کہ عمدہ عادات اختیار کریں کہ یہ انسان کے لئے بہت ضروری ہیں۔ اپنی آپ نگرانی کریں اپنے نفس کو قابو میں رکھیں اور اپنے جسم اور روح، ظاہر و باطن، دونوں کو پاکیزہ رکھیں۔ مجھے کسی شخص کی عادات ظاہری و باطنی معلوم ہوں تو میں بتا سکتا ہوں کہ یہ شخص واقعی آپ اپنی عزت کرتا ہے یا نہیں۔ اور جو اخلاق وہ برت رہا ہے محض نمائشی ہیں یا خود اس کی سرشت بن گئے ہیں۔ ایک شخص کے متعلق میں نے پڑھا ہے کہ وہ تنہا بھی اگر دسترخوان پر بیٹھتا تو انہیں آداب کو ملحوظ رکھتا جنہیں وہ اپنے دوستوں کی موجودگی میں بجالاتا۔ اس کی یہ عادت درست تھی۔ کیونکہ ان موقعوں پر جو آداب ملحوظ رکھے جاتے ہیں وہ بحیثیت بنی انسان دسترخوان پر بیٹھنے کے ہوتے ہیں اور ان کی تعداد کے لحاظ سے نہیں ہوتے۔ ہماری عادات ہماری انسانیت کو ظاہر کرنے والے ہوں ہم کو چاہیئے کہ زیادہ کھانے پینے سے پرہیز کریں کہ یہ حیوانیت ہے۔ ہم کو چاہیئے کہ اپنی اشتہاؤں کو قابو میں رکھیں کہ ثبات عقل انہیں سے ہے۔ جسم کی عزت کریں کہ ہمارا جسم ہماری انسانیت کا گہوارہ ہے۔ ہمارے ہر برے فعل، ہر اظہار جذبات، زندگی کی ہر افراط و تفریط اور جسم و روح کی عدم پرداخت سے اس عمدہ انسانیت کی جو ہم میں موجود رہتی ہے اور جو ہماری ذات اور رویے سے ظاہر ہونی چاہیئے تذلیل ہوتی ہے۔ اور ہم بحیثیت انسان انسانیت کے درجے پر پہنچنے کے بہائم کے درجے میں تنزل کر جاتے ہیں۔

دوسری چیز جس پر ہمیں اختیار حاصل ہے وہ ہماری زندگی کے مقاصد ہیں۔ اچھے مقصد اور برے مقصد کے انتخاب کا دارومدار ہمیں پر ہے۔ گو ہمارے افعال ظاہری مجبوری کے تحت ہوں لیکن ہماری شخصیت کا قلعہ اور مرکز ہماری قوت ارادی ہے جس کے ہمیں ہم مالک و مختار ہیں۔ ایسی زبردست قوت کو اپنے قبضے میں رکھ کر چاہیں تو ہم اعلیٰ و ارفع مقاصد کی طرف رجوع ہوں یا ادنیٰ و اسفل کی طرف۔ یا اگر چاہیں تو کوئی ارادہ ہی نہ رکھیں۔ اور صرف زندگی کی رو میں بہے چلیں۔ لیکن کسی ایک مقصد کے ہو رہنا بغیر مقصد کے رہنے سے اچھا ہے۔ اور اعلیٰ مقصد ہی انسان کے لیے زیبا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کا مقصد کیا ہے اعلیٰ مقصد انسانی زندگی کے اعلیٰ نظام میں حصہ لینا ہے۔ دوسرے جوابات جو عموماً دیئے جاتے ہیں وہ یا تو خیالی ہیں یا لایعنی ایک جواب اپنی روح کی نجات ہے لیکن کون کہے گا کہ یہ اعلیٰ مقصد ہو سکتا ہے۔

ایک جواب خدا کی تمجید اور اس کی محویت ہے لیکن یہ جواب ناقابل عمل نظر آتا ہے۔ ایک جواب فرمان خدا کی تعمیل ہے لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ فرمان خدا کیا ہے۔ فرمان خدا کی تعمیل مذہبی تاریخ میں اعلیٰ ادنیٰ، شیطانی اور خدائی تمام مقاصد پر محیط ہے۔ انسانی زندگی کے اعلیٰ نظام میں حصہ لینا البتہ ایک مقصد ہے جس کو انسان اپنا مطمح نظر قرار دے سکتا ہے۔ سب کو اپنی زندگی سے محبت ہے۔ اور ہم چاہتے ہیں کہ اس کو اسی اعلیٰ منزلت پر دیکھیں۔ ہم کو اپنی زندگی سے خالص محبت ہے اس اعتبار سے نہیں کہ جو کچھ وہ ہے بلکہ اس اعتبار سے کہ وہ کیا سے کیا ہو سکتی ہے۔ انسانی زندگی کے اعلیٰ نظام میں حصہ لینے کا مقصد ایسا ہے جو تاجر، وکیل، ڈاکٹر، ماں، بچے، مزدور وغیرہ سب سے ممکن ہے۔ گو اس مقصد کی سعی میں بالکل قلیل حصہ لیا جائے لیکن اس کو واجب العمل بنایا جا سکتا ہے۔ مقصد ہی ایسی چیز ہے جس کے لیے ہم ذمہ دار ہیں اور جس کی بدولت ہم اپنے چھوٹے سے چھوٹے کام کو اہمیت دے سکتے اور اپنی بے اثر کوششوں کو انمول بنا سکتے ہیں۔

ہم کو چاہیئے کہ اپنی مصروفیتوں پر وقتاً فوقتاً نظر ڈالتے رہیں اور دیکھیں کہ یہ مقصد ہماری مصروفیتوں میں کس قدر حصہ لے رہا ہے۔ کیا وہ کام جو ہم کر رہے ہیں اور وہ زندگی جو ہم کر رہے ہیں انسانی زندگی کے اعلیٰ نظام کی طرف لیجا رہی ہے اور آیا ہمارے کام اور ہماری زندگی پر سب لوگ عمل پیرا ہوں تو زندگی کا اعلیٰ نظام ممکن الحصول ہے۔ تاجر خود سے سوال کرے کہ تجارت کے اصول کیا ہیں اور اگر یہ اصول وہ نہیں ہیں جو ہونے چاہیئیں۔ تو کیا وہ ان اصول کو نہ بدل کر ان کو قائم رکھنے کی کوشش کر رہا ہے یا بدلنے کی کوشش میں ہے۔ وکیل اور ڈاکٹر اپنے پیشوں کے متعلق خود سے سوال کریں کہ اعلیٰ مقصد ان کو برائیوں سے بچا کر ان کے پیشوں کو ہر ممکن طریقہ سے اعلیٰ وارفع بنانے میں مدد دے رہا ہے یا نہیں۔ ماں خود سے سوال کرے کہ آیا وہ اپنے بچے کی تربیت اس طریقے پر کر رہی ہے کہ وہ دنیا میں بڑا ہو کر ایک نئی ہستی ہوگا یا یہ کہ قدیم رسم و رواج منافرت اور ریاکاریوں میں حصہ لے گا۔ بچہ بھی وفاداری اور بہادری کے کارناموں سے سبق حاصل کرے اور خود سے سوال کرے کہ کیا وہ بھی کوئی نئی بات پیدا کر سکتا اور کیا مصیبت اور اہل دنیا کی تحقیر پر صبر سے کام لے سکتا ہے۔ مزدور خود سے سوال کرے کہ اس کی اصل غرض کیا ہے اور اگر اس غرض پر عام طور پر عمل پیرا ہو جائیں تو کیا زندگی کا اعلیٰ نظام حاصل ہو سکتا ہے۔ کیا وہ صرف اجرت کی خاطر کام کر رہا ہے یا یہ کہ اس کو اپنے بے لاگ باضابطہ کام سے دلچسپی ہے اس کا حرفتی دنیا کی تبدیلیوں بلکہ تبدیلیوں سے بھی بڑھکر انقلابات کا مطالبہ محض انصاف کے خیال پر مبنی ہے۔ یا انتقام و حسد کی خاطر بے روزگار مزدور

بھی اس مقصد سے آپ کو باہر نہیں کرسکتا۔ کڑی سے کڑی مصیبت میں بھی وہ صبر سے کام لے کر آپ کو ارتکاب جرم سے باز رکھ سکتا ہے۔ گو لوگ اس کی توہین و حقارت کریں وہ ان کی توہین و حقارت نہ کرے اور دوسروں کے ساتھ کسی قسم کا برا سلوک کرنے پر موت کو ترجیح دے۔ ہر جگہ اور ہر شخص کے لئے یہ مقصد کارآمد ہے بڑوں کو یہ انکسار کا سبق دیتا ہے تو چھوٹوں کو حصول عزت کا۔ اور ان دوسرے مقاصد جو بالکل گرے ہوئے ہیں اور جن پر آسانی سے کاربند ہو سکتے ہیں بلند تر ہے۔ اگر لوگوں کا مقصد زندگی صرف یہ ہوتا ہے کہ بیوی بچوں کے واسطے کمائیں۔ تو اس مقصد میں انسانیت نہیں ہے حیوانوں کا بھی یہی مقصد ہے۔ آدمی صاحب عقل صاحب شعور اور صاحب اخلاق ہے اور انصاف کی عملداری کے لئے کوشاں لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ وہ بعض اوقات اپنے اعزاز و مرتبہ کو بھول جائے مساعی سے منہ پھیر لے ضمیر کو بدل ڈالے بلند خیال سے ہاتھ دھو بیٹھے اور اعلیٰ و ارفع فہم و ادراک کو صرف اپنے لئے کما لینے پر محدود کرے۔ اور اس نفس پروری میں اور شقاوت سے بیوی بچوں کا بھی لحاظ نہ کرے۔ اے دوست تو اپنے خیالات کو اس قعر مذلت سے نکال اور سوچ تو سہی کہ تو کیا ہے۔ اپنے دل اپنے خیال اور اپنے ضمیر کو بلند مقصد سے منور کر کہ باوجود قارون کا خزانہ جمع کرنے کے تو خود کو تباہ کر رہا ہے۔ اور بجائے بلندی کی طرف جانے کے پستی کی طرف جا رہا ہے ہمیشہ جوان رہنے کے بیر فرتوت بن رہا ہے۔ اور اپنی زندگی کو سود و زیاں کی حد تک محدود کیے ہوئے ہے جبکہ وہ بلند کام اور نیک امور کی بجا آوری میں صرف کیجا سکتی ہے۔

قدیم مذہب کا ایک لطیف جملہ ہے "تو پھر پیدا ہوگا" یہ مذہبی عقیدہ جو اس جملہ سے اخذ کیا گیا ہے بے معنی اور عجیب و غریب نہیں بلکہ اس کے اندر ایک بڑی سچائی مضمر ہے اس جملہ سے مقصد اعمال کی اصلاح نہیں اور نہ فلاں فلاں عادت کا اختیار کرنا اور نہ کوئی ظاہری تبدیلی ہے بلکہ زندگی کے سرچشموں کی جدید قوت ہے۔ نئے اور جدید ارادے کی فتح خیالات کی تبدیلی اور جدید عزم کا انقلاب ہے۔ اس عزم سے ہمارے جملہ فرائض قدم آگے بڑھاتے ہیں۔ یہاں قدیم مذہب سے تفاوت صرف اس قدر ہے کہ قدیم مذہب کی رو سے یہ عزم خدا کی دین ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ عزم ہمیں خود کرنا چاہیئے۔ ہم اس کے لیے رکوع و سجود نہیں اختیار کرتے بلکہ ہم کمر باندھتے اور عزم بالجزم کرتے ہیں۔ گو ہماری پرانی فطرت جو ہم میں ودیعت ہے فوراً آمادہ ہو اور ہماری قدیم خامیاں اور قدیم عادات مورچہ نہ چھوڑیں لیکن بتدریج ہم اپنی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اس قادر مطلق سے جس کا تسلط تمام دنیا پر ہے اور جو

انسان کی مدد کرتا ہے ہمارا تعلق صرف اس عقیدہ کی حد تک ہے کہ وہ ہمارے اوپر نیچے آگے پیچھے سب طرف سے ہے اور اپنی قوت ہم کو دے رہا ہے۔ ہم اپنے امکان کی حد تک جو چاہیں خود ذات سے کر سکتے ہیں ہماری زندگی کا اہم ترین مقصد یہی نہیں بلکہ ہمارے افعال میں ہماری نیت بھی ہمارے تابع ہے۔ اور اس کی اصلاح کے ہم ذمہ دار ہیں۔ یہاں اس اخلاقیات کو جس کی بنا محض افعال کے نتائج پر قایم کی جاتی ہے ناکامی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ایک کام کے نتائج ایک ہی ہوں لیکن کبھی اس میں اخلاقی خوبی پنہاں رہتی ہے کبھی نہیں۔ ایک غریب آدمی کو اگر ایک ڈالر دیا جائے تو وہ اس کے آذوقہ کے لئے کام آئے گا خواہ وہ ڈالر محض اس کو ٹالنے کے لئے دیا جائے یا اس کی ہمدردی کی غرض سے اگر ٹالنے کے لئے دیا گیا ہے تو اس میں اخلاقی خوبی کہاں۔ یہ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ہماری اخلاقی خوبی کہاں۔ یہ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ہماری اخلاقی خوبی سوائے ہمارے تمام دنیا سے پوشیدہ رہی ہے لیکن اس کا اثر ہمارے تمام خیالات پر پڑتا ہے۔ نظریۂ اخلاقیات میں میں نتائج کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتا۔ ہمارے افعال محض ظاہری اخلاق کی حد تک نہیں بلکہ ان میں نیت بھی راست رہنی چاہیے کیونکہ راستی اور عدم راستی سے افعال کے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ ایک کام راست وہ ہے جو بنی انسان کے لئے مفید ہو اور جس کے نتائج عملی طور پر فایدہ مند ہوں۔ اخلاقی خوبی کا کام وہ ہے جس میں نیت بھی بنی انسان کی بھلائی کی رہے۔ خالی راستی پر رہنا کافی نہیں بلکہ ہماری نیت بھی راست رہنی چاہیئے۔ اور اسی پر ہمارے اخلاق کا دارومدار ہے۔ انسان کی اصلی زندگی نمایشی نہیں بلکہ پوشیدہ ہے جو کچھ ہم ظاہر میں دیکھتے ہیں وہ نتائج ہوتے ہیں۔ اصل اسباب ہم سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ دنیا ظاہر کو دیکھتی اور اس پر مطمئن ہو جاتی ہے اور ہم خود بھی دنیا کے معیار کو آسانی کے ساتھ قبول کرنا چاہتے ہیں لیکن جب حقیقت پر غور کرتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا معیار سطحی ہے۔ گو ہمارے ناپاک خیالات، ہمارے عداوات، رشک وحسد، کم ظرفی، تنگ خیالی وغیرہ سے کوئی نہیں واقف ہوتا لیکن دراصل یہی خرابی کا باعث ہیں۔ ہاں دل اور باطن پاک رہے۔ اور ہم اپنی نظر میں ایسے ہی پاک باطن نظر آئیں جیسے ہم دنیا کو بتانا چاہتے ہیں۔ خود غرضی ہم سے دور اور دنیا کی محبت دل میں معمور ہو۔ اور اگر ہم دوسروں کے ساتھ سختی سے پیش آئیں تو یہ غصہ کی بنا پر ہو۔ اگر وہ ہم سے برائی کریں تو ہم کو ان سے عداوت نہ رہے اور اگر وہ ہم کو ستائیں تو ہم انہیں پلٹ کر نہ ستائیں۔ ہر شخص کو چاہیئے کہ سب سے بڑھکر احتیاط و نگرانی اپنی ذات کی کرے کیونکہ کسی کے دل کے اندر کوئی دیکھنے نہیں آتا۔ میرا خیال ہے کہ ہر شخص صبح اٹھ کر کہے "آج میرا دل

نیک خیالات کا خیر مقدم کرتا ہے ۔ میرا ہر کام انہیں کی اتباع میں ہوگا ۔ میں عداوت، حسد، مکروفریب اور حرص کو اپنے سے دور کرتا ہوں ۔ کوئی لفظ میری زبان سے ایسا نہ نکلے گا اور کوئی کام میں ایسا نہ کروں گا جس کی صداقت، محبت اور عزت اجازت نہ دے ۔ "بہ نسبت نیت کے افعال پر ہم آسانی کے ساتھ قابو پا سکتے ہیں ۔ ایک نادرست خیال کو دماغ میں آتے ہی فوراً دور کرنے اور ایک ناپاک ارادہ کو فوری دبانے کے لئے بڑی جدوجہد احتیاط اور مشق کی ضرورت ہے ۔ اور جب تک کہ ارادہ قوی اور طبیعت پر قابو نہ ہو یہ ممکن نہیں لیکن یہ ہمارا فرض ہونا چاہیئے اور یہ یاد رہے کہ آسانی کے ساتھ غلبہ حاصل کرنا بڑی بات نہیں ۔ عاجز ہو کر زبردست کا مقابلہ کرنا اور پیہم شکست کھا کر ہمت نہ ہارنا یہ مردانگی کا شیوہ ہے ۔ گو جسم کمزور اور دل ناتوان ہے لیکن ارادہ قوی ہے تو یہ عالی ہمتی ہے اور ایسی لڑائی پر ملائک خود حیرت اور تعجب کریں تو جائے تعجب نہیں ۔ ہیسیاڈ کہتا ہے کہ نیکی کے مندر کے سامنے امٹ دیوتاؤں نے مشقت کو کھڑا کر دیا ہے اور صفت کا راستہ بہت دشوار اور لمبا رکھا ۔ دنیا میں کوئی اچھی چیز ایسی نہیں جو مانگتے ہی مل جائے ۔ ہمارا وجود شاہد ہے کہ ہم ناکمل بنائے گئے ۔ تکمیل ہمارے ہاتھ ہے ۔

یہ خالی از تعجب نہیں کہ ماضی کی ہر مذہبی تحریک ذاتی راستبازی کے ایک نئے خیال کو اپنی آغوش میں لیئے ہوئے ہے ۔ چنانچہ قدیم عبرانیوں میں اصل مذہب وجود میں آیا تو ان کے پیامبر کی دعا یہ تھی ۔ مجھے ایک صاف دل عطا کیجیو اور مجھے راستی کی طرف ہدایت کیجیو ۔ عیسٰی کی دعا اپنے زمانے کے دیگر مذاہب سے مقابلے میں اور زیادہ درستی کے لئے تھی ۔ لوتھر نے جب آپ کو مذہب ماضی کی جکڑ بندیوں سے آزاد کیا اور ضمیر کو شمع ہدایت بنایا تو اس کا مطمح نظر یہ تھا کہ نیک کام بھی بد ہو جاتا ہے اگر نیت بری رہے تو آج حریت سے ایک مذہب کی ابتدا ہونے کے امکان میں مجھے شک صرف اس وجہ سے ہے کہ فرقۂ احرار کی توجہ انسانی حقوق پر ہے ۔ انسانی فرائض پر نہیں ۔ سوسائٹی کی اصلاح اس کے پیش نظر ہے ۔ اپنی اصلاح پیش نظر نہیں ایمرسن کا یہ قول وہ بھولے ہوئے ہے کہ سوسائٹی کی اصلاح اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہر متنفس خود اپنی اصلاح نہ کرے ۔ جان سی لرنڈ کہتا ہے کہ وہ لوگ جو خود غلطی پر ہیں برائیوں کی اصلاح نہیں کر سکتے ہمیں چاہیئے کہ آپ کو سدھاریں ۔ دنیا پر نظر نہ کریں بلکہ خود سے سوال کریں کہ ہم کیسے ہیں ۔ اور اگر ہم سیہ کار ناپاک حاسد، تنگ حوصلہ، غیر متحمل، دوسروں کی کمزوریوں سے فایدہ اٹھانے والے ہیں تو دنیا کی اصلاح کو چھوڑ کر پہلے اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں ۔

لیکن زندگی عمل ہی عمل اور فریضہ کی جدوجہد کا نام نہیں بسا اوقات صبر و تحمل اور شکیبائی میں جدوجہد ہے

ہم کو شدید معرکہ آرائیاں اپنی بے صبری اور ان مصائب سے کرنی پڑتی ہیں جنہیں ہم سمجھتے ہیں کہ ہم برداشت نہیں کر سکتے ۔ اکثر ان مصائب میں ہم تنہا ہوتے ہیں ۔ ہمارا ہمدم و غمخوار کوئی نہیں ہوتا ۔ اور ہم ان کے متعلق کسی کو کہہ بھی نہیں سکتے ۔

میرا خیال ہے کہ زندگی میں ہم پر جو کچھ بیتا پڑتی ہے وہ ہماری برداشت سے زیادہ نہیں ہوتی ۔ بظاہر ہمیں مصیبت زیادہ معلوم ہوتی ہے لیکن ہم اسے برداشت کر سکتے ہیں ۔ گو ہمیشہ صحت و تندرستی ہمارے بس کی نہیں لیکن طبیعت ہمارے بس کی ہے ۔ ہم دوستوں کی وفات کا غم سہہ سکتے ہیں ۔ ہم ان کی بے وفائی اور احسان فراموشی برداشت کر سکتے ہیں ۔ اور اگر ہماری امیدیں بر نہ آئیں ۔ تو اس کو بھی ہم بغیر تلخی اور ترشروئی کے فراخ حوصلگی کے ساتھ سہہ سکتے ہیں ۔ ہمارے وجود کی علت غائی ان چیزوں میں نہیں جو ہم سے جدا کرلی جائیں ۔ خوشحالی میں یہ مضمر نہیں اور نہ دوستوں کی صحبت ، اعزاز منزلت اور گھر دار کے تعلقات میں اس کی بجا آوری لازمی ہے ۔ یہ وہ چیز ہے کہ مصیبتوں کے باوجود بھی اس کی تکمیل کی جا سکتی ہے ۔

اے انسان ۔ تیری قابلیت تیرے اندر پوشیدہ ہے ۔ ہاں تیرے صابر نفس تیرے مصمم ارادے اور تیرے اس کام کو پامردی و ایمانداری کے ساتھ بجالانے میں جو تجھے دیا گیا ہے خواہ اس کی بجا آوری میں تجھ کو رنج اور مصیبتوں سے سابقہ پڑے یا مسرت و راحت سے بس یہی ہمارا میدان عمل ہے ۔ سقراط سے بڑھکر ہم نہیں چاہتے کہ ہمارا مدعا کیا ہونا چاہیئے ۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہمارے لئے بہترین کیا چیز ہے ہم نہیں جانتے کہ وہ کونسی شئے ہے جو اوصاف الوہیت کو باہر لا سکتی ہے ۔ غریب گارفیلڈ کا قول ہے کہ کامل صحت اور کامل حسن مل کر نہیں رہتے ۔ اور جیسا کہ جزر سے ساحل کی اصلی علامات اور سمندر کے دامن کا حال معلوم ہوتا ہے ویسا ہی دکھ بیماری اور کمزوری میں انسان کے اصلی کیرکٹر کا پتہ چلتا ہے ۔ میتھو آرنلڈ اپنے ایک دوست کے متعلق لکھتا ہے :-

اس کا جسم کمزور تھا ۔ اور اس کی طبیعت پست ۔ میں نے اس کے لئے صحت ، کامیابی اور شہرت کی دعا کی لیکن میں اب نہیں چاہتا ۔ کیونکہ یہ خود آپ اپنا صلہ ہیں اور ان سے نیکی کی توقع نہیں ۔ یہ ہم کو آزماتے اور ہم میں شقاوت پیدا کر دیتے اور ہماری حیا اور صاف طینتی اور نرم دلی کو کم کر دیتے ہیں ۔ ایمرسن تو یہاں تک کہتا ہے "مصیبت نام ہے بڑے آدمیوں کی ترقی کا" اور اگر یہ بات ہم پر شاق گزرتی ہے تو ہم کسی حوصلہ مند مرد یا عورت کو جوانمردی اور صبر کے ساتھ مصیبتوں کا مقابلہ کرتے دیکھیں پھر اس کو شاق محسوس نہیں کریں گے ۔ اے دوست اگر تو پریشانی میں ہے اور زمانہ تیرا مساعد نہیں ۔ اور تیرا مدعا تجھ سے دور ہے

تو ناامید نہ ہوجیو۔ اور یہ باور نہ کرلیجو کہ تو قسمت کے راستے پر نہیں اور دنیا نے تیرے لئے کوئی راستہ چلنے کے لئے نہیں بنایا۔ پیشتر سے بنایا ہوا راستہ ادائی فریضہ کا تیرے لئے موجود ہے۔ گو جد و جہد کی ضرورت اس میں نہ ہو بلکہ تیری برداشت کا امتحان ہو تو اپنی انتہائی پامردی سے برداشت کے جوہر دکھا۔ اس وقت تجھ سے بڑھکر فریضہ کی ادائی میں مرد میدان کوئی نہ ہوگا۔

(باقی)

لا الیٰ ھؤلاء و لا الیٰ ھؤلاء

از

حضرت امجد حیدر آبادی

کامل نہ جہالت ہے، نہ آگاہی ہے
سودا ہے گدائی، نہ سر شاہی ہے
سر ڈھانکتا ہوں، تو پاؤں کھل جاتے ہیں
کیا جامۂ زندگی کی کوتاہی ہے
یہ نقشِ حیات، موت سے بدتر ہے
ہر سانس میں اک چھپا ہوا خنجر ہے

رباعی

سانچے میں اجل کے ہر گھڑی ڈھلتی ہے
دن رات، یہ شمع زندگی جلتی ہے
ہے وجہ حیات، آمد و رفت نفس
یا عمر کے حلق پر چھری چلتی ہے؟

عارف کو قدم قدم پہ حیرانی ہے
کیا مقصد زندگی پریشانی ہے
کس سے کہوں، آہ کیا پریشانی ہے
اس راہ میں عقل بھی تو دیوانی ہے
ہر شام عبث تھی، ہر سحر لاحاصل
ہر کسب فضول، ہر ہنر لاحاصل
افسوس کہ زندگی کا حاصل نہ ملا
زندہ رہے عمر بھر، مگر لاحاصل

ہر وقت دل ستم زدہ طوف میں ہے
اک پاؤں اُمید میں ہے، اک خوف میں ہے
ہم ٹوٹ ہی سکتے ہیں، نہ جڑ سکتے ہیں
گڑ سکتے ہیں قبر میں، نہ اُڑ سکتے ہیں
اس دو عملی میں زندگانی ہے تباہ
لب پر کبھی لا الٰہ، کبھی الا اللہ
منزل ہی نہیں یہاں اقامت کے لئے
بستر ہی نہیں ہے، خواب راحت کے لئے
کہتا ہے ہر اک مقام، آگے بڑھئے
کیجئے نہ کہیں قیام، آگے بڑھئے

رباعی

حاصل نہیں جس کا، وہ تگ و تاز ہے یہ
کھلتا نہیں، کھل کربھی، عجب راز ہے یہ
ملتا نہیں کوئی انتہائی نقطہ
کہتا ہے ہر انجام، کہ آغاز ہے یہ

رباعی

ہر محفل سے بحال خستہ نکلا
ہر بزم طرب سے دل شکستہ نکلا
منزل ہی نہیں، کوئی مسافر کے لئے
سمجھا تھا جسے مقام، رستہ نکلا
ایتھر کی طرح، فضا میں آوارہ ہوں
ضدی بچے کا گویا گہوارہ ہوں

ہر آن چلا جاتا ہے ہنستا رونا
ممکن ہی نہیں ہے ایک کروٹ سونا
معجون سرور و دردمندی ہوں میں
مجموعۂ پستی و بلندی ہوں میں
بیداری و خواب میں مذبذب ہوں میں
موت اور حیات سے مرکب ہوں میں
گاہے در صحو، گہہ مستی ہستم
گہہ رو بعلو، گاہ بہ پستی ہستم
یک پا بہ سقر دارم و یک پا بہ بہشت
من خیر بہ شر عجیب ہستی ہستم

منزل نہیں معلوم، مگر چلتا ہوں
قالب کی خبر نہیں، مگر ڈھلتا ہوں
دل، سینے میں بے سبب دہل جاتا ہے
چپکے سے کلیجہ کوئی مل جاتا ہے
ہر دم، کروٹ دل بتاں لیتا ہے
یہ کون، جگر میں چٹکیاں لیتا ہے

رباعی

سوتا ہوں، تو چپکے سے جگا دیتا ہے
جب جاگ اٹھتا ہوں، پھر سلا دیتا ہے
ہنستے کو رلا دیتا ہے، چٹکی لیکر
روتا ہوں، تو پھر ہنس کے، ہنسا دیتا ہے

رباعی

اس کی میری موافقت مشکل ہے
عبد اور رب میں مناسبت مشکل ہے
ہے جس کا کمال، کُلَّ یومٍ فی شان
ایسے مالک کی عبدیت مشکل ہے

رباعی

شکوہ اس کے غضب کا کرتا بھی ہوں
ہر سانس میں پھر دم اس کا بھرتا بھی ہوں
مالک میں مرے، مہر بھی ہے قہر بھی ہے
مرتا بھی ہوں اس پہ، اس سے ڈرتا بھی ہوں

مذاق کی قیمت

از

جناب محمد باقر صاحب کرمانی متعلم نظام کالج

یوسف محکمہ تفتیش کا ایک زبردست سراغ رساں تھا۔ دس سال ہوئے اس نے دفعتہً ملازمت ترک کردی تھی۔ اور اپنے پیشے سے ہمیشہ کے لئے ہاتھ اٹھا لیا تھا پبلک کو اس کا بہت افسوس ہوا اور حقیقت بھی یہ ہے کہ یوسف جیسے سراغرساں کی کمی قابل تاسف ضرور تھی۔ تین چار سال سے محمد عالم سے اس کی دوستی ہوگئی اور اب وہ ایک دوسرے کے دلی دوست اور دلی ہمدرد تھے۔

"بھائی یوسف" محمد عالم نے کہا "تمہارا ملازمت سے یکایک علٰحدہ ہوجانا ایک ایسا مسئلہ ہے جو اب تک میری سمجھ میں نہیں آیا اور میری ہی سمجھ پر کیا موقوف ہے ہر ایک کو پریشان کر رکھا ہے۔"

"عالم۔ تمہارا یہ سوال" یوسف نے کہا "زمانہ گذشتہ کی دل دکھا دینے والی یاد کو تازہ کردیتا ہے۔"

"تم ہمیشہ یہی کہہ کر ٹال دیا کرتے ہو" عالم نے اصرار کرتے ہوئے کہا "مگر آج تمہیں ضرور بتانا ہوگا"

"تم کیوں اصرار کرتے ہو" یوسف نے کہا "اس کا سبب ایسا ہے کہ اس کے سننے سے تمہارا دل دہل جائے گا"

"نہیں نہیں۔ تم ضرور بیان کرو" عالم نے کہا۔

"اچھا! جب تم اس قدر مصر ہو تو خیر میں اس خون چکاں داستان کو بیان کئے دیتا ہوں" یوسف نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"گو آج تک میں نے اس واقعہ کا کسی سے ذکر نہ کیا تھا مگر چونکہ مجھے تم پر کامل بھروسہ ہے اس لئے کہے دیتا ہوں سنو۔"

"میں جب کالج میں تعلیم پا رہا تھا" یوسف نے کہنا شروع کیا "میرے دو ہم جماعت تھے۔ نیاز اور بشیر۔ ہم تینوں میں بہت گہری دوستی تھی۔ ہم مڈل اسکول سے باہم پڑھتے آرہے تھے۔ ہماری دوستی ضرب المثل ہوگئی تھی۔ اور لڑکے ہم کو حسد کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ کالج کا زمانہ یوں توں کرکے گذر گیا جب ہم نے

عملی دنیا میں قدم رکھا اور معاش کی فکر دامنگیر ہوئی تو بشیر اور میں یہیں ملازم ہو گئے۔ مگر افسوس کہ نیاز کو کوئی ملازمت نہیں ملی اور وہ مجبوراً ہم سے جدا ہو کر لکھنؤ روانہ ہو گیا۔ اس کو کئی سال گذر گئے۔ چونکہ مجھے سراغرسانی کا بہت شوق تھا میں نے جاسوسی کا پیشہ اختیار کر لیا اور بشیر ایک دفتر میں ملازم ہو گیا۔ ایک دن میں مکان پر تھا کہ مجھے ایک خط ملا۔ یہ خط اسی زمانے کے میرے بچھڑے ہوئے دوست نیاز کا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ وہ اب لاہور لوٹ آیا ہے بشیر اور مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔

یوسف نے جیب سے دو سگار نکالے ایک عالم کو دیا اور دوسرا خود سلگا کر دو تین کش لئے اور پھر کہنا شروع کیا۔

"میں اس خط کو دیکھ کر پھولا نہ سماتا تھا۔ بچپن کا ساتھی دلی دوست اور پھر ایک زمانہ کا بچھڑا ہوا لوٹ آیا تھا بہر حال میں اسی وقت بشیر کے مکان پہنچا۔ بشیر کو بھی ایک خط اسی مضمون کا وصول ہوا تھا۔ ہم دونوں خوش خوش اس کے خود نوشت پتہ پر روانہ ہو گئے۔ یہ مکان شہر سے بالکل علیحدہ تھا۔ آبادی سے دور ایک مقام پر اس نے ایک عالی شان مکان کرایہ پر لے رکھا تھا۔ مکان نہایت وسیع تھا۔ ملازم بھی کئی تھے۔ آخرکار ہم نے خبر دی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ باہر آیا اور ہم سے گلے ملا۔ گو وہ مجھ سے چھوٹا تھا مگر اب وہ مجھ سے زیادہ ضعیف معلوم ہو رہا تھا۔ ہم میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے واقعات بیان کئے۔ نیاز نے کہا کہ وہ یہاں سے لکھنؤ روانہ ہوا تھا۔ وہاں پر اس نے ایک کان میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس نے اپنی دیانت داری اور سچائی سے اس کان کے مالک کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ رفتہ رفتہ ترقی کر کے دو کان کا منیجر بن گیا۔ اتفاق سے تھوڑے ہی دنوں بعد کان کا مالک انتقال کر گیا اور وہ خود اس کان کا مالک ہو گیا۔ اس نے وہاں پر شادی کی تھی مگر اس کی بی بی بہت جلد مر گئی کوئی اولاد نہ تھی اس کے بعد اس نے اور شادی نہ کی۔ اب وہ بہت بڑا مالدار آدمی تھا۔ کان کو ایک منیجر کے حوالے کر کے وہ یہاں چلا آیا تھا اور اپنے زندگی کے دن آرام و راحت میں بسر کرنے لگا۔"

یوسف اتنا کہہ کر رک گیا۔ اُس کی آواز بھر آئی تھی۔ اس نے ایک سرد آہ بھری اور پھر کہنا شروع کیا:

"بشیر اور میں اکثر اوقات سارا سارا دن اس کے پاس گذار دیتے تھے۔ مجھے گو فرصت ملتی ہی بہت کم تھی مگر پھر بھی فرصت کا زیادہ وقت اس کے مکان پر گذرتا تھا۔ ایک دن اس نے ایک واقعہ بیان کیا جب نیاز نے شروع شروع ترقی کر کے زینے چڑھنے رہا تھا تو اس کی اور اس کے ایک اعلیٰ بالا دست عہدہ دار کی ان بن ہو گئی۔ اُس نے چاہا کہ نیاز کو علیحدہ کر دے مگر مالک کی نظر عنایت اس کے شاملِ حال تھی،

کچھ نہ کر سکا جب نیاز منیجر بنا تو اس نے اپنا بدلہ لینا چاہا۔ اور موقع پا کر اس کو پولیس کے ہاتھوں پھنسا دیا جب وہ قید سے چھوٹا تو وہ بھی موقع کا منتظر تھا۔ ایک مرتبہ نیاز کو تنہا پا کر اس نے حملہ کر دیا مگر نیاز بال بال بچ گیا اور اتفاق سے ایک پولیس انسپکٹر اس طرف آنکلا اور اس نے حملہ آور کو گرفتار کر لیا چونکہ وہ ایک مشہور آدمی تھا لہذا اس کے لئے دوبارہ تین سال کی قید بامشقت تجویز کی گئی اور وہ قید کر دیا گیا۔ اگرچہ اس واقعہ کو آج چار سال ہو چکے تھے مگر اب بھی نیاز اس کے نام سے کانپنے لگتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اگر وہ چھوٹ جائے اور اس کو پالے تو پھر اس کو زندہ نہ چھوڑوں گا۔ اکثر جب کبھی اس کا نام لیا جاتا تو نیاز کے حواس باختہ ہو جاتے اور رنگ زرد ہو جاتا۔" یوسف دم لینے کے لئے رک گیا۔ پھر اپنی تقریر کو یوں جاری کیا :

زمانہ گزرتا گیا اور ہم ہنسی خوشی سے رہا کرتے تھے۔ صرف اس کا ہی ایک ایسا خیال تھا جو نیاز کو پریشان کرتا تھا۔ ہم اس شخص کے نام سے خوف زدہ ہوتے چلے تھے۔ ہم نے عبدالقادر کو جو ہمارا دوست تھا نیاز کا معتمد بنا دیا۔ ایک صبح میں اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ ملازمہ نے ایک خط لاکر نیاز کے حوالے کیا۔ میں نے دیکھا لفافہ کے ایک سرے پر "اشد ضروری" لکھا تھا۔ نیاز تھوڑی دیر خط کو گھورتا رہا خطوط اس کے پاس بہت کم آیا کرتے تھے۔ اس نے جلد جلد لفافہ چاک کیا اور خط پڑھنا شروع کیا۔ میں اس کے چہرہ کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے جیسے وہ خط پڑھتا جا رہا تھا ویسے ویسے اس کا چہرہ زرد ہوتا جا رہا تھا۔ میں خاموش اس کے چہرے کو ٹکٹکی باندھے بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ آخر کار اس نے رومال سے پسینہ پونچا اور تھرتھراتے ہوئے ہاتھ سے خط کو میری طرف بڑھا دیا اور اس کی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے۔

اعظم . . . . . . کے پاس سے۔ نہیں! ناممکن ہے وہ اب تک مر چکا ہوگا۔ اف وہ زندہ ہے۔ وہ ضرور اب انتقام لے گا . . . . اور شریر . . . . بدمعاش . . . . "

میں نے خط پڑھا۔ مضمون یہ تھا :

"تم نے میری جان لینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اب میری باری ہے۔ میں نے تمہاری تلاش میں ساری دنیا کی خاک چھانی۔ آہاہ۔ اب تم مل گئے۔ ایک مدت سے انتقام کی آگ میرے سینے میں مشتعل تھی۔ اب اس کے ٹھنڈا کرنے کا موقع ہاتھ آیا۔ کل رات کے . . . . . . دس بجے . . . . . . تم . . . . . . مار ڈالے جاؤ گے۔ کیسی ہی کوشش کرو مگر اب میرے پنجے سے چھوٹ نہیں سکتے۔ خوب جان لو کہ فیصلہ اٹل ہے۔" "اعظم"

یہ وہی نام تھا جس سے نیاز کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے تھے اور روح فنا ہوجاتی تھی۔ میں نے خط کو میز پر رکھدیا۔ نیاز مٹھیاں کسے کمرہ میں ٹہل رہا تھا۔ سر نیچے کی طرف جھکا ہوا اور چہرے سے پریشانی اور اضطراب کے آثار نمایاں تھے۔ میں نے آخر اس کو دلاسا دینے کے لئے کہا:

"ممکن ہے کہ یہ صرف ایک دھمکی ہو اور سرمایہ دار حقیقت نہ ہو" مگر اس نے سر ہلایا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کو پورا یقین تھا کہ وہ دھن کا پکا اور بات کا دھنی ہے۔

یوسف دم لینے کے لئے رک گیا۔ دو تین گھونٹ پانی کے پیئے پھر اپنی تقریر کا سلسلہ یوں شروع کیا (عالم خاموش بیٹھا اس داستان کو سن رہا تھا)

"اس وقت وہ بےخودی کی حالت میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ اس کی زبان سے یہ الفاظ نکل رہے تھے خیر تم نے جو کچھ میرے ساتھ کیا وہ ضرور رنگ لائے گا۔ میں ایک نہ ایک دن اس کا بدلہ لونگا۔ ہاں میں خاموش رہنے والا آدمی نہیں ہوں۔ میں اس کا بدلہ لونگا اور ضرور لونگا۔

میں سمجھ گیا کہ یہ اسی کے الفاظ تھے جو وہ پریشانی کی حالت میں دہرا رہا تھا۔ میں نے اسے تسلی اور تشفی دی اور کہا کہ اس کا سب کچھ انتظام ہوجائے گا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں"۔

مجھے اس وقت ایک ضروری کام پر جانا تھا اس لئے میں نیاز سے شام میں ملنے کا وعدہ کرکے روانہ ہوگیا۔ اس کا چہرہ بالکل اداس تھا اور ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

میں شام میں بشیر کے ساتھ نیاز کے مکان پہنچا۔ نیاز کے معتمد عبدالقادر سے ملاقات ہوئی۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ نیاز سارا دن گھر سے باہر نہیں گیا۔ مغموم اور محزون کمرے میں پڑا ہوا تھا۔ ہم اس کمرے میں داخل ہوئے۔ میز کے قریب ایک آرام کرسی پر بیٹھے وہ اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوا تھا ہم نے بہت کچھ تسلی اور تشفی دی۔ کھانا بھی ہم نے اسی کے ساتھ کھایا۔ اس کی خوابگاہ میں بیٹھے باتوں میں مصروف تھے کہ گھڑی نے دس بجائے۔ نیاز اس آواز سے چونک اٹھا اور اس کی زبان سے یہ الفاظ بیساختہ نکل گئے

"اُف میری زندگی کے اور صرف چوبیس گھنٹے باقی رہ گئے" ابھی ہم کچھ کہنے نہ پائے تھے کہ وہی ملازمہ پھر داخل ہوئی اور اس بے وقت آنے کی معافی چاہتے ہوئے ایک خط نیاز کی طرف بڑھادیا۔ نیاز نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے خط کھولا جلد جلد اس کو پڑھنے لگا۔ اس وقت اس کے

چہرے پر مردنی کے آثار ظاہر تھے۔ خط اسی شخص نے دوبارہ لکھا تھا۔ مضمون یہ تھا:

میں نے تمہیں دوبارہ یاد دلانا مناسب جانا۔ کل ..... رات کے ..... دس بجے ..... تم ..... مار ڈالے جاؤ گے۔"

"اعظم"

نیاز کرسی پر آگے کی طرف جھک گیا۔ دونوں ہاتھوں پر سر رکھ کر غرق خیالات ہو گیا۔

"یہ خط اس وقت کون لے آیا؟" میں نے ملازمہ سے پوچھا۔

"ایک لڑکا ہے اور میں نے اس کو روک رکھا ہے" ملازمہ نے کہا:

"اچھا تو اس کو یہاں بلاؤ" میں نے ملازمہ سے کہا:

"لڑکے سے میں نے خط کے بارے میں چند سوالات کئے۔ مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اس کو کسی نقاب پوش نے خط دیا تھا اور یہاں پہنچانے کے لئے آٹھ آنے انعام دیئے تھے۔ ہم نے اس کو بہت کچھ تسلی دی اور کل شام ہی سے اس کے پاس آنے کا وعدہ کر کے روانہ ہو گئے۔ نیاز نے مجھ سے مدد مانگی چونکہ وہ چند وجوہ سے اس واقعہ کی پولیس کو اطلاع نہیں دے سکتا تھا۔ لہذا اس نے مجھ سے خواہش کی کہ میں اس آڑے وقت میں اس کے ضرور کام آؤں۔ دوسرے دن شام کے چھ بجے میں اپنے کام سے فارغ ہو کر سیدھا اس کے مکان روانہ ہوا۔ جب میں اس کے کمرہ میں داخل ہوا تو نیاز اور اس کا معتمد بیٹھے ہوئے تھے۔ کمرہ میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ جب میں ان کے قریب گیا تو سامنے کی میز پر ایک خط رکھا ہوا تھا۔ اس کے اطراف سیاہ خط کھینچے ہوئے تھے۔ نیاز نے خط کی طرف اشارہ کیا اور میں نے اس کو کھولا۔ ایک کاغذ کے پرزے پر یہ الفاظ تھے:

آج ..... دس بجے رات"

"مجھے ابھی ابھی وصول ہوا ہے" نیاز نے کہا جب میں نے خط بند کر کے میز پر رکھ دیا۔

"نہیں کوئی بات نہیں" میں نے اطمینان بخش لہجہ میں کہا: "ہم تمہاری مدد کے لئے موجود ہیں۔ کوئی خطرہ کی بات نہیں۔"

نیاز نے کہا کہ بشیر کا مزاج یکایک ناساز ہو گیا ہے اور وہ اس لئے نہیں آ سکا اور اس کی اطلاع اس نے ٹیلیفون کے ذریعہ دیدی تھی۔ "ہم یہاں سے اٹھ کر اس کے خاص کمرہ میں چلے گئے۔ اس کمرہ

وسط میں ایک میز تھی اور اس کے اطراف چند کرسیاں۔ ایک بجلی کا چراغ وسط کمرہ میں لٹک رہا تھا"،
"ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ہمارے سامنے ایک دروازہ تھا جس سے ہم داخل ہوئے تھے۔ ایک اور دروازہ بالکل ہمارے عقب میں تھا۔ اسی دروازے سے راستہ مکان کے پچھلے حصہ میں جاتا تھا۔ ہم نے اس کا دل بہلانے کے لئے ادھر ادھر کی باتیں کرنا شروع کیں۔ قریب آٹھ بجے ہم نے کھانا کھایا۔ پھر اس کمرے میں آ بیٹھے۔ اتفاق سے سکریٹری نے خط کا مضمون چھیڑ دیا۔ میں نے کہا کہ یہ سراسر دھمکی تھی۔ آج کل کوئی ایسے واقعات پیش نہیں آتے۔ اور پھر ہماری موجودگی میں کون اس کمرے میں داخل ہونے کی جرأت کر سکتا تھا۔"

"نہیں۔ ایسا نہیں" نیاز نے چونک کر کہا "وہ مذاق نہیں کر رہا ہے۔ وہ ضرور کر کے رہے گا۔ مستقل مزاج اور عزم کا پکا ہے .... اُف وہ ضرور انتقام لے کر ہی رہے گا۔"

عالم خاموش بیٹھا اس قصہ کو سن رہا تھا۔ کہنے لگا:

"یہ قصہ البتہ دلچسپ معلوم ہوتا ہے مگر تمہاری ترک ملازمت سے اس کا کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا"

"نہیں۔ اگر تم اس کا اصلی سبب سننا چاہتے ہو تو چپ چاپ سنتے جاؤ۔ پھر تم خود ہی جان لوگے"
یوسف نے کہا۔ پھر اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے:

"میں نے دروازے کے بارے میں دریافت کیا کہ آیا وہ بند تھا یا نہیں۔ نیاز نے سر کے اشارہ سے اثبات میں جواب دیا۔ انہیں باتوں میں نو۹ بج گئے۔ پھر گھڑیال نے آدھا بھی بجایا۔ اب کمرہ میں خاموشی۔ ایک عجیب خاموشی۔ قبرستان کے خوفناک سناٹے سے ملتی ہوئی کمرے میں چھائی ہوئی تھی۔ کوئی آہٹ، کوئی آواز مہر سکوت کو توڑنے والی کانوں میں نہ آتی تھی۔ اب وہ وقت جس کی دہشت نیاز کا دل دہلانے والی تھی قریب تھا۔ نیاز کے دل میں موت کا بھیانک اور ڈراؤنی خیال جاگزیں ہو گیا تھا۔ دنیا کی ساری چیزوں میں موت کا خیال سب سے زیادہ ہیبت ناک اور باعث تحلیل روح ہے۔ مرنے کے نام سے انسان کی روح فنا ہو جاتی ہے۔ پہلے تو انسان یہ نہیں چاہتا کہ دنیا کی تمام نعمتیں اس سے چھین لی جائیں اور پھر آیندہ کا خیال کر کے گھبرا جاتا ہے کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔ اب دس بجنے میں پندرہ منٹ رہ گئے تھے .... دس ... پانچ ... چار ...... تین ...... دو ...... ایک گھڑیال نے دس بار اس خوفناک وقت کی آمد کا اعلان کیا

شروع کر دیا۔ ابھی دس پورے بجنے نہیں پائے تھے کہ ایک قہر کی آواز آئی اور کمرے میں گُپ اندھیرا چھا گیا اور ساتھ ہی کسی چیز کے گر کر ٹوٹنے اور کسی کے چیخ مارنے کی آواز آئی۔ عبد القادر نے فوراً جیب سے بتی لیمپ نکال کر بٹن دبا دیا۔ بٹن کے دباتے ہی کمرہ روشن ہو گیا۔ ہمارے سامنے عقب کے دروازے کی طرف بشیر کھڑا ہوا مسکرا رہا تھا۔ میری نظر فوراً نیاز پر پڑی اور منھ سے ایک چیخ نکل گئی۔"

نیاز ہمارے سامنے زمین پر بیہوش پڑا ہوا تھا۔ ہمارے حواس اُڑ گئے۔ عبد القادر غش کے خیال سے اس کو ہوا دینے لگا۔ بشیر کے بھی ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ میں نے آگے بڑھ کر نبض دیکھی ..... حرکت رُک چکی تھی۔ میرا سر چکرانے لگا۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ زمین پیر تلے سے نکلتی معلوم ہوئی۔ میں کرسی کا سہارا لیکر بیٹھ گیا۔ بشیر نے اس کو ہلا کر جگانے کی کوشش کی مگر بے سود "کیا مر گیا؟" بشیر نے بیساختہ چلایا۔

"افسوس۔ اس نے ہیبت ہی میں جان دیدی" میں نے کہا:

وہ اب ایسی نیند سو چکا تھا کہ کسی کے جگائے جگ نہیں سکتا تھا۔ وہ ایک ایسی دنیا میں پہنچ چکا تھا جہاں سے کوئی نہیں پلٹا۔ اس وقت زندہ انسان کی بجائے بیجان مٹی کا ڈھیر فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اُف آدمی کے برابر کوئی دلیر نہیں اور نہ اس سے زیادہ بزدل کوئی مخلوق"

"عبد القادر کبھی مجھ کو اور کبھی بشیر کو متحیر نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ بشیر نے اس کو ڈاکٹر کے فی الفور بلانے کے لئے کہا۔ مگر میں نے اس کو روک دیا۔ اب نیاز کی ہستی طبیب اور ڈاکٹر کے دسترس سے باہر تھی۔ بشیر سکتے کی حالت میں کھڑا ہوا تھا آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ کیسا روح فرسا منظر تھا جس کے تصور سے اس وقت میرے رونگٹے کھڑے ہوئے جا رہے ہیں۔ ہمارے بچپن کا دوست اور برسوں کا ساتھی ہمارے سامنے مردہ پڑا تھا۔ پھر کیونکر؟"

"یوسف" عالم نے حیرت سے اس کو روک کر کہا "میں نہیں سمجھا کہ وہ بیمار دوست بشیر وہاں کیونکر آگیا اور دروازہ کس نے کھولا۔ اور فیر کس نے کیا"

"میں کہتا ہوں۔ تم سنتے جاؤ" یوسف نے بھرآئی ہوئی آواز سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے "اکثر اوقات نیاز اعظم کے نام سے بہت گھبرایا کرتا تھا۔ ہم نے سوچا کہ اس کا خوف مذاق کے پیرایہ میں نکال دیں۔ میں چونکہ سہرا غرسان تھا اس لئے میں نے یہ تجویز پیش کی کہ اعظم کے نام سے اس کو خط بھیجے جائیں اور موت کی دھمکی دیجائے۔ اس مقررہ وقت کے لئے ہم نے بشیر کو بیماری کے بہانے

روک لیا۔ صرف عبدالقادر اور میں اس کے ساتھ رہے۔ ہم نے جعلی کنجی کے ذریعہ سے بشیر کو اس بازو کے کمرے میں پہنچا دیا اور اس دروازے کی جعلی کنجی اس کے حوالے کر دی۔ دس بجے بشیر سے دروازہ کھول کر چراغ پر فیر کرنے کے لئے کہا گیا تھا تاکہ چراغ گل ہو جائے۔ اور فیر کی آواز آئے چنانچہ تم نے سنا۔ بالکل ایسا ہی ہوا۔ مگر آہ ہماری تجویز کس قدر غلط ثابت ہوئی اور ہمارے مذاق کا کس قدر خوفناک انجام ہوا۔"

"دوسرے دن ہم نے یہ خبر مشہور کر دی کہ نیاز قلب کی حرکت رک جانے سے مر گیا چونکہ مرحوم کی جائداد کا کوئی وارث نہ تھا اس لئے ہم نے اس کا تمام سامان فروخت کر ڈالا اور اس رقم سے ایک مسافر خانہ اور ایک یتیم خانہ کی بنیاد ڈالی۔"

"اے میرے دوست" اس نے دفعۃً پرجوش لہجہ میں کہنا شروع کیا "داستان غم اب قریب الختم ہے تم یقیناً مجھ پر لعنت بھیجو گے۔ میں کہتا ہوں بھیجو اور جی کھول کر بھیجو۔ ..... اس ناعاقبت اندیش پر جو اس وقت تمہارے سامنے بیٹھا ہوا ایک ہستی بیگناہ کے انجام ناکام کی داستان حسرت بیان کر رہا ہے۔ افسوس" "ما درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال" ...... اب اس کا ضبط جواب دے رہا تھا۔ وہ کچھ دیر کے لئے رک گیا۔ پھر بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔ انسان بایں ہمہ دعوئ ہمہ دانی واقعات مستقبل سے کس قدر لاعلم رہتا ہے ...... کسے معلوم تھا کہ ہم کو اپنے مذاق کی قیمت ..... ابدی رنج و غم اور دائمی اشک ندامت ادا کرنی پڑے گی۔ کیونکہ اس سے انکار ہو نہیں سکتا کہ وہ ...... آغوش لحد کی تاریکی میں سونے والا نیاز ہماری ناعاقبت اندیشی کا مقتول اور ہم اس کے نادانستہ قاتل ......"

دن خورشید کا زرنگار تاج پہنے ہوئے آئیں گے اور گذر جائیں گے۔ راتیں زلف سیاہ دوش ہستی پر بکھرائے ہوئے آئیں گی اور شبنم کے آنسو بہاتے ہوئے چلی جائیں گی لیکن نیاز .... وہ مجسمہ خلوص و محبت ..... مٹی کے کئی من ڈھیر میں دبا ہوا نیاز ...... کہاں! اور ہمارا ضمیر ... آلودہ گناہ ضمیر کو ملامت سے فراغ کہاں! بسا اوقات کنج تنہائی اور خیالات کی پریشانی سے اکتا کر میں پاس والے دریا کے کنارے چلا جاتا ہوں مگر ..... محمد عالم کیا تم سمجھتے ہو کہ میرا جی بہلتا ہوگا؟ ..... نہیں بالکل نہیں ..... آج چار سال کا عرصہ اس واقعہ جانکاہ کو گزرے ہوئے ہوتا ہے لیکن اس طویل مدت میں کوئی ساعت کوئی گھڑی ایسی نہ گذری ہوگی جس میں جنت نصیب نیاز یاد نہ آیا ہو جب سحر کا دست بے باک رات کی قبائے سیاہ کو چاک کرنے لگتا ہے اور جب ڈوبتے ہوئے سورج کی زرد شعاعیں فلک بوس پہاڑوں کو آخری

بوسہ دیتی ہیں، جب بادِ خزاں کے جھونکے ہر برگ و گل کی رنگینیوں کو جبراً چھین لیتے ہیں، جب فصلِ بہار کی آمد آمد گاہِ خشک میں روحِ تازہ پھونکنے لگتی ہے۔ اس وقت بھی اس کی یاد...... ہر وقت تازہ رہنے والی یاد.... دل سے فراموش نہیں ہوتی۔"

"دریا کی ہوا۔ موجوں کے نغمہ زا شور ہر وقت اسی کا مرثیہ پڑھتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔"

نیاز کے الم ناک انجام کے بعد ہی میں نے ملازمت ترک کر دی اور دنیا کے شور و غل سے الگ بنی نوعِ انسان کی صحبت سے دور اس عزلت گاہ میں صدائے ضمیر کی جگر خراشیاں محسوس کرنے چلا آیا ہوں بشیر کو بھی بہت صدمہ ہوا۔ اس نے بھی جلد دنیا سے منھ موڑ لیا اور اپنے ضمیر کی لعنت و ملامت سے جلد نجات پا گیا۔ عبدالقادر کا حال معلوم نہیں کہ اس کا وفورِ غم اس سے کن بیابانوں کی خاک چھنوا رہا ہے داستان ختم ہوئی۔"

محمد عالم چپ چاپ اٹھا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ دونوں دوست آہستہ آہستہ دروازے تک آئے۔ محمد عالم نے اشک آلود نظریں اوپر اٹھا کر یوسف کو انداز رحم سے دیکھتے ہوئے رخصتی مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس کے بعد رخصت ہو گیا۔

یوسف بہت ضعیف ہو گیا ہے۔ کمر جھکنے لگی ہے اور ہاتھ پاؤں میں خفیف سا لرزہ عارض ہو گیا ہے پھر بھی صبح و شام کی نماز مکان کے پاس والے دریا کے کنارے آ کر نہایت خضوع و خشوع کے ساتھ ادا کرتا ہے۔ اور ہر نماز کے ختم پر نیاز کی روح پر سورۂ فاتحہ پڑھ کر بخشتا ہے۔"

رموز و نکات

از

جناب ابوالفاضل راز چاندپوری۔

(۱)

میخانۂ دہر کے مناظر توبہ! بیخود ہیں تمام اہل ظاہر توبہ!

واقف نہیں راز بیخودی سے کوئی کافر ہیں یہ مے پرست کافر توبہ!

(۲)

لاریب کہ رہنمائے دوراں تو ہے گم کردۂ راہ کا نگہباں تو ہے

قربان اس ادائے خوش فہمی کے! دنیا کافر ہے اک مسلماں تو ہے

(۳)

رونق دہ بزم ناز دنیا تو ہے شیدائے جمال شمع عقبیٰ تو ہے

کیا دید رخ حبیب ہوگی اے راز بیگانۂ جلوہائے معنیٰ تو ہے

(۴)

اے سالک راہ کوئے جاناں ہشیار! وہ دیکھ وہی ہے یوسفستاں ہشیار!

دس ہی قدم ہے اور منزل تیری رستے میں مگر ہے چاہ کنعاں ہشیار!

وہی آیا نظر کثرت میں مجھ کو تھا جو وحدت میں

از

جناب مولوی محمد حبیب الدین صاحب صغیرؔ تلمیذ حضرت علوی و بیکش

نظر کیوں کر نہ آئے اس کی صورت میری صورت میں
میں وہ صنعت ہوں صانع ہے نہاں خود اپنی صنعت میں

کہوں کیا ہائے تجھ سے کیا مزا ہے تیری الفت میں
بتاؤں کیا تجھے میں کیا نہاں ہے تیری صورت میں

خدا رکھے تصور کو کہ ہے تکلیف میں راحت
مجھے ہر آن لطف وصل بھی حاصل ہے فرقت میں

یہ کیسا بے خودی میں خود نمائی کا خیال آیا
یہ کیسی بزم آرائی کی سوجھی تجھ کو خلوت میں

میری معدومیت بھی تیری ہستی میں ہے پوشیدہ
مری گم نامیاں بھی تو نہاں ہیں تیری شہرت میں

ہوئی شوقِ نمایش سے تری بے پردگی ورنہ
نہ آتا حجلۂ وحدت سے تو میدانِ شہرت میں

حقیقت میں دوئی بھی شانِ یکتائی کی مظہر ہے
وہی آیا نظر کثرت میں مجھ کو تھا جو وحدت میں

ہے میری نیستی اس ہستیٔ موہوم میں پنہاں
مری بے صورتی کا بھی ہے جلوہ میری صورت میں

فقط اک نام کا اصل و مثنیٰ میں تفاوت ہے
نہیں ہے فرق کوئی اُس کی صورت میری صورت میں

ہے تیرا حسن ہی خود طالبِ دیدار کا طالب
نہاں ہے جلوۂ شوقِ نمایش تیری صورت میں

نہ تھی کچھ لن ترانی اُس کی بے جا حضرت موسیٰؑ
نہ ہو جب غیر پھر آئے نظر وہ کس کی صورت میں

تیرے جو دیکھنے والے ہیں تجھ کو دیکھ لیتے ہیں
تری صورت نظر آتی ہے ہر ذرّہ کی صورت میں

بجز صورت کے کوئی شئے نظر آتی نہیں ہرگز
بہر صورت اگر ہو شوق دیکھو اس کو صورت میں

حقیقت میں مری صورت پرستی حق پرستی ہے
نہیں ہے جس کی صورت وہ نظر آتی ہے صورت میں

ہزاروں راہرو تھک کر سرِ رہ بیٹھ جاتے ہیں
نشانِ منزل کا ملتا ہی نہیں راہِ حقیقت میں

صغیرؔ دلکش کو کیوں نہ ہو ذوقِ مئے عرفاں
کہ وہ برسوں رہا ہے علوی و بیکش کی خدمت میں

شاعری

از

جناب سلیمی متعلم کلیہ جامعہ عثمانیہ

شاعری کی لوگوں نے مختلف تعریفیں کی ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ آج تک ہمیں کوئی ایسی تعریف نہیں ملی جس کو ہر لحاظ سے جامع و مانع کہا جا سکے۔ جذبۂ الفت کے مانند شاعری بھی ایک تاثر ذہنی ہے جس کو ہم اس کے خصائص و تاثرات کی بدولت جانتے تو ہیں لیکن اس کی صحیح صحیح تعریف نہیں کر سکتے۔

شاعری کی سیدھی سادھی تعریف یہ ہے کہ جب ہم اپنے تاثرات ذہنی (جذبات و احساسات) کو ایسی اثر آفریں زبان میں ادا کریں کہ سامعین کے دل میں بھی ویسے ہی جذبات موجزن ہو جائیں اور وہ ہمارے ادا کردہ خیالات کو اپنے خیالات کی ترجمانی خیال کرے تو یہ شاعری حقیقی شاعری ہوگی۔

وسیع معنوں میں تو ہر وہ شخص جو جذبات رکھتا اور ان کو دوسروں پر ظاہر کر سکتا ہے شاعر ہے لیکن محدود معنوں میں شاعری کا لفظ صرف انہی معدودے چند ہستیوں کے لئے مخصوص ہو سکتا ہے جو ذکی الحس ہوں اور اپنے جذبات کو نہایت موثر اور دلکش طریقے سے بیان کر سکیں اور یہی ایک چیز ہے جو شاعر اور ایک عامی کے درمیان مابہ الامتیاز ہے۔

شاعر ذکی الحس اور متخیل ہوتا ہے۔ ہر وقت اس کے دل میں جذبات کا طوفان اُمنڈتا رہتا ہے۔ وہ اظہار جذبات پر پوری طرح قادر ہوتا ہے۔ وہ خود غرض نہیں ہوتا بلکہ نہایت کشادہ دلی سے اپنے پرسوز کلام کے ذریعہ دوسروں کے دلوں کو گرماتا اور اکساتا رہتا ہے تاکہ وہ بھی اس کی معیت میں کائنات و عالم کی گوناگوں دلچسپیوں سے مستفید ہو سکیں۔

شاعر کے تخیل کی پرواز بلند ہوتی ہے وہ دنیوی بندشوں سے آزاد ہو کر اپنے تخیل کی پیدا کردہ دنیا کی سیر کرتا ہے۔ اس کی بلند و بالا آواز پورے عالم پر چھا جاتی ہے۔ وہ جب اپنے روح پرور اور حیات بخش نغمے آلاپتا ہے تو ایسا ساحر معلوم ہوتا ہے جس نے تمام دنیا کو اپنے پنجۂ اقتدار میں لے لیا ہو۔

ہم اس کم بصر شخص کی مانند ہیں جس کو درخشاں روشنی بھی دھندلی معلوم ہوتی ہے اور جو ایک وادی پر بہار

ابرباراں اور گلہائے خوشنما کے حسن جان نواز کا پورا پورا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ لیکن شاعر جب انہی چیزوں کو دیکھتا ہے تو اس میں ایسا محو ہو جاتا ہے کہ اپنی خبر نہیں ہوتی۔ اور فرط مسرت سے بیخود ہو کر اپنے دلی جذبات کا اظہار ایک شیریں و دلکش نغمے کی صورت میں کرتا ہے جسے عرف عام میں "شعر" کہتے ہیں۔ ہم کس طرح ایک بہرے سے زیادہ نہیں۔ اگر وہ صرف آوازوں کا احساس کر سکتا ہے تو ہم بھی موسیقی کو روانی آب سے زیادہ نہیں سمجھتے۔ لیکن شاعر "روح موسیقی" سے لطف اندوز ہوتا ہے آواز کے زیر و بم میں تمیز کرتا ہے اور ہم کو بھی پیام کیف آور میں مطلع کرتا ہے کہ اگر "روح نغمہ" سے محظوظ ہونا چاہتے ہو تو اپنے آپ کو موسیقی میں گم کر دو۔

ستاروں کو ہم سب دیکھتے ہیں اور ان کی پر عظمت اور پر اسرار حقیقت پر متعجب ہوتے ہیں لیکن شاعر جب انہیں دیکھتا ہے تو نہایت خضوع و خشوع کے ساتھ ان کے آگے جھک جاتا ہے اور زاہد پاکباز کی طرح ہم سے بھی استدعا کرتا ہے کہ آؤ ہم سب مل کر عالم بالا کی سیر کریں اور سب مل کر ایک ایسا نغمہ گائیں جو اس آسمانی مملکت کے شایان شان ہو۔

ہزاروں چیزیں ہماری نظر سے پوشیدہ ہیں۔ بعض ایسی ہیں کہ ہم ان کو قابل توجہ نہیں سمجھتے۔ لیکن شاعر کی نگاہ انہی گمنام چیزوں کی متلاشی ہوتی ہے وہ حسن سادہ پر جان دیتا ہے۔ اور اس کی تعریف میں ایسے ایسے غیر فانی نغمے الاپتا ہے کہ یہی نغمے جب ہم تک پہنچتے ہیں تو ہم اس حسن سادہ کی سحر کاری سے بیخود ہو کر اپنی سابقہ حماقت پر متاسف ہوتے ہیں۔

سموئیل ٹیلر کہتا ہے "اگر موجدان مشنری نے ہم میں غیر جسمانی اعضا کا اضافہ کر دیا ہے تو شاعروں نے اس سے بھی گراں قدر عطیہ نوع انسان کو بخشا ہے۔ انہوں نے ہماری روح میں بہت سے نئے ابواب کھول دئے ہیں۔"

سب سے بڑا شاعر وہی ہے جس کے دل میں سارے جہان کا درد ہو جو کسی مخصوص قوم کا نہیں بلکہ پورے عالم کا ترجمان ہو۔ جو ایسے اشعار کہتا ہے جن سے دوسروں کے دلوں میں گداز، نرمی اور ہمدردی کا مادہ پیدا ہو اس بنا پر ہم شکسپیر کو سب سے بڑا شاعر اور "مثل خدا" GODLIKE کے مقدس اور پر احترام الفاظ سے پکارتے ہیں۔

صرف جذبات کا نام ہی شاعری نہیں۔ شاعری کے اور بھی بہت سے لوازمات ہیں۔ جذبہ

اثر تاثرات اسی وقت شاعری کے زمرے میں آسکتے ہیں جب وہ دلکش انداز میں بیان کئے جائیں۔ یہاں پر ہر ایک مجہول شئے کا سامنا ہے جس کی تعریف آسان نہیں۔ ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ بعض آدمی اظہار جذبات پر قادر ہوتے ہیں اور اپنے تاثرات و کیفیات کو ایسے دلکش پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ سامعین کے دل میں ہیجان برپا ہوجاتا ہے اور اس قوت بیان کو آرٹ (صنعت) موسیقی، مصوری، مجسمہ سازی اور اداکاری (ACTING) سے منسوب کیا جاتا ہے۔

جذبات شاعری کی جان ہیں ان کو ہم سامعہ نواز موسیقی اور حسین و جمیل تصاویر میں ادا کر سکتے ہیں شاعر جب کسی المناک یا خوفناک واقعہ بیان کرتا ہے تو اس میں حسن پیدا کر دیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ شاعر کا سب سے بڑا راز واقعات کو دلکش اور موثر طریقے سے پیش کرنا ہے۔

جب ہمارا طرز بیان غیر مائل حسن یا غیر دلکش ہو تو اسے ہم شاعری نہیں سمجھ سکتے۔ یہ صرف شاعری کی نقالی یا صدائے بازگشت ہوگی لیکن بعض وقت یہی صدائے بازگشت اصل سے ایسی مشابہ ہوتی ہے کہ ماہرین فن بھی مشکل سے امتیاز کرسکتے ہیں۔

تصنع آمیز شاعری ہمارے جذبات میں کسی قسم کا ہیجان پیدا نہیں کرسکتی۔ اس کا اثر بالکل عارضی اور زود رو ہوتا ہے لیکن حقیقی شاعری ایک چلتا ہوا جادو ہے جس کا وجد آفریں اثر ہمارے رگ و ریشے میں سرایت کرجاتا ہے شاعری بقول والٹر "حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھانا" اور بقول سسر "روح کی پرورش کرنا ہے" لیکن شاعری کو محض گندہ جذبات کی آماجگاہ بنانا اور غیر ناقدانہ روش سے اس پر گامزن ہونا شراب آتشین سے سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔

شاعر مصوری و موسیقی کا موجد ہوتا ہے۔ وہ رنگ آمیزی کا کام الفاظ سے لیتا ہے جب وہ بیخود ہوکر درد دل بیان کرتا ہے تو لوگ اسے شعر اور موسیقی کا نام دیتے ہیں وہ زبان کا بھی موجد ہوتا ہے جب اس کا وسیع تخیل متروہ الفاظ کے جامہ میں نہیں سما سکتا تو وہ بت تراشی کے مانند نئے نئے الفاظ اور تشبیہیں تراشتا ہے۔

شاعری دنیا جذبات کی دنیا ہے۔ وہ جذبات سے کھیلتا اور فطرت کے دلکش مناظر سے اپنا دل بہلاتا ہے۔ شاعر فطرت کا ترجمان ہوتا ہے وہ اپنے غیر فانی نغمات کے ذریعے تمام عالم پر چھا جانا چاہتا ہے۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہوجائے تو اس کا نام صفحہ عالم پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ثبت ہوجاتا ہے جیسا کہ حافظ مرحوم فرماتے ہیں

"ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما" ——— (مترجمہ)

تجلیاتِ فروغ

از

جناب محمد حنیف صاحب فروغ مرحوم

مرتے دم تم نے اگر شکل دکھائی ہوتی
کچھ مرے جینے کی صورت نکل آئی ہوتی

داورِ حشر کو کچھ اور گمان ہو جاتا
تم نے محشر میں اگر دیر لگائی ہوتی

ہو کے برہم صفتِ ابر رُلایا برسوں
ہنس کے بجلی دلِ عاشق پہ گرائی ہوتی

دل انسان سے نکل کر وہ سماتا اس میں
عرش میں گر دلِ انسان کی سمائی ہوتی

لاش پر میری بناوٹ سے وہ روتے اے کاش
جھوٹی الفت ہی پس مرگ جتائی ہوتی

ساقیا جام کی تکلیف تھی کم ظرفوں کو
سب کے بدلے مجھے چلّو سے پلائی ہوتی

دل کسی رشکِ مہِ نو سے لگاتے نہ اگر
کبھی عالم میں نہ انگشت نمائی ہوتی

دل مرا تیرِ ادا سے ترے ہونا زخمی
ناوکِ ناز کی گر چوٹ بچائی ہوتی

کیا کروں کان تک اسکے نہیں جانے نیاز
عرش تک ہے مرے نالوں کی رسائی ہوتی

دل سے دل مل گیا اب آنکھ لڑاتے کیوں ہو؟
صلح کے بعد کسی جا ہے لڑائی ہوتی

ہجر کی شب مجھے مرنے کی تمنّا تھی فروغ
کاش قسمت میں مری موت پرائی ہوتی

شہیدانِ محبّت

از

جناب سید شبیر حسین صاحب قیس حیدرآبادی

شام ہوچکی تھی۔ باغ کے پھولوں کے ایک جھرمٹ میں چڑیاں جمع ہو رہی تھیں۔ کیونکہ آج گل و بلبل کے درمیان محبت کا مقابلہ ٹھنا تھا۔ ان کی چہک سے ایک شور مچا تھا۔ پتے اور ڈالیاں کھڑکھڑا رہی تھیں۔ اور ہوا، حلقہ ڈالے سنسنا رہی تھی۔ سبزہ بھی سننے کے لئے جاگ اٹھا تھا کہ دیکھیں آج کون بازی لے جاتا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد خاموشی چھا گئی۔

پہلے بلبل نے ایک محبت کا دردناک گیت گایا جس سے سب پر ایک کیفیت طاری ہوگئی۔ اس کے بعد اس نے گل سے کہنا شروع کیا "اے گل تو جانتا ہے کہ مجھے تجھ سے عشق ہے۔ میں تیری ہی محبت کا گیت الاپتا رہتا ہوں۔ اسی لئے میں دنیا میں ایک سچا عاشق مشہور ہوں۔ شعرا میری محبت میں صفحے کے صفحے لکھ ڈالتے ہیں۔ میں محبت کا پرستار ہوں بلکہ میں محبت ہی کے لئے پیدا کیا گیا ہوں۔ اور میری دنیا محبت ہے۔ اے نادان پھول! تجھ میں سوائے خوشنمائی و خوشبو کے بوئے وفا نہیں۔ تجھ میں محبت کا نام نہیں۔ سنتا ہوں کہ معشوق بے وفا ہوتے ہیں۔ سمجھتا ہوں کہ سچ ہے کیونکہ میں نے تیری محبت میں کیا کیا نہ تکلیفیں جھیلیں، دن رات تیری محبت میں تڑپتا رہا۔ تیرے صدقے پھرتا رہا۔ ناز اٹھاتا رہا۔ مگر آہ سوائے سینہ کوبی کے کچھ حاصل نہ ہوا۔ تو نے میری طرف ذرا بھی توجہ نہ کی۔"

یہ کہتے کہتے بلبل کے آنسو نکل پڑے۔ چڑیوں کے بھی دل بھر آئے اور سب نے چلا کر کہا۔

"اے بے وفا پھول تجھے شرم نہیں آتی کہ تیرا عاشق صادق تجھ پر جان قربان کرے اور تجھے ذرا بھی اثر نہ ہو"

تمام ہمسایہ پھولوں نے سر جھکائے۔ اور گلاب کو آہستہ سے طعنے دینے شروع کئے۔ یہاں تک کہ گلاب کے رخساروں پر شرم سے نمی آگئی۔ آخرکار اس نے زبان کھولی اور کہا۔ "اے بلبل! تو سچ کہتا ہے مگر تو میرے دل سے کیا واقف۔ تجھے کیا معلوم کہ اس دل میں فقط تیری محبت بسی ہوئی ہے۔ اے چڑیو، پتو اور پھولو، میں تم سب کو گواہ کرکے اپنا راز محبت کھول رہا ہوں اور اس کے بعد تم مجھے مرجھایا ہوا پاؤ گے

کیونکہ میں زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہوں اب تاب ضبط باقی نہیں۔ یہ ضبط و صبر ہی کا نتیجہ ہے کہ میں بدنام ہو کر اف تک نہیں کرتا۔ بلبل کی طرح کمینہ نہیں ہوں جو ہر ایک سے اپنی محبت کا اظہار کرتا پھروں خود رسوا ہوں اور دوسرے کو بھی رسوا کروں۔ حسرت بھری خاموش آہوں سے زبانیں باہر نکل آئی ہیں۔ اور ان پر کانٹے آئے ہیں آہ! عشق نے دل میں رخنے ڈال دئے ہیں۔ صبر ـــ ایک طویل صبر کی وجہ سے میرا خون خشک ہو چکا اور میں سفید پڑ گیا ہوں۔ اے اندھے عاشق آنکھیں کھول اور دیکھ کہ میں خود کو تیری محبت میں فنا کرکے کانٹوں کے احاطے میں گرفتار ہوں۔ اور اب میرا باغ جوانی برباد ہو چکا۔ تو نہیں سمجھ سکتا کہ میری مصیبتیں تجھ سے کتنی بڑھی ہوئی ہے۔

اے بلبل! اگر تجھ کو مجھ سے حقیقی محبت ہے تو آ میرے ساتھ خود کو فنا کر دے۔ یہ تیرا آخری امتحان محبت ہے ـــ گلاب کی آواز رک گئی۔ بلبل کے دل پر ایک سخت صدمہ ہوا۔ وہ بے تابی سے اس کے قریب اڑا ایک دلدوز کانٹا اس کے دل میں چبھا۔ مگر اسے مطلق خبر نہ ہوئی۔ بلبل نے گلاب پر سر رکھ دیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے "میرے گلاب۔ پیارے گلاب" اس نے آخری دردانگیز آواز میں کہا۔ اس کے دل کا خون گلاب پر ابل رہا تھا۔ اور گلاب سرخ پڑ گیا۔ مگر وہ مرجھا کر نڈھال ہو چکا تھا۔ بلبل کی روح نکل رہی تھی۔ مگر وہ ان آخری لمحات عشق میں اس قدر سرشار تھا کہ اس نے درد تک محسوس نہ کیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد وہ خاک پر مردہ پڑا تھا۔

گلاب کی پتیاں ایک ایک کرکے اپنے عاشق صادق پر گرنے لگیں۔ اور خاک نے اس گر شہیدان محبت کو اپنے دامن میں چھپا لیا۔

چڑیاں بصد حسرت بلبل کے مدفن پر نگاہ ڈالتی ہوئیں یکے بعد دیگرے اڑ گئیں۔ لیکن پھولوں نے اس کی مجاوری میں ہمیشہ کے لئے سر جھکا لیا۔

افق میں ایک گہری سرخی نمایاں تھی۔ اور آسمان نے بھی سیاہ چادر اوڑھ لی۔

غزل

از

جناب حکیم آزاد انصاری صاحب

وہ دل کہاں سے لاؤں شکیبا کہیں جسے
باقی بھی ہو شکیب کا یارا کہیں جسے

وہ درد دے کہ درد تمنا کہیں جسے
وہ دکھ عطا ہو، عین مداوا کہیں جسے

سُن مجھ سے سُن، وہ کیا ہے؟ فقط ربطِ حسن و عشق
اس دہر کی حقیقت کبریٰ کہیں جسے

اے مرکزِ امید! خبر لے، کہ مٹ چلی
وہ آس زندگی کا سہارا کہیں جسے

تیرے نثار، تو نے مجھے دل عطا کیا
اور دل وہ دل کہ شوق سراپا کہیں جسے

دیدارِ حسنِ دوست کی حسرت بجا، مگر
وہ دیدہ لا کہ دیدۂ بینا کہیں جسے

تکمیلِ ربطِ مرکزِ اعلیٰ کی دیر ہے
خود کھینچ لے گا مرکزِ اعلیٰ کہیں جسے

اب میں کہاں ہوں، جلوہ گہِ حسنِ دوست میں
اب میں وہاں ہوں حسن کی دنیا کہیں جسے

اک ہم کہ بندگانِ تمنا میں بھی ذلیل
اک تم کہ سب خدائے تمنا کہیں جسے

تدبیر کیا ہے، آپ کی جانب سے حکم کار
تقدیر کیا ہے آپ کا منشا کہیں جسے

اے جستجوئے منزلِ عالی! ادب، ادب
زیرِ قدم ہے عرشِ معلیٰ کہیں جسے

اے فیلسوفِ خام تجھے یہ خبر نہیں
خود فلسفہ ہے عشق کا سودا کہیں جسے

پیری میں شغلِ بادہ و شاہد وہ شغل ہے
لطفِ شبابِ رفتہ کا احیا کہیں جسے

نادان! جا، تمام بُروں کو برا نہ کہہ
اچھا وہی نہیں ہے سب اچھا کہیں جسے

کیا آپ جانتے نہیں؟ آزاد کون ہے
بندہ نواز! آپ کا بندہ کہیں جسے

ناکام امتحان

از

جناب اقبال حسین خان صاحب سابق متعلم کلیہ جامعہ عثمانیہ

"ابھی تم نے تو کہا تھا کہ آج مجھ کو کپڑے دلوانے ساتھ لے چلونگا۔ شوفر کو میں نے کہلا بھیجا ہے کہ وہ کہیں نہ جائے۔"

"آج تو معاف کرو کل ضرور چلیں گے کیونکہ آج مجھے چار بجے پروفیسر فیض کے ہاں ایٹ ہوم میں یک ہونا ہے۔ یہ تھے پروفیسر محمد بخش کے الفاظ جو اپنی بیوی محترمہ غ بیگم کے سامنے صلاحیت سے ارشاد فرما رہے تھے۔

بیگم۔ "واہ یہ بھی کوئی بات ہے ہر روز اسی طرح کی ٹال کہ مجھے یہاں اور مجھے وہاں جانا ہے آپ تو روز ایٹ ہوم اُڑائیں سینما جائیں اور ہمیں کپڑے دلوانے بھی نہ لیجائیں۔"

پروفیسر "میں تم سے پھر کہتا ہوں کہ کل پر آج کی بات رکھو۔"

بیگم (مچل کر) "نہیں ایسا نہیں ہونے کا۔"

پروفیسر "بڑی آفت میں جان ہے۔ سچ کہا ہے کہ عورتیں کافی ناقص العقل ہوتی ہیں ضروری اور غیر ضروری کام کبھی نہیں دیکھتیں۔ بس حکم دے دیا کہ نہیں ہونے کا۔"

بیگم۔ (تنک کر) "دیکھو جی میں خون کے گھونٹ پیکر چپ ہوں۔ آپ ہیں کہ بڑھتے چلے جاتے ہیں اب تو اللہ کی شان آپ ایل فیل پر اُتر آئے ہیں۔

پروفیسر (نہایت آہستہ سے) میں نے کب تم کو بُرا بھلا کہا"۔

بیگم اللہ ری دیدہ دلیلی کہ کہتے ہیں اور پھر مکرتے ہیں ذرا ہوش کے ناخن لو۔ منہ سنبھال کر بولو۔"

پروفیسر "یہ بھی کوئی بگڑنے کی بات ہے" یہ الفاظ صلح کن لہجہ میں ارشاد فرمائے۔

بیگم۔ (روٹھنے کی ادا سے) "بس مجھے اب کچھ نہ بولو۔ اب تک تو بہت سہا، لیکن اب صبر نہیں ہو سکتا۔"

پروفیسر محمد بخش نہایت سنجیدہ آدمی بھی تھے اور معاملہ فہم بھی سمجھ گئے "بیوی کا تھرمامیٹر چڑھ گیا ہے

اگر اور بگڑ بیٹھیں تو جان پربن آئیگی ۔ چاہتے تھے کہ کسی صورت سے سمجھالیں لیکن ایک پیش نہ گئی۔ جانا ضروری تھا حتمی وعدہ کیا تھا کہ ایٹ ہوم میں شریک ہوں گے اب جو بیوی کو بگڑتے دیکھا تو سٹی بھول گئے۔ سوچنے لگے کہ کیا کریں آخر یہ ترکیب سوجھی کہ باہر چلیے چلو واپسی پر دیکھا جائے گا۔ بسم اللہ کہہ کر آہستہ سے باہر چل دیئے۔ بیوی غضب ناک نگاہوں سے تکتی رہیں۔ جب مولانا دیوڑھی سے باہر ہوئے تو بیگم نے چلّا کر آواز دی "گل بہار! اری وہ گل بہار! جہنم جلی کہاں مرگئی" غریب گل بہار ڈرتی مرتی بیگم کے روبرو لرزتی زمین دیکھتی کھڑی ہوگئی۔ پہلے ہی سے بیگم کا غصہ جانتی تھی آج تو حالت ہی آپے سے باہر دیکھی سمجھی کہ آج ضرور شامت ہے۔

بیگم ۔ جا مردار شوفر نگوڑے سے کہدے کہ اگر آج تو سرکار کو باہر لے گیا تو بلا تنخواہ دیئے نکال دوں گی "

گل بہار دوڑی ہوئی گئی اور بیگم کا حکم سنا دیا۔ شوفر پہلے ہی سے اپنے گھر جانے کے لئے بیچین تھا صرف بیگم کے حکم کی وجہ مجبوراً رکا ہوا تھا۔ خوشی خوشی شیروانی پہنی ٹوپی اوڑھ روانہ باشد۔ پروفیسر صاحب بہت بیچین ہوئے لیکن کرتے کیا مجبوراً دم سادھ کر خاموش ہو رہے۔ مولانا کو کوفت تھی بہت۔ جانا ضروری لیکن کچھ کرتے دھرتے نہ بن آئی۔ آخر ڈرائینگ روم میں مجبوراً تشریف لے گئے۔ نہایت مغموم آرام کرسی کے دستے پر ہی بیٹھ گئے۔ بہت دیر تک سر جھکائے سوچتے رہے کہ کیا کریں کیسے جائیں۔ جب کچھ نہ سوجھی تو ادھر اُدھر دیکھنے لگے پہلی نظر جناب کی اپنی قد آدم تصویر پر پڑی یہ جوانی کے وقت کی تھی بہت دیر تک تکتے رہے کچھ عہد ماضی کا دھیان جوانی کی امنگوں اور شادی کے قبل کی آزادی و بے فکری کا خیال دل پر ایک سانپ سا لہرانے لگا۔ اب کیا تھا بیٹھے بیٹھے بغیر ارادہ کے ہر چیز کا جائزہ لینے لگے۔ اس کو دیکھا اُس کو دیکھا دل ہی دل میں اس چیز کی تعریف کی اُس چیز پر تنقیدی نظر ڈالی۔ جب کمرے کے تمام اشیاء کا جائزہ لے چکے تو میز کی باری آئی۔ بہت دیر تک گھورا کئے یکایک جناب کی نظر ایک اگری رنگ کے لفافہ سے ٹکرا کر رہ گئی جو میز پر دھرا ہوا تھا۔ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے خراماں خراماں میز تک تشریف لے گئے بغیر ہاتھ لگائے پڑھنے لگے پہلے اپنا نام پڑھا۔ پھر لفافہ کے ایک جانب لکھا دیکھا از دفتر مسجل یونیورسٹی۔ لفافہ کو ہاتھ میں اٹھالیا اور فوراً چاک کر کے پڑھنے لگے۔ لکھا تھا کہ "امتحانات کے پرچے فوراً جانچکر روانہ فرمائیے نتیجہ بہت جلد شایع کیا جائے گا۔" پروفیسر صاحب تیار ہوگئے کہ چلو اس فرصت میں تھوڑے پرچے ہی دیکھ ڈالیں کوئی اور کام تو ہے نہیں۔ کرسی کھینچ کر میز کے سامنے جا بیٹھے کلاہ شریف بازو رکھ دی، لگے میز کا خانہ کھینچنے۔ نہ کھلنے پر ایک زور کا جھٹکا دیا تب بھی نہ کھلا پھر کیا تھا جھٹکوں کا تانتا بندھ گیا۔ اس کشمکش میں دوات اوندھی ہوگئی تمام ٹیبل پر سیاہی ہی سیاہی ہوگئی اب کیا تھا غصہ سے چہرا لال انگارہ ہوگیا۔

تھوڑی دیر خاموش کھڑے کھڑے میز کو گھورا کیئے خیال آیا کہ خانہ مقفل ہے بڑی خفت ہوئی قفل کھولا پرچے نکال میز پر رکھنا چاہتے تھے کہ سیاہی کا خیال آیا۔ پھر کیا تھا چلا کر نوکر کو آواز دی۔ غریب مصطفیٰ ڈرتا ہانپتا ہوا روم میں داخل ہوا پروفیسر صاحب کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پروفیسر صاحب پہلے تو مصطفیٰ کو سر سے پیر تک غصہ سے گھورتے رہے گویا کہ یہ اس کا اپنا ہی قصور تھا پھر پھرٹ آواز میں حکم صادر فرمایا "میز صاف کر" "جی حضور" "پیپر ٹیک کرو فوراً" غریب مصطفیٰ نے جلدی جلدی میز کو صاف کر دیا اور ہمارے جہ بان پروفیسر پرچوں کا پلندہ لیئے کھڑے رہے جب میز صاف کیا جا چکا تو صاحب نے پرچوں کو زور سے میز پر پٹخ دیا۔ اور کرسی کھینچ کر میز کے مقابل جم گئے اب کیا تھا بیچارے غریب طالب العلموں کے قسمتوں کا فیصلہ ہونے لگا۔

(۲)

"ہاں! تو تمہارے تمام انتظامات لندن جانے کے ہو چکے نا" ناصر نے گہری دلچسپی لیتے ہوئے محمود سے پوچھا۔

"بھائی ہو تو گئے مگر نتیجہ کا انتظار ہے بغیر کامیاب ہوئے جانا کیسا ہو گا خدا کرے کہ کامیاب ہو جاؤں" محمود نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

"کامیابی میں شک ہی کیا ہے مٹھائی کی تیاری کرو اس سال تو تم کامیاب ہو کر ہی رہو گے اتنی سخت محنت کرنے کے بعد آخر ناکامیابی کیا معنے؟"

"یہ تو نہ کہو پہلے اور دوسرے سال بھی تو میں نے کوشش کی تھی لیکن نتیجہ معلوم۔ امتحان قسمت بازی ہے محنت ...."

نہیں محمود اس سال تو تم ضرور کامیاب ہو گے تمہاری انتہائی بدقسمتی تھی کہ دو سال سے فیل ہو رہے ہو آخر کب تک؟ خدا رحیم ہے اس سال تو ویسا نہ ہو گا بس اب مٹھائی کی تیاری کرو۔ ناصر نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ہاں اگر قسمت میں ہے تو انشاء اللہ تعالیٰ کامیاب ہو کر ہی رہوں گا نتیجہ تو نکلنے دو پھر جس قدر کھا سکتے ہو کھاؤ" محمود نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"ہم تو اسی وقت کھائیں گے جس بات کا یقین ہو اس میں اول کیا اور بعد کیا۔"

"اس قدر عجلت نہ کرو دو تین دن صبر سے کام لو نتیجہ شایع ہوتے ہی کھلا دوں گا امید تو ہے کامیاب ہو جاؤں گا۔"

اس سال میں نے بہت اچھے جوابات لکھے ہیں کاش سال گذشتہ ہی کامیاب ہو جاتا تو آج میں عزیز کے ساتھ لندن میں ہوتا۔ سال اول کی تکمیل ہو چکتی مگر قسمت بری تھی کہ دو نشانات سے انگریزی میں اور ایک نشان سے ریاضی میں فیل کر دیا گیا" محمود نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"خیر گذشتہ ناکامیابیوں کا نعم البدل ہو جائے گا تم کو تو فرسٹ کلاس میں کامیابی کی توقع ہے نا" ناصر نے محمود سے استفسار کیا۔

"بھائی فرسٹ ورسٹ تو رہنے دو صرف کامیاب . . . ."

محمود نے فقرہ ختم نہ کرنے پایا تھا کہ دو چار اور دوست آدھمکے بہت دیر تک امتحان اور اس کے متعلقات پر آپس میں تبادلہ خیالات ہوتا رہا۔ محمود امتحانات کے معاملہ میں بہت بد قسمت تھا دو سال سے پروفیسر کو تعجب تھا کہ محمود کیوں ناکامیاب ہوا۔ کلاس میں اچھی حالت تھی لیکن اس سال تو غریب کو یقین کامل تھا کہ ضرور کامیاب ہو گا۔ قیصر جرمنی کو آغاز جنگ کے زمانہ میں اپنی فوجوں کے پیرس اور وارسا کے آئے دن قریب تر ہوتے جاتے سے جیسی خوشی ہوتی ہو گی ویسی ہی اس وقت محمود کو تھی جب کہ تمام دوست احباب قبل از قبل مبارکباد دے رہے تھے کوئی کہتا تھا کہ درجہ اول میں کامیاب ہو گا کوئی کہتا تھا کہ درجہ دوم تو یقینی ہے۔ جس طرح قیصر کو پیرس میں ناشتہ کرنے اور وارسا میں شام کھانے کی امید قوی تھی اسی طرح محمود کے تمام دوستوں کو اس کی کامیابی کا یقین تھا۔

محمود خوش حال گھرانے کا لڑکا تھا والدین کو اس کی تعلیم کی بہت کم فکر تھی۔ ۱۶ سال تک تو غریب نے ابجد تک ختم نہیں کی تھی ایک مولوی صاحب اخلاقی کمزوری کہئے یا سراپا انکساری ہمیشہ اپنے شاگردوں سے دب کر رہنے کے عادی تھے وہی محمود کو پڑھایا کرتے تھے۔ لڑکپن ہی سے کچھ ایسی فضا میں محمود کی بسر ہوئی تھی کہ جس میں محمود کے تعلیم پانے کی بہت کم توقع کی جا سکتی تھی اس پر طرہ مولوی ممدوح کی تعلیم سونے پر سوہاگہ کا کام کر گئی تھی۔ مولوی صاحب تعدد ازدواج کے مؤید اکثر فرمایا کرتے "بھائی میرا تو یہ مقولہ ہے کہ جہاں خدا نے آمدنی میں پانچ روپے کا اضافہ کیا ایک نئی شادی کر لو" مولوی صاحب نہ صرف یہ فرمایا کرتے بلکہ اس پر شدت سے کاربند بھی تھے۔ باوجود دو بیبیوں کی سنبھال مشکل ہونے کے پھر تیسری کی تلاش میں سرگرم و کوشاں تھے۔ حال ہی کا ذکر ہے کہ انہوں نے بہت سستے میں ایک اور تازہ عقد کر لیا تھا سچ کہا ہے کہ "جوئندہ یابندہ" اب یہ حال کہ مولوی صاحب بہت کم محمود کو پڑھانے آنے لگے لیکن محمود یہ

اکثر تقاضا فرمایا کرتے کہ "بھائی تمہارے والد سے کہکر ہماری تنخواہ میں اضافہ کرادو آخر ہمارے اخراجات بھی تو ہیں تمہاری نئی اسنا نی کا خیال ہے ورنہ ہم کبھی تم سے ایسا نہ کہتے۔"

محمود کے والد نے جب مولوی صاحب کی یہ حالت دیکھی تو محمود کو سرکاری مدرسہ میں شریک کروادیا۔ محمود کی خوش قسمتی کہیئے یا بدقسمتی بغیر امتحان مڈل کلاس میں شریک کرلیا گیا۔ مولوی ممدوح نے تو صرف "بغدادی قاعدہ" اور "ماں بچے کی کتاب" ختم کروائی تھی محمود کا مڈل کلاس میں اچانک چلنا نہایت مشکل تھا استاد کے سوال کا جواب تو کیا دینا برابر رواں تک نہیں پڑھ سکتا تھا اکثر کلاس ٹیچر صاحب اس کو ڈانٹ ڈپٹ کرتے جن کے خوف سے محمود اپنے والد کو کہہ کر کلاس ٹیچر صاحب کو خانگی تعلیم کے لئے مقرر کروالیا۔ اب نئے استاد صاحب قبلہ اگلی سی سختی نہیں فرمایا کرتے۔ دوسرے ساتھیوں کو دیکھ کر محمود کو بھی تعلیم کے شوق نے اکسایا۔ محمود اب تعلیم میں گہری دلچسپی لینے لگا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو سال میں سرکاری جانب سے مڈل کے امتحان میں شریک کروادیا گیا لیکن دو سال میں ابجد سے بڑھ کر مڈل میں کامیابی حاصل کرنا مشکل تھا اس لئے محمود ناکامیاب رہا اس کے والد کے دوستوں نے رائے دی کہ محمود کو منشی کے امتحان میں شریک کروادو اس طرح لڑکا فارسی بھی پڑھے گا اور بیچ پوں کی زبان سیکھنے کی نوبت بھی نہ آئے گی۔ ایسا ہی کیا گیا۔ محمود کو ایک ہمدرد فارسی کے لائق استاد پڑھانے لگے انہوں نے بہت شفقت سے تعلیم دی۔ پہلے آمدن، کریا۔ اور نگار دانش کی چند حکایات پڑھائیں۔ شاگرد ذہین تھا بہت جلد فارسی میں چل نکلا دو سال کی محنت شاقہ کے بعد دیوان حافظ، صائب، سکندر نامہ اور رقعات عالمگیری وغیرہ ختم کی اور منشی کے امتحان میں درجہ دوم میں کامیابی حاصل کی۔

نئے مولوی صاحب کی رائے سے محمود دوبارہ سرکاری مدرسہ میں شریک کروادیا گیا۔ پرانی دقتیں دوبارہ عود کر آئیں۔ محمود کلاس میں مشکل سے چل سکتا تھا صرف مڈل میں تھوڑی بہت انگریزی پڑھی تھی لیکن بہت جلد ہی انگریزی میں ترقی کرنے لگا۔ دو سال کی سخت کاوش کے بعد میٹرک کے انگریزی پرچہ میں امتحان دینے کے قابل ہوگیا۔ محمود سرکاری طور پر امتحان میٹرک میں شریک کروادیا گیا لیکن ابھی تک محمود میں بعض کمزوریاں باقی تھیں نتیجہ کے طور پر امتحان میں ناکامیاب رہا۔ لیکن دوسرے سال میٹرک کامیاب کرلیا۔ اس وقت محمود کی مسرتوں کی کوئی حد نہ تھی۔ محمود نے کالج میں اختیاری مضامین سائنس اور ریاضی لئے غریب ریاضی بہت کم جانتا تھا لیکن اس قدر محنت کی کہ پہلے سال۔ سال دوم میں بھی ترقی مل گئی۔ دوسرے سال انٹرمیڈیٹ کے امتحان کے لئے بھیجدیا گیا۔ اب محمود کی حالت اچھی خاصی بدل گئی تھی محنت کا بھی کافی

عادی ہوگیا تھا کلاس میں حالت اچھی تھی پروفیسروں کو اس کی کامیابی کا یقین تھا مگر قسمت ہیٹی تھی کہ محمود کی ابتدائی تعلیم کے نقصان کا بدل ہونے کے بجائے محمود صرف تین نشانات سے ریاضی میں ناکامیاب کر دیا گیا جس سے اس کی ہمت پست ہونے لگی تمام خیالات تھر بھر ہو گئے ۔ یہ بیٹھا تھا کہ دو سال میں کسی صورت سے بی ، اے ہو کر انگلستان چلا جائے اور وہاں پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرے لیکن قسمت سے پیش نہ گئی ۔غریب نے استقلال کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا دوبارہ محنت شروع کر دی اور اپنے والدین سے لڑھکر انٹرمیڈیٹ کامیاب ہونے ہی انگلستان جانے کے کل انتظامات مکمل کروالیا جو اس کے لئے آسان کام نہ تھا ۔یوں بھی محمود کے والدین انگلستان جانے کے قائل نہ تھے کہتے تھے کہ "قسمت میں ہے تو انسان بغیر لندن گئے یہاں بھی ترقی کرسکتا ہے"۔ دوسرے محمود کو چاہتے بھی بہت تھے اس لئے دریا پار اپنے لڑکے کو بھیجتے ہوئے جھجکتے تھے ۔اور کسی طرح راضی نہیں ہوتے تھے لیکن محمود نے دل میں ٹھان رکھی تھی کہ انگلستان جاکر ہی رہے گا ۔والدین کو اس قدر مجبور کیا کہ ان کو خواہ مخواہ ہاں بھرنی پڑی دوسرا سبب محمود کی بیچینی کا انگلستان جانے کے لئے یہ بھی تھا کہ اس کا ایک دوست سال حال تعلیم کی غرض سے انگلستان جارہا تھا وہ چاہتا تھا کہ ان کے ہمراہ روانہ ہوجائے ۔

محمود دوبارہ امتحان دے چکا تھا پرچوں کے جوابات اطمینان بخش حالت میں لکھے تھے صرف نتیجہ کا انتظار تھا ۔نتیجہ شایع ہوگیا مگر کیسا نتیجہ محمود کے امیدوں پر پانی پھیر دینے والا اس کے تمناؤں کو خاک میں ملا دینے والا ۔اب محمود بالکل ناامید ہوگیا یہ سمجھنے لگا کہ اس کی قسمت میں کامیاب ہونا نہیں لکھا ہے ۔ استقلال ہاتھ سے جاتا رہا لیکن اس کے مخلص دوست اس کو آہستہ آہستہ راستی پر لے آئے ہر قسم کی تسلی اور تشفی کرتے رہے آخر محمود نے دوبارہ امتحان کے لئے تیاری شروع کر دی محمود نے کالج بھی بدلا اور اب کے سال نہایت شد و مد کے ساتھ تعلیم جاری رکھی ۔ یہ تیسرا وقت کہ محمود امتحان میں شریک ہوا پرچے نہایت اطمینان بخش حالت میں لکھے ۔ دوبارہ نتیجہ کا انتظار تھا دوسرے لندن جانے کے لئے بیچین ۔عزیز لندن جاچکے تھے لیکن ہر خط میں محمود کو جلد آنے کے لئے لکھتے تھے ۔

(۳)

(وہی پروفیسر صاحب کا برانگیختہ مزاج)

پہلا پرچہ ۔خط دیکھو بالکل ،بچوں سا ۔بہت زشت ۔جواب کو سلجھا کر لکھا ہے ۔ (غور کر کے) اچھا یہ

یہ مطلب ہے ۔ بات تو وہی ہے جو ہونی تھی ۔ ٹھیک بالکل ٹھیک (اپنے ہیجان سے متاثر ہو کر) نہیں نہیں سراپا غلط ۔ ایک دو کا جواب صاف صاف ہے مگر الفاظ پڑھے نہیں جاتے ۔ بے فکرے طالب العلم نے انڈھ کا سنڈھ لکھ مارا ہے (شمار کر کے) نمبر تو کم بخت کو خاصے کامیابی کے آئے ہیں لیکن نہیں ایسا نہیں ہو سکتا زشت خطی کی تعزیر گول مول لکھنے کی سرزنش بھی تو چاہیے (دوقفہ لیکر) اُنھ کچھ بھی ہی سب ایک قلم غلط .....
.... لغو (پرچہ کو الٹ کر)

دوسرا پرچہ ۔ یہ بھی اسی انداز میں لکھا ہے ۔ کیا کیا ...... اچھا یہ بات ہے ......
وہی طرز اتنی ہم خیالی ...... ناممکن (برہم ہوکر) ضرور کاپی کی ہوگی (نمبر دیتے ہوئے) ستایش، ہاں ستایش!

تیسرا پرچہ ۔ صاف خط ہے عبارت سے ذہنی منگھڑت معلوم ہوتی ہے ۔ عمل بھی صحیح نہیں ۔ صرف ترتیب میں صفائی ہے (۵۵) نمبر ارے چوک ہوگئی (۵۰) کا ہندسہ پڑ گیا ...... اُنھ باشد باشد ۔ کون کانٹ چھانٹ کرے ۔ رعایت معلوم ہوگی (آپ ہی آپ) کون اتنی چوکسی کرتے جاتا ہے لیکن نمبر کی صحت پر اعداد کی شکل بگڑ جائے گی ۔ غالباً احتمالی خیال پیدا ہوگا کہ بے جا اعانت کی گئی ہے ......
..... خیر رہنے دو ..... صحیح بالکل صحیح ۔

چوتھا پرچہ ۔ اخاہ نمبت‌لر ۔ ریاضی کا پرچہ ۔ اُس نے کہہ تو دیا تھا جواب گول مول ہے ۔ کم بخت نے مطلق محنت نہیں کی ہے (بڑبڑاتے ہوئے) جواب اناپ شناپ لکھ مارا ہے فضول، بالکل من گھڑت، اب کے زمانہ کے طالب العلم ایسے ہی پھسڈی ہوتے ہیں ۔ کسی کام پر جی نہیں لگاتے (غور کر کے) کامیابی کے نمبر بالکل نہیں آئے ۔ بدنصیب ہے (اندیشہ کرتے ہوئے) بیگم خفا ہوں گی (قلم اٹھا کر) کامیاب بے شک کامیاب ۔

(بعد ہی سارے کے سارے پرچوں کو سرسری طور پر اُلٹ پلٹ کر)

کون دیکھے دردسری محض دردسری ۔ وقت کی خرابی کے سوائے کچھ حاصل نہ فایدہ ۔ لکھت واہیات ۔ کس قدر رات آگئی (گھڑی دیکھ کر) بہت وقت گذر گیا کب تک جانچ کروں ۔ ہاتھ شل ہو گئے دماغ تھک گیا ۔ (پیچھے ٹیکا دیکر) بہت بگڑ گئیں دسترخوان تک نہیں بچھوایا دھوک سے بیچین ہو کر کمبخت ختم ہی نہیں ہوتے ۔ بس تو یہ ہی بات ہوتی چاہیئے ۔ اِدھر بیگم الگ اونٹ رہی ہوں گی ۔ ان کی کٹ حجتی سے الگ ناک میں دم ہے ۔ اور اس معلمانہ زندگی سے الگ ۔

اب پروفیسر صاحب پنجاب میل اوڑاتے لگے ایک آدھ سطر پڑھ کر کسی پر کامیابی کے نمبر ڈال دیتے اور کسی پر ناکامیابی کے۔ اس ردوکد میں پروفیسر صاحب بچارے محمود کے نوشتے امتحانی جوابات پر بلا سوچے سمجھے خط قسمت کی طرح ناکامیابی کے نمبر ڈال دیئے۔ حالانکہ محمود کے خیالات و عمل سے مستفیض ہونے والے طلبہ نے غیر معمولی کامیابی حاصل کرلی (سچ پوچھو تو یہ سود محض ان کی اتفاقی خوش نصیبی سے ان کے ہاتھ آگیا تھا) گویا ہوی کے بگاڑ کا نزلہ پروفیسر صاحب نے قلم غفلت رقم سے اسی طرح ٹپکا دیا کہ ناکامیاب طلبہ نے امید کے خلاف کامیابی کی صورت دیکھی اور باوصف بچی تلی کامیابی کے طلبہ کو ناکامیابی کی منزل ہی میں ہیٹا ہو کر رہنا پڑا۔

(۴)

ٹپک اے شمع آنسو بنکے پروانہ کی آنکھوں سے سراپا درد ہوں حسرت بھری ہے داستاں میری

محمود بیچین برآمدے میں ٹہل رہا تھا خبر اڑی تھی کہ آج نتیجہ شایع ہونے والا ہے۔ محمود کا عزیز دوست ناصر۔ رجسٹرار آفس نتیجہ دیکھنے گیا ہوا تھا۔ محمود کو اس کا سخت انتظار تھا۔ پانچ بج چکے تھے۔ ابھی تک ناصر نہیں لوٹا۔ محمود سمجھ رہا تھا کہ ناصر کا نہیں آنا خالی از علت نہیں۔ بقول ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ محمود ناصر کی تاخیر کے کئی اسباب سوچ رہا تھا۔ "آہ کیا ہوگا اگر میں اس سال بھی ناکامیاب ہو جاؤں"۔ اس نے سلسلہ خیالات جاری رکھتے ہوئے کہا اب اس میں انتظار کی تاب باقی نہ تھی۔ دامن صبر ہاتھوں سے چھوٹ چکا تھا۔ محمود کے لئے یہ چند لمحے وہ ناقابل برداشت لمحے تھے جو کسی اوسط درجے کے انسان کو اس کی زندگی میں بہت کم پیش آتے ہیں۔ اور جب آتے ہیں تو صدیوں لمبے ہو جاتے ہیں۔

پاؤں کی آہٹ نے اس کو چونکا دیا اس کا سلسلہ تخیل منقطع ہوگیا۔ ناصر سامنے کھڑا تھا لیکن اس نے ناصر کی صورت دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ کیا ہوا۔ "ناصر سچ کہو کہ کیا ہوا" محمود نے دھڑکتے ہوئے دل سے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا "توقعات کے خلاف" ناصر نے رُکتے ہوئے جواب دیا۔

خبر کیا تھی ایک برق بلا تھی کہ خرمن مسرت اور راحت کو دم بھر میں خاک سیاہ کر گئی۔ جب انسان اپنی توقعات کے خلاف خود کو ناکام دیکھتا ہے تو وہ مغموم ہو جاتا ہے اور اس کی زندگی تاریک۔ اس طرح "مسرت کی تلاش کا حاصل غم اور خوشی کے تمنا کا نتیجہ رنج ہوتا ہے" شدید صدمہ تھا۔ محمود کھویا ہوا تھا۔ دنیا کی تمام دلفریبیاں اس کے لئے کوئی دل کشی نہ رکھتے تھے۔ ناصر محمود کا سچا دوست

اس کا رنج والم کرنے کی ہر چند کوشش کی کہ محمود کی طبیعت کو بہلائے۔ لیکن ناصر کی کوششیں پوری نہ ہو سکیں۔
نتیجہ شائع ہو کر تین دن ہو چکے ہیں لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا محمود کی اُداسی میں اضافہ ہوتا چلا تھا۔ کھانے کی اشتہا باقی نہ تھی۔ نیند اس سے کوسوں دور ہو چکی تھی۔ دنیا ایک تاریک شئے نظر آرہی تھی۔ رات کے دو بج چکے تھے محمود میز کے قریب بیٹھا ہوا کچھ ایسے خیالات میں محو تھا کہ اُسے دنیا اور مافیہا کی کچھ خبر نہ تھی۔ چراغ کی روشنی اس کے گول چہرہ پر پڑ رہی تھی اس کے چہرہ کا تغیر اس کے اندرونی احساسات کا پتہ دے رہا تھا۔ اس کا چہرہ کبھی سفید پڑ جاتا تھا اور کبھی سُرخ۔ کبھی مرقع یاس بن جاتا تھا اور کبھی تصویر حیرت۔ پیشانی پر ٹھنڈے ٹھنڈے پسینے کے قطرات جمع ہو رہے تھے۔ اُس کی آنکھیں پُرنم تھیں اور وہ اپنے آپ یوں بڑبڑا رہا تھا۔ شعر ؎

بنائیں کیا سمجھ کر شاخ گل پر آشیاں اپنا چمن میں آہ کیا رہنا جو ہو بے آبرو اپنا

محمود پر دوبارہ خموشی طاری تھی لیکن دماغ کچھ سوچ رہا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی خاص نتیجے پر پہنچنے کی کوششیں کر رہا ہے۔ اس کے خیالات خطرناک حد تک آزاد ہوتے جا رہے تھے۔ چہرہ کا اتار چڑھاؤ ہاتھ پیر کی بے معنی حرکتیں آنکھوں کی مجنونانہ چمک اس بات کا ثبوت دے رہی تھی کہ وہ اس وقت کسی فیصلہ آخر پر پہنچنا چاہتا تھا آخر کار اس نے فیصلہ کر ہی لیا کیسا فیصلہ نہایت ہی خوفناک فیصلہ۔ ایسا فیصلہ جو حسرت اور یاس کی انتہائی گہرائیوں میں بھی ڈوبنے کے بعد انسان کرتے ہوئے لرزتا ہے۔ محمود کے چہرہ پر یکایک اُداسی چھا گئی اس نے اپنے دراز پاؤں کو جو کانپ رہے تھے نزدیک کھینچا۔ پھر کھینچا۔ آخر کار اٹھا۔ ایک ایسے پرندے کی مانند جس کے پر نوچ لئے گئے ہوں جو قید کی بندشوں کو توڑ کر اڑ جانا چاہتا ہو۔ محمود دروازے کی طرف بڑھا کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بمشکل دروازہ کھولا۔ آہستہ آہستہ سیڑھیوں سے اُترتا ہوا صحن میں داخل ہو گیا۔ پھر یکایک دوڑنے لگا۔ تقدیر معلوم نہیں اس کو کہاں کشاں کشاں لیجا رہی تھی۔ ہر سو پچاس قدم پر پلٹ پلٹ کر وحشتناک نظروں سے گھر کی طرف دیکھتا جاتا تھا اور پھر دوڑتا جاتا تھا۔

تین ماہ ہو چکے ہیں محمود لاپتہ ہے۔ اُس کے والدین اس کی تلاش سے عاجز آگئے۔ اور ان کی تمام محنتیں اکارت گئیں۔ محمود کے دوستوں کو بھی محمود کی جدائی کا بڑا ہی قلق رہا۔

تسکین قلب

(شکسپیر کی ایک مشہور عالم نظم کا سلیس ترجمہ)

از

جناب رشید احمد صاحب حیدرآبادی

نگاہیں دہر کی پلٹی ہوئی رہتی ہیں جب ہم سے
دکھائی دیتے ہیں آثار جب اپنی خرابی کے

مقدر سے بگڑ جاتے ہیں جب سب کام بن بنکر
مصیبت پر مصیبت آتی ہے جب آفت آفت پر

سفینہ جب کہ گھر جاتا ہے طوفان مصائب میں
محبت ہوتی ہے مفقود جب خویش و اقارب میں

ترقی کی ہوس جب باعث آزار ہوتی ہے
فلاکت سے بہت جب زندگی دشوار ہوتی ہے

رہائی جب نہیں ہوتی غم و اندوہ و حرماں سے
بکھیڑے زندگی کے تنگ کر دیتے ہیں جب جاں سے

مجھے جب دوسروں کی زندگی پر رشک ہوتا ہے
تمناؤں پہ اپنی جب دل ناکام روتا ہے

تو ان اوقات میں تیری محبت یاد آتی ہے
محبت یاد آتے ہی مصیبت منہ چھپاتی ہے

تاریخ ادب کی خصوصیات

از

جناب سید شاہ محمد صاحب بی، اے عثمانیہ

تاریخ ادب سے کسی زبان کی ادبی کتابوں کا بلحاظ ترتیب زمانی مطالعہ مراد ہے۔ لیکن چونکہ کسی کتاب کے خیال کے ساتھ اس کے مصنف کے خیال کو بھی مربوط کیا جاتا ہے۔ اس لیئے تاریخ ادب میں کتابوں اور ان کے مصنفین کا احوال ہوتا ہے۔

یہاں تک تو تاریخ ادب کی تعریف ہوئی۔ اب ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ تاریخ ادب کی خصوصیات کیا ہیں؟ سب سے پہلے شخصی عنصر (PERSONAL ELEMENT) کا لحاظ نہایت ضروری ہے۔ کوئی کتاب اپنے مصنف کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ بالفاظ دیگر ہر کتاب خود ہمیں مضمر شخصیت کی طرف لیجاتی ہے۔ اسی کے ذہن وذکاوت کی وہ پیداوار ہوتی ہے اور اسی کے خیالات وحسیات کا مجسمہ۔ اس لحاظ سے تاریخ ادب میں ہماری توجہ ان شخصیتوں پر ہونی چاہیئے جنھوں نے ادب کی ساخت وتشکیل میں حصہ لیا۔ ایک مختصر کتاب میں ہم ان کی حیات، تجربات وکردار کی پوری تفصیل ظاہر نہیں کر سکتے۔ تاہم ہماری یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ مختلف اشخاص (یا مصنفین) میں ذکاوت کے لحاظ سے فرق وامتیاز کریں۔ ذکاوت کا مفہوم نہایت وسیع ہے لیکن ادبی دنیا میں شخصی قوت اور جدت مراد ہے کیا خوب کہا گیا ہے کہ ہر بڑا مصنف دنیا میں ایک بالکل نئی چیز لاتا ہے یعنی خود اپنی ذات۔ اور یہ صحیح ہے کیونکہ وہ اپنی تحریرات میں خود کو منتقل کرتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا بیان اپنا ایک مخصوص اور ممتاز رنگ اختیار کرلیتا ہے۔ اور دوسرے اشخاص کے بیان سے مختلف ہوجاتا ہے۔ ہر شاہکار کے مطالعہ میں شخصی عنصر جزء لاینفک ہے کسی تاریخی مطالعہ میں گو وہ کتنا ہی مختصر اور غیر تفصیلی کیوں نہ ہو اس عنصر کو احتیاط سے پیش نظر رکھنا چاہیئے، کیونکہ اس کے بغیر ہم نہیں سمجھ سکتے کہ فلاں مصنف کو اپنی قوم کے ادبیات میں یہ درجہ کیوں ملا ہے؟ اس نقطۂ نظر سے تاریخ ادب کا اہم کام یہ ہے کہ ہر مصنف نے شخصی طور پر جو خاص سرمایہ اپنے ادب میں چھوڑا ہے اس کی نوعیت اور قدر کو واضح کیا جائے لیکن یہ کام اس کے فرائض کا چھوٹا سا حصہ ہے کیونکہ مصنفین اور ان کی تصنیفات کی محض ایک فہرست

کو تاریخ ادب نہیں قرار دے سکتے۔ ادب بحیثیت مجموعی بلحاظ مرورِ ادوار نشوونما پاتا اور بدلتا رہتا ہے۔ تاریخ کا کام یہ بتانا ہے کہ اس دفتر میں ہر مصنف کی جگہ کیا ہے اور اس کا تعلق اپنے متقدمین و متاخرین کے ساتھ کس طرح رہا۔ ایک غیر معمولی شخصیت والا مصنف یقیناً اپنے عہد کے ادب پر اپنا اثر چھوڑتا ہے اور بہت سے متاخرین ارادۃً یا بلا ارادۃً اس کی پیروی کرنے لگتے ہیں اس طرح سے "درسگاہیں" اور "تحریکات" وجود میں آتی ہیں، یہ ایک خاص عرصے تک قائم رہتی ہیں اور مذاق و حالات کی تبدیلی کے ساتھ دوسری "درسگاہیں" اور "تحریکیں" ان کی جگہ لیتی ہیں۔ مثلاً انگریزی ادب میں پوپ کا مدرسہ۔ رومانی تحریک وغیرہ اس قسم کی درسگاہیں اور تحریکیں ہمیشہ ارتقائے ادب میں بڑا حصہ لیتی ہیں اور متعلم کے لئے انفرادی مصنفین کی سی اہمیت رکھتی ہیں۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ سب سے زیادہ بلند پایہ مصنف بھی اپنا ذہنی سلسلہ و میراث رکھتا اور تحریک و مثال کے باعث دوسروں کا مرہون منت ہوتا ہے۔

ابھی ابھی پوپ کے مدرسہ کا ذکر کیا گیا لیکن اس کا خاص انداز بیاں اس کا اپنا تراشیدہ نہیں تھا البتہ اس کے ہاتھوں اس کی تکمیل ہوئی۔ یہ انداز بیان ایک طولانی ادبی تحریک کا نتیجہ تھا جس کی ایک بڑی پیداوار پوپ کا پیشرو ڈرائڈن تھا۔ اسی طرح رومانی تحریک کا حال ہے جس کا زبردست معلم و حامی سر والٹر سکاٹ تھا۔ لیکن رومانی درسگاہ کا معلم بننے سے پہلے اسکاٹ کو اپنے پیشرووں سے اس مدرسہ میں تعلیم پانا پڑا۔ تاریخ ادب میں ان تمام امور کا تذکرہ ضروری ہے۔ مصنفین اور گروہوں کے درمیان تعلقات کو واضح کرنا چاہیئے۔ درسگاہوں اور تحریکوں کی پیدائش، ترقی و زوال سے بحث کرنا چاہیئے اور اگر کوئی مصنف ان کی پیدائش یا ترقی کا باعث ہوا ہو تو اس کے اثر کو بھی ظاہر کر دینا چاہیئے۔

لیکن ہمارا کام یہیں ختم نہیں ہوتا۔ پہلے کہا جا چکا ہے کہ ادب بحیثیت مجموعی حسب مرور ادوار بڑھتا اور بدلتا رہتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہر عہد کی دلچسپیاں اور اشیاء سے متعلق خیالات مخصوص ہوتے ہیں اس لحاظ سے اس عہد کا ادب ایک خاص مذاق کی پیداوار ہوتا ہے یہ مذاق ایک خاص عرصہ تک قائم رہتا ہے اور ایک عہد کا مذاق عموماً دوسرے عہد سے مختلف ہوتا ہے۔ مثال کے لئے ہم عہد وکٹوریا کو لے سکتے ہیں جس کو گزرے تھوڑا سا عرصہ ہوا لیکن ہمیں معلوم ہے کہ جس طرح اس زمانہ کی بعض رسوم و رواج ہمارے لئے اجنبی ہیں۔ اسی طرح اس عہد کے ادب کی بعض باتوں کا حال ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ عہد سپنسر (SPENSER) میں فیری کوئین (FARIE QUEEN) کی اور عہد پوپ میں ریپ آف دی لاک (RAPE OF THE LOCKE)

کی اور عہد اسکاٹ میں لیڈی آف دی لیک (LADY OF THE LAKE) کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی بہت زیادہ تھی۔ اس اعتبار سے تاریخ ادب کا اہم کام یہ بھی ہے کہ ایک عہد سے دوسرے عہد تک ادب کی تبدیلیوں کو واضح کرے اور ان کے اسباب کی چھان بین کرے۔

ان اسباب میں سب سے پہلے افراد انسانی کا اثر قابل لحاظ ہے۔ کیونکہ ایک بڑا مصنف ایک نیا مذاق پیدا کرتا اور ادب میں نئے باب کا اضافہ کرتا ہے لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ ہر صاحب ذکاوت اپنے گردوپیش کے حالات اس کی تہذیب، خیالات اور دماغی و اخلاقی رجحانات سے لازماً متاثر ہوتا ہے اس لئے اس کی تحریرات کی خصوصیت پر ان باتوں سے روشنی پڑتی ہے اگر ایک زبردست شخصیت والا مصنف اپنے عہد پر اپنا ایک نقش بٹھاتا ہے تو ساتھ ہی وہ اپنے عہد سے بھی متاثر ہوتا ہے۔ اس کے بیان کی قبولیت عموماً ملک کی دلچسپی و مذاق کے مطابق ہوتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے ہم ہر مصنف کو اپنے عہد کی پیداوار سمجھ سکتے ہیں۔ اس کے بعد ہم اس زمانہ کے ان اثرات کی تلاش کریں گے جنہوں نے اس کے خیال و مذاق کی رہبری میں حصہ لیکر اس کے کلام میں امتیازی رنگ پیدا کر دیا۔

اس قسم کی تحقیق بہت وسیع ہوتی ہے۔ کبھی زیر بحث اثرات خالص "ادبی" ہوتے ہیں یعنی وہ بعض کتب و ادبیات کے مطالعہ سے متعلق ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایلزبتھی ادب پر غور کر سکتے ہیں نشاۃ جدیدہ نے اس عہد میں یونانی اور لاطینی ادب عالیہ (CLASSICS) کے مطالعہ کا ذوق پیدا کر دیا تھا اور اسی ذوق نے انگریزی ادب کے ہر باب میں شاندار نتائج پیدا کئے۔ اسی طرح سترھویں صدی کے اختتام پر فرانسیسی ادب کا اثر انگریزی ادب پر غالب تھا اور ایک سو سال بعد یہ جگہ جرمن ادب نے لے لی۔ مگر اکثر دفعہ یہ اثرات "غیر ادبی" ہوتے ہیں اور عموماً حیات، سیاسیات اور اجتماعیت کی وجہ رونما ہوتے ہیں۔ کسی عہد کی زندگی میں جو چیزیں نئی دلچسپیوں اور خیالات کا باعث ہوئیں یا جو چیزیں اس کے خیالات و جذبات کی متغیر تشکیل کا سبب ہوئیں یا جو باتیں اشیاء و اشخاص سے متعلق اس عہد کے زاویۂ نگاہ کی تبدیلی کا باعث ہوئیں۔ ان تمام کو اس عہد کے ادب کی پیدائش میں جزو لازمی سمجھنا چاہیئے۔ اس لئے ہر کتاب کے ساتھ ساتھ اس کے عہد کے حالات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے مثلاً تحریک اصلاح (REFORMATION) انقلاب فرانس، انیسویں صدی میں ترقی سائنس۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ عام تاریخ اور تاریخ ادب میں کتنا گہرا رشتہ ہے۔

آخر میں ہم تاریخ ادب کے فرائض کا خلاصہ کر سکتے ہیں۔ اس کا بڑا مقصد ارتقائے ادب کی چھان بین

ایک عہد سے لیکر دوسرے عہد تک اس کی تبدیلیوں کی تحقیق اور اس کے مواد و صورت میں واقع ہونے والے تغیرات کی توضیح سے اس کے بعد ان تغیرات کے اسباب و علل سے بحث کرنا بھی ضروری ہے۔ اس طرح یہ نہ صرف اشخاص اور ان کے ادبی سرمایہ کی تاریخ ہو جاتی ہے بلکہ ان شخصی اور غیر شخصی قوتوں کی بھی جو ان کے کام میں ممد ہو جائیں ۔

(ماخوذ از ہڈسن)

حافظ شیراز

رسالہ نگار کی رائے:-

اس کتاب میں مولوی سید یوشع بی، اے، نے جو متوسلین دکن میں سے ہیں، حافظ کی شاعری پر خود اس کے شعروں سے مدد لیکر تنقید کی ہے یعنے انہوں نے ظاہر کیا ہے کہ حافظ خود اپنی شاعری کے متعلق کیا رائے رکھتا تھا یہ مقالہ اسلوب بیان و ندرت گفتگو کے لحاظ سے اچھا ہے..... طباعت کتابت نہایت پاکیزہ، قیمت (۸/)

مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد

خانہ برباد

از

جناب سید علی شبیر صاحب صدر منتظم عدالت عالیہ

وہی دھوپ ہے وہی چھاؤں ہے　　یہ تو ہو نہ ہو میرا گاؤں ہے

مجھے یاد ہے مجھے یاد ہے

وہی گلیاں ہیں یہ جہاں کبھی　　پھرا کرتا تھا میں خوشی خوشی

مجھے یاد ہے مجھے یاد ہے

یہ درخت ہے وہی نیم کا　　میں تو جھولا جس میں تھا ڈالتا

مجھے یاد ہے مجھے یاد ہے

یہی ہاں وہ توتے کا تال ہے　　میں یاں تیرتا تھا خیال ہے

مجھے یاد ہے مجھے یاد ہے

وہ مکان اگلے اُجڑ گئے　　یہ تمام گھر ہیں نئے نئے

مجھے یاد ہے مجھے یاد ہے

میرے گھر کا نقشہ بدل گیا　　کوئی اور اس میں ہے آ رہا

مجھے یاد ہے مجھے یاد ہے

وہ مکاں رہا نہ مکیں رہے　　میرے ساتھی ہائے کہاں گئے

مجھے یاد ہے مجھے یاد ہے

مرا رہنا سہنا اے بام و در　　تمھیں یاد ہو کہ نہ ہو مگر

مجھے یاد ہے مجھے یاد ہے

دیا سلائی

از

جناب ناکارہ حیدرآبادی

تمہید | بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ کسی شخص سے رستہ میں ایک آدھ دیا سلائی مانگ لینا ایک نہایت ہی سہل کام ہے۔ مگر میرے نزدیک یہ خیال نہایت مضحکہ خیز ہے۔ میں یہاں دلائل و براہین سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ صرف اپنی خاص ڈائری سے میرا اپنا ایک تلخ تجربہ" نقل کئے دیتا ہوں جسے آپ لوگ جھوٹ سمجھ کر پڑھیں تو زیادہ بہتر ہوگا اسے پڑھنے کے بعد بھی اگر بعض ناظرین کو اختلاف رائے ہو یا شکوک باقی رہ گئے ہوں تو وہ بالمشافہ یا خط و کتابت کے ذریعہ مجھ سے سوال کر سکتے ہیں اور اپنے شبہات دور کر سکتے ہیں۔ آخر میں یہ کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔

"اتر جاؤ!" ایک سیاہ پوش شخص نے سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا تھا، پکارا۔

میں نے اپنے دل کو تسلی دے لی کہ یقیناً میں اس شخص کا مخاطب نہیں۔ اور برابر بائیسکل کے پیڈل مارتا گیا۔ مجھے یہ معلوم کرنے کی ضرورت تھی نہ پروا کہ پولیس کا سپاہی کس بدنصیب کو اتر جانے کا حکم دے رہا ہے۔ مگر پھر آواز آئی "لیمپ جلاؤ! ...... فر فر فر!"

میں نے اپنے لیمپ کی طرف دیکھا اور پھر مڑ کر سپاہی کو دیکھا۔ غریب اپنے ہاتھ زور سے ادھر ادھر دائیں بائیں آگے پیچھے ہلا رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ناچ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ یا تو کسی افریقی رقص کا مظاہرہ کر رہا ہے یا قواعد کر رہا ہے۔ مجھے اس کی اس حالت بےکسی و بےبسی پر بڑا ترس آیا۔ میں فوراً اپنی بائیسکل پر سے اتر پڑا۔ ممکن تھا کہ ایسا کرنے کے بجائے سپاہی کی چیخ پکار

کی پرواہ کرکے میں تیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے نکل جاتا۔ مگر پھر مجھے فوراً ہی یاد آگیا کہ قریب ہی ہیں ایک تھانہ ہے۔ اس وقت بائیسکل کا لیمپ جلا لینا ہی مناسب معلوم ہوا۔ چنانچہ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ دیا سلائی کی ڈبیہ ندارد۔ میں نے کہا چلو۔ دو پیسوں کی قربانی ہی سہی۔ مگر پھر خیال آیا کہ دو پیسے ہاں چارپائی! جی ہاں ایک دو نہیں۔ اکٹھے چار پائی، محض ایک دیا سلائی کے واسطے خرچ کرنا اسراف نہیں تو اور کیا ہے۔ ان دو پیسوں کا اس سے بہتر مصرف ہو سکتا ہے۔ آج جمعرات کا دن ہے اور شہر میں فقیروں کی کمی نہیں۔ اس طرح کیوں نہ ثواب کمایا جائے؟ کسی رہرو سے کیوں نہ دیا سلائی مانگ لی جائے؟

مجھے زیادہ دیر ٹھہرنا نہ پڑا۔ میں نے پہلے گذرنے والے سے پوچھا: "کیا آپ کی جیب سے ایک آدھ دیا سلائی برآمد ہو سکے گی؟"

چونکہ سوال ذرا پیچیدہ اور ٹیڑھا تھا اس لئے اسے سمجھنے میں ذرا دیر ہوئی۔ "نہیں ہے ناجی حضرت!" اس نے ایک منٹ میرا منہ تکنے کے بعد کہا۔ اور وہاں سے اس طرح دفع ہوا گویا میں اس پر بل پڑنے والا ہی ہوں۔

کچھ دیر بعد ایک اور آدم کے بیٹے کا اُدھر سے گذر ہوا۔ میں سدِ راہ ہو گیا۔ "آپ پاس دیا سلائی ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"دیا سلائی چاہیئے؟" آپ کہنے لگے "ابھی حاضر کرتا ہوں" اور ساتھ ہی ساتھ شیروانی کی جیب میں ہاتھ ڈالنے اور نکالنے کا عمل شروع ہو گیا۔ "مجھے خوب یاد ہے" آپ نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "کہ میں نے ایک ڈبیہ کل ہی خرید کے اس شیروانی میں رکھی تھی۔ اللہ کی قسم وہ ڈبیہ پیچھے کی جیب میں کل سے پڑی تھی ——— یا ہاں بہت ممکن ہے کہ اوپر کی جیب میں ہو۔ ٹھہریئے ٹھہریئے۔ ذرا ان پارسلوں کو تھام لیجئے۔"

"کوئی مضائقہ نہیں" میں بولا۔ "خواہ مخواہ آپ تکلیف نہ کیجئے۔ میں کسی اور شخص سے مانگ لوں گا۔"

کہنے لگے "واہ تکلیف کی کونسی بات ہے؟ ابھی ایک منٹ کے اندر مل جاتی ہے۔" اور پھر آپ کی لمبی لمبی انگلیاں ان کی اپنی جیبوں کی گہرائیوں میں غوطے لگانے لگیں۔ پھر یہ وہ شیروانی نہیں جو میں عموماً . . . . . ."

میں نے دیکھا کہ آپ کا جوش و خروش لمحہ دو نی تا تیہ چوگنی ترقی پر ہے۔ اُسے ٹھنڈا کرنا ہی بہتر معلوم ہوا۔ "خیر جانے دیجئے" میں نے کہا "اگر یہ شیروانی وہ نہیں جو آپ عموماً .... تو خیر جانے دیجئے۔ کوئی مضائقہ نہیں" مگر شاید انہوں نے نہیں سنا۔ بولے۔ ٹھہرو۔ ٹھہرو۔ ڈبیہ کہیں نہ کہیں ضرور ہونا چاہیئے شاید اس میں ہو۔ نہیں، اس میں بھی نہیں۔ ٹھہرو ذرا اپنی واسکوٹ کو دیکھ تو لوں۔ اگر وہ حرامخور درزی جانتا کہ شریف آدمیوں کی جیبیں کس طرف لگائی جاتی ہیں ......"

میں نے سوچا کہ شاید ایسے ہی موقعوں پر کہا جاتا ہے کہ ناچ نہ آئے آنگن ٹیڑھا۔ اس وقت تک اس کی حالت عجیب و غریب ہو گئی تھی۔ اس نے جھنجلا کر اپنی چھڑی ایک طرف کو پھینک دی "یہ سب میرے ناخلف لونڈے کا کیا دھرا ہے" اس نے اپنی خشخشی ڈاڑھی کے بال نوچتے ہوئے کہا "یہ معاش ہر وقت ٹٹولتا رہتا ہے۔ جب دیکھو میری شیروانی سے کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے۔ گھر چلکر اس نامراد کی کھال نہ ادھیڑ ڈالی اور اسے کچا نہ چبا ڈالا تو کچھ نہ کیا۔" معاً میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میرے تصور کی صورت آنکھوں میں پھر گئی۔

"آہ! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں!" میں کہنے لگا "خدا کے لئے (بقول آپ کے) اپنے ناخلف لخت جگر نور نظر کو اس لہجہ میں نہ کوسئے۔ ہے ہے! مجھے آپ کی اس خشخشی ڈاڑھی پر بڑا ترس آرہا ہے۔ کیوں آپ اس بیچاری کے بال نوچ رہے ہیں! اور یہ آپ نے کیا فرمایا کہ گھر پہنچکر اپنے ہی لونڈے کو کچا کھا جاؤنگا خدانخواستہ آپ مردم خوار کی نسل سے تھوڑے ہی ہیں جو ایسا کرنے چلے۔" مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ نہیں سن رہا ہے۔

ارے ہاں! ذرا صبر سے کام لیجئے" وہ کہہ رہا تھا "پتلون کی جیب میں دیکھتا ہوں۔ آپ میری شیروانی کا دامن ...."

میں نے خیال کیا کہ سب سے بہتر ایک مختصر مگر موثر تقریر کرنا ہوگا "جناب آپ خواہ مخواہ زحمت مت فرمائیے۔ ڈبیہ نہ ملی نہ ملی۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ نہیں نہیں۔ آپ کو اپنی شیروانی اتارنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ آپ یہ کاغذات ایسی بے دردی سے کیوں پھینک رہے ہیں؟ از راہ کرم اپنے پارسل واپس لے کر بندہ کو ممنون و مشکور فرمائیے ــــ اور آہ! آپ اپنے کپڑے اس بے رحمی سے پھاڑنے کی کیوں کوشش کر رہے ہیں؟ کیا آپ کا دھوبی اس کا اہل نہیں؟ اور یہ آپ ...."

یکایک اس کے منھ سے ایک ہلکی سی چیخ، خوشی کی چیخ نکل گئی۔ اس نے اپنا ہاتھ پتلون کی جیب سے باہر نکالا "میں نے پالیا! میں نے پالیا! یہ لیجیے!" وہ چلایا، اسی طرح جس طرح ارشمیدس اپنے تجربہ کو کامیاب ہوتے دیکھ کر مارے خوشی کے چلایا ہوگا مگر فرق صرف اس قدر تھا کہ وہ سائنس داں بالکل ننگ دھڑنگ تھا۔ جی چاہا کہ اپنے آپ کو اس فرشتہ خصلت شخص کی لمبی گردن پر ڈال دوں میں نے کہا چلو اتنی دیر کی محنت اکارت تو نہیں گئی۔ کچھ ہو آخر ڈبیہ مل تو گئی۔ میں نے ڈبیہ اس کے ہاتھ سے لے لی، اس کا شکریہ ادا کیا اور کھول کر دیکھا۔

دیا سلائی کی ڈبیہ خالی تھی! — یکایک میرے بہیمانہ جذبات بیدار ہو گئے۔ میں نے اس شخص کو ایک گذرنے والی موٹر کے سامنے ڈھکیل دیا اور جو ہو سو ہو کہکر اپنی رفیق حیات (بائیسکل) پر سوار ہو "ہوں میرا بھائی" ہوگیا — اس روز سے لیکر آج تک مجھے پھر کسی سے دیا سلائی مانگنے کی خواہش ہوئی ہے نہ ہمت۔

وفورِ اضطراب

از

جناب محمد جمیل احمد خان صاحب کوکب شاہجہانپوری

رہے گی چیرہ دستی تا کجا تارِ گریباں پر — جنوں کو دسترس اے کاش ہوتی رشتۂ جاں پر

وفورِ اضطراب و جوشش وحشت معاذ اللہ — کہ ہوتا ہے گمانِ صبحِ محشر شامِ ہجراں پر

ترے ذوقِ خلش کی اے دلِ مجروح کچھ حد بھی — کہ دم آنکھوں میں ہے حسرت بھری نظریں نمکداں پر

کوئی شوریدہ سر کیا آج ہی کل میں رہا ہوگا — قیامت کی اداسی ہے در و دیوارِ زنداں پر

طریقِ حسن میں یہ بھی مگر ہے طرزِ غمخواری — کوئی رہ رہ کے ہنستا ہے مرے حالِ پریشاں پر

نہ چھیڑ اے آرزو اب کشتۂ تیغِ تغافل کو — وہ بت اور آئے بہرِ فاتحہ گورِ غریباں پر

مدد اے شانِ وحدت المدد اے ذوقِ نظارہ! — پڑے ہیں جلوۂ کثرت کے پردے چشمِ حیراں پر

ضرورت ہے کہ وا ہو دیدۂ عبرت نظر کو اب — عجب عالم ہے ہنگامِ سحر شمعِ شبستاں پر

حکیم قاآنی

(میرزا حبیب شیرازی)

از

جناب عبدالقوی صاحب فانی، ام، اے (علیگ) لکچرار فارسی لکھنو یونیورسٹی

پروفیسر فانی، حکیم قاآنی کی سوانح حیات اور تنقید کلام پر ایک بسیط محققانہ مقالہ لکھ رہے ہیں جس کے مختلف حصے بعض رسالوں میں شائع ہوئے۔ اس سے پہلے اس موضوع پر پروفیسر صاحب موصوف کا ایک مضمون "مکتبہ" کے ذریعہ ہدیہ ناظرین کیا جا چکا ہے۔ یہ مضمون درحقیقت اس سے پہلے شائع ہونا چاہیئے تھا لیکن پریس کی مثلوں میں ایسا چھپا رہا کہ آج تک دستیاب نہ ہو سکا تھا۔ امید ہے کہ قارئین کرام خصوصاً فارسی ادب کے متعلق اس کو بڑی دلچسپی سے مطالعہ فرمائیں گے۔ (مکتبہ)

خاندان اور پیدائش سرزمین ایران کے اس سدا بہار چمنستان میں جہاں بلبل شیراز[۱] اور لسان الغیب[۲] نے شاخسار سخن پر جلوہ افروز ہو کر زمزمہ سنجی کی تھی اور بہاری دنیا کو محو کر دیا تھا میرزا محمد علی گلشن[۳] کے آشیانہ میں خیابان کلام کے ایک اور ہزار داستان کا ظہور ہوا جس کی چہک اور نوا سنجیوں نے چار دانگ عالم سے خراج تحسین حاصل کیا۔ شکرستان فصاحت کا یہ طوطی اور گلستان بلاغت کا یہ بلبل میرزا حبیب قاآنی تھا۔ شیراز میں ۱۲۲۲ھ؁ میں پیدا ہوا۔ اپنی کتاب[۴] "پریشان" کے آخر میں جو میرزا حبیب نے سعدی کی گلستان کے طرز پر تصنیف کی تھی لکھتا ہے:-

شکر کہ از یاریِ یزدانِ من　　جمع شد اوراق پریشانِ من

. . . .

رفتہ ز ماہِ رجب ایام بیست　　پنجہ و دو سال و ہزار و دویست

کم بود از سی دو سہ مہ سالِ من　　لیک بسے خستہ بُود حالِ من

---

[۱] شیخ مشرف الدین ابن مصلح الدین سعدی شیرازی۔ [۲] خواجہ محمد شمس الدین حافظ شیرازی [۳] مجمع الفصحا جلد ۲ صفحہ ۴۲۶ [۴] پریشان صفحہ ۸۴ مطبوعہ بمبئی ۱۲۷۵ھ

کہنا ہے شکر ہے کہ خدا کی مدد سے میری کتاب پریشان ۲۰ رجب المرجب ۱۲۵۲ھ (مطابق یکم نومبر ۱۸۳۶ء) کو جبکہ میری عمر ۳۰ سال ہونے میں دو تین ماہ کم تھی ختم ہوئی۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ قاآنی کا سنہ پیدائش ۱۲۲۲ھ (مطابق ۱۸۰۷ء) تھا۔

جس خاندان سے اس رنگین مزاج شاعر کا تعلق تھا اس کا نام زنگنہ تھا۔ میرزا حبیب کے والد میرزا محمد علی جن کا تخلص گلشن تھا خود بھی ایک اچھے شاعر تھے۔ ان کی نسبت مؤلف مجمع الفصحا[1] لکھتے ہیں :-

"در ایام شیب اوکہ زمان شباب مولف بود مکرر در شیراز صحبتش دست می داد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سیاق اشعارش پسندیدہ فصحای زماں بنفیاد"

بچپن اور یتیمی قدرت نے ذہانت اور حافظہ کا عطیہ میرزا حبیب کو نہایت فیاضی سے عطا کیا تھا۔ جو باتیں اور بچے مدتوں میں سیکھتے وہ بہت جلد سیکھ لیتا۔ والدین کو اس ہونہار فرزند سے بہت محبت تھی۔ یہ اللہ آمین کی اولاد نازونعم میں پرورش پاتی رہی اور باپ کی تربیت آموز نظر کچھ کم گیارہ برس تک اتالیق کا کام دیتی رہیں۔

زمانہ کی گردش نے اس گوہر شاہوار کو بہت جلد دریتیم کر دیا اور وہ محبت بھری آنکھیں جو میرزا حبیب کے جمال کو دیکھ کر روشن رہتی تھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں یعنے شفیق باپ کا سایہ میرزا حبیب کے سر سے اُٹھ گیا۔

میرزا طاہر جو ناصر الدین شاہ کے زمانہ کا ایک اچھا شاعر اور ادیب تھا گنج شائگاں[2] میں لکھتا ہے:-

"درسِ ہفت سالگی از پدر مرحومش میرزا ابوالحسن کہ متخلص بہ گلشن بود وطبعش گلشن فصاحت را چشمۂ روشن خلف ماند"

لیکن خود میرزا حبیب اپنی کتاب[3] پریشان میں ایک جگہ لکھتا ہے :-

"یازدہ سالہ بودم کہ پدرم گلشن را کہ شمع کمال بنور جمالش روشن بود خارے در پا رفت وہنوز

---

[1] مجمع الفصحا جلد ۲ ص ۴۲۶

[2] دیوان حکیم قاآنی مطبوعہ بمبئی ۱۲۷۰ھ کی ابتدا میں جو مختصر حال قاآنی کا لکھا ہے وہ گنج شائگاں سے منقول ہے۔

[3] کتاب پریشاں ص ۱۹ مطبوعہ بمبئی۔

خارش در پا بود کہ کارش از دست شد۔ چہ بمقتضائی ہرم[۱] از اں خارش در پا ورمی حادث شد کہ طبیبان بدرمانش درماندند و آیہ اِذَا جَاءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَاخِرُوْنَ[۲] فرو خواندند۔ در آں حالت کہ اجلش فرا رسید....... وصید جانش از قید تن رمیدن گرفت۔"

بہر حال میرزا حبیب کا سن ابھی اس قابل نہ تھا کہ اس پر یتیمی کا کوہ گران اور پریشانیوں کا آسمان اس طرح یک لخت ٹوٹ پڑتا۔ یہی عمر پڑھنے لکھنے کی تھی اور یہی عمر کھانے پینے اور نشوونما پانے کی۔ آخر کار یہی صلاح ٹھہری۔ میراث پدر خواہی علم پدر آموز۔ چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ اس بچہ نے علوم وفنون کی تحصیل کرکے باپ کے گلشن میں وہ خیابان کاریاں اور تختہ بندیاں کیں کہ گل و ریاحین کی کثرت سے گلشن مرحوم کی روح باغ باغ ہوگئی اور اس کا لگایا ہوا نونہال ایران کے چمن زار میں اس طرح پھلا پھولا کہ اس کے رنگ و بو پر خود فصاحت شیدا اور بلاغت فریفتہ تھی۔ اس کے غنچے بڑے بڑے شہزادوں اور اُمرار کے طرۂ امتیاز کی زینت اور اس کے پھول شاہان کجکلاہ قاچار کے تاج وبیہیم کی زیبائش تھے۔

خراسان کا سفر، تعلیم اور شاعری کی ابتدا

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن، جامعہ الازہر قاہرہ (مصر) اور مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کی طرح خراسان کا دار الحکومت مشہد مقدس[۳] بھی اس زمانہ میں ایک زبردست دار العلوم کا حکم رکھتا تھا جہاں چاروں طرف سے شائقین علوم وفنون آتے تھے اور اس سرچشمہ علم وفضل سے سیراب ہوتے تھے جس طرح مدرسۃ العلوم دیوبند میں علاوہ تعلیم مفت ہونے کے نادار طلبا کے خورد ونوش اور کتابوں کے مصارف کا بھی خیال رکھا جاتا ہے اسی طرح مشہد مقدس میں بھی طلبار کی ہر طرح کفالت ہوتی تھی۔ میرزا حبیب نے بھی خدا پر بھروسہ کرکے بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا[۴]۔ کہا اور بقول میرزا طاہر[۵]۔

"بحکم فطانت فطری ولیاقت جبلی از برائے تکمیل علوم وتحصیل فنون رای مسافرت کرد و راہ خراسان گرفت۔"

۱۔ بڑھاپا۔ ۲۔ جب موت کا وقت آجاتا ہے نہ ایک گھڑی آگے ٹلتا ہے اور نہ پیچھے ہٹتا ہے۔
۳۔ اس شہر کا اصلی اور قدیم نام طوس ہے۔ چونکہ حضرت امام علی بن موسیٰ رضا کا مزار یہاں ہے اس لئے یہ مشہد مقدس کہلاتا ہے۔ ۴۔ اللہ ہی کے نام سے اس کشتی کی روانگی اور اس کی لنگراندازی ہے۔ یہ قرآن شریف کی ایک آیت ہے۔ ۵۔ دیوان قاآنی۔ دیباچہ۔

اس وقت نہ تو وہاں ریل کا سلسلہ تھا اور نہ موٹروں کا کوئی نظام تھا۔ قافلہ بندی کر کے سفر کرنا پڑتا تھا اور اس جادہ پیمائی کے ساتھ آبلہ پائی کا بھی شرف اکثر حاصل ہو جاتا تھا۔ میرزا حبیب بھی خدا کا نام لیکر چل کھڑا ہوا اور منزلیں مارتا ہوا امام ضامن وثامن کے آستانہ پر جا پہنچا۔ اور اپنی تعلیم کی جدوجہد میں مصروف ہوا۔ بقول[1] مصنف گنج شائگاں۔

"و در ارض مقدس کہ مدرس محصلین علوم و مرجع مستعدین ہر مرز و بوم است بار اقامت نہاد وباب استفادت کشود۔"

چونکہ تحصیل علوم کی لو دل کو لگی تھی میرزا حبیب نے نہایت محنت سے علوم متداولہ میں دستگاہ حاصل کرنا شروع کی۔ اوائل عمر ہی میں جب کہ ابھی درسیات کی تحصیل جاری تھی شعر گوئی کا شوق پیدا ہو گیا تھا اور لوگوں میں اس کا چرچا پھیلنے لگا تھا۔ میرزا طاہر کا بیان ہے۔

"ہم در آن عہد صبی و آوان صغر...... بگفتن شعر پرداخت و از اشعار شیرین نمکین شوری در شہر انداخت۔"

فطری ذہانت، خداداد شوخی طبیعت، طبعی موزونی اور ادب کے نکات و معانی کے ادراک کی قدرتی قابلیت نے لڑکپن ہی سے اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا تھا۔ بقول رضا[2] قلی ہدایت۔

"طبعش از صغر سن موزوں بود رفتہ رفتہ ترقی نمود...... و در شاعری بمقامات اعلیٰ واصل آمد۔"

مشق سخن کے شروع ہوتے ہی وہ نفیس اشعار اور وہ رنگین قصیدے فصاحت کے سانچے میں ڈھلکر نکلنے لگے جن سے میرزا حبیب کی شہرت تمام نواح میں پھیل گئی۔ چنانچہ گنج شائگاں کے الفاظ اس پر شاہد ہیں۔

گروہے کانا و کامل وانبوہے دانا و جاہل وانواع مختلفہ انام از خواص و عوام..... برو گرد آمدند واز خردی سال و بزرگی سخن وے شگفت ماندند۔ زائش طبع و تراوش خاطرش را با قہر و جبر بے درنگ و صبر از یک دیگر گرفتہ دست بدست می بردند تا در تمامی شہر مشہور شد۔"

حضرت لسان الغیب خواجہ حافظ شیرازی اور حضرت امیر خسرو دہلوی کی نسبت مشہور ہے کہ

---

[1] دیوان قاآنی۔ دیباچہ۔ [2] مجمع الفصحا ص۴۰۲ جلد دوم۔

یہ حضرات اگرچہ ہر وقت فضائے شعر و سخن میں سانس لیتے تھے اور رات دن اسی چرچے میں بسر کرتے تھے ان کو علی الترتیب حضرت بابائے کوہیؒ کے مزار اور حضرت نظام الدینؒ[2] اولیا کے فیض سے مستفید ہونے کے بعد شعر و سخن کے میدان میں بازی لیجانے کا موقع ملا تھا۔ اسی طرح میرزا حبیب بھی گو مبدءِ فیاض سے موزوں طبیعت لیکر آئے تھے مگر چونکہ ان کو اہل بیت رسول سے دلی عقیدت تھی ائمہ اطہار کی منقبت گوئی نے انا مدینۃ العلم کے فیوض و برکات کی ایسی بارش کی اور علیؑ بابہا کے اسرار و رموز کی ایسی باب کشائی کی کہ فصاحت کی گنگا جمنا اور بلاغت کے جیحون و سیحون بہ گئے اور

۱؎ حضرت خواجہ حافظ شیراز ابتدا میں اچھے شعر نہ کہتے تھے۔ محض تفریح طبع کے لئے لوگ اپنی صحبتوں میں ان کو بلاتے تھے اور ان کے بے تکے اشعار سے اپنا دل بہلاتے تھے دو سال کے بعد جب خواجہ صاحب کو بھی اس تمسخر اور مذاق کا احساس ہوا تو ایک دن بہت غمگین ہوئے اور بابا کوہی کے مزار پر جاکر خوب روئے۔ رات کو خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ تشریف لائے اور ان کو ایک لقمہ کھلایا اور کہا جا اب تجھ پر تمام علوم کے دروازے کھل گئے۔ نام پوچھا تو معلوم ہوا کہ جناب امیر حضرت علی علیہ السلام ہیں۔ صبح کو اٹھتے ہی یہ غزل لکھی۔

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند ۔۔۔ وندراں ظلمت شب آب حیاتم دادند۔

لوگوں کو اس غزل پر بڑا اچنبھا ہوا۔ جب امتحاناً حافظ کو طرح دیگئی اور اس میں بھی انہوں نے عمدہ غزل لکھی تب جاکر اطمینان ہوا اور حافظ کی شاعری کی دھوم مچ گئی۔ (تفصیل کے لیے تذکرہ میخانہ مرتبہ عبدالنبی فخر الزمانی ملاحظہ ہو)

۲؎ امیر خسرو حضرت خواجہ نظام الدین محمد سلطان الاولیا کے مرید تھے۔ مولانا سید محمد کرمانی المعروف با میر خرد جو امیر خسرو کے معاصر اور حضرت سلطان الاولیا کے مرید و خلیفہ ہیں اپنی کتاب سیر الاولیا میں لکھتے ہیں:-

"روزے در مدح سلطان المشائخ پیش سلطان المشائخ شعرے گذرانید۔ فرمان شد کہ آن طاس شکر کہ زیر کھٹ است بیار و سر خود نثار کن و قدرے ازاں بخور۔ امیر خسرو ہمچناں کرد لاجرم شیرینی سخن او شرق و غرب عالم گرفت۔"

لیکن خود امیر خسرو مثنوی نہ سپہر میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

من از وے لعاب دہاں یافتم ۔۔۔ کزان گونہ آب دہاں یافتم

دو قطرہ ازاں در دوات افگنم ۔۔۔ تظلم در آب حیات افگنم

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امیر خسرو کی جامعیت حلاوت سخن اور نعد کلام حضرت نظام المشائخ کے

چار دانگ عالم میں ان کی سخن وری کا ڈنکا بج گیا۔ ہم اپنے اس نظریہ کے ثبوت میں اس مشہور قصیدہ کے چند شعر پیش کرتے ہیں جس کا مطلع یہ ہے۔

بگردون تیرہ ابرے بامداداں بر شد از دریا جواہر خیز و گوہر ریز و گوہر بیز و گوہر زا

یہ قصیدہ میرزا حبیب نے حضرت علی بن موسیٰ الرضا علیہ التحیۃ والثناء کی شان مبارک میں کہا ہے۔ ذیل کے اشعار میں اس معجز بیان شاعر نے "تا حاصل برد فردا" کے فیض کی امید میں "دہقان" بنکر "مزرع ثنا" میں "تخم سخن" کی کاشت کی ہے اور اپنی "سخندانی" کا پورا ثبوت دیا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے۔

زہے اے نخل باغ دین کہ برکت اندر دیدہ عقل بین نماید خوشہ پروین کم از یک دانہ خرما

در اوصاف تو قاآنی دہد داد سخن دانی کند امروز دہقانی کہ تا حاصل برد فردا

سخن تخم است، او دہقان، ثنا مزرع، امل باراں فشاند دانہ در میزاں کہ چیند خوشہ در جوزا

میرزا کی انہیں عقیدتمندیوں کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ آگے چلکر ایسا بے عدیل شاعر اور بے مثیل سخن سنج ہو جاتا ہے کہ بالفاظ صاحب گنج شائگان "باتفاق سخن شناساں عصر و دقیقہ یابان نظم و نثر ...... دانشمند بدیں عذوبت الفاظ و سلاست بیاں و قدرت طبع و طلاقت لساں مادر ایام نادر زاد و روزگار کمتر از عدم بوجود و از غیب بشہود آورد۔"

قاآنی کے تخلص کی وجہ اور شاہزادہ نواب شجاع السلطنت کے دربار میں رسائی

چونکہ میرزا کا نام حبیب تھا اس لئے شاعری کے ابتدائی دور میں حبیب ہی تخلص تھا اور اس زمانہ کی بہت سی نظمیں اسی نام سے لکھی گئی تھیں۔ اسی زمانہ میں ایک دوسرا شاعر میرزا عباس بسطامی بھی ان کا رفیق طریق تھا جو مسکین تخلص کیا کرتا تھا۔

جب تحصیل علم کے دوران میں میرزا حبیب کا قیام خراسان میں تھا فتح علی شاہ قاچار کا تیسرا لڑکا شہزادہ اعظم شجاع السلطنت حسن علی میرزا خراساں اور کرمان کا گورنر تھا۔ چونکہ شاہزادہ خود صاحب علم

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۷) فیض و برکت اور عطا کا نتیجہ ہے جیسے خود امیر خسرو علی الاعلان کہتے ہیں۔

سلہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے متعلق ایک حدیث ہے جس میں جناب رسالت مآب صلعم ارشاد فرماتے ہیں۔ انا مدینۃ العلم وعلیٌّ بابھا۔ میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کے دروازہ ہیں۔

وفضل تھا اور مذاق سخن بھی رکھتا تھا جب میرزا کی شاعری کی شہرت شہزادہ کے کانوں تک پہنچی اس نے میرزا کو اپنے دربار میں طلب کیا اور قصیدہ لکھنے کی فرمائش کی۔ میرزا نے حسب الحکم قصیدہ لکھا جس کا مطلع یہ ہے :-

گرفت خیمہ گیتی شمیم عنبر ناب گرد خاک سر کوئے سیر عرش جناب

شہزادہ کو یہ قصیدہ بہت پسند آیا اور اس نے میرزا کو اپنے مصاحبوں میں داخل کر لیا اور اس کی تربیت میں مصروف ہوا چنانچہ بقول میرزا طاہر :-

"پس از ادراک سعادت حضور بموجب ظہور نہایت ادراک در ہماں خردسالی در جرگ ندمائے سال خورد بشرف منادمت بزم خاص اختصاص یافت۔"

میرزا عباس بسطامی مسکین اور مرزا حبیب دونوں نواب شجاع السلطنت کے مدح گو تھے۔ اس کے دربار میں ایک مدت تک داد سخنوری دیتے رہے۔ شجاع السلطنت کے دو بیٹے اوکتا قاآن اور فروغ الدولہ تھے جن سے شہزادہ کو نہایت محبت تھی۔ میرزا حبیب اور میرزا عباس بسطامی مسکین کے جو گہرے تعلقات شاہزادہ سے تھے اور اس کی مربیانہ شفقت جس قدر ان دونوں پر تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہزادہ نے میرزا حبیب کا تخلص قاآن کے نام پر قاآنی اور میرزا عباس کا تخلص فروغ الدولہ کی نسبت سے فروغی قرار دیا۔ چنانچہ ایک قصیدہ[۲] میں خود قاآنی اسی کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے۔

جہاندار امنستم آن سخن سنج ہنر پرور کہ از قاآن دوراں نم لقب گردیدہ قاآنی

---

[۱] مجمع الفصحا صہ ۳۹۴ جلد دوم

[۲] دیوان قاآنی صہ ۳۳۶

غزل

از

جناب قادر محی الدین صاحب ارمان منشی فاضل

مری آنکھوں سے پردہ کرتے ہو میری نظر ہو کر
بنے ہو سنگ دل پتھر میں چھپتے ہو شرر ہو کر

الٰہی مطلب مشکل کا بر آنا ہوا مشکل
نکلتی ہے مرے دل سے دعا بھی بے اثر ہو کر

سمندِ عمر اک دن منزل آخر پہ پہنچے گا
منازل ہو رہیں گے طے یوں ہی شام و سحر ہو کر

خوشی سے میں بھی پھر زخمِ جگر اپنے دکھاؤں گا
مگر یہ شرط ہے پوچھو کبھی تم چارہ گر ہو کر

زمانہ قیسؔ کو دیوانہ کہتا ہے تعجب ہے
خبر رکھتا تھا لیلیٰ کی ہمیشہ بے خبر ہو کر

جوانی میں غرور انسان کو زیبا نہیں سچ ہے
شجر گلشن میں ہوتے ہیں خمیدہ بارور ہو کر

کہاں کی فاتحہ ٹھوکر لگانے کاش آ جاتے
ہماری خاک اڑتی کچھ ادھر اور کچھ ادھر ہو کر

تمنا ہے عوض نامہ کے اپنی جان ہی دیدوں
چلا ہے کوئے دلبر دل میرا جب نامہ بر ہو کر

مقدر پر شہیدانِ چمن کے رشک آتا ہے
بہا لیتی ہے شبنم ان پہ آنسو نوحہ گر ہو کر

کہاں ہے کوئے دلبر اے دلِ بیتاب حیرت ہے
ارادہ اور اتنی دور کا بے بال و پر ہو کر

محبت کا نتیجہ آج کچھ نکلے گا اے ارماں
مری رودادِ غم وہ سن رہے ہیں داد گر ہو کر

تنقیدیں

دنیائے راز

از جناب راز چاندپوری چھوٹی تقطیع ضخامت (۱۱۲) قیمت عہ حالی ملنے کا پتہ:- مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن سڑک حیدرآباد دکن۔

یہ جناب راز صاحب چاندپوری کا پاکیزہ مجموعہ کلام ہے جو بڑی خوبی اور نفاست سے مرتب اور طبع کیا گیا ہے ابتدا میں مرزا جعفر علی خان صاحب اثر لکھنوی کا ایک مقدمہ ہے جس میں کلام راز کے محاسن پیش کئے گئے ہیں راز صاحب ایک قدرتی شاعر اور اعلیٰ درجے کے حسن کار ہیں۔ ان کی نظمیں ہندوستان کے اکثر و بیشتر ادبی رسالوں میں کئی برس سے شایع اور مقبول خاص و عام ہوتی رہی ہیں۔ تخیل کی بلندی، خیالات کی گہرائی اور مناسب جوش و سادگی ان کے کلام کی وہ خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے ان کا کلام تاثیر میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے اور ہر صاحب ذوق اس کو پڑھ کر مزے لینے لگتا ہے۔ دنیائے راز میں کلام کو مختلف سرخیوں کے تحت درج کیا گیا ہے جو ان نظموں پر کافی روشنی ڈالتی ہیں۔ مثلاً تمہید و تحمید، تخیلات و تصورات، مشاہدات و واقعات سرد لبراں وغیرہ۔ راز کی دل افروز شاعری کی مقبولیت کے مدنظر ہمیں امید ہے کہ دنیائے راز ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی اور جدید شاعری کے شیدائی اس مجموعے میں اپنی مرغوب طبع چیز پائیں گے۔

سالگرہ نمبر صبح دکن

مرتبہ مولوی احمد عارف صاحب مدیر قیمت قسم اول عہ قسم دوم عہ دفتر صبح دکن افضل گنج سڑک یا مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن سڑک حیدرآباد سے مل سکتا ہے۔

ابتدائے تہذیب سے ہر ملک کی وفاشعار رعایا اپنے بادشاہ، مالک یا قائد اعظم کی سالگرہ کی تقریب مناتی اور اپنی عقیدت مندی اور دلی مسرت کا اظہار کرتی رہی ہے۔ ہمارے ملک میں زمانہ قدیم سے جہاں مختلف طور پر مختلف طبقات رعایا و برایا اپنے بادشاہ ذی جاہ کی تقریب سالگرہ منایا کرتے ہیں، اخبارات ملک بھی اس مبارک دن اپنی عقیدت مندی سے تبریک و تہنیت کے مضامین اور نظموں سے مزین اور خوش رنگ شایع ہوتے ہیں۔ اس خصوص میں حیدرآباد کے مشہور روزنامہ صبح دکن کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ مولوی احمد عارف صاحب پچھلے دو تین سال سے بڑے اہتمام اور کوشش سے اپنے اخبار کا سالگرہ نمبر شایع کرتے

ہیں۔ جو ایک طرف سالگرہ نمبر بھی ہوتا ہے اور دوسری طرف سالنامہ کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اب کی دفعہ صبح دکن کا یہ نمبر بڑی آب و تاب سے شایع ہوا ہے اور سچ یہ ہے کہ نہ صرف پچھلے تمام سالگرہ نمبروں سے بڑھ چڑھ کر ہے بلکہ اردو صحافت میں اپنی خاص حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ حصہ اول اعلیٰحضرت آقائے ولی نعمت کے کلام فخر سلاطین، شاہانہ مجوزہ طرح پر غزلوں، مدحیہ نظموں اور قصیدوں کے علاوہ ذات شاہانہ کے عہد کی ترقیوں، سیرت و کردار شاہانہ کے متعلق دلچسپ مضامین سے مزین ہے۔ دوسرے حصے میں متعدد علمی ادبی تاریخی اور سیاسی دلچسپی کے مضامین اور متعدد اعلیٰ نظمیں شریک ہیں۔ دونوں حصوں کے مضامین نہایت دلچسپ اور بلند پایہ ہیں اور نظمیں اکثر و بیشتر عمدہ تخیلات اور اچھے احساسات کا نمونہ ہیں۔ حصہ دوم میں ایک مضمون "متفقیت اور وحدت اسلامیہ" جو جناب قاضی تلمذ حسین صاحب ام، اے رکن دارالترجمہ کا ہے بلاشبہ مفید اور ایک نہایت معتبر سیاسی کتاب پر مبنی ہے مگر طرز بیان اور اصطلاحات کی پیچیدگی کی وجہ سے بہت مغلق اور عسیر الفہم ہو گیا ہے۔ قاضی صاحب نے فیڈرلزم کے لئے جو اس دور گول میز کانفرنس میں بہت عام ہو گیا ہے، متفقیت کا جو لفظ استعمال کیا ہے وہ خود بہت مغلق ہے۔ اس کے لئے وفاقیت نہ صرف سہل اور اچھی اصطلاح ہے بلکہ مقبول خاص و عام بھی ہے۔ اسی مضمون میں انہوں نے کمیونزم کے لئے بار بار مشترکیت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ حالانکہ اس کے لئے اشتراکیت کئی برس سے سارے ہندوستان میں رایج ہے۔ قاضی صاحب کے الفاظ کے مقابلے میں یہ دونوں لفظ نہ صرف بولنے میں سہل ہیں بلکہ صحیح اصول پر وضع ہوئے ہیں۔ وفاق اور اشتراک سے اسم مصدر وفاقیت اور اشتراکیت ہی بنینگے نہ کہ متفقیت و مشترکیت۔ اسم فاعل سے اسم مصدر بنانے کا طریقہ کلیہ نہیں بلکہ استثنائیہ ہے۔ مضامین نظم و نثر کے علاوہ سالگرہ نمبر حضور بندگان عالی، حضرت ولیعہد کی نئی تصویروں کے علاوہ ملک کے متعدد ادیبوں شاعروں اور عہدہ داروں کی تصویروں سے بھی آراستہ ہے۔

دیوان اثر مرتبہ مولوی عبدالحق صاحب بی، اے (علیگ) معتمد انجمن ترقی اردو ضخامت (۸۰) صفحات مجلد قیمت ۱۲؎ حالی یا ۱۲؎ کلدار دفتر انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) یا مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد سے مل سکتا ہے۔

یہ خواجہ میر درد کے بھائی میر اثر کا نہایت مختصر دیوان ہے جسے انجمن ترقی اردو نے شایع کیا ہے ابتدا میں حسب معمول مرتب کا مقدمہ ہے مگر طویل نہیں بلکہ بالکل مختصر۔ ایک دو صفحات میں شاعر کا ذکر

ایک درمیں اس کی شاعری پر رائے اور باقی تین چار صفحات میں انتخاب کلام، اور مقدمۂ ختم، محقق مرتب کا کہنا ہے کہ شاعر کے حالات کہیں نہیں ملتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عام طور پر تذکروں میں بہت کم حالات مندرج ہیں بریں ہم اگر پورے طور پر داد تحقیق دیجائے تو مختلف ذرایع اور ایک حدتک شاعر کے کلام سے بہت کچھ ملنے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ میر اثر کی شاعری زبان کی سادگی اور اثر کی خوبیاں بدرجہ اتم رکھتی ہے اور اس خصوص میں وہ اردو کے تقریباً تمام شاعروں میں خاص طور پر ممتاز ہیں۔ نظام کالج حیدرآباد کی بزم ادب کی جانب سے بھی میر اثر کا ایک دیوان قبل ازیں شایع ہوچکا ہے۔ زیر نظر دیوان اور اس دیوان میں اشعار کا تھوڑا سا فرق ہے۔ یہ نامناسب نہیں کہ دیوان اثر جامعہ عثمانیہ کے انٹرمیڈیٹ میں دیوان درد کی بجائے شریک نصاب کیا جائے کیونکہ ادبیات کے نصاب میں ہمیشہ اسی قسم کا ردوبدل مستحسن ہے اس سے پڑھنے اور پڑھانے والوں کے لئے تنوع کے علاوہ ایک ہی کتاب کے کئی سال تک رہنے سے جو بیزاری، بے لطفی و بے توجہی پیدا ہوجاتی ہے وہ رفع ہوجائیگی۔

تاریخ مغربی یورپ جلد اول مترجمہ مولوی یحیٰ صاحب تنہا بی، اے ال ال بی وکیل عدالت عالیہ بڑی تقطیع ضخامت (۲۸۲) صفحات قیمت عہ ہے حالی یا عہ کلدار جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی یا مکتبہ ابراہیمیہ سے طلب کی جائے۔

ڈاکٹر راین سن کی تاریخ مغربی یورپ ایک مشہور اور متداول کتاب ہے اور ہندوستان کی کئی جامعات میں بی، اے کے نصاب میں شریک رہ چکی ہے۔ مولوی تنہا صاحب نے اس کی جلد اول کو صفائی اور خوبی کے ساتھ اردو میں ترجمہ کیا ہے اور مصنف کے حالات زندگی کے اضافے اور کچھ حاشیوں کے ساتھ اسے اصل سے زیادہ دلچسپ اور مفید بنا دیا ہے۔ اردو میں ایسی اعلیٰ درجے کی محققانہ کتابوں کے ترجمے کی بہت ضرورت ہے اور اگرچہ حیدرآباد میں دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ بہت سی عمدہ کتابوں کا ترجمہ کرچکا ہے لیکن اس کا دایرہ افادہ متعدد غیر تجارتی طریقوں کی وجہ سے نہایت ہی محدود ہے۔ کتابیں اس قدر گراں پڑتی ہیں کہ عام مطالعہ کرنے والے تو کیا طلبہ جامعہ بھی انہیں نہیں خریدتے۔ اس کے برخلاف جامعہ ملیہ کی اردو اکاڈمی کی طرف سے بعض ایسی عمدہ کتابیں بالکل تجارتی اصولوں پر شایع ہوئی ہیں کہ عام طور پر آسانی سے خریدی جاسکتی ہیں۔ تاریخ مغربی یورپ کا بھی یہی حال ہے کتاب نہایت عمدہ اور قابل مطالعہ اس پر قیمت بھی نہایت واجبی اور مناسب ہے امید ہے کہ اہل علم اور بالخصوص طلبۂ

مذاق رکھنے والے حضرات اس کتاب سے بہت لطف اندوز ہوں گے۔

الکشافہ مرتبہ مولوی محمد حمید اللہ صاحب ایم، اے، ال ال بی (عثمانیہ) شاہی رو ور قیمت سالانہ (۱ے) حجم (۳۲) صفحات ملنے کا پتہ دفتر بوائے اسکاؤٹ سیف آباد (حیدر آباد)۔

یہ حیدر آباد کے پرانے اسکاؤٹوں کا ایک چھوٹا سا ماہوار رسالہ ہے جو مولوی حمید اللہ صاحب سے پرجوش رو ور اور سرگرم اہل علم کی ادارت میں شایع ہونے لگا ہے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے مضامین دلچسپ اور اسکاؤٹنگ (کشافی) کے متعلق مفید معلومات کے حامل ہوتے ہیں۔

کانفرنس گزٹ یہ ایک پندرہ روزہ تعلیمی اخبار ہے جو اکرام اللہ خاں صاحب مولف وقار حیات کی ادارت میں کل ہند مسلم تعلیمی کانفرنس کی طرف سے شایع ہونے لگا ہے۔ مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق دلچسپ معلومات اور مضامین شایع کرتا ہے۔ سالانہ چندہ (عہ) ہے اور جامعہ اسلامیہ علی گڑھ کے پتے سے ملتا ہے۔

کتب موصولہ

۱۔ تاریخ نثر اردو از مولوی احسن مارہروی قیمت ہے حالی
۲۔ خزینہ تاریخ مرتبہ سید یوسف الدین صاحب قیمت عہ ″
۳۔ سفر انگلستان مرتبہ رشید احمد صاحب قیمت ۱۵ر حالی
۴۔ بچوں کی تربیت از محمد عبد الغفار صاحب خیری قیمت ۱۲ر حالی
۵۔ بچھڑی بیٹی از جناب خاتون اکرم صاحبہ قیمت ۱۰ر حالی
۶۔ موہنی از جناب صغرا ہمایوں مرزا صاحب قیمت ۱۵ر حالی
۷۔ تحریر النسا ″ ″ قیمت ۱۵ر حالی
۸۔ عصمتی کروشیا از جناب فاطمہ بیگم صاحبہ قیمت عہ حالی
۹۔ عصمتی کشیدہ از جناب آمنہ نازلی صاحبہ قیمت عہ حالی

یہ سب کتابیں فرمایش پر مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن سٹرک سے مل سکتی ہیں۔

فہرست مضامین مجلہ مکتبہ

(جلد پنجم)

تمت

بتقریب سالگرہ ہمایونی اعلیٰحضرت بندگانعالی خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ

روزنامہ صبح دکن کا سالگرہ نمبر

شایع ہو گیا ہے

باعتبار مضامین و تصاویر اس سال کے ہندوستان بھر سے شایع ہونیوالے سالناموں میں ایک امتیازی شان رکھتا ہے

حضرت ظل سبحانی خسرو دکن کے تازہ ترین کلام کے علاوہ حضور پرنور کے عنایت کردہ مصرعہ طرح پر شعرا دکن کی غزلیں

(مقالات) دکن کے مایۂ ناز مستند اہل قلم حضرات۔

نواب سر نظامت جنگ بہادر۔ علامہ عمادی ناظر مذہبی۔ ڈاکٹر عبد اللطیف پی ایچ ڈی، نواب اکبر جنگ بہادر۔ قاضی تلمذ حسین رکن دار الترجمہ۔ ڈاکٹر سیادت علی، ام اے ال ال بی ڈی فل، سر ولیم بارٹن سابق رزیڈنٹ مولوی سید ابو الاعلیٰ مودودی۔ ڈاکٹر ولی الدین ام اے ال پی ایچ ڈی مولوی سید ابو الخیر مودودی رکن دار الترجمہ۔ وغیرہم

کے سیاسی، تعلیمی، معاشرتی، تاریخی، ادبی، تمدنی، شاہکار اور (حصہ نظم) ملک کے بلند پایہ نازک خیال شعرا

استاد جلیل۔ نواب فصاحت جنگ بہادر۔ حضرت جوش نواب شبیر حسن ملیح آبادی۔ حضرت اختر، نواب اختر یار جنگ بہادر یادگار امیر۔ جناب اختر مولوی سید علی اختر۔ حضرت عفو مولانا سید شاہ ابراہیم۔ جناب بدر (ابو الکلام محمد بدر الدین) حضرت عالی۔ علامہ وحید الدین۔ جناب کامل (مولوی عبد اللہ خان) حضرت ضیا (علامہ ضیا یار جنگ بہادر)۔ جناب شہرت (کیپٹن اعجاز علی) وغیرہم۔

کے افکار نادرہ و خیالات عالیہ سے مزین ہے۔

تصاویر۔ ان معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ظاہری حسن و دلفریبی کو بھی متعدد ہاف ٹون بلاک کی تصویروں نے مکمل کر دیا ہے۔ خسرو دکن کی دو تازہ ترین تصویریں جو خاص اسی موقع کے لئے ہم نے بصرف زر کثیر تیار کرائی ہیں اور جو اس سے پہلے منظر عام پر نہیں آئیں۔ شہزادہ عالی قدر نواب ولیعہد بہادر کے دو نایاب تازہ ہاف ٹون بلاک فوٹو حیدرآبادی نمایندگان گول میز کانفرنس کا گروپ اور قدیم مشاہیر ہیں۔ نواب سر سالار جنگ اعظم اور نواب میر عالم کے علاوہ اس نمبر کے جملہ مضمون نگار حضرات کی تصویریں شایع کی گئی ہیں۔ اس طرح کل تصاویر کی تعداد پینتیس ہے

قیمت قسم اول عہ ۸/ قسم دوم عہ خریداران صبح دکن سے علاوہ محصولڈاک عہ ۴/ و ۱۲/

دارالاشاعت مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود حیدرآباد دکن

کا

ماہوار علمی اور ادبی مجلہ

مکتبہ

مدیر

عبدالقادر سروری ایم اے ال ال بی

شرکاء

سید محمد ایم اے

عمر یافعی
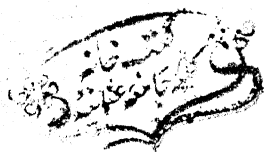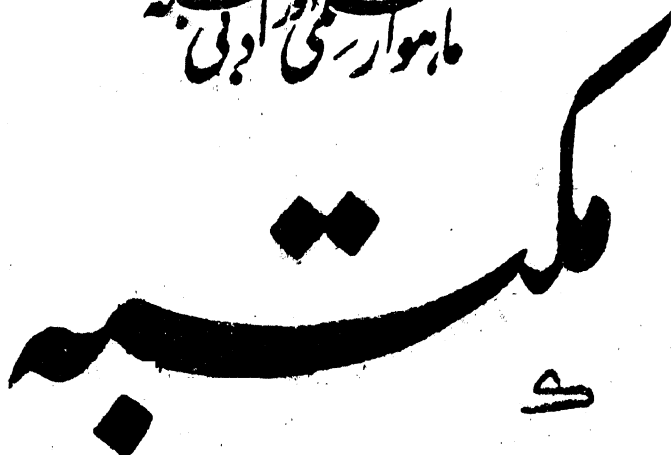
مجلّۂ مکتبہ

یہ دار الاشاعت مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود کا ماہوار رسالہ ہے۔

یہ علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں علم و ادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہونگے حجم کم سے کم چار جزو ہوگا۔

بنظر احتیاط پرچہ بذریعہ سرٹیفکٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا۔ اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو ہر فصلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالہ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔

قیمت سالانہ (للعہ) مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے (عـہ) فی پرچہ ۶ ـر

اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (عہ) نصف کیلئے (سے) اور چوتھائی کے لئے عہ ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲ ۱/۲ سے ۲۵ فیصدی تک کمی ہوسکے گی۔

ترسیل زر و مضامین اور جملہ خط و کتابت منتظم مجلۂ مکتبہ مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے کیجئے۔

رجسٹرڈ نشان پٹہ سرکار آصفیہ
(۶۵)

رجسٹرڈ نشان پٹہ انگلشیہ
(..........)

مجلۂ مکتبہ

جلد ۶ | بابتہ ماہ بہمن ۱۳۴۰ف مطابق دسمبر ۱۹۳۰ء | شمارہ (۳)

(تصاویر)

(۱) جناب ایم اسلم صاحب (۲) جناب سید علی اختر صاحب اختر (۳) علامہ عبدالجبار خاں آصفی مرحوم (۴) حکیم وحید الدین عالی مرحوم

(فہرست مضامین)

شذرات

معارف کے شذرات میں ایک دو مہینے قبل مدیر صاحب نے اس امر پر اظہار افسوس کیا تھا کہ ہندوستان میں اردو کا کوئی جامع بک ڈپو نہیں، جس میں اردو کی کل مطبوعات موجود ہوں اور جو شایقین اردو کی ضرورت کی بروقت اور خاطر خواہ سربراہی کر سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو کے ساتھ جہاں اور معاملات میں اہل ہندوستان نے باوجود اس کو ہندوستان کی ایک بہت بڑی اور متعدد صوبوں کی مادری اور کل ہند اہمیت کی زبان سمجھنے کے، بے اعتنائی برتی ہے، اردو بک ڈپوؤں کے قیام میں بھی ایسی کوتاہی دکھائی کہ ہندوستان کے اکثر و بیشتر شہر (حقیقی معنوں میں) اردو بک ڈپو سے خالی ہیں، لاہور، دہلی اور صوبجات متحدہ کے بعض شہر اردو کتابوں کے بڑے مرکز اشاعت ہیں لیکن ان شہروں میں واقعی شایان شان اردو بک ڈپو تقریباً مفقود ہیں۔

حیدرآباد بھی ایک عرصہ تک اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تھا، مگر بحمداللہ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ کے اہتمام اور کارکنان انجمن کی کئی سال کی محنت سے حیدرآباد میں ایسا اردو بک ڈپو قایم اور جاری ہے جو حیدرآباد کے عام تاجران کتب کی طرح صرف درسی کتابوں کی تجارت نہیں کرتا بلکہ اردو کی تمام مطبوعات بشرطیکہ وہ اوٹ آف پرنٹ نہ ہو گئی ہوں ہر وقت مہیا کرتا ہے کتابوں کے علاوہ اردو کے تقریباً تمام مشہور علمی و ادبی اور دیگر فنی رسالے بھی اس میں ہر وقت تازہ بہ تازہ موجود رہتے ہیں۔

حیدرآباد جیسی وسعت و اہمیت کے شہر میں بعض اور بھی بک ڈپو ہیں جن میں خاص طور پر حیدرآباد بک ڈپو قابل ذکر ہے لیکن یہ انگریزی کتابوں کی تجارت کرتا ہے اور انہی کتابوں اور رسالوں کا ایک بڑا ذخیرہ اس میں موجود ہے۔ دیگر بک ڈپو عموماً تعلیمی اور درسی کتابیں مہیا کرتے ہیں خواہ وہ انگریزی کی ہوں یا اردو اور فارسی کی۔ **مکتبہ ابراہیمیہ** علاوہ تعلیمی و درسی کتابوں کے ہر مذاق کی اردو کتابوں کی اپ ٹو ڈیٹ طریقہ پر سربراہی و تجارت کرتا ہے۔ بیرون دکن کے جن معزز اصحاب نے حیدرآباد آکر اس کا معاینہ کیا ہے۔ انہوں نے اس کے طریقے اور انتظام کو نہایت پسند فرمایا، اور ہم اہل ذوق حضرات کو مدعو کرتے ہیں کہ اگر حیدرآباد تشریف لائیں تو ایک بار ضرور اس اردو بک ڈپو کو ملاحظہ فرمائیں۔

حیدرآباد میں شاید ہی کوئی علمی ذوق رکھنے والا ایسا ہو جس نے اس کو نہ دیکھا ہو۔ شہر کے ایک

پر رونق اور موقع محل کے لحاظ سے نہایت عمدہ مقام یعنے اسٹیشن روڈ پر یہ بک ڈپو ہر اردو داں آنے جانے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتا رہتا ہے۔ ہم انشاء اللہ آیندہ اس کے متعلق بعض بڑے بڑے اردو اہل قلم حضرات کی رائیں پیش کریں گے۔

یہ امر نہایت موجب مسرت ہے کہ جناب سید رشن صاحب کی ادارت میں لاہور سے ایک نیا رسالہ "چندن" کے رومانوی نام سے جنوری ۱۹۳۱ء سے شایع ہونے والا ہے۔ ہمیں جو اطلاع ملی ہے اس کے بموجب "اس کے ہر نمبر میں ملک کے بہترین افسانہ نویسوں کے کئی کئی افسانے ہونگے، رنگین بیان شعرا کے پاکیزہ اور روح کو وجد میں لانے والی نظمیں ہونگی، مشہور ادیبوں کے زبردست مضامین ہونگے اور حالات حاضرہ پر مناسب رائے زنی ہوگی"۔ لکھائی چھپائی کے نسبت بھی اطمینان دلایا گیا ہے کہ "نہایت پیاری اور بے داغ ہوگی"۔ کچھ دنوں قبل جناب ایم حید صاحب نے بھی ہنس کے نام سے ایک ایسا ہی رسالہ ہندی زبان میں جاری کیا ہے اس کے مقاصد بھی یہی ہیں اردو میں باوجود افسانوں سے بھرے ہوئے رسالوں کے ہو گئی ہیں ایک ایسے رسالے کی ضرورت ہے جو حقیقی معنوں میں عمدہ افسانے شائع کرے، ہم جناب سید رشن صاحب کو اس ارادے پر مبارکباد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ انکی توجہ اور دیگر ارباب قلم کے تعاون سے ان کی یہ کوشش بارآور ثابت ہوگی۔

اس مہینے کے دوسرے دو ہفتے میں پٹنہ متعدد مستشرقین اور دیگر اہل علم و فضل حضرات کا مرجع بنا رہا حسن اتفاق سے اب کی دفعہ ہندوستان کی دو مشہور علمی بزمیں یعنے کل ہند مستشرقی کانفرنس (آل انڈیا اورینٹل کانفرنس) اور مجلس اسنادات تاریخ ہند (انڈین ہسٹاریکل ریکارڈز کمیشن) بھی منعقد ہوئیں، اول الذکر کی شرکت کے لئے یورپ کی بعض مشہور جامعات کے مشاہیر پروفیسر بھی دور دراز سے یہاں تشریف لائے ہیں۔ حیدرآباد سے حسب معمول جامعہ عثمانیہ کے کئی پروفیسروں نے نمایندگی کی اس کانفرنس میں اب کی دفعہ نہایت اچھے اور بلند پایہ محققانہ مضامین پڑھے گئے۔ ان میں خاص طور پر شمس العلماء سر جے۔ جے مودی۔ اور مولانا سید سلیمان ندوی مدیر معارف کے مضامین قابل ذکر ہیں، سر مودی نے قدیم اسناد کے حوالے سے بتایا ہے کہ ہندوستان قدیم پر ایران کے کیا عظیم الشان اثرات اس کی زندگی کے ہر شعبہ میں کارفرما تھے اور بالخصوص چندر گپت اور اشوک موریا، فرمانروایان ہند کے متعلق ان کی تحقیقات ایک نئے باب کا افتتاح کرتی ہیں۔ اسی طرح

مولانا سلیمان ندوی نے عمر خیام پر قدیم و معاصرانہ شہادتوں کی بناء پر جو نئی روشنی ڈالی اور اپنی تحقیقات سے اس کے متعلق جن چیزوں کی تردید و توضیح کی ہے وہ بھی بڑی بصیرت افروز ہے۔ اور بھی کئی مقالے قابل تحسین ہیں۔

دوسری مجلس میں بھی سابحال حسب عادت مولوی سید خورشید علی صاحب ناظم دفتر اسناد ات تاریخی نے حیدر آباد کی نمایندگی فرمائی اور اپنے دفتر میں سال بھر میں جو نئے اور خاص اہمیت کے کاغذات برآمد ہوئے اور جن پر کام کیا گیا، ان کی نسبت کمیشن کے اجلاس خصوصی میں جو صرف مقررہ ارکان پر مشتمل ہوتا ہے پیش کئے۔ اس مجلس کے ساتھ حسب سابق بڑی عمدہ تاریخی نمائش بھی ہوئی، حیدر آباد سے اب کی دفعہ بعض نوجوان تعلیم یافتہ اصحاب نے بھی جن کا تعلق دفتر اسناد ات تاریخی سے ہی مولوی صاحب موصوف کی کوشش سے شرکت کی۔

اس نمبر میں جو تصویریں شائع ہو رہی ہیں ان میں ایک علامہ عبدالجبار خاں آصفی مرحوم کی ہے جو فارسی کے زبردست شاعر اور پر زور انشاء پرداز تھے، متعدد فارسی اور اردو کتابیں ان کی یادگار ہیں دوسری تصویر مولانا حکیم وحید الدین صاحب عالیؔ مرحوم کی ہے۔ مرحوم حیدر آباد کے ایک حاذق حکیم عربی اور فارسی کے جید عالم اور شاعر تھے، اردو میں بھی ان کا کلام خاصا بلند پایہ ہے جس کو ہم وقتاً فوقتاً شائع کرتے رہے ہیں۔ تیسری تصویر جناب میاں اسلم صاحب کی ہے جو پنجاب کے مشہور افسانہ نویس اور کئی دلچسپ کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ کی کتابیں اسقدر شہرت حاصل کرچکی ہیں کہ باوجود عدم تشہیر کے اکثر کے کئی کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ چوتھی تصویر جناب سید علی اختر صاحب اختر کی ہے جن کی دلاویز نظمیں نگار، مجلہ مکتبہ، ہمایون وغیرہ اور اکثر ممتاز ادبی رسالوں میں شائع ہوتی رہی ہیں پاکیزہ تخیل، اچھوتے خیالات اور دلکش ترکیب جو ان کے کلام کی خصوصیات ہیں قارئین رسائل سے پوشیدہ نہیں۔ کلام کی مقبولیت خداداد ہے۔ مجلہ مکتبہ پر بھی آپ کی خاص عنایت ہے۔ اور اکثر اپنا گراں قدر کلام دیتے رہتے ہیں۔

میر تقی میر پر ایک نظر

(از)

جناب محمد باقر رضا صاحب کرمانی

میر گیارہ سو پچیس ہجری میں عالم ارواح سے دنیائے اجسام میں آئے، اکبر آباد کو میر کی جائے ولادت ہونے کا فخر حاصل ہوا۔ لیکن ابھی میر کا عہد طفولیت یہاں گزرا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، میر مجبوراً دہلی روانہ ہو گئے، دہلی میں انہوں نے خان آرزو کے پاس جو ان کے رشتہ دار تھے، پرورش پائی۔ میر قدرت کی طرف سے ایک خاص ذوق شاعری لائے تھے، اور فطرت نے غزل گوئی کا سہرا ان کے سر باندھا تھا۔ اس پر خان آرزو کی صحبت اور تربیت نے ان کی شاعری میں چار چاند لگا دئے، میر نے فن شاعری میں وہ کمال پیدا کیا کہ صدر نشین بزم شعرائے اردو کہلائے اور آسمان سخن پر آفتاب ہو کر چمکے۔ جب مکرر ورود دہلیات اور متواتر نزول آفات سے دہلی خراب ہوئی تو ۱۱۹۵ھ میں دہلی کو خیر باد کہا اور لکھنؤ چلے گئے۔ میر صاحب کے کلام کی شہرت لکھنؤ کی فضا میں پہلے ہی سے پھیل چکی تھی، ان کا مشاعروں میں شریک ہونا تھا کہ ان کے کلام نے خاص و عام سے خراج تحسین حاصل کرنے اور قبولیت عام کا تمغہ پانے لگا رفتہ رفتہ میر کے کلام کی شہرت نواب آصف الدولہ نے بھی سنی، اور انہوں نے دو سو روپیہ مہینہ کر دیا۔

میر کمال درجہ بد دماغ، نازک مزاج، اور خود پسند واقع ہوئے تھے۔ فقر کے نشہ میں ایسے مست تھے کہ امیر و غریب، شاہ و گدا کسی کی ایک نہ مانتے تھے، اور کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور خود فرماتے ہیں۔

حیف بندے ہوئے خدا نہوئے سر کسو سے فرو نہیں ہوتا

ان کی نازک مزاجی نے ان کو نواب صاحب سے ایک ذرا سی بات پر قطع تعلق کرنے پر مجبور کر دیا، اور صاحب موصوف کے لطف و کرم سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا۔ بقائے دوام

اور شہرت عام کے دربار میں شریک تو ہوئے مگر بد دماغی اور بے پروائی سے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتے تھے، شعر پڑھتے اور منہ پھیر لیتے" میر صاحب کو اپنی بد دماغی کا حال خوب معلوم تھا لکھتے ہیں۔

حالت یہ ہے مجھکو غموں سے نہیں فراغ　　　دل سوزش درونی سے جلتا ہے جوں چراغ

سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ　　　ہے نام مجلسوں میں مرا میر بد دماغ

از بسکہ بد دماغی نے پایا ہے اشتہار

میر صاحب کے کلام کی خوبی اور زبان کی شیرینی نے ان کی خود پسندی اور بد دماغی کی پردہ پوشی کی اور صاحبان فہم نے ان کے کلام کی خوبیوں کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی بد دماغی کو نظر انداز کر دیا۔ میر کو انتقال کئے سو سال سے زیادہ ہو چکے ہیں لیکن آج بھی ہم ان کی خود داری اور بے نیازی پر فخر کرتے ہیں، اور ان کی کتاب زندگی کا فراخ دلی اور کشادہ پیشانی سے مطالعہ کرتے ہیں۔

میر صاحب کے چھ دیوان غزلوں کے ہیں، چند رباعیات، مستزاد اور مخمس بھی ہیں۔ چار قصیدے منقبت میں اور ایک آصف الدولہ کی تعریف میں قصیدے میں میر سودا کو نہیں پہنچ سکتے اس کا سبب یا تو یہ ہے کہ ان کی خود داری اور خود پسندی گوارا نہ کرتی تھی کہ وہ کسی کی مدح میں قصیدہ لکھیں یا ایں کہ یہ ان کی قسمت میں نہ تھا اور صرف سودا ہی کا حصہ تھا۔ میر صاحب ایسے متوکل اور قانع انسان واقع ہوئے تھے کہ انہوں نے ہر طرح کے دنیاوی مصائب و آلام جھیلے لیکن کبھی کسی کے سامنے دست مدعا پیش نہ کیا اور نہ کبھی سر حاجت خم کیا، انہوں نے دنیا کے مال و دولت کو ہیچ سمجھا اور خاطر میں نہ لایا، نکات الشعرا، اور فیض میر بھی انہیں کی تصنیفات سے ہیں مگر آخر الذکر نایاب ہے۔

میر صاحب کی مثنویاں البتہ قابل ذکر ہیں۔ اگرچہ میر کے زمانے میں غزل کی زبان منجھ گئی تھی لیکن مثنوی کی زبان کے سنورنے کے لئے ابھی مدت دراز درکار تھی، لیکن وہ میر ہی کا حق تھا کہ انہوں نے اپنی سادہ زبان، دلکش و دلپذیر پیرایہ، برجستہ مصرعوں اور چستہ ترکیبوں سے مثنوی کو ترقی کے کئی زینے آگے بڑھا دیا، حالی صاحب میر کی مثنویوں کے بارے میں فرماتے ہیں۔ "جس زمانہ میں میر نے مثنویاں لکھی ہیں اس وقت اردو زبان پر فارسیت

غالب تھی اور مثنوی کا کوئی نمونہ اردو زبان میں غالباً نہ تھا اور اگر نمونہ موجود تھا بھی تو اس سے چنداں مدد نہیں مل سکتی" اور آگے لکھتے ہیں۔

"جس وقت میر نے یہ مثنویاں لکھی ہیں اس وقت اس سے بہتر مثنوی لکھنا امکان سے خارج تھا بایں ہمہ میر کی مثنویاں اکثر عبارات سے امتیاز رکھتی ہیں، باوجودیکہ میر صاحب کی عمر غزل گوئی میں گزری ہے، مثنوی میں بھی بیان کے انتظام اور تسلسل کو انہوں نے کہیں ہاتھ سے جانے نہ دیا"

میر صاحب کی مثنویاں کل تین قسم پر منقسم ہیں (۱) عاشقانہ (۲) جو نواب صاحب موصوف کے متعلق ہیں (۳) جو خانگی اشیا، پر لکھی گئی ہیں میر صاحب کی مثنویوں میں عاشقانہ مثنویوں نے زیادہ شہرت حاصل کی ہے۔ ان کی زبان بھی اور مثنویوں کی زبان کی بہ نسبت بہت صاف اور شستہ ہے۔ گو میر صاحب بہت گھریلو واقع ہوئے تھے اور انہیں قدرتی مناظر اور بیرونی مطالعہ کا زیادہ موقع ہاتھ نہ لگا، مگر بقول ورڈس ورتھ "شاعر کے خیال کے لئے موضوع ہر جگہ موجود ہے"۔ میر نے انہیں گھریلو اشیاء پر طبع آزمائی نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ شروع کی چونکہ میر کو جانوروں کا عام طور پر بہت شوق تھا اس لئے انہوں نے، بندر بلی، بکری وغیرہ پر مثنویاں لکھیں، اور خوب لکھی ہیں۔

جس وقت میر صاحب کے مکان کی دیوار مزدور کا بار منت نہ اٹھا سکی اور گر پڑی تو کتے وغیرہ فراغت سے میر صاحب کے مکان میں داخل ہوئے اور چین کرنے لگے، میر صاحب بہت پریشان ہوئے۔ اس کا حال انہوں نے یوں ضبط تحریر کیا۔

دو طرف سے تھا کتوں کا رستہ	کاش جنگل میں میں جا کے بستا
ہو گھڑی دو گھڑی تو دھتکاروں	ایک دو کتے ہوں تو میں ماروں
چار جاتے ہیں چار آتے ہیں	چار عف عف سے جان کھاتے ہیں
کس سے کہتا پھروں میں حال نغز	کتوں سا میں کہاں سے لاؤں مغز

اسی مثنوی میں انہوں نے کھٹملوں کا غضب ڈھانا بھی اس طرح بیان کیا ہے:۔

گرچہ بہتوں کو میں مسل مارا پہ مجھے کھٹملوں نے مل مارا
ملتے راتیں کو گھس گئی پوریں ناخنوں کی ہیں لال سب کوریں
ہاتھ تکیہ پہ گہہ بچھونے پر کبھو چادر کے کونے کونے پر
ہاتھ کو چین ہو تو کچھ تھمیے کب تلک یوں ٹٹولتے رہیے

میر صاحب نے ایک مثنوی میں مرغوں کا لڑنا اور ان کے مالکوں کی حرکات کا جو خاکہ کھینچا ہے وہ بھی قابل غور ہے۔

مرغ لڑتے ہیں ایک دو لاتیں سینکڑوں ان سفیہوں کی باتیں
ان لے پر جھاڑے وہ پھڑنے لگے ان نے کی لوک یہ اکڑنے لگے
وہ جو سیدھا ہوا تو یہ ہیں کج ساتھ اس کے بدلتے ہیں سچ مچ
مرغ کی ایک پر فشانی ہے ان کی سو رنگ بدزبانی ہے

میر صاحب کی دوسرے قسم کی مثنویاں کل چھ ہیں سب سے بڑی مثنوی شکار نامہ ہے، جب نواب صاحب شکار کے لئے جنگل کی طرف قدم بڑھاتے ہیں تو جانوروں کی خوف و دہشت کے مارے جو حالت ہوتی ہے اس کا نقشہ پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

چلا آصف الدولہ بہر شکار نہا دیا باں سے اٹھا غبار
روانہ ہوئی فوج دریا کے رنگ لگے کانپنے ڈر سے شیر و پلنگ
طیور آشیانہ سے جانے لگے وحوش اپنی جانیں چھپانے لگے

اسی سلسلہ کی اور بھی مثنویاں ہیں، مثلاً نواب صاحب کا ہولی کھیلنا۔ نواب صاحب کی کدخدائی اور ساقی نامہ۔

میر صاحب کی وہ مثنویاں جو عشق و محبت سے تعلق رکھتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔
شعلہ عشق، دریائے عشق، جوش عشق، اعجاز عشق، معاملات عشق، اور عشق افغان پسر ان مثنویوں میں سے بعض کے وہ اشعار جو عشق و محبت کی تعریف میں ہیں مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر درج کئے جاتے ہیں۔
مثنوی شعلہ عشق میں محبت کی یوں تعریف فرمائی ہے ؎

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور　　نہ ہوتی محبت، نہ ہوتا ظہور
محبت سبب محبت سبب　　محبت سے آتے ہیں کار عجب
محبت ہی اس کارخانہ میں ہے　　محبت سے سب کچھ زمانہ میں ہے
محبت عجب خواب خونریز ہے　　محبت بلائے دل آویز ہے
محبت لگاتی ہے پانی بن آگ　　محبت سے ہے تیغ وگردن میں لاگ
محبت سے پروانہ آتش بجاں　　محبت سے بلبل ہے گرم فغاں
محبت سے ہے انتظام جہاں　　محبت سے گردش میں ہے آسماں

جب ایک جوان رعنا، اور ایک مہ پارہ کی نگاہیں دوچار ہوتی ہیں تو اس وقت اس جوان کا جو حال ہوا اس کا نقشہ 'دریائے عشق' میں یوں کھینچا ہے۔

ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ　　صبر رخصت ہوا ایک آہ کے ساتھ
بیقراری نے کج ادائی کی　　تاب وطاقت نے بے وفائی کی
دل پہ کرنے لگا طپیدن ناز　　رنگ چہرہ کا کر چلا پرواز
ہاتھ جانے لگا گریباں تک　　چاک کے پاؤں پھیلے داماں تک
خو ہوئی نالۂ حزیں کے ساتھ　　رابطہ آہ آتشیں کے ساتھ
کچھ کہا گرکسو نے شفقت سے　　رو دیا ان نے ایک حسرت سے

میر کا کلام

ملا طغرا جو عروضیین کے صدر ہیں فرماتے ہیں "کیف در صہبائے کلامیست کہ بے تلاش فکر باغر نطق در آید وانچہ آورد را جادہ دہد نے کلام را تازگی بخشد دماغ را شگفتگی"۔ علامہ حالی شاعری کی تعریف یوں کرتے ہیں "جو خیال ایک غیر معمولی اور نرالے طور پر لفظوں کے ذریعہ ادا کیا جائے کہ سامع کا دل اس کو سن کر خوش یا متاثر ہو"۔ بالکل یہی حال میر کی شاعری کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ماضی وحال کا سرتاج میر کو صرف اس لئے کہتے ہیں کہ ان کے برجستہ اور سلیس اشعار بغیر مشکل سمجھ میں آجاتے ہیں اور شاعری کی جان بھی یہی ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا　　آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

اور ایک مقام پہ فرماتے ہیں۔

عشق ہمارے خیال پڑا ہے خواب گیا آرام گیا دل کا جانا ٹھہر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا

ملک الشعرا ٹینیسن (Tennyson) لکھتا ہے کہ قابل غور یہ بات نہیں کہ ہم کیا لکھ رہے ہیں بلکہ کس طرح کہہ رہے ہیں"۔ اسی طرح میر کا کلام بلحاظ معنی نہایت اعلیٰ ہے، لیکن بلحاظ زبان بھی خاص امتیاز رکھتا ہے، سادگی ان کے کلام کا جزو اعظم ہے۔ لیکن سادگی میں بھی ہر وقت ایک نیا اسلوب ایک نیا پیرایہ اور ایک نیا انداز ہوتا ہے شبلی نعمانی صاحب فرماتے ہیں کہ" جذبات الفاظ کے ذریعہ ادا ہوں وہ شعر ہے"۔ اگر میر کے کلام کا مطالعہ کیا جائے اور ان کے اشعار شبلی نعمانی کی رائے کے مطابق عقل سلیم کی ترازو میں وزن کئے جائیں تو معلوم ہوگا کہ میر کے اشعار نہ صرف جذبات کے مظہر ہیں بلکہ سامعین کے جذبات کو ابھارنے والے اور ان کے دل پر تیر و نشتر کا کام کرنے والے ہیں اور یہی شعر کی معراج ہے۔ دلی کیفیات اور قلبی واردات کو سادہ شیریں اور خوشنما الفاظ کا لباس پہنا کر اس خوبی سے پیش کرتے ہیں، کہ اس پر سے ہزار بلند پروازیاں اور نازک خیالیاں قربان ہیں، فرماتے ہیں،

کس غم میں مجھ کو یارب یہ مبتلا کیا ہے دل ساری رات جیسے کوئی ملا کیا ہے

حسرت اس کی جگہ تھی خوابیدہ کھول کر میر کا کفن دیکھا

جب میر صاحب نازک خیالی کو سلاست کے ساتھ ملا دیتے ہیں تو ایک عجیب لطف پیدا ہوتا ہے فرماتے ہیں۔

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہوں دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

اسی ہی بیخودی کے مضمون کو غالب نے بھی باندھا ہے اور میر نے بھی غالب صاحب فرماتے ہیں

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی

میر صاحب فرماتے ہیں۔

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو دیر سے انتظار ہے اپنا۔

غالب نے اپنی ذات کو دو مقام پر فرض کیا ہے۔ لیکن میر بیخودی میں اپنے آپ کو ایسے

بھول جاتے ہیں کہ دیر سے انتظار کیا جاتا ہے۔

میر کا کلام دریائے فصاحت میں غرق ہوتا ہے، جس مضمون کو بھی باندھتے ہیں سادگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، جب تصوف میں کچھ فرمانا چاہتے ہیں سلاست کا اس قدر خیال رکھا جاتا ہے کہ سمجھنے والے کو تکلیف نہ ہو فرماتے ہیں

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہی خود مختاری کی ۔۔۔ چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

جب کبھی ان کے کلام میں بلاغت پائی جاتی ہے تو وہی سلاست کا بھیس لئے ہوئے۔

نشانہ باز ایسے ہیں قدر انداز اتنے ہیں ۔۔۔ ادھر چٹکی سے چھوٹا تیر مٹھی سے کماں کھدی

ایک مقام پر میر نے نیم باز آنکھوں کی تعریف اپنے خاص رنگ میں کی ہے، فرماتے ہیں:۔

میر ان نیم باز آنکھوں میں ۔۔۔ ساری مستی شراب کی سی ہے

میر کے زمانہ میں فارسیت اردو پر بہت غالب تھی اور ان کے کلام میں بھی فارسیت کا رنگ بہت ہے، اور کیوں نہ ہو زمانہ کا تقاضہ یہی تھا، چنانچہ خود نکات الشعراء میں فرماتے ہیں۔ "اگر ترکیب فارسی موافق ریختہ بود مضائقہ ندارد" میر صاحب کے چند اشعار جن میں فارسیت کا رنگ غالب ہے نمونتاً درج کئے جاتے ہیں۔

ہنگامہ گرم کن جو دل ناصبور تھا ۔۔۔ پیدا ہر ایک نالہ سے شور نشور تھا

یہ چشم شوق طرفہ جگہ ہے بہار کی ۔۔۔ ٹھہرو بقدر ایک مژہ اس مکان میں

اپنے ہی دل کو نہ ہو واشد تو کیا حاصل نسیم ۔۔۔ گو چمن میں غنچۂ پژمردہ تجھ سے کھل گیا

یاد ایام کہ یاں ترکِ شکیبائی تھا ۔۔۔ ہر گلی کوچہ مجھے کوچۂ رسوائی تھا

علامہ نظم طباطبائی اپنے دیوان کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ "ایجاز مخل از اطناب ممل ناموزوں تر است"۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ میر کے پاس نہ ایجاز مخل ہے نہ اطناب ممل، جو کچھ

بیان کرتے ہیں وہ صاف اور سیدھی سادی اردو ہے، فرماتے ہیں :-

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

خواجہ الطاف حسین حالی مقدمہ شعر و شاعری میں لکھتے ہیں۔ "شاعری کی معراج کمال یہ ہے کہ اس کا عام کلام ہموار اور اصول کے موافق ہو اور کہیں کہیں اس میں ایسا جلوہ نظر آئے جس سے شاعر کا کمال خاص و عام کے دلوں پر نقش ہو جائے، البتہ اتنی بات ہے کہ اس کے عام اشعار خاص خاص اشخاص کے دل پر خاص خاص حالتوں میں تقریباً ویسا ہی اثر کریں جیسا اس کا خاص کلام ہر شخص کے دل پر ہر حالت میں اثر کرتا ہے اور یہ بات اسی شاعر کے کلام میں پائی جا سکتی ہے جس کا کلام سادہ اور نیچرل ہو۔"

بس یہی حال میرؔ کے کلام کا ہے۔ شاعری آسان اس حیثیت سے ہے کہ صرف اس کو قافیہ سمائی کی حد تک رکھیں مگر مشکل اور مشکل تر ہو جاتی ہے، جب جذبات فطرت کا صحیح مرقع اور مناظر قدرت کا سچا خاکہ کھینچا جاتا ہے، بیمار پڑنا نرگس بیمار کا طالب رہنا نزع کی ہچکیوں کا آنا اور مسیحا کا انتظار، عاشق زار کی قبر پر صرصر کا خاک اڑانا اور قمری کا نوحہ کرنا، ان سب باتوں کے بتلانے کے لئے ایک ایسے معجز نما شاعر کی ضرورت تھی جو ساری مسیحائی ایک شعر پر ختم کر دے۔

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

اکثر مقامات پر تصنیف مصنف کی زندگی کا آئینہ ہوتی ہے، اسی طرح شاعر کا کلام بعض بعض جگہ اس کے حالات زندگی کا ترجمان ہوتا ہے، اور اس کی زندگی کا پتہ دیتا ہے۔ پس میرؔ کا کلام حسرت و ناکامی، غم و اندوہ کا جو میرؔ کے مونس و غمخوار تھے سچا اور حقیقی مرقع ہے، ان کا کلام زبانِ حال سے گویا ہے میں جس دل سے نکلا ہوں وہ حرمان و یاس کا پتلا اور ناکامی اور نامرادی کا مجسمہ ہے، خود فرماتے ہیں :-

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان ہوا

میرؔ کا رونا سب کو ہنساتا ہے، جب میرؔ رلاتے ہیں تو سب رونے لگتے ہیں :-

جب کہ پہلو سے یار اٹھتا ہے درد بے اختیار اٹھتا ہے

میر ہنستے نہیں مگر ایک عجیب اور پُر لطف پیرایہ اختیار کرتے ہیں کہ ظرافت کا مزہ صاف عیاں ہوتا ہے، فرماتے ہیں :-

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

رشک کا مضمون کسی شاعر نے نہیں باندھا اور کسی نے اس پر طبع آزمائی نہیں کی اور اس میدان سخن میں تخیل کے گھوڑے نہیں دوڑائے، مگر ایک ہی بات کے لئے میر نے جو انداز بیان اختیار کیا ہے وہ قابل غور ہے۔

مر گیا غیرت کے مارے دیکھی پروانے کی بات شمع کو گل گیر چھیڑے تھی یہی مرجانے کی بات

اسی طرح گریبان کا چاک کرنا ہر شاعر نے ضروری سمجھا ہے اور اس کو اپنے پرواز تخیل کا اعلیٰ نمونہ بنانے کی کوشش کی ہے لیکن میر کا جنوں اس طرح گریبان چاک کرتا ہے کہ اس کا جواب شعرا اپنی متحدہ کوشش کے بعد بھی نہیں دے سکے، فرماتے ہیں :-

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

غزل گوئی میں امام ہونے کے علاوہ دیگر اصناف سخن میں وہ طبع آزمائی کی ہے کہ داد دئے بغیر نہیں بن پڑتی ۔ نہ غالب کا عقیدہ تعجب خیز ہے اور نہ ناسخ کا قول حیرت انگیز اگرچہ ذوق نے غزل گوئی میں بہت زور مارا، مگر میر کا انداز نصیب نہ ہوا۔

اس شاعر شیریں مقال کو سعدی گلستان فصاحت کہیں تو درست، بلبل بوستان سلاست کہیں تو زیبا ہے، خدائے سخن کہیں تو مناسب اور سرتاج الشعرا کہیں تو بجا ہے میر نے چمنستان اردو میں وہ پھول کھلائے جن پر آب حیات شبنم ہو کر برسا، جن کی شمیم نے فضائے عالم میں پھیل کر شہرت عام حاصل کی، اور جن کی شادابی اور تروتازگی میں امتداد زمانہ اور مرور ایام کے ہاتھوں کبھی فرق نہیں آسکتا، اس عندلیب گلشن اردو کی شستہ بیانی اور شیریں بانی، جتنی عبارات اور سلاست کلمات نے اردو کے قالب میں ایک نئی روح پھونک دی اور ایک نئی جان ڈالدی پس اس جگہ پر یہ لکھنا بیجا نہ ہوگا، کہ میر صاحب کا ادعا،

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا مستند ہے میرا فرمایا ہوا

نامناسب نہیں ۔

انجامِ غم

از جناب سید علی اختر صاحب اختر

بہت غمگینیوں سے روح جب بیتاب ہوتی ہے
عروسِ شادمانی آشنائے خواب ہوتی ہے

دھواں سا پھیل جاتا ہے فضائے آسمانی میں
کوئی لذت نہیں ملتی سرودِ شادمانی میں

ہر اک جنبش سے دل کی، درد کی آواز آتی ہے
نہ جانے کیوں مگر نبضِ تمنا ڈوب جاتی ہے

غم افزا کاوشیں رگ رگ میں گو بیدار ہوتی ہیں
عمل کی قوتیں گہرائیوں میں دل کی سوتی ہیں

دماغِ جستجو پر، نا امیدی، مسکراتی ہے
چراغِ فکر کی نورآفریں لو تھرتھراتی ہے

حیاتِ دہر کی ہر سانس محشر خیز ہوتی ہے
فضا اک ظلمتِ مغمومؔ سے لبریز ہوتی ہے

لرزتا ہے فلک اس بارشِ آلام پیہم پر
پہنچ جاتا ہے جب مجروح دل انتہائے غم پر

یکایک قفل کھل جاتا ہے زندانِ مصیبت کا
جبینِ دہر پر ملتا ہے اک پیغام راحت کا

عجب انداز سے اس وقت ہر شے مسکراتی ہے
نقابِ رازِ فطرت اپنے چہرے سے اٹھاتی ہے

فضائیں نور کی موج رواں معلوم ہوتی ہیں
ہوائیں ہر قدم پر گلفشاں معلوم ہوتی ہیں

ہر اک ذرے سے چشمہ پھوٹتا ہے آبِ حیواں کا
ہر اک غنچہ میں ملتا ہے تبسم حسنِ پنہاں کا

بہارِ تازہ آجاتی ہے ہر برگِ خزانی پر
کوئی پردہ نہیں رہتا حریم شادمانی پر

زمین پر جاودانی حسن کے دریا اُبلتے ہیں
رباب زندگی سے سرمدی نغمے نکلتے ہیں

نگاہوں پر حجاب دل شکن باقی نہیں رہتا
فضا میں ابرِ تاریکی فگن باقی نہیں رہتا

ہر اک شئے اپنے اصلی حسن کی تکمیل ہوتی ہے
حقیقت بے نیازِ پردہ تمثیل ہوتی ہے

گزر جاتا ہے دل اندیشۂ دورِ خرابی سے
بدل جاتی ہے ہر ناکامگاری کامیابی سے

تہِ دامانِ راحت زندگی آرام پاتی ہے
یہ پھر گہرائیوں سے روح کی آواز آتی ہے

کہ یہ بیداریٔ احساس اصل زندگانی ہے
یہی انجامِ غم "یعنی نشاطِ جاودانی" ہے

از

جناب ایم اسلم صاحب

جمیلہ اور خورشید دونوں سگی بہنیں تھیں ان کے والد متوسط درجے کے لوگ تھے گاؤں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے جمیلہ کی شادی ایک ایسے شخص سے ہوی جو شہر میں کاروبار کرتا تھا۔ اور خورشید قاسم نام ایک زمیندار کے پلے پڑی۔ شادی کو برسوں گزر چکے تھے دونوں بہنیں اپنی اپنی جگہ خوش تھیں، اور ایام زیست آسودگی اور آرام سے بسر کر رہی تھیں۔

ایک روز جمیلہ کو اپنی ماں جائی بہن یاد آئی۔ چنانچہ وہ اپنے خاوند کے ہمراہ خورشید سے ملنے آئی، خورشید نے اپنے عزیز مہمانوں کی بہت آؤ بھگت کی دو چار روز بعد ایک روز جمیلہ نے خورشید سے پوچھا۔

کہو خورشید کیسی کٹتی ہے"؟

"تم دیکھتی ہو"۔ خورشید مویشیوں کے تھان کی طرف دیکھکر بولی "خیر سے دو بھینسیں بندھی ہیں دو جوڑی بیل ہیں تیس چالیس ایکڑ زمین ہے، ایک آدہ کارندا بھی ہے۔ دودھ مکھن گھر کا ہے گیہوں بھی باہر سے آجاتے ہیں، اور موسم کی ترکاری بھی، اللہ کا دیا سبھی کچھ ہے"، "تو گویا تم اس زندگی کو پسند کرتی ہو!" جمیلہ طنزاً بولی "کچا مکان، گھاس پھوس کی چھت، یہاں گوبر، وہاں گوبر نہ پہننے کو اچھا لباس نہ کھانے کو عمدہ خوراک نہ سونے کو علیحدہ کمرہ نہ بیٹھنے کو ستھری جگہ اے جمیلہ بُرا نہ مانو تو صاف کہہ دوں۔ مجھے تمہاری محبت نے یہاں بٹھا رکھا ہے، ورنہ میں تو ایسے گھر میں ایک روز بھی نہ کاٹ سکوں،

جمیلہ بولی:-

"یہاں سکھ اور چین کی زندگی بسر کرنے کی کونسی چیز موجود نہیں"؟

"چین اور سکھ یہاں۔ اس گھر میں" جمیلہ نے ادہر ادہر نفرت سے دیکھ کر کہا۔ "خورشید

تم کیا جانو چین اور سکھ کس جانور کا نام ہے کبھی میرے پاس چلکر دیکھو کیا کیا سامان جمع کر رکھے ہیں" سب دولت کے کھیل ہیں" خورشید بولی۔ لیکن میں ناشکری کیوں کروں اللہ میاں نے بہت کچھ دے رکھا ہے"

جمیلہ اور خورشید کا خاوند دونو پاس ہی کھاٹ پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے، قاسم جو دونوں بہنوں کی باتیں بڑی غور سے سن رہا تھا بولا!۔

"جمیلہ سچ تو کہتی ہیں۔ ہم لوگوں کو چین اور سکھ کہاں میسر، گنواروں کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے" "کیوں ناشکری کرتے ہو" خورشید اپنے خاوند کی طرف دیکھ کر بولی" یہاں کس چیز کی کمی ہے!" "اور یہاں رکھا ہی کیا ہے!"۔ قاسم مڑکر بولا" خورشید چکی پیسو۔ روٹی کھاؤ بس یہ ہے ہماری خوشی کی ابتدا اور انتہا"

جمیلہ کا خاوند ابھی تک چپکے بیٹھا یہ باتیں سن رہا تھا۔ ایک دو بار کھانس کر بولا! "آپس میں الجھتے کیوں ہو۔ اور زمین حاصل کرنے کی کوشش کرو، یہاں نہیں تو کسی اور جگہ جاکر تلاش کرو، یوں اپاہجوں کی طرح گھر بیٹھ رہنے سے تو کچھ ہاتھ نہ آئے گا"

قاسم" کہتے تو سچ ہو۔ اب کے فصل پک جائے تو ضرور کچھ اور زمین خریدنے کی کوشش کرونگا" "دور کیوں جاؤ" جمیلہ کا خاوند بولا" یہ ریاست کا علاقہ پاس ہی تو ہے لاکھوں ایکڑ زمین یوں ہی پڑی ہے ہمیانی میں روپے ڈالو اور جتنی چاہو لے لو"

فصلیں اب کے سال خوب ہوئی تھیں۔ قاسم کے پاس بہت سے روپے غلہ کی فروخت سے جمع ہوگئے تھے اور اب وہ سفر کی تیاریاں کر رہا تھا۔ لیکن خورشید جسے قدرت سے ایک قانع دل عطا ہوا تھا، اس تجویز کی مخالف تھی، لیکن قاسم جسے دولت کی ہوس بیقرار کر رہی تھی، کب ٹلنے والا تھا، آخر ایک روز وہ گھر سے چل نکلا اور ریاست کے علاقہ میں جا پہنچا۔ اور حسب منشا بہت سی زمین خرید کر کھیتی باڑی کا کام شروع کر دیا۔ اور چند روز بعد خورشید کو بھی اپنے پاس بلوا لیا۔ قاسم بہت محنتی آدمی تھا آسودگی اور آسائش بہت جلد

اس کے گھر کی دربان بن گئی، لیکن دولت کی فراوانی اس کے لئے اطمینان قلب کا سامان مہیا نہ کرسکی، بلکہ یہی دولت اور آسودگی اس کی حرص و ہوس کے لئے ایک تازیانہ ہوگئی۔ قاسم اب بھی اسی جستجو میں مارا مارا پھرتا تھا کہیں سے اسے اور بھی سستے داموں پر اور بہت سی اراضی مل جائے، اور ایک دو برس ہی میں دولت کا مین برسنے لگے، وہ گھر میں بیٹھا اکثر یوں بڑ بڑایا کرتا " تف ہے زندگی پر اگر دولت نہیں تو کچھ بھی نہیں"۔

آخر ایک روز خورشید تنگ آکر کہنے لگی "کبھی اللہ کا شکر بھی کیا کرو۔ اب کونسی تمنا ہے جو باقی رہ گئی"؟

قاسم "اور کونسی آرزو ہے جو پوری ہوئی"۔

خورشید "کیوں کفران کرتے ہو۔ توبہ کرو۔ اصلی دولت تو دل کا اطمینان ہے۔ اگر وہی حاصل نہیں تو پھر زندگی کا لطف کیسا"؟

قاسم "تم یونہی فضول باتیں کئے جاؤگی۔ لومیری سنو کہتے ہیں کہ اس ریاست کے پار پہاڑوں کے سلسلے سے پرے ایسے لوگ آباد ہیں جن کے پاس لاکھوں ایکڑ اراضی پڑی ہے میں نے تو اب وہاں جانے کی ٹھانی ہے"۔

"اور خورشید پھر دیکھو کہ وہ مین برسے گا کہ سب پاپ کٹ جائیں گے"۔

"یہ نگوڑے لوگ کہاں سے آکر تم کو ایسی باتیں سنا دیتے ہیں" خورشید بڑبڑاتی ہوئی بولی

"واہ خوب" قاسم سنکر بولا "خیر خواہوں کو نگوڑا کہتی ہو۔ کہیں عقل گھاس چرنے تو نہیں گئی"

"تیری یا تمھاری"؟ خورشید خاوند کی طرف دیکھکر بولی "سنا نہیں۔ گھر کی آدھی پردیس کی ساری سے اچھی ہے"

"اجی دیس پردیس کی کیا بات ہے" قاسم بولا "پاے گدا لنگ نیست، ملک خدا تنگ نیست"

ہٹ کا پکا اور ضد کا پورا تھا قاسم آخر ایک روز اپنے طویل سفر کے لئے خورشید سے رخصت ہوا۔ خادم ساتھ تھا، اور روپے بھی کافی موجود تھے، آخر منزل بہ منزل سفر کرتا ہوا وہ پہاڑوں سے

یار ایک ایسے ملک میں جا نکلا جہاں میلوں تک سرسبز چراگاہیں اور زرخیز زمینیں غیر آباد پڑی تھیں۔ اس جگہ کے باشندے بہت مہمان نواز تھے ایک دو روز میں جب درماندگی اور سفر کی کوفت جاتی رہی تو قاسم ایک ایسے شخص کے پاس جو ان وسیع زمینوں کا مالک تھا سودا کرنے کے لئے گیا۔ اور پوچھا

"آپ زمین کس نرخ پر دیں گے"؟

"آپ کو کتنی درکار ہے"؟

"قاسم:۔ جتنی بھی آپ دیدیں"۔

"یہاں دینے کا سوال نہیں۔ جس قدر لے سکیں لے لیں"

قاسم:۔ "اور دام!"

زمینوں کے مالک نے چاندی کا ایک پیالہ نکالا اور کہا۔

"آپ اسے چاندی کے سکوں سے بھر دیں اور ایک مقام پر رکھدیں، اور پھر صبح سے شام تک آپ جس قدر زمین کے گرد گھوم لیں۔ وہ سب آپ کی ہوگی"۔

"آپ تو مذاق کرنے لگے" قاسم مسکرا کر بولا۔

"واللہ ہرگز نہیں"

"تو اچھا منظور" قاسم نے ہمیانی سے روپے نکال کر چاندی کا پیالہ بھر دیا، زمینوں کا مالک بولا ایک شرط اور بھی ہے"!

"فرمایئے"

"جس جگہ سے آپ چلنا شروع کریں گے، غروبِ آفتاب سے پیشتر آپ کو اسی جگہ پہنچ جانا ہوگا۔ ورنہ آپ کو روپے واپس ملیں گے اور نہ زمین"۔

قاسم:۔ "یونہی سہی، لیکن جو زمین میں پسند کروں گا اس کی حدبندی کیسی ہوگی"۔

"آپ بیفکر رہیں" زمینوں کا مالک بولا "میرے آدمی گھوڑوں پر سوار ہو کر آپ کے ساتھ جائیں گے، جہاں آپ کہیں گے وہاں سرخ جھنڈیاں لگاتے جائیں گے۔ ان جھنڈیوں کے اندر جس قدر رقبہ ہوگا وہ سب آپ کی ملکیت ہوگا۔"

قاسم کل صبح پر معاملہ رہنے دیں"۔

اگلے روز الصبح قاسم لوگوں کے ساتھ میدانوں میں آیا۔ اس کے پاس پانی کی ایک چھاگل تھوڑا سا پنیر اور روٹی تھی۔ ایک مقام پر ایک سرخ جھنڈی نصب کر دی گئی، اور قاسم جلدی جلدی قدم اٹھا کر چلنے لگا اور اپنی مرضی کے مطابق جگہ بہ جگہ جھنڈیاں نصب کروا تا گیا۔

ہلکے ہلکے نیلے بادلوں کے عقب میں سے آفتاب کی سنہری کرنیں نمودار ہو چکی تھیں قاسم نے ٹھنڈے ٹھنڈے وقت میں بہت سا فاصلہ طے کر لیا۔ لیکن کیا مجال جو ایک بار بھی پیچھے پلٹ کر دیکھا ہو۔ اسے زمین حاصل کرنے کا شوق تھا کہ نہ اسے بھوک تھی اور نہ پیاس، گو اب دھوپ بہت تیز ہو رہی تھی لیکن حرص ہوس کا بندہ گرمی کو کب خاطر میں لاتا تھا، اسی طرح وہ دوپہر تک چلتا رہا۔ اور جب بھوک اور پیاس اور تپش بہت تنگ کرنے لگیں تو اس نے ایک جگہ کھڑے ہو کر پنیر کے ساتھ روٹی کھالی اور چھاگل سے منہ لگا کر ٹھنڈا پانی پی کر پھر چل کھڑا ہوا۔

اب سائے ڈھلنے لگے تھے اور قاسم بھی تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا، لیکن وہ پھر بھی قدم آگے ہی اٹھائے چلا جاتا تھا، چلتے چلتے اس کے پاؤں میں آبلے پڑ گئے، اس نے جوتیاں اتار کر پھینک دیں، کچھ دیر بعد چھاگل بھی بوجھل معلوم ہونے لگی۔ ٹھنڈا پانی پی کر قاسم نے چھاگل بھی اتار کر پھینک دی۔ اور پھر آگے چل کھڑا ہوا۔

جب طیور صحرا کے قافلے دن بھر چرنے چگنے کے بعد بستی کی جانب سے پہاڑوں کو لوٹنے لگے قاسم کو بھی واپس جانے کا خیال آیا۔ اس نے ایک بار للچائی ہوئی نگاہوں سے ان سرسبز چراگاہوں کو جو میلوں تک پھیلی ہوئی تھی دیکھا اور پھر واپس لوٹنے لگا۔ اس کے ہمراہی جہاں جہاں وہ کہتا سرخ جھنڈیاں گاڑتے جاتے تھے،

لیکن اب اس کی حالت بہت خراب تھی۔ آبلوں سے خون نکل رہا تھا زبان سوکھ کر حلق میں کانٹا ہو رہی تھی۔ بھوک سے جان عذاب میں آگئی تھی، قدم اٹھائے اٹھتا نہ تھا۔ لیکن قاسم کو تو زمین کی پڑی تھی۔ اب اس کی منزل مقصود بہت دور تھی، اس لئے وہ اپنی رہی سہی طاقت کے ساتھ بھاگنے لگا۔ آفتاب ایک ناز معشوقہ کے ساتھ مغرب کی گھاٹیوں

کے پیچھے چھپ رہا تھا۔ اب قاسم کو وہ سُرخ جھنڈا جہاں سے اس نے اپنا سفر شروع کیا تھا نظر آنے لگا تھا۔ جھنڈے کے پاس جو لوگ تماشہ دیکھنے کی غرض سے آکر جمع ہو گئے تھے رُومال ہلا ہلا کر اس کی ہمت بندھا رہے تھے۔ آخر اِدھر آفتاب نے مشرق کے مکینوں کو الوداع کہا اور اُدھر قاسم جھنڈے کے پاس پہنچ کر زمین پر گرا۔ لیکن جب لوگوں نے اسے اٹھایا تو وہ ایک جسم بے جان تھا۔

ملک کے دستور کے مطابق زمین کے مالک نے اس کے خادم کو صرف اس قدر جگہ دی جو قاسم کے قبر کے لئے کافی ہو سکے۔

رُباعیات

از

از جناب محمد عباس علی صاحب قاصر گورکھپوری

(۱)

تسلیم ہے عادت انکی جو ہیں کامل
راضی برضا رہتے ہیں مردِ عمل
کیا رنج و ملال اور کیا عیش و نشاط
وہ مرد ہیں ہر حال میں ہیں خوش دل

(۲)

سب پیتے ہیں یوں تو منہ سے نابِ عبر
پیتا نہیں کوئی مخصوص ساغرِ عبر
تشنہ عبر ہے دیکھ تو اے قاصر
دنیا ہے دو روزہ کی تماشائے عبر

غزل

از علامہ نواب ضیا یار جنگ بہادر

بادۂ عشق اگر بوالہوساں نوش کنند　　آنچہ از ہوش بیاد است فراموش کنند

صحبتِ اہلِ غرض عاقبت افسانہ شود　　شمع را می برند از بزم چوں خاموش کنند

نشّہ از بیخبری ترکِ تعلق نہ کند　　سرخوشاں کے رہِ میخانہ فراموش کنند

آید آں روز کہ آہ از دلِ کوثر خیزد　　تشنہ کامانِ تو گر بادۂ غم نوش کنند

چند پرسی ز نمازی کہ بہ سُکر انجامد　　سورۂ فاتحہ صد جائے فراموش کنند

پند شایستہ خزف بیش نہ باشد امروز　　گوہری نیست کہ تا زیب بنا گوش کنند

صد زباں شعلۂ فریادِ عنادل دارد　　آتشِ خرمنِ گل نیست کہ خاموش کنند

از دو چشمِ تو کجا فتنہ رہائی یابد　　گہ ز آغوشِ جدا گاہ ہم آغوش کنند

یارِ دل را نتواں برد بجز دستِ دعا　　ایں نہ رختیست کہ از پشت سر دوش کنند

خارِ حسرت مژۂ چشمِ تماشا گردد　　ہر کجا تاختِ ترکانِ زرہ پوش کنند

غنچہ ہا را بچمن کیست نواسنج ضیا
دردِ دل را کہ بیاں از لبِ خاموش کنند

بدیسی ریل

اجی حضرت! کیا پوچھتے ہو، مولانا شوکت تھانوی کی طرح ہم 'سودیشی ریل' کا خواب تھوڑے ہی دیکھ رہے ہیں، جو مزے سے خیالی گھوڑے دوڑاتے بیٹھ جائیں۔ سودیشی ریل تو جب بنیگی، تب بنیگی، اب تو آنکھوں دیکھا، ہاں آنکھوں دیکھا، 'بدیسی ریل' کا حال سن لو۔ سن کیا لو، جانتے تم خود بھی سب کچھ ہو۔ 'بدیسی ریل' میں بیٹھتے بیٹھتے ادھ بڑھ ہوگئے تو کیا پھر بھی تمھیں اس کا حال سننے کی ضرورت ہے۔

اچھا سنو، غور سے سنو! طبیعت کا پنڈولم (رقاصہ)، تھام کر بدیسی ریل کی باتیں سنو ہاں تو گھر کی چار دیواری یا گاؤں کی سرحد کو پار کرایک دن اپنے رام کے دماغ میں بھی سیر کی سنک سوار ہوئی۔ عمر بھر کی گاڑہی کمائی سے جو تھوڑی بہت پونجی جمع ہوئی تھی، وہ گانٹھ میں باندھی اور چل پڑے سیدھے شاہدرے کی طرف، ہمارا سفر ہی کونسا لمبا چوڑا تھا، جس کے لئے بڑی پونجی درکار ہوتی، روز کنواں کھودنا اور روز پانی پینا، پھر بھی کاٹ کباڑ کر تیرتھ جاترا کے لئے دو سو روپے تو جمع ہوگئے تھے، خیر ہم نے پہلے ریل کبھی نہیں دیکھی تھی نہ اسٹیشن سے پالا پڑا تھا، ہاں سنا ضرور سن رکھا تھا کہ ریل میں بیٹھ کر مہینوں کا راستہ گھنٹوں میں طے ہو جاتا ہے، آرام بھی خوب ملتا ہے، ہم نے کہا۔ مرتی جاتی دنیا ہے، چلو ہاتھ پیر چلتے پھرتے ایک بار تیرتھ جاترا تو کرلیں۔ پھر نہ جانے کیا ہو؟ بس، یہی خیالات اپنے رام کو ریل تک گھسیٹ لائے

پوچھتے پچھاتے اسٹیشن پر پہنچے۔ مسافر خانہ مسافروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بہتیرا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا لیکن کوئی بھی شناسا سا نہ دکھائی دیا، تھوڑی دیر میں ایک مسافر اور آیا۔ میں سامنے ہی کھڑا تھا۔ اس نے مجھے جھک کر سلام کیا میں نے خوش ہو کر سلام کا جواب دیا۔

"کہئے وشو لیھ جی کہاں جانے کا ارادہ ہے" میں نے اشتیاق سے پوچھا "مہاراج میں پریاگ (الہ باد) جارہا ہوں، ہردوار تو کئی بار اشنان کیے۔ اب کی بار

پرماتما کی دیا ہوی تو تروینی[1] میں غوطہ لگانے کا خیال ہے، اس تنناسا مسافر نے بڑی نرمی سے کہا:-

میں بھی گھر سے پریاگ کا ہی ارادہ کر کے چلا تھا، اپنا ایک جان پہچان کا ساتھی پا کر مجھے بڑی خوشی ہوی ۔ علی الخصوص اس لئے کہ میں یاترا کرنے کا عادی نہیں تھا۔ جب وشو ولبھ جی کو میرے پریاگ چلنے کی بات معلوم ہوی ۔ وہ بڑے خوش ہوئے اور بولے ۔ "ضرور چلئے پنڈت جی آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی"

"اچھا۔ پریاگ کی طرف جانے والی گاڑی کب چھوٹتی ہے؟"

"رات کے ساڑھے تین بجے" وشو ولبھ جی نے کہا۔

"رات کے ساڑھے تین بجے، چلو وہ ٹھنڈا وقت ہوگا۔ دن میں تو مارے گرمی کے جی گھبراتا ہے، لیکن کوئی بات نہیں، گھر سے نکلنے کے بعد آرام تو ہے ہی نہیں پھر دھرم کی راہ ہے، بڑی کٹھن"۔

وشو ولبھ جی سو گئے میں جاگتا رہا۔ مجھے یاترا کرنے کی عادت نہیں تھی، ادھر مسافر خانہ میں اتنی جھک جھک تھی کہ نیند حرام ہوگئی۔ تیسرے درجہ کا مسافرخانہ وہاں بھلا گھڑی کا کیا کام۔ ذرا خاموشی ہونے پر اسٹیشن پر بجنے والا گھنٹہ سنائی دیا، معلوم ہوا کہ تین بج گئے ایک طرف سے آواز آئی "پورب کے جانے والو چلو ٹکٹ بٹ رہا ہے" 'بٹ رہا' کا لفظ سن کر میں چونکا۔ 'بٹ'، کیا مفت مل رہا ہے۔ ساری عمر طالب علموں کو "سید ہانت کومدی" پڑھانے میں گزری، بات بات میں ویاکرن کے قاعدے نام کے آگے ناچتے تھے، لیکن تھوڑی دیر میں ہی یہ جان کر اطمینان ہو گیا کہ بدیسی ریل کے ٹکٹ بکا نہیں، بٹا کرتے ہیں ان کو بکنا کہنا ریلوے کی ہتک کرنا ہے۔

میں نے وشو ولبھ جی کو جگایا اور کہا۔ "تیار ہو جاؤ تین بج گئے"، وہ بھڑ بھڑا کر اٹھے اور آنکھیں ملتے ملتے بولے "لائے ٹکٹ، ٹکٹ لادیں" میں نے انہیں گانٹھ میں سے دام کھول کر دیئے، وہ اپنا اور میرا دونوں کا ٹکٹ خریدنے کو چل دیئے۔

ریل آنے میں مشکل سے بیس منٹ رہ گئے تھے، کھڑکی پر آدمیوں کی بھیڑ جمع تھی، سب

[1] الہ آباد کا وہ مقام جہاں تین دریا گنگا، جمنا اور سرسوتی ملتے ہیں۔

ٹکٹ ٹکٹ، چلا رہے تھے، لیکن بدیسی ریل کا "انگلو انڈین" بابو ابھی آرام کرسی پر پڑا خراٹے ہی لے رہا تھا، پولس کے تین کانسٹبل ٹکٹ گھر سے باہر گدھ کی طرح منڈلا رہے تھے لوگوں کی چیخ پکار سن کر ٹکٹ بابو جاگا اور اس نے کھڑکی کھولی، مسافر نجات کا دروازہ کھلا دیکھ کر بڑے شوق سے ٹکٹ خریدنے کو لپکے، ادھر سپاہی لوگ بھی چوکنے ہوئے، چوکسی کے لئے، ان مسافروں کی بھلائی کے خیال سے۔ کہاں جاؤ گے بھئی! آؤ ہم ٹکٹ لادیں، وغیرہ باتیں بناکر مسافروں سے پیسے اینٹھنے شروع کئے جس نے ان سے ٹکٹ منگوایا اسے ہی دو آنے اور پولیس دیوتا کی بھینٹ چڑھانے پڑے۔

کچھ دیر لوگ سیدھے ٹکٹ بابو تک پہنچ گئے، تو انہیں مایوس ہوکر لوٹنا پڑا۔ بابو نے جھڑک کر کہا۔" کہاں کا ٹکٹ؟ سیدھی طرح کیوں نہیں بتاتا؟ جاؤ روپے کی ریز گاری نہیں ہے۔ نوٹ کے روپے لاؤ، تب ٹکٹ ملیگا، ریل آنے میں پندرہ منٹ رہ گئے لیکن بابو کی چڑھی ہوی بھویں نہ اتریں وہ برابر سب مسافروں سے ٹرا کر بولتا رہا، ادھر کانسٹبلوں کی بے ایمانی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ جس نے انہیں دو آنے دے دئیے اسے ہی دوسرے دروازے سے ٹکٹ لادیا گیا، ہمارے ساتھی وشولیھجی نے بھی ایسا ہی کیا، اور بھی بہت سے مسافر اسی طرح ٹکٹ خریدنے میں کامیاب ہوئے، کتنے ہی غریب آدمی چوگنے چنے دام لے کر چلتے تھے رہ گئے۔

بڑی جد وجہد کے بعد ٹکٹ کے پلیٹ فارم پر پہنچے، گاڑی کھڑی تھی، ڈبے مسافروں سے ٹھسا ٹھس بھرے ہوئے تھے۔ بیٹھیں تو کہاں بیٹھیں اور جائیں تو کدھر جائیں۔ سارے ڈبے دیکھ لئے لیکن تل دھرنے کو جگہ نہ ملی۔ وشولیھ نے گارڈ سے کہا۔" دیکھئے صاحب گاڑی میں بیٹھنے کو بالکل............"

"او پاگل کا ما فق مٹ بولو، آم کچھ نائیں جانتا، جہنم میں جاؤ، ہٹو ٹرین اسٹارٹ ہوتا ہے،" گارڈ نے بڑی نفرت سے جواب دیا۔ گارڈ کا خشک جواب پاکر ہم لوگ پھر گاڑی کی طرف لپکے، خوش قسمتی سے ایک خالی ڈبہ دکھائی دیا، اسی میں جھٹ سے بیٹھ گئے، اس میں دو عورتیں پانچ بچے اور ان کے تین مرد تھے۔

ہمارے بیٹھتے ہی گاڑی چلنے لگی۔ ہم نے جگہ ملنے پر خدا کا شکریہ ادا کیا اور ان بیسیوں

مسافروں کی حالت زار پر ترس کھایا جو بیچارے جگہ نہ ملنے سے پلیٹ فارم ہی پر لڑکھڑاتے رہ گئے۔

تھوڑی دیر میں ہاتھرس جنکشن آیا۔ یہاں ٹکٹ چیکر نے اپنی قینچی ہماری کھڑکی سے کھڑکھڑائی، اور لیبل دیکھ کر بولا۔ "او، تم لوگ اس ڈبے سے اترےگا، یہ انڈینس کے واسطے نہیں ہے۔ ڈیکھو (For Europeans only.) لکھا ہے۔

"صاحب! یہ تو تیسرا درجہ ہے، انگریز لوگ اس میں کیوں بیٹھیں گے؟ گاڑی میں کہیں جگہ نہیں ہے، ہمیں اسی میں بیٹھے رہنے دیجئے، بیوی بچوں کو تکلیف ہوگی"۔ مسافروں نے بڑی لجاجت سے کہا۔

"نائیں، بکومٹ، تم کو ہزار بار اترنا ہوگا، ام ابھی پولیس بلاتا ہے" ادھر گورے چکر کی دھمکی سے ہم لوگوں نے وہ ڈبہ خالی کر دیا، پلیٹ فارم پر اسباب کا ڈھیر لگ گیا، سوتے ہوئے بچے بڑے پریشان ہوئے، مگر کیا کیا جاتا۔ صاحب کا حکم تھا اس کی تعمیل کرنی ضروری تھی جوں ہی اس گاڑی میں جگہ تلاش کرنے کے لئے ہم ادھر ادھر دیکھنے لگے، اتنے میں گاڑی چل پڑی! اور سب ہاتھ ملتے رہ گئے، ہمارے دیکھتے دیکھتے ٹرین دھڑ دھڑاتی ہوئی نکل گئی۔

بڑی مصیبت سارا پروگرام بگڑ گیا، دوسری گاڑی بارہ بجے جائے گی، اب اس کا انتظار کرنا چاہئے، آپس میں صلاح مشورہ ہوا، ابھی تو سوا پانچ گھنٹے کاٹنے ہیں، کہاں کاٹے جائیں؟ اسی چبوترے پر یا باہر، اسی سوال پر غور و خوض کر ہی رہے تھے کہ اچانک پولیس کا سپاہی آیا اور ڈانٹ کر بولا۔ "کہاں جاؤ گے؟ چلو باہر، یہ جگہ تمہارے لئے نہیں ہے مسافر خانہ میں پڑو" کانسٹبل کے یہ جملے سب کو برچھی کی طرح لگے، اسباب بہت تھا اس لئے وشو ولبھ نے مددگار اسٹیشن ماسٹر سے پوچھا "آپ اجازت دیدیں تو ہم لوگ کچھ دیر تک یہیں پڑے رہیں"

"نہیں تم لوگوں کو باہر جانا ہوگا، پولس ان لوگوں کو اس جگہ سے ہٹاؤ"، اسٹیشن ماسٹر نے کہا۔

خیر صاحب! قلیوں کو منہ مانگی اجرت دے کر سب لوگ مسافر خانہ میں پہنچے، چو طرف سے یہی آواز کان میں پڑ رہی تھی بھائی یہاں چوری بہت ہوتی ہے، روزانہ کسی نہ کسی کا ٹرنگ

غائب ہوتا ہے، ابھی تین گھنٹے ہوئے ایک مارواڑی اپنے نقدی کے بکس کے لئے رو رہا تھا۔ رام رام کرکے وقت گزارا، گاڑی کا وقت ہونے پر اسٹیشن پہنچے ٹرین آئی اس میں بھی بھیڑ کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ بڑی گھس پٹ کے ساتھ جوں توں کر اس میں بیٹھے، جس بنچ پر جتنے آدمی بیٹھنے چاہئے، اس سے ڈیوڑھے اس پر بیٹھے تھے، نیچے کا فرش اور اسباب رکھنے کے بنچ گھرے ہوئے تھے آدمی سے آدمی کا سر ٹکرا جاتا تھا پسینے کے پرنالے بہ رہے تھے سانس لینے میں مصیبت معلوم ہوتی تھی۔ دم گھٹا جاتا تھا، اتنے میں گارڈ دکھائی دیا "گارڈ صاحب! مرے جاتے ہیں، جگہ نہیں ہے اور ڈبہ لگوا دیجئے"۔ مسافروں نے کہا۔

" او پاگل کا مافق مت بولو، ٹرین اسٹارٹ ہوتا ہے۔ اب کچھ ہو سکتا نہیں"۔ اس ادھ گورے ملازم نے بڑی لاپروائی سے جواب دیا۔

گاڑی اپنی پوری رفتار سے چل پڑی لوگ چیختے پکارتے رہ گئے، بیساکھ کی گرمی نے سب کا ناس نکال دیا۔ پانی پانی کی پکار مچی، مگر پانی کہاں؟ تھوڑی دیر میں ایک اسٹیشن آیا، پانی، پانی، اور پانی! مگر کوئی پانی والا نہیں! معلوم ہوا یہاں ایک پانی والا تو ہے مگر وہ صرف رات کی گاڑیوں پر کبھی کبھی بالٹی لئے دیکھا جاتا ہے۔ باقی وقت میں بابوؤں کی گائے بھینسوں کو چرا لانے اور کاموں سے ہی فرصت نہیں ملتی۔

یہاں سے بھی تالو سے جیب لگا کر آگے بڑھنا پڑا، پانی کا پتہ نہیں پھر ایک اور اسٹیشن پر گاڑی ٹھہری، یہاں بھی پانی والا نداراد۔ بھلا ہو سیوا سمیتی کے رضاکاروں کا، جنھوں نے بڑی پھرتی اور مستعدی سے پانی پلایا۔ جس نے پانی پیا، اس نے انہیں دعا دی اور سیوا سمیتی کا گن گایا۔

خطرناک بھیڑ اور سخت گرمی کی وجہ سے ہمارے ڈبے میں دو عورتیں اور تین بچے بےہوش ہوگئے ساتھیوں کے چھکے چھوٹنے لگے۔ ایسی گھبراہٹ میں ایک مسافر کو رحم آیا اور اس نے جھٹ ریل کی زنجیر کھینچ دی، گاڑی ٹھہر گئی۔ گارڈ غصہ میں آکر بولا کس بدمعاش نے چین کھینچا" کلڈ ماچلا یا جائے گا۔ اچھا ٹکٹ (اگلا) اسٹیشن آنے دو"

"صاحب! یہ عورت بچے گرمی سے پریشان ہیں، ان کے لئے کچھ کیجئے، یہ بیچارے مر

جاتے ہیں، اسی لئے زنجیر کھینچی گئی ہے۔ آپ جو کچھ کر سکتے ہیں ان کے لئے ضرور کریں" اس ڈبے کے کچھ مسافروں نے کہا ہم کچھ نہیں جانتے، مرجانے دو، اچھا چین کس نے کھینچا؟ تم نے؟ اپنا ٹکٹ لاؤ" گارڈ نے نہایت سنگدلی سے کہا۔

اتنی ڈیوٹی ادا کرنے کے بعد گارڈ نے پھر سیٹی بجائی۔ گاڑی چلی اور اگلے اسٹیشن پر پہنچی۔

ٹوڈلہ پہنچ کر گارڈ نے چین کھینچنے والے صاحب کو پولیس کے حوالہ کیا۔

مسافر:- "میں نے کوئی غیر قانونی کام نہیں کیا، آپ مجھے کیوں ٹرین سے اتارتے ہیں؟ خطرے کے وقت زنجیر کھینچنا کوئی جرم نہیں!"

گارڈ:- "نہیں تم نے ہمیں تنگ کرنے کے لئے گاڑی کو غیر ضروری طور پر ٹھہرایا کوئی خطرہ نہیں تھا۔"

مسافر:- "آپ کیسے کہتے ہیں کہ خطرہ نہیں تھا۔ پانچ آدمی بھیڑ اور گرمی کے سبب اب تک بیہوش ہیں۔ ان کی جان پر آبنی۔ اس سے زیادہ اور خطرہ کیا ہوتا؟"

گارڈ:- "نہیں ایسی معمولی باتوں کے لئے گاڑی نہیں ٹھہرائی جاتی۔ تم نے بڑا جرم کیا ہے۔ اچھا جو کچھ ہو، عدالت میں اپنی صفائی دینا۔"

پولیس نے ان صاحب کو ٹرین سے اتار لیا۔ وہ بیہوش مسافر بھی اتار لئے گئے۔ گارڈ نے کہا۔ "انہیں ہیضہ ہوا ہے، ایسی حالت میں ٹرین سے وہ نہیں جا سکتے"۔

اسٹیشن ماسٹر نے بھی گارڈ کے بیان پر صاد کیا، بیہوش مسافر اور ان کے ساتھی ٹرین سے اتار لئے گئے، زنجیر کھینچنے والے صاحب پہلے ہی پولیس کے حوالے ہو چکے تھے، لیکن اس پر کسی نے غور نہیں کیا کہ ایسی سخت گرمی میں ریل میں اتنی زیادہ بھیڑ کیوں ہے؟

ایک مسافر دست سے بری طرح تکلیف میں تھا، وہ پاخانہ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا، لیکن پہلے اس نے یہ نہ دیکھا کہ اس پاخانہ کے نل میں پانی ہے کہ نہیں۔ بہتیرے نل کھٹکھٹایا، پر دو چار بوندیں گریں، اس سے زیادہ پانی نہ نکلا۔ بچارے کی بڑی مشکل میں جان تھی۔ بھلا ہو ارام بابو کا جس نے اپنے لوٹے سے اس مسافر کو پانی دیا اور تب وہ باہر آنے کے قابل ہوا۔ پاخانہ کا یہ حال دیکھ کر اور کسی کی تو ہمت ہی نہیں

نہیں ہوئی کہ ادھر پاخانے کے لئے جانا خیال کرتا ۔ یہ تھا اس کڑاکے کی گرمی میں اس پاخانے کے نل کا حال ۔

خیر، آہستہ آہستہ گاڑی اٹاوہ اسٹیشن پہنچی ، یہاں عجیب کیفیت دیکھنے میں آئی ، گاڑی کو کھڑے کھڑے تیس منٹ ہو گئے ، لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی ۔ سبب دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک اسپشل ٹرین آ رہی ہے ، اس لئے گاڑی ایک گھنٹہ بعد چلے گی ۔ اسٹیشن پر پولس کا سخت پہرہ تھا ، گاڑی کے ایک ایک ڈبے سے لگا ہوا ایک ایک سپاہی کھڑا ہوا تھا ، کوئی مسافر نقل و حرکت کر نہیں سکتا تھا ، اور نہ کوئی شخص پلیٹ فارم پر ٹہل سکتا تھا ، افسروں ، پولیس کے سپاہیوں اور اسٹیشن کے ملازمین کے سوا اور کوئی دکھائی نہ دیتا تھا ، اسپشل کے آنے کے کچھ ہی منٹ پہلے ایک اور تماشا ہوا ، ہماری ٹرین کی سب کھڑکیاں بند کر دی گئیں جس سے کوئی اسپشل کی شکل بھی نہ دیکھ سکے ، اس وقت طبیعت بہت گھبرا رہی تھی ، مگر کیا کیا جاتا ؟ اپنے بس کی کچھ بات نہیں تھی ، تھوڑی دیر میں اسپشل دھڑ دھڑاتی ہوئی نکل گئی ، بند گاڑی میں ہمیں صرف اتنا معلوم ہوا کہ ایک طوفان تھا جو آیا اور چلا گیا ، اس کے سبب ایک گھنٹہ کی تکلیف ہم کو بھگتنی پڑی ۔ اسپشل کے نکل جانے پر گاڑی کی کھڑکیاں کھولنے کی اجازت ملی ۔ جوں توں کرکے پورے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہماری گاڑی چلی اور اگلے اسٹیشن پر پھر ٹھہر گئی ۔ کیوں ؟ جب تک پنجاب میل نہ نکل جائے گا گاڑی آگے نہ بڑھیگی ۔ خیر ، پون گھنٹہ یہاں بھی انتظار کیا ۔ اس اسٹیشن پر تو پانی پانڈے کا پتہ بھی نہ تھا ۔ لوگ پیاس سے بری طرح گھبرا رہے تھے ۔ ناک میں دم تھا ۔

یہاں ایک اور آفت آئی ، ٹکٹ چکر نے ٹکٹ دیکھنا شروع کیا ، اور سب کے اسباب کو بڑی ٹیڑھی نظر سے دیکھا ، کانٹے پر اٹھا اٹھا کر تولا ، میرے ایک ساتھی سے چکر نے کہا ۔

" تمھارا اسباب بہت زیادہ ہے ۔ ایک روپیہ چودہ آنہ لاؤ ۔"

" نہیں نہیں صاحب ! ہم تو پہلے ہی ناپ تول کر سامان لائے ہیں ، یہ بستر ہے اور وہ کھانے کا توشہ ۔ اس ٹرنک میں پہننے کے کپڑے اور کچھ کتابیں ہیں "

" نہیں ، نہیں ، بکو مت ایک روپیہ چودہ آنہ جلد لاؤ ، نکالو ، ورنہ پولیس کے سپرد

کر دیا جائے گا "

" نہیں، صاحب! آپ تو .... "

" نو نو، زیادہ مت بکو، دام نکالو دیر ہوتا ہے "

اس بچارے مسافر نے کلاہ پوش چکر کے رعب میں آ کر ایک روپیہ نکالا

" لیجئے صاحب! ایک روپیہ ہے "

" ویل، چودہ آنے اور دیگا "

" صاحب! اب نہیں ہے۔ یہی روپیہ بڑی مشکل سے نکلا ہے "

" نہیں، بکتا ہے، پاگل نافق، اچھا، بارہ آنہ اور نکالو "

بچارے مسافر نے چوں توں کر آٹھ آنہ اور دیئے اور کہا۔

" لائیے رسید "

" کیسی رسید مانگتا ہے، رسید تو پورے ایک روپیہ چودہ آنہ کی دی جائے گی۔ رسید لینا ہے تو چھ آنے اور نکالو "

غریب مسافر اپنا سامنہ لے کر بیٹھ گیا، پھر رسید کا نام بھی نہ لیا، ایک نہیں اس ٹرین میں کتنے ہی مسافروں کے ساتھ ایسا ہی عمل ہوا، سب نے کچھ نہ کچھ بھینٹ چڑھا کر چکر دیوتا کی بلا کو چوں توں کر کے چھٹکارا پایا۔ تھوڑی دیر بعد کانپور سے آگے ایک چھوٹے سے جنکشن پہ گاڑی کھڑی ہوی، اس کا نام اس وقت یاد نہیں رہا۔ یہاں پچیس منٹ ٹھہرنے کا وقت تھا لیکن جب گاڑی روانہ ہونے میں دس منٹ رہ گئے، تب ایک بابو ہمارے پاس آ کر بولا " ہٹو ہٹو، جلدی ہٹو، اس میں ڈاک کا دفتر آئے گا، فوراً خالی کرو "

" بابو صاحب! آپ کیا کہتے ہیں، اب ہم کہاں جائیں؟ گاڑی چلنے والی ہے۔ کسی اور ڈبے میں جگہ نہیں ہے "

" ہٹو، ہٹو، ہم نہیں جانتے، سرکاری کام ہے جلد ہٹو، قلیوں سے ان کا اسباب نکال کر پلیٹ فارم پر رکھدو، ان کی حجت میں کہیں ڈاک نہ رہ جائے "۔ بات کی بات میں اسباب کا ایک ڈھیر لگ گیا، پندرہ بیس جتنے مسافر اس ڈبے میں تھے، سب اتار لئے گئے،

اتنے ہی میں انجن نے سیٹی دی اور ٹرین چل پڑی ، ہم لوگوں کو اتنا بھی موقع نہ ملا جو دوسرے ڈبے میں جگہ بھی دیکھ سکتے ۔

"اب یہاں سے الہ باد کو گاڑی کب جائے گی ؟-ایک مسافر نے بابو سے پوچھا" چھ گھنٹے کے بعد"

"اس سے پہلے ؟"

"کوئی نہیں ،میل جائے گا ۔ اس سے تم لوگ نہیں جا سکتے ،کیوں کہ وہ یہاں ٹھہرتا نہیں ہو تا چھ گھنٹہ تک مسافر خانہ میں پڑے پڑے وقت کاٹا ، بڑی مشکل سے گاڑی کا وقت ہوا پھر بھیڑ بکری کی طرح اس میں بھرے جانے کے لئے چلے ،گیٹ پر بابو نے ٹکٹ دیکھنے شروع کئے "اوہ ! تمہارا ٹکٹ اب کام نہیں دے سکتا ، اس کی میعاد گزر گئی اتنا وقت کہاں لگایا شاہدرہ سے یہاں تک پہنچنے میں اتنا ٹائم ۔

"نہیں ، اس سے تم نہیں جا سکتے" بابو نے کہا ۔

"بابو جی ، اس میں ہمارا کیا قصور ہے ؟ ہم تو اب تک الہ آباد پہنچ گئے ہوتے" ریل والوں نے ہمیں کئی جگہ فضول کیوں اتارا ؟"

"نہیں ہم کچھ نہیں جانتے ، تم لوگ دوسرا ٹکٹ خرید و ، نہیں تو واپس جاؤ ۔راستہ چھوڑ دو دوسرے مسافروں کو آنے دو" بہت گفت وشنید کیا ،پر اس بابو نے ایک نہ سنی کیا کرتے ہم نے یہاں سے الہ آباد کا ایک دوسرا ٹکٹ اور لیا ۔

تھوڑی دیر میں گاڑی آئی ، اس میں بھی خوب بھیڑ تھی ،لیکن ہم لوگ دل کڑا کر کے بیٹھ ہی گئے ، دل میں کہا کہ کب الہ آباد آوے اور کب دوزخ سے نجات ملے ،

سخت انتظار اور بڑی مصیبت کے بعد معلوم ہوا کہ الہ آباد اب صرف دس بارہ میل ہے یہ معلوم کر کے جان میں جان آئی ، سوچا چلو اب تھوڑی دیر میں اس ریل کی رگڑ سے چھٹی ملیگی ۔الہ آباد اسٹیشن آیا ، سب لوگ گنگا جی کی جے بول کر اترے اور گیٹ کے طرف بڑھنے لگے ، اتنے میں ایک پولیس کے سپاہی نے آکر کہا ۔

"تم سب لوگ یہیں رک جاؤ ، اس گاڑی میں ایک مسافر کی چوری ہو گئی ہے ،سب کی

تلاشی لی جائے گی "

" جمعدار صاحب ، ہمیں چوری سے کیا مطلب۔ گنگا اشنان کرنے آئے ہیں چلے جائیں گے ہم تو اپنے ڈبے سے اٹھ کر بھی کہیں نہیں گئے ، ہمیں اب کیوں روکتے ہیں ؟ "

" نہیں چلو ، تھانے کو ، وہاں داروغہ جی سے جو کچھ کہنا ہے کہہ لینا ، چلو لوٹو ، ادھر ہے ریل کا تھانہ "

" نہیں جمعدار جی ہمارے لئے تو آپ ہی تھانہ دار ہیں ، ہم لوگ بہت تھکے ہوئے ہیں۔ راستہ کی کافی مصیبت برداشت کر چکے ہیں اب اور آفت میں نہ ڈالئے ۔ ہمیں تروینی میں غوطہ لگانے دو آپ کو بھی پُن ملیگا "

" نہیں ، پُن ون ہم نہیں جانتے ، اٹھاؤ اسباب اور چلو تھانے کو "

" اجی حوالدار ، دیکھئے.......... "

" کیوں بکتے ہو ، کیا زبردستی جانا چاہتے ہو ؟ "

ہم اور ہمارے ساتھی اس نئی مصیبت کو دیکھکر بڑے گھبرائے ۔ خشک منت وسماجت کا سپاہی پر کچھ اثر نہ ہوا ، آخر میں سب نے مل کر دس روپے دے کر اس تکلیف کی مصیبت سے پیچھا چھوڑایا۔

رام رام کر کے اسٹیشن سے باہر نکلے ۔ یہاں تانگہ والے ، قلیوں اور پنڈوں نے جو درگت بنائی اس کا بیان غیر ضروری اور ناقابل اظہار ہے ، ایک یکے پر بیٹھ کر سیدھے تروینی پہنچے خوب نہائے دھوئے اور بھگوان کا سمرن کیا ۔ تیرتھ کے ثواب وفضیلت سے ساری حرارت اتر گئی اور طبیعت خوش ہو گئی ، پوجا پاٹ کے بعد کھانا کھایا پھر دھرم سالے میں جاکر ایسا سوئے کہ دوسرے دن صبح آٹھ بجے آنکھیں کھلیں ۔

دوسرے دن پھر تروینی آشنان کے لئے چل پڑے راستے میں سنا کہ کل گیا سے آگے وہ مسافر گاڑی جس میں ہم آئے تھے ، ایک مال گاڑی سے ٹکرا گئی ، وجہ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس گاڑی کے گارڈ اور ڈرائیور اتنی زیادہ شراب پی گئے تھے کہ ضرورت سے زیادہ پاگل بن گئے ۔ اور نشہ کی حالت میں انہیں "لوکن" یا "لین کلیر" کا کچھ دھیان نہ رہا

یکایک اسی لائن کی طرف ٹرین بڑھائی، جس پر مال گاڑی کھڑی ہوئی تھی، مال کے تو انجن اور ڈبوں کا ہی نقصان ہوا ہوگا، لیکن مسافر گاڑی (پاسنجر) کے کتنے ہی مسافر مر گئے اور پچاسوں کو سخت چوٹیں آئیں۔

اس ریل کے حادثہ کو سن کر اپنے رام کا دل دہل گیا، بھگوان کا شکر ادا کیا اور تروینی میں بڑے اعتقاد سے غوطہ لگا کر بھگتی کے جذبہ میں کہا، "گنگا مہارانی! تیرا ہی فضل ہے جو آج ریل کے صدمہ سے ہماری جانیں بچ سکیں، دیوی! تو مبارک ہے، اسی لئے تیری شہرت ساری دنیا میں ہے"۔ (ماخوذ)

غلام رسول (سٹی کالج)

زندہ طلسمات

جس کو باشندگان حیدرآباد کے علاوہ معزز حکماء و ڈاکٹروں نے صدہا مریضوں پر امتحان کر کے سینکڑوں سرٹیفکیٹ عطا کئے، زندہ طلسمات ملکی ہونے کے علاوہ رجسٹرڈ پیٹنٹ شدہ ہے حسب ذیل امراض پر آناً فاناً میں طلسمی اثر دکھانا اس کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے مثلاً ہیضہ، پلیگ، بخار، پیچش، متلی، کھانسی، دمہ، بواسیر، خارش، سانپ بچھو کے زہر اور اقسام کے درد کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے، آزمایئے پبلک کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے قیمت بالکل قلیل رکھی گئی ہے

شیشی نمبر(۱) ۱۰/ نمبر(۲) ۸/ نمبر(۳) ۴/

ایک درجن کے خریدار کو خرچہ وی پی معاف ہوگا

پتہ خط و تار۔ زندہ طلسمات حیدرآباد دکن

(پتہ اس مقام کا یاد رکھنا چاہیئے جہاں مال سستا اور اچھا ہے)

اسٹیشنری کی ارزاں دکان

کو نہ بھولئے کیونکہ بہترین اور فیشن ایبل مال کا نیا اسٹاک آیا ہوا ہے، نیز چھاپے کی جملہ سیاہیاں و دیگر سامان بھی موجود ہے، اضلاع پر مال کی روانگی کا خاص انتظام ہے زیادہ مال کے خریدار کو معقول کمیشن بھی دیا جائے گا

خصوصاً طالب علموں کی سہولت کے لئے اکسرسائز بک و روشنائیوں کا خاص انتظام کیا گیا ہے مختلف کارخانوں کے بہترین فونٹین پن ادنیٰ سے اعلیٰ تک واجبی قیمت پر دیئے جاتے ہیں

جی بابل کرشنیا

چار مینار حیدرآباد دکن نمبر (۲۵۰۰)

زندگی

ایک انگریزی نظم کا معنی خیز ترجمہ

(از)

ابوالافتخار فخر حیدرآبادی

(۱)

پیش جو آئیں مشکلیں ان کا کرو مقابلہ! مردانگی یہی تو ہے ہمت کبھی نہ ہارنا!

بیزار ہو کے موت سے اس کو نہ تم کہو بُرا! اپنے ہی دل میں سوچو تم فائدہ اس سے ہوگا کیا!

(۲)

کیونکہ تمہاری زندگی ایسی تو کچھ بُری نہیں جیسا اسے سمجھ کے تم رہتے ہو غمزدہ، حزیں!

جب یہ تمہاری زندگی سمجھو بُری ہے بالیقیں فرض ہے کر دے بےخبر دولتِ غفلت آفریں

(۳)

مانا غریبوں کی طرح گو ہے تمہاری زندگی خاک میں کیوں ملاتے ہو اپنی یہ پیاری زندگی!

صبر سے حوصلہ سے گر تم نے گزاری زندگی راحت و انبساط میں گزرے گی ساری زندگی!

(۴)

نقدِ قناعتِ گدا چیز ہے ایسی قیمتی سامنے جس کے، نسیہ ہے، مملکت و تونگری!

ویسی ہی کاٹ سکتے ہو ادنیٰ سی جھونپڑی میں بھی جیسے کسی امیر کے گزرے محل میں زندگی

(۵)

دیکھو غروبِ مہر کی آخری کرنیں زرفشاں گھر یہ غریب و امیر کے یکساں ہیں فرق ہے کہاں؟

بے زر ہو، یا ہو زر بکف جب پڑتیں سخت گرمیاں دونوں کے گھر کے سامنے ہوتی ہیں تیغ گدازیاں

حجاز کا ایک روسی سیاح

از

جناب سید علی شبیر صاحب صدر مہتمم عدالت عالیہ سرکار عالی

اب کوئی تیس برس قبل مولوی سید علی شبیر صاحب کی تالیف "حجاز کے فرنگی سیاح" کا نقش اول حیدرآباد کے مشہور ادبی رسالے "افسر" میں "فرنگی حجاج" کے عنوان سے شایع ہوا تھا، جس میں ان فرنگی سیاحوں کے حالات و سفرنامجات پر مختصراً تبصرہ کیا گیا تھا جو مسلمانوں کا بھیس بنا کر مکۂ معظمہ و مدینہ منورہ گئے۔ رسالہ مذکور سے ہندوستان کے بعض دوسرے اخبارات "چودھویں صدی" وغیرہ نے اس مضمون کی نقل کی تھی اس کے کچھ برس بعد لائق مولف نے بعض سیاحوں کے حالات کے اضافہ کے ساتھ حواشی وغیرہ لکھ کر مورخانہ حیثیت سے اس تالیف کو مکمل کر دیا اور پھر اس کے چیدہ چیدہ اجزا ۱۳۴۱ھ سے ۱۳۴۲ھ تک حیدرآباد کے ادبی رسالے "ترقی" میں شایع ہوتے رہے، جب یہ رسالہ بند ہو گیا تو ربیع الاول ۱۳۴۴ھ میں اس مضمون کا سلسلہ حیدرآباد دکن کے ایک دوسرے پرچے "ترجمان" میں شروع ہوا۔ جب اس رسالے کو بھی مرگ مفاجات نے آلیا تو ۱۳۴۷ھ میں اس کا کچھ حصہ "مجلۂ مکتبہ" میں شائع ہوا۔

چونکہ ملک میں ان سیاحوں کے حالات بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھے جا چکے ہیں اور یہ تالیف اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک خاص اہمیت رکھتی ہے اس لئے تو اس کے باقی ماندہ غیر مطبوعہ اجزا میں سے ایک روسی سیاح حجاز کے حالات اب ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں۔

(مکتبہ)

حاجی ولی الدین عرف ڈاکٹر ویلین معاملاتِ مشرق سے بہت دلچسپی اور بھیس بدلنے میں کمال رکھتا تھا جس شرح و بسط سے اس نے عرب کی دوسری سیاحتوں کی کیفیت شایع کی ہے، بعض وجوہ سے وہ.... حرمین الشریفین کے حالات شائع نہ کر سکا۔

ڈاکٹر ویلین ۱۸۱۱ء میں جزیرہ المنڈ میں جو خلیج بوتھینا کے دہانے پر علاقۂ روس میں واقع ہے۔ پیدا ہوا تھا، اس کی ولادت کے کچھ دن بعد اس کے والدین فنلینڈ چلے گئے اور

---

[1] روس کے شمال و مغرب میں صوبۂ فن لینڈ واقع ہے، یہ جھیلوں اور دلدلوں کی سرزمین ہے، یہاں پانچ ہزار سے

اور اس کو وہیں تعلیم دلائی۔ لڑکپن میں اس کی طبیعت سادہ جوشیلی اور آزاد واقع ہوئی تھی، وہ اچھا تیراک اور بہادر ملاح تھا، کھیل اور شرارتوں کے موقعہ پر ہمیشہ اپنے ساتھیوں کا سرغنہ رہا کرتا تھا، ایک مرتبہ کسی شرارت کی سزا میں اس کو ایک گاؤں میں نظر بند بھی رکھا گیا تھا، مطالعہ کتب کا اس کو بڑا شوق تھا سنہ ۱۸۳۶ء تک پچیس برس کی عمر میں وہ نو زبانوں کا مالک ہو گیا تھا، السنہ مشرقی میں عربی و فارسی کی جانب اس کی توجہ بہت تھی اور فرانسیسی و انگریزی علم ادب میں بھی اچھی دستگاہ حاصل کی تھی سنہ ۱۸۳۰ء میں اپنے والد کے انتقال کے بعد وہ سینٹ پیٹرزبرگ[1] چلا گیا اور وہاں کی مشرقی تعلیم گاہ میں ترکی، عربی و فارسی کی تکمیل کی یہاں اس نے عربی سیاحت کا ایک نقشہ اپنے ذہن میں قایم کیا اور یونیورسٹی کی جانب سے اس کو وہ مدد مل گئی جو سیاحت کے شایق طلبا، کو ملا کرتی تھی، اسلامی ممالک میں وہ ایک طبیب کی حیثیت سے سفر کرنا چاہتا تھا، اس لئے وہ اپنی تعلیم طب تمام کرنے کے لئے فنلینڈ واپس چلا گیا۔ جون سنہ ۱۸۴۳ء میں وہ سیاحت عرب کے لئے روانہ ہوا۔ مگر پیرس میں اس کی چوری ہو گئی اور چوروں نے اس پر حملہ کیا جس سے وہ زخمی ہو گیا، اور چھ مہینے تک اس کو مجبوراً یہاں ٹھہرنا پڑا۔ بالآخر جنوری سنہ ۱۸۴۴ء میں وہ قاہرہ پہنچا اور مسلمانوں کا بھیس بنا کر رہنے لگا، پورے سوا برس میں مسلمانوں کے رسم و رواج سے اچھی طرح واقف ہو کر وہ اپریل سنہ ۱۸۴۵ء میں ریگستان کے سفر پر شمالی عرب[2] کی جانب روانہ ہوا، اس کا ارادہ تھا کہ صحرائے نجد[3] طے کرتا ہوا خلیج فارس جائے مگر روپیے کی قلت کی وجہ سے یہ ارادہ ملتوی کرنا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) زیادہ جھیلیں ہیں جو ایک دوسرے سے متصل چلی گئی ہیں، اس کا رقبہ کوئی ڈیڑھ لاکھ مربع میل اور آبادی تخمیناً تیس چالیس لاکھ ہے سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے بعد یہ صوبہ خود مختار ہو گیا ہے۔

[1] روس کے مشہور بادشاہ پیٹر نے اسے آباد کیا تھا اور قدیم دارالسلطنت ماسکو کی بجائے اس کو اپنا پایہ تخت بنایا تھا، سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عمومی کے بعد روسیوں نے جرمنوں کی دشمنی کے باعث اس کا نام تبدیل کر کے پیٹروگریڈ کر دیا یہاں کی آبادی (۲۱) لاکھ ہے،

[2] عرب کا شمالی حصہ ملک حجاز ہے، جس کے مشہور شہر مکہ، مدینہ، جدہ اور طائف ہیں۔

[3] نجد وسط عرب کا ایک زرخیز ملک ہے جس میں صوبہ احسا۔ قطیف۔ عسیر۔ حائل وغیرہ شامل ہیں۔ یہاں کے فرمانروا

پڑا۔ وہ حائل[1] سے مصری قافلہ حج کے رستہ پر ہو لیا، اور عراقی و ایرانی حاجیوں کے ساتھ مکہ و مدینہ جانے کا ارادہ کر لیا۔ حائل تک اس نے حالات سفر تفصیل سے لکھے ہیں لیکن حج کے زمانہ میں اس نے مجبوراً لکھنا موقوف کر دیا، لوگ کہتے ہیں کہ ویلن کی قابلیت کا آدمی حجاز کے حالات نہایت اچھے لکھ سکتا تھا۔ یہاں کے حالات قلمبند نہ کرنے کے وجوہ یہ بیان کرتا ہے کہ:-

"حاجیوں کے ساتھ میرا خوفناک پوزیشن (جو بھیس بدلنے کی وجہ سے تھا) تیز اور تھکا دینے والی منزلیں۔ ساتھ والے عربوں کا اکل شُرب[1] این جو کچھ تو ہر شخص کی ذاتی فکر و غم کی وجہ سے اور کچھ ایرانیوں کی نالائق صحبت کی وجہ سے تھا[2] غرض ان وجوہ نے مجھ کو کسی بات کے لکھنے اور سوال کرنے سے باز رکھا۔"

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) سلطان عبدالعزیز ابن عبدالرحمٰن ابن سعود ہیں جن کے زیر نگیں آج کل ملک حجاز بھی ہے، صرف نجد کا رقبہ پانچ لاکھ مربع میل اور آبادی کوئی بیس پچیس لاکھ ہے، یہاں کا پایہ تخت ریاض ہے۔

[1] نجد کے شمال میں علاقہ جبل شمر واقع ہے، جہاں قبیلہ بنی شمر آباد ہے، اس علاقہ کا دارالامارت حائل ہے پیشتر یہاں اس قبیلہ کا شیخ حکمراں بنا، پھر ترکوں کے زیر اثر آیا۔ آج کل اہل نجد کی...... حکومت ہے، حائل کی آبادی تخمیناً بیس ہزار ہے، یہاں کے باشندے حنبلی مذہب وہابی مشرب ہیں، شہر میں مسجدیں بکثرت ہیں ایک بڑی جامع مسجد ہے، جس میں بہت سے علماء و طلباء رہتے ہیں۔ اس مسجد کے سامنے بڑا بازار ہے، شہر کے گرد فصیل اور وسط میں امیر نجد کا محل ہے، حائل کی آب و ہوا نہایت فرحت بخش ہے، یہاں والوں کا بیان ہے کہ اگر کوئی شخص ثابت بھیڑ کھا کر ایک گلاس پانی پی لے تو ہضم ہو جاتی ہے، عراق و بغداد سے جو راستہ حجاز جاتا ہے اس پر حائل ایک بڑی منزل ہے۔ ایرانی اور عراقی حاجی اسی راہ سے مدینے پہونچتے ہیں، ہارون الرشید کی ملکہ زبیدہ خاتون نے اسی راستے سے حج کیا تھا اس وجہ سے یہ سڑک درب زبیدہ کہلاتی ہے۔ حائل سے مدینہ جانب شمال کوئی دو سو تین سو میل ہے۔

[2] برٹن اور حاجی ولی کہتے ہیں کہ ایرانی لوگ صحرائی سفر میں بہت ہی بدسلیقہ، تکلیف دہ اور بار خاطر ہوتے ہیں ۱۹۴۵ء کے سفر حجاز میں تھوڑی دور تک اس فقیر کا بھی ایرانیوں سے ساتھ رہا ہے۔ بعض کو جفاکش پایا اور بعض کو

حائل سے مدینۂ منورہ تک پہنچنے میں اس کے (۸۵) گھنٹے صرف ہوئے۔ یہ خصوصیت کے ساتھ اونٹوں کی تیز رفتاری کا باعث تھا، وہاں مدینے سے مکے اور پھر وہاں سے جدے گیا۔

ایرانیوں سے نفرت کرنے میں وہ بڑا متعصب مسلمان تھا۔ جدے سے قاہرہ واپس ہو کر وہ مسلمانوں کے ایک محلہ میں فروکش ہوا۔ ۱۸۴۶ء میں وہ جزیرہ نمائے سینا[۱] کو عبور کرتا ہوا دمشق و بیروت[۲] پہونچا ۱۸۴۷ء میں وہ صحرائے نجد کو قطع کرنے کے ارادہ سے پھر روانہ ہوا مگر اس مرتبہ بھی اس کی یہ دیرینہ آرزو پوری نہ ہوئی، اس کے ساتھ والوں کو پتہ لگ گیا کہ حاجی ولی حقیقت میں بھیس بدلا ہوا عیسائی ہے، اس وجہ سے اس کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے اور وہ ایران کی سیاحت کے ارادہ سے روانہ ہو گیا۔ بصرے[۳] پہونچا یہاں اس نے ایک ہنڈی کا روپیہ وصول کرنا چاہا، مگر روپیہ نہ ملا اور بڑی مشکل سے اس کو ایک انگریزی کپتان نے بغداد تک پہونچا دیا، ورنہ بھوکوں مرجاتا، وہ یورپ واپس ہوا۔ اور لندن پہنچا۔ کچھ تو

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) کو تھوڑی سی تکلیف پر چیخ اٹھنے والا۔ ہمارا قافلہ جب مکہ معظمہ پہنچا ہے تو میں نے ایک ایرانی کو جس کا معلم تھوڑی دیر کے لئے نگاہ سے اوجھل ہو گیا تھا یہ کہتے سنا: "خدا لعنت کند بریں معلمان ہمہ دزد ہستند، سارق ہستند، حرامی ہستند"

[۱] جزیرہ نمائے سینا یا کوہ سینا بحر احمر کے ساحل پر قصبۂ سوئز کے قریب ایک پہاڑی مقام ہے، اس کی مشہور دو چوٹیاں جبل قیطران اور جبل موسیٰ ہیں جنکی بلندی سطح سمندر سے علی الترتیب (۸۵۹۲) اور (۷۴۹۸) فٹ ہے۔ جبل موسیٰ کے سامنے ایک چھوٹا سا مسطح میدان ہے جسے الراحہ کہتے ہیں اور عموماً یہی جبل سینا کہلاتا ہے۔ حسب روایت توریت شریف بنی اسرائیل نے اسی جگہ ڈیرے ڈالے تھے، جبل موسیٰ کے دامن میں وادی شعیب واقع ہے، یہاں ایک خانقاہ بنی ہوئی ہے۔ جس میں کلیسائے یونان کے راہب سکونت رکھتے ہیں، اس کے علاوہ اور بھی بعض زیارت گاہیں یہاں موجود ہیں جو رَبِّ اَرِنی اور لَن ترانی کی داستانیں سناتی ہیں جزیرہ نمائے سینا کی آبادی پندرہ ہزار ہے، زیادہ تر عرب آباد ہیں۔

[۲] بیروت شام کا مشہور شہر اور بندرگاہ ہے، تہذیب و تمدن کا تمام سامان یہاں موجود ہے، مدرسے، کالج کتب خانہ۔ مطبع۔ ہوٹل۔ ٹرام وے، حتیٰ کہ ناچ گھر بھی ہے جس نے اس کو رشک پیرس بنا دیا ہے۔ اب اور کیا

خرابی صحت کی وجہ سے کچھ یورپ والوں کی بے میل طرز معاشرت کے باعث جس کی سالہا سال سے اس کو عادت نہیں رہی تھی، نیز مشرق کی سیر کا اشتیاق جو اس کے دل میں باقی رہ گیا تھا، ان سب باتوں نے اس کی فکروں میں اضافہ کر دیا اور اسے مالیخولیا ہو گیا۔ تاہم وہ اپنے واقعات سفر انگریزی میں لکھتا رہا، جو لکچروں کے طور پر اس نے رایل جیوگریفکل[۱] سوسایٹی میں پڑھے، ان سے اس کی شہرت بحیثیت ایک جری کامیاب سیاح کے بہت کچھ ہو گئی اور علمی دنیا کی آنکھیں اس کی طرف متوجہ ہو گئیں فرانس و جرمنی کی علمی سوسایٹیوں نے بھی اس کی بڑی قدر کی اور جب ۱۸۵۰ء میں وہ فنلینڈ واپس گیا تو وہاں اس کو ہلسنگ فورس[۲] یونیورسٹی میں عربی کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔ کچھ عرصہ تک اس نے اپنے فرایض وہاں انجام دئے، مگر وسیع ریگستانوں کا معاوضہ مدرسہ کی تنگ چار دیواری کوئی اچھا معاوضہ نہ تھا۔ اگرچہ وہ سرد ملک کا رہنے والا تھا مگر وہ اپنے وطن کی نمی اور کہر کو عرب کے گرم موسم اور وہاں کی بیدویوں کی سادہ طرز معاشرت سے بدلنا چاہتا تھا، اسی تمنا میں خون جوش کھاتے کھاتے اس کو حرارت لپٹ گئی جو آخر کار اس کی موت کا باعث ہوئی ۱۸۵۱ء میں اس نے سینٹ پیٹرزبرگ کی جیوگریفکل سوسائٹی[۳] سے معاملہ کر کے پھر سیاحت عرب کی دل میں ٹھانی تاکہ اس ملک کو وہ پوری طرح...... چھان مارے اس نے چھ سال کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) چاہئے۔ آبادی کوئی تین لاکھ ہے (۱۳) بصرہ وعراق عرب کا مشہور بندرگاہ اور شہر ہے حضرت عمرؓ کے زمانہ میں آباد ہوا تھا۔ شط العرب کے کنارے بسا ہے، بغداد اور بصرہ کے درمیان آج کل ریل بھی چلتی ہے، اور کشتیاں بھی۔ آبادی کوئی ایک لاکھ ہے (۱) جیوگریفکل سوسائٹی ۱۸۳۰ء میں بمقام لندن قایم ہوئی تھی جو آج تک اپنا کام کر رہی ہے۔ اس کے مقاصد جغرافی تحقیقات و انکشافات ہیں:۔

۲۔ صوبۂ فن لینڈ کا پایہ تخت ہے، یہاں کی یونیورسٹی مشہور ہے جس میں تقریباً تین ہزار طالب علم پڑھتے ہیں یہاں کے کتب خانہ میں کوئی ڈھائی لاکھ کتابیں ہیں، علم ہیت کی تعلیم کے لئے رصدگاہ بھی اچھی بنی ہوی ہے۔ آبادی کوئی دو لاکھ ہے۔

۳۔ وہ انجمن جس کے مقاصد جغرافی تحقیقات اور نامعلوم ملکوں کے حالات دریافت کرنا ہوں۔

کی تنخواہ پیشگی وصول کرنے کی اجازت لے لی، مگر کسی وجہ سے یہ تدبیر ناکام ہوگئی، چونکہ اسلامی ممالک سے اس کو گہری دلچسپی تھی اور یورپ میں اس کا دل نہیں لگتا تھا، اس لئے پھر یہ مصر پہنچ گیا، اور اسکندریہ میں اس نے تجارت کی دکان کر لی۔ وسط ۱۸۵۳ء میں جب برٹن سفر حجاز کی تیاری کے لئے قاہرہ میں مقیم تھا، یہ بھی وہاں ٹھہرا ہوا تھا اور دونو ایک ہی مسافر خانہ میں اترے ہوئے تھے، برٹن نے اس کے قیام کی وجہ اپنے سفرنامہ کی پہلی جلد میں یہ تحریر کی ہے کہ حاجی ولی (ویلن) کے ساتھ تجارت میں ایک بدمعاش محمد شفیع نامی نے ساجھا کر لیا تھا، یہ شخص اپنے کو بڑا مالدار ظاہر کرتا تھا، خفیہ طور پر بردہ فروشی بھی کرتا تھا۔ اور جعلسازی و دغابازی اس کا خاص پیشہ تھا، چنانچہ اس نے حاجی ولی پر بھی دو ڈھائی ہزار روپیہ کا دعویٰ قاہرہ کی عدالت میں دایر کر دیا تھا اور حاجی ولی اس کی پیروی کے لئے اسکندریہ سے قاہرہ آیا ہوا تھا۔ یہ مقدمہ برٹن کی حجاز سے واپسی کے بعد بھی اکتوبر ۱۸۵۳ء تک چل ہی رہا تھا۔ برٹن کی حاجی ولی سے تقریباً روزانہ ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ اس کی دیکھا دیکھی برٹن نے ایک ہندوستانی حکیم کا روپ بھرا، ورنہ پہلے اس کا ارادہ تھا کہ وہ مرزا عبداللہ بوشہری کے نام سے حجاز میں داخل ہو مگر ویلن نے اس کو یہ مشورہ دیا کہ حجاز میں ایرانی بڑی نفرت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں[۱]۔ تم بھول کر بھی ایرانی مت بنو، ورنہ بڑی مصیبت میں پڑو گے، چنانچہ اسی مشورہ پر عمل کرکے، برٹن نے اپنا نام حکیم عبداللہ خان رکھ لیا تھا اور اپنے کو ہندوستانی ظاہر کیا تھا، برٹن اپنے سفرنامے میں ویلن کو جابجا حاجی ولی کے نام سے یاد کرتا ہے اور وہ مصر میں بھی اسی نام سے مشہور تھا

برٹن نے اس کو نہایت سادہ مزاج، صاف باطن لکھا ہے۔ سفرنامہ برٹن کے دیکھنے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ویلن کو شراب نوشی سے سخت پرہیز تھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر اس جلسہ نوشی کی کیفیت جس میں برٹن اور ترکی بے قاعدہ فوج کے ایک البانی[۲] کپتان علی آغا نامی

---

[۱] ۔ ایرانی اپنی متعصبانہ حرکات کی وجہ سے حجاز میں بدنام ہیں

[۲] ۔ البانیا سلطنت ٹرکی کا ایک مشہور کوہستانی صوبہ تھا جسے ۱۹۱۲ء میں دول یورپ نے ترکوں کے قبضہ سے

نے ویلن کو دھوکے سے بلایا تھا، سفرنامۂ برٹن سے ترجمہ کرکے درج کردیا جائے تاکہ ناظرین خود ڈاکٹر ویلن کے عادات و اطوار کا اندازہ کرسکیں۔ برٹن۔ علی آغا۔ اور ویلن تینوں ایک ہی سافر خانہ میں فروکش تھے اور برٹن شراب پینے کے لئے علی آغا کے کمرے میں گیا ہوا تھا۔ وہ وہ لکھتا ہے کہ :۔

"نو بجے رات کو جب کاروانسرائے میں بالکل سناٹا ہوگیا میں نے اپنا حقہ اٹھایا۔ تمبا کو کی تھیلی لی، تلوار کمر سے لگائی اور چپکے سے علی آغا کے کمرے میں چلا گیا۔ یہ اس وقت، زمین پر فرش بچھائے بیٹھا تھا، سامنے چار موم بتیاں جل رہی تھیں۔ دسترخوان چنا ہوا تھا جس میں لوہے کے ایک برتن میں پانی بھرا ہوا تھا۔ جس میں عرقی (شراب کا) سفید بلوری قرابہ اور عطر کی ایک شیشی پڑی ہوئی تھی، علی آغا نے میری بڑی آؤ بھگت کی۔ اس نے ایک چھوٹا سا گلاس اٹھایا، اچھی طرح دیکھا۔ انگلیاں ڈالکر اسے صاف کیا، لبالب بھرا اور سلام کرکے مجھے دیا، میں نے جھک کر سلام کیا اور گلاس لے کر ایک سانس میں چڑھا گیا۔ اسی طرح اس نے بھی پی اور دور چلتا رہا۔ ہر گلاس کے بعد حلق ٹھنڈا کرنے کے لئے ہم ایک ایک گھونٹ پانی کا اور ایک ایک چمچہ گوشت یا کسی اور چیز کا کھاتے رہے۔ پھر ہم نے اپنے حقے بھرے۔ اور روزہ داروں کی طرح لمبے لمبے دم لگانے لگے۔ البانی کپتان نیم مست تھا مگر وہ برابر بھرتا اور پیتا رہا۔ میں بھی مدہوش نہیں ہوا۔ علی آغا نے عطر کی شیشی اٹھائی اور سیدھی ہتیلی پر عطر ڈالکر میرے منہ پر ملا، میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ لیکن ہماری سرخوشی زیادہ دیر تک نہ ٹھری۔ کپتان نے یہ بات نکالی کہ حاجی ولی کو بہکا پھسلا کر اپنے ساتھ یہاں بلا لاؤ اسے بھی زبردستی پلائیں گے۔ یہ بہت ہی بیہودہ خیال تھا۔ حاجی ولی کو یہاں بلانا گویا قمارخانہ میں محتسب کو دعوت دینا تھا۔ خیر صاحب۔ میں حاجی کو بلانے کے لئے دوڑا

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) نکال کر ایک علیحدہ عیسائی ریاست قایم کردی۔ اب بھی اس کے بعض بعض علاقوں میں مسلمان رئیس حکمراں ہیں، یہاں کی آبادی پندرہ سولہ لاکھ ہے۔ جس میں بارہ تیرہ لاکھ مسلمان باقی عیسائی ہیں جنکی خاطر یہاں ایک عیسائی فرمانروائی ضرورت ہوئی۔ یہاں ایک جنگجو مسلمان قوم آرنوت زیادہ آباد ہے۔

گیا اور جب اس کو اپنے ساتھ لے کر واپس آیا تو دیکھا کہ علی آغا نے تفریح کا اور بھی سامان تیار کر لیا ہے۔ اس نے سبز پتوں کی ایک شاخ صحن میں کھڑی کر دی اور پانی کا ایک گھڑا اسطرح لٹکا دیا کہ اس میں سے باریک دھار نکلکر سبزی پر سے بہتی بہتی اور اس کے سامنے بیٹھا ہوا وہ اپنے وطن کے سبزہ زاروں اور بہتے ہوئے چشموں کا تصور کر رہا تھا۔ حاجی ولی کے پہنچتے ہی علی آغا کھڑا ہو گیا اور حاجی کے کندھے پکڑ کر اسے بٹھا دیا۔ بڈھا آدمی اس تماشے کو دیکھکر ڈرا۔ کپتان کا نشہ اس وقت زوروں پر تھا، اس نے گلاس بھرا اور حاجی سے پینے کو کہا۔ اس نے قطعی انکار کیا۔ تب علی آغا خود پی گیا۔ ہم نے اپنے ناراض حاجی کو حقہ پلایا اور پھر وہی چھیڑ شروع کی۔ حاجی نے ہماری بہت منت و سماجت کی کہ میں نے یہ گناہ کبیرہ عمر بھر نہیں کیا۔ ایسا ہی ہے۔ تو میں تمھارے ساتھ کل پی لونگا۔ کبھی وہ قرآن کی آیتیں پڑھتا تھا، کبھی خوشامد کرتا تھا۔ کبھی پولیس کو بلانے کی دھمکی دیتا تھا لیکن نہ سنی، آخر مجبور ہو کر وہ بے تحاشا بھاگ کھڑا ہوا۔ اور گھبراہٹ میں اپنا جوتا، ٹوپی اور اور حقہ بھی یہیں چھوڑ گیا، علی آغا نے اس بے وفا مہمان کا تعاقب دروازہ تک کیا پھر لوٹ کر اس کے جوتے، ٹوپی اور حقے پر شراب چھڑکی اور جتنی زبانیں اس کو آتی تھیں ان میں حاجی کو گدھا کہا۔ اس کے بعد ہم نے کھانا کھایا اور گوارش طعام کے لئے کئی گلاس اور پیئے اور حقوں کے دھوئیں اڑائے، اب علی آغا بڑی شان سے کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا کسی طائفے کو بلاؤ میں اس کا ناچ دیکھکر اپنی آنکھیں سینکونگا۔ میں نے کہا، کاروانسرائے میں رنڈیوں کے آنے کی ممانعت ہے۔ اس نے نشیلی آواز میں پوچھا کس نے ممانعت کر دی ہے، میں نے جواب دیا پاشا نے۔ اس پر علی آغا نے آہستہ سے اپنی ٹوپی اتاری، آستین سے اس پر برش کیا اور ذرا آگے کی طرف جھکا کر اسے اپنے سر پہ جمایا۔ اور موچھوں کو بل دیتے دیتے کلا بتو بنا دیا۔ کندھے پر حقے کی نلی رکھی اور دروازے کی طرف چلا اور کہا، خدا کی قسم پاشا کو اپنے ساتھ لاکر دروازے کے سامنے نچاؤنگا۔"

اس کے بعد علی آغا نے کاروانسرائے میں بہت غل مچایا اور کئی سوتے ہوئے آدمیوں کو حقے کے نیچے مار مار کر جگا دیا، کسی کو ڈھکیل دیا۔ کسی کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا۔ بڑی مشکل سے

اس کا ملازم اور برٹن اس کو پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے اس کو کمرے میں لائے ، وہ چیخ چیخ کر مصریوں کو گالیاں دے رہا تھا ، اور پکار پکار کر اپنا قدیمی نعرۂ جنگ لگا رہا تھا کہ ،اے مصریو ،اے کتے کی اولادو ،اے فرعون کے بچو ، ہم نے تمام اسکندریہ کو ذلیل کر دیا ، تمام قاہرہ کی عزت مٹادی تمام سوئز کو بے آبرو کر دیا"۔

برٹن کہتا ہے کہ دوسرے روز حاجی ولی میرے پاس آیا اور طعن آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا کہ اب خیریت اسی میں ہے کہ تم فوراً حج کو روانہ ہو جاؤ اُس کا کہنا ٹھیک تھا۔ ایک ہفتے تک کاروانسرائے میں البانی کپتان کی شرارت اور ہندوستانی حکیم (برٹن) کی ریاکاری کے سوا اور کوئی ذکر ہی نہ تھا۔

ویلن کی وفات کے متعلق رالی صاحب اپنی کتاب کرسچینز اَیٹ مکہ (مکہ میں پیروان مسیح) میں لکھتے ہیں کہ سیاحت عرب کی آخری مہم کے بارہ میں جب اس کی تجویز پوری نہ ہوئی تو اس کو اس قدر صدمہ بیٹھا کہ ۱۸۵۲ء میں وہ امراض قلب میں مبتلا ہو کر مرگیا۔ دلشکنی اس کی ضرور ہوئی تھی اور ممکن ہے کہ وہ مرا بھی امراضِ قلب سے ہو لیکن رالی صاحب نے سن وفات صحیح نہیں لکھا۔ ۱۸۵۳ء تک وہ مصر میں موجود تھا ، جیسا کہ ہم ابھی سفرنامہ برٹن سے لکھ چکے ہیں غالباً ویلن کا انتقال ۱۸۵۴ء یا اوائل ۱۸۵۵ء میں ہوا ، جیسا کہ سفرنامۂ برٹن سے مترشح ہے۔

ویلن کے حالات سفرعرب ۱۸۵۴ء میں رایل جیوگرفی کل سوسائٹی لندن کے رسالہ جلد نمبر (۲۴) میں شائع ہوئے ہیں۔

ؔ۔ آگسٹس رالی صاحب اس کتاب کے مولف ہیں۔ یہ ۱۹۱۱ء میں تالیف ہوئی ہے ، یعنی اس فقیر کے مرتبہ مضمون فرنگی حجاج کے گیارہ برس بعد۔ رالی صاحب چونکہ عرب کے حالات سے بالکل نابلد ہیں اس وجہ سے انہوں نے عیسائی سیاحان حجاز کے صرف حالات پر اکتفا کیا ہے۔ ان کے بیان کردہ واقعات سفر پر کوئی تنقیح یا تنقید نہیں کیا۔

قندِ پارسی

(از)

مولانا حکیم محمد وحید الدین عالی مرحوم

کارِ من با ضبطِ سوزِ عشق تا افتادہ است
ہمچو نے در استخوانم شعلہ ہا افتادہ است

از غرورِ آرائی بگلزارِ جہان طاؤس وار
ہر کسے غافل زعیبِ پیشِ پا افتادہ است

کس نمی بیند دریں باغ از سرِ چشمِ التفات
چوں گلِ پژمردہ کز بادِ صبا افتادہ است

زانقلابِ آسماں آں عہدِ بیمہری رسید
کآشنا در فکرِ قتلِ آشنا افتادہ است

از ہدایت بسکہ رنگیں نغمہ ہا دارم بلب
عندلیبِ سدرہ چشیم از نوا افتادہ است

از تپیدِ تہلکۂ او فریاد می خیزد ز خاک
گر شہیدِ تو بدشتِ کربلا افتادہ است

بیقرار شس چوں سپند از خودی دارد خبر
کز کجا برخاستہ است؟ در کجا افتادہ است

عالمے باشد اسیرِ حلقۂ گیسوئے او
از جنوں ہر کس دریں دامِ بلا افتادہ است

حیرتِ حسنت مرا کرد از دو عالم بے خبر
من نمی دانم کجایم دل کجا افتادہ است

حیف از قحطِ خریداران ببازارِ جہاں
گوہرِ فضلِ تو عالی از بہا افتادہ است

محبت و عشق

از جناب شیخ عبد الحمید صاحب شوق - بی اے (آنرز)

ذیل کا مضمون شوق صاحب کی کتاب مبادئ نفسیات کے چودھویں باب کا ایک حصہ ہے جو دارالاشاعت مکتبہ کی جانب سے چھپکر عنقریب شایع ہو گی۔ ہم مصنف کی اجازت سے اس حصہ کو جس میں اصول نفسیات کے تحت کافی روشنی ڈالی گئی ہے ناظرین مکتبہ کے ذوقِ مطالعہ کے لئے شایع کر رہے ہیں

(مکتبہ)

تمام جاندار اپنے ہم جنسوں کے ساتھ ملکر رہنے کے فطرۃً خواہشمند ہوتے ہیں اور انسان تو سب سے بڑھ کر مدنی الطبع واقع ہوا ہے، اس کی خصلت ہی یہ ہے اپنے ہم جنسوں کی صحبت کے بغیر اس کو چین نہیں پڑتا اور تنہائی اس کے لئے ایک عذاب الیم کا حکم رکھتی ہے۔ جانوروں میں بھی اپنی مادہ اور اولاد کی محبت بہت بڑی حد تک پائی جاتی ہے، اور ان میں یہ خصلت جبلی اور وجدانی طور پر (Instinctively or Intuitively) موجود ہوتی ہے۔ لیکن انسان کو جو شئے بذریعہ جبلت وجدان حاصل ہوئی ہے اس کو یہ اپنے نفس مدرکہ کے تصور اور تخیل کی وجہ سے چار چاند لگاتا ہے، اسی طرح اس نے محبت اور ہم جلیسی کے شریف فطری وجدان کو ایسا رنگ دیا ہے کہ ؎

محبت زندۂ جاوید کر دیتی ہے انساں کو رہے ہیں لیلی و مجنوں جہاں میں داستاں ہو کر

(شوق)

حضرت انسان محبت فطری کو وحشت عشق تک ترقی دے کر یہ فرماتے ہیں ؎

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

لہ۔ ناظرین عشق کی اس تشریح کو وجدان الفت سے متمیز رکھیں، وجدان الفت ایک مرکب وجدان ہے۔ اس میں موردِ الفت کی دلی عزت اس کی یا بعض عادات کی تعریف اپنے ذاتی مفاد کا اس پر انحصار، یا اس سے تعلق ایک مدت کی

اگر پوچھا جائے کہ یہ عشق و محبت کیا شئے ہے تو جواب ملتا ہے :-

اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی　　شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ

دل بدست دگرے دادن و حیراں بودن　　عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن

لیکن حکمائے محققین مثل ڈاکٹر فرائڈ[1] (Dr. Froyde) اور حکیم محمد حسن قریشی[2] وغیرہ اس کی طبعی اصلیت اور کنہ نکالتے ہیں، ان کی رائے میں محبت حیوانوں میں ہو یا انسانوں میں محض مادہ منویہ کی تہیج کا نام ہے، ہمارے خیال میں یہ رائے مندرجہ ذیل دلائل کی بناء پر نہایت قرین صواب ہے۔

(۱) عام لوگوں میں محبت اولاد و والدین (Filial Love) محبت زوج اور محبت برادران اور ہمشیرگان ہی محبت سمجھی جاتی ہے، ان میں سے اولاد تو ہمارے مادۂ شہوانی کی تہیج کا نتیجہ ہوتی ہے اور ہم خود والدین کی اسی تہیج کا نتیجہ ہیں۔ خاوند اور بیوی کا جو تعلق تہیج ہوتا ہے اس کے بیان کی حاجت نہیں۔ اور بہن اور بھائی ایک ہی تہیج کا نتیجہ ہوتے ہیں یہی تہیج یا ہیجانِ فطری اپنے موقع اور محل نیز سوسائٹی کے رسم و رواج کا پابند ہو کر محبت کی مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے۔

(۲) اولاد اور والدین کی محبت بھی اگرچہ بعض اوقات بعض خاص وجوہات سے شدت کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے۔ جیسا کہ حضرت یوسف اور حضرت یعقوب کے قصہ میں، لیکن اصل میں عشق و محبت اسی کو کہتے ہیں۔ جو ان لوگوں کے درمیاں ہو جن میں زن و شوہر کے تعلقات

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ہم طبیعی کا اثر وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ انگریزی میں لفظ (affection) الفت کے مفہوم کو خوب ادا کرتا ہے محبت ایک حد تک الفت میں داخل ہوتی ہے، لیکن اسکی روز افزوں ترقی اس کو عموماً عشق سے قریب تر رکھتی ہے (affection) بمعنی تاثیر کو ناظرین اس لفظ کے اس محل استعمال سے متمیز رکھیں۔ مؤلف

[1] ملاحظہ ہو ڈاکٹر فرائڈ کی کتاب　　[2] اس کے علاوہ اور بہت سے یورپین محققین کی رائے بھی یہی ہے، چند ایک کے نام حسب ذیل ہیں :-

قایم ہو سکتے ہیں۔

(۳) عشق اور محبت سب جوانی کے چونچلے ہیں جب کہ قوی شہوانی اپنی طاقت پر ہوتے ہیں اس کے بعد بڑھاپا برودت اور یبوست مزاج میں پیدا کرتا ہے، یعنی رگوں کا خون خشک ہو کر کمزوری اور ضعف شروع ہو جاتا ہے تو پھر

وقتِ پیری شباب کی باتیں — ایسی ہیں جیسی خواب کی باتیں

(۴) مرد اور عورت میں جب اول اول ملاپ ہوتا ہے تو محبت بہت جوش و خروش پر ہوتی ہے، لیکن اس کے بعد کمی ہونی شروع ہوتی ہے، اور آخر کار جب اولاد ہو جاتی ہے تو دونوں کی محبت کا زیادہ حصہ بچہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

(۵) بعض میاں بیوی میں اگر نا اتفاقی رہتی ہو تو بچہ ہونے پر (چونکہ وہ دونوں کی باہمی تسخیر کا نتیجہ اور اس لئے دونوں کا مواد محبت ہوتا ہے) وہ ان دونوں کی موافقت کا موجب ہو جاتا ہے اور اس کی پرورش وہ دونوں ایک دل ہو کر کرتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ انسان اپنی فطری خواہشات میں چونکہ فعلی توجہ بھی شامل کر سکتا ہے اس لئے اس خواہش فطری کے کسی مورد پر جب عملی توجہ مسلسل مبذول ہوتی ہے تو اس کا خیال گویا عادت میں داخل ہو کر طبیعت ثانیہ بن جاتا ہے، فعلی توجہ کے علاوہ انسان کو جذبۂ جمالی اور معیار حسن کی ودیعت بھی ملی ہے، پس انسان اپنی فطری خواہش کا مورد بنانے کے لئے ایسے شخص کو انتخاب کرتا ہے جو اس کے معیارِ حسن پر ٹھیک اترے اور جس کی بابت وہ یہ کہہ سکے کہ:۔

محبوب بھی چنا تو زمانہ میں لاجواب — قربان جاؤں اس نگہِ انتخاب کے

ممکن ہے کہ اس کے انتخاب کو لوگ بھی وہی درجہ نہ دیں جسطرح مشہور ہے کہ (شوق)

گفت لیلیٰ را خلیفہ کاں توئی — کز تو مجنوں شد پریشان دعوی

از دگر خوباں تو افزوں نیستی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ۔ مین ۔ سلے ۔ شاوٹ وغیرہ لیکن سب سے زیادہ وضاحت اور بلند آہنگی کے ساتھ یہ نظریہ پروفیسر ربو (Prof Riboo) ایک فرنچ محقق نے پیش کیا ہے، اس کی کتاب کا مطالعہ جذبات کے بارہ میں نہایت عجیب و غریب معلومات کا اضافہ کرتا ہے، فلسفہ جذبات میں مولوی عبد الماجد نے اس میں سے اقتباس کر کے لکھا ہے وہ

اس کا جواب وہی ہو سکتا ہے جو لیلیٰ نے دیا تھا۔

گفت خامش چوں تو مجنوں نیستی

یعنی کہ۔ لیلیٰ را با چشم مجنوں باید دید۔ عاشق کے معیار حسن پر زمانہ میں صرف اس کا محبوب ہی ٹھیک اترتا ہے۔ جب وہ معیار کسی شخص میں موجود مل جاتا ہے تو پھر قوائی فطری اس کو اس سے طلب مواصلت پر بیقرار کر دیتے ہیں، لیکن سوسائٹی کی پابندیاں اور قانون، مذہب اور اخلاق کے جذبات اس کی راہ میں حائل ہو جاتے ہیں تو ان سب کو توڑنے کی وحشت سر پر سوار ہوتی ہے امید اور یاس کی کیفیات کی وجہ سے

ہوتی ہے بے صبری و طاقت میں جنگ   عرصۂ عالم نظر آتا ہے تنگ

(حالی)

ایک دفعہ اتفاقی طور پر اپنے محک حسن پر درست شخص مل جانے کے بعد اس کا ہر وقت تخیل اور تصور یہ کیفیت پیدا کرتا ہے کہ:۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا   جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

(اور)

گوشۂ دل میں بنی تصویرِ یار   جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

تصور اور تخیل کے ساتھ ارتباط خیالات و تصورات کا بیان ہو چکا ہے۔ محبت اور عشق جس میں ہر وقت ایک ہی خیال اور ایک ہی تصور مرکز توجہ میں رہتا ہے۔ دایرۂ ذہن میں اس کے ساتھ ان اشیاء اور اشخاص کا بھی تصور پیدا ہوتا ہے جو محبوب کے ساتھ تعلق رکھتے ہوں یعنی اس کے خیرخواہوں سے دوستی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ان کی عزت اور وقار اس طرح کا ہوتا ہے کہ جیسا کہ مشہور ہے۔

کہ مجنوں سگِ کوئے لیلیٰ کے پاؤں چوما کرتا تھا، لیکن اگر اس کے ساتھ یہ خیال شامل ہو جائے کہ ان میں سے کوئی شخص اس کے محبوب کو خود قابو میں کر کے عاشق کو محروم کر دے گا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) وہ بھی لطف سے خالی نہیں۔ ؎ دیکھو قانون ازدواج کیمیائے عشرت مصنفہ حکیم محمد حسن قرشی پرنسپل طبیہ کالج پنجاب یونیورسٹی

تو پھر رقابت کا جذبہ انتقام کی آگ کے ساتھ بھڑکتا ہے، عشق و محبت کے قصے کہانیوں میں یہ بات غور کے قابل ہے کہ امراء و رؤساء اور بادشاہوں کے عشق ہی کے قصے زبان زد خاص و عام ہوتے ہیں، غرباء میں یا تو پابندیاں کم ہونے کی وجہ سے شہوانی خواہشات کے پورا کرنے کی صورت جلد نکل آتی ہے یا چونکہ ان کو اپنی فکر معاش میں فعلی توجہ کا موقعہ نہیں ملتا اس لئے ان میں عشق و محبت کے واقعات بہت کم ہوتے ہیں، البتہ دولت مندوں کو خوب تصوّر اور تخیل کی فرصت ملتی ہے۔ ان کے ہواخواہ ان کی دولت پر نظر رکھ کر ان کے محبوب کی ہر وقت تعریف و توصیف کرتے ہیں ان کے اختیارات ان کو حوصلہ دلاتے ہیں۔ محبوب کو طاقت۔ لالچ۔ رعب غرض کسی نہ کسی طرح قابو میں لانے کی ان کو امید ہوتی ہے۔ پس خوب خوب چونچلے ہوتے ہیں۔ اسی لئے مشہور ہے کہ ؎

ہے ریت عاشقوں کی تن من نثار کرنا رونا جگر جلانا اور ان کو پیار کرنا

یہ دن کی بیقراری اور شب کی اختر شماری توجہ کی وجہ سے تصور اور تخیل کے باوجود فطری خواہشات فوراً پورا نہ ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے کیونکہ

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک

(غالب)

لیکن بعض وضع کے پابند لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ محض حسن پرستی اپنا شغلہ رکھتے ہیں اور ہر قسم کے مذہبی، اخلاقی، قانونی منہیات سے بچ جاتے ہیں وہ ہر شئے کے حسن کو خدا کے طرف منسوب کرکے ع

حسن لیلیٰ عکس رخسار من است

سمجھتے ہیں اور انسانی نظر سے ان کی نگاہ جمال باری پر جاتی ہے اسی کا نام صوفیائی اصطلاح میں عشق مجازی سے عشق حقیقی تک ترقی کرنا ہے، مگر ایسا ہونا انتہائی درجہ کے نیک خصلت اور خدا پرست لوگوں ہی کی حالت میں ممکن ہے، ورنہ عام طور پر تو ؎

شہوت کا نام عشق بناوٹ کا نام حسن اہل ہوس نے دونوں کی مٹی خراب کی

اور

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی   اب آبروئے دیدۂ اہل نظر گئی

یہ بیان تو ایک جملہ معترضہ ہی سمجھنا چاہیئے، نفسیات کے لیے عشق آلہی کی اہمیت جوہر حسن کی طرف انتہائی توجہ کے علاوہ کچھ نہیں ہے

ترسیل تخیل کے بیان میں ہم بتا چکے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی طرف انتہائی توجہ کرے تو اس کو بھی کچھ نہ کچھ خیال اپنے چاہنے والے کا ہو جاتا ہے ع

دل را بدل رہست دریں گنبد سپہر

اور عاشق کی بیقراری معشوق کو بھی چین لینے نہیں دیتی ہے

الفت کا یہ مزہ ہے کہ ہوں وہ بھی بیقرار   دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

(ظہیر)

لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے ع

مجھ کو ان کا ہے جنوں اور اسے سودا اپنا

محبوب کو اپنے چاہنے والے سے ایک گونہ نفرت ہوتی ہے وہ اس کی وحشیانہ حرکات سے برافروختہ ہو جاتا ہے اور بقول امیر

ان کو آتا ہے پیار پر غصہ   مجھ کو غصہ پہ پیار آتا ہے

اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ عاشق اپنے محبوب کے معیار حسن پر ٹھیک نہیں اترتا۔ اور وہ کسی اور کو اپنے عشق کے لئے انتخاب کر چکا ہوتا ہے۔ کیونکہ ہے

غالب ان سیمیں تنوں کے واسطے   چاہنے والا بھی اچھا چاہیئے

جذبۂ جمالی کے بیان میں ہم ظاہر کر چکے ہیں کہ اپنے محبوب کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے کے لئے عشاق ہر قسم کی آرایش اپنے جسم اور مکان کی کرتے ہیں ہے

ہے تیرے دل میں اگر شوق تمنا اُس کی   تو یہ لازم ہے کہ اسے اپنا تمنائی کر

آخر میں اس امر کا اظہار کر دینا ضروری ہے کہ محاورۂ عام میں لفظ محبت کو ایسے مواقع پر بھی استعمال کر دیتے ہیں جہاں نفسیات تو اس کو دیکھنا ہرگز گوارا نہ کرے گا۔

(۱) اظہار تشکر اور اعتراف عظمت کے طور پر مثلاً کرشن کو اپنے استاد سے بڑی محبت ہے۔

(۲)۔ خاص رغبت کے معنی ہیں۔ مثلاً مجھے فلاں کھانے سے بڑی محبت ہے۔

(۳)۔ کسی کتے یا گھوڑے کی وفاداری۔ جفاکشی یا اور کسی صفت کی وجہ سے جو لگاؤ اس سے پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کو بھی محبت کہہ دیتے ہیں۔

(۴)۔ کسی کام میں عادتاً آدمی مشغول رہے اور اس میں دلچسپی لے تو بھی محبت کہلاتی ہے مثلاً فلاں شخص کو مطالعہ کتب سے بہت محبت ہے۔

لیکن نفسیات میں اس کے اصطلاحی معنی وہی ہیں جن کی تشریح اوپر بیان ہوئی۔ یعنی عشق صرف انسانوں میں پھر جوان انسانوں میں اور خصوصاً جوان عورت اور مرد میں ہی ہوتا ہے۔

نوٹ۔ لوگ عموماً عشق کو دل سے متعلق سمجھتے ہیں اور عقل کو دماغ سے اور اس لئے عشق کو عقل سے بالکل جدا خیال کرتے ہیں۔ لیکن نفسیات دونوں کو نفس کی مختلف حالتیں سمجھتا ہے۔ اور مختلف قسم کے ذہنی متغیرات کی فہرست میں داخل کرتا ہے۔ اس اختلاف کی وجہ وہی ہے جو ۔۔۔ کیفیت کے متعلق نوٹ میں بیان ہوئی، عشق و محبت چونکہ انتہائی توجہ کا نام ہے اور توجہ ہمیشہ متاثر ہوتی ہے۔ اس لئے عشق بھی گوناگوں تاثرات کا تماشا ہوتا ہے۔ تاثر کی لہر تمام جسم میں خون کی برق قوت سے دوڑتی ہے اور چونکہ جسم میں دوران خون کا مرکز دل ہے اس لئے عشق کی تمام کیفیتیں دل میں مرکوز معلوم ہوتی ہیں۔ اور عاشق کو جب خیال یار آتا ہے تو بھی کہتا ہے کہ:۔

دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے بیٹھے بیٹھے مجھے کیا جانئے کیا یاد آیا

(۶)۔ جنون۔ ہم باب اول میں بیان کر چکے ہیں کہ اگر دماغ میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو اس کا اثر نفس پر ضرور پڑتا ہے، اور نفس یا ذہن کی تمام خرابیوں کا سبب دماغی عوارض ہوتے ہیں۔ دماغ میں نقص کے چار وجوہ ہو سکتے ہیں۔

(۱)۔ پیدائشی طور پر دماغ خراب ہو۔ جس طرح مادرزاد دیوانوں اور مجذوبوں کا۔

(۲)۔ سر کو سخت چوٹ وغیرہ کا صدمہ پہنچا ہو۔ اور اس کے بعد عارضی طور پر یا ہمیشہ کے لئے دماغ میں کوئی نقص پیدا ہو گیا ہو۔

(۳)۔ سخت دماغی محنت سے دماغ تھک کر آیندہ کے لئے بالکل بیکار ہو جائے۔

(۴)۔ کسی روحانی صدمہ سے نفس کے انتہائی طور پر متاثر ہونے کے وجہ سے دماغ ناقابل تلافی طور پر ناقص ہو جائے۔

ان میں سے کسی وجہ سے دماغ اپنا کام ٹھیک ٹھیک کرنے کے قابل نہ رہنے کو جنون (Insanity) کہتے ہیں اس کی تین صورتیں عام طور پر دیکھنے میں آتی ہیں۔ ان کا مختصر ذکر ہم یہاں بیان کرتے ہیں۔

توہم (Hallucination.) کی حالت میں انسان کو اپنے سے علحدہ کوئی ہستی یا شخصیت ہونے کا پختہ یقین ہو جاتا ہے۔ بعض وہمیوں کو اپنے بادشاہ ہونے کا خیال ہو جاتا ہے۔ کوئی خود کو جانور سمجھ لیتا ہے۔

چند دن ہوے ایک اخبار میں پڑھا تھا کہ اٹلی میں ایک عورت ہے جس کو اپنی بابت مسیح ہونے کا ایسا پختہ گمان ہے کہ ۲۵۔ ڈسمبر کے دن اس کے ہاتھوں پاؤں اور پیشانی سے اسی طرح خون کی دھاریں نکلتی ہیں جس طرح حضرت عیسیٰؑ کے صلیب پر چڑہانے سے نکلی ہونگی پاگل خانوں میں اکثر لوگ اسی قسم کے جنون میں مبتلا پائے جاتے ہیں۔ عاشق عام طور پر اس مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

(۲) سودا (Madness.) کی حالت میں ہی حال ہوتا ہے جو شاعر لوگ اپنے اشعار میں اکثر لکھتے ہیں۔

اب تو وحشت سے ہمارا ساتھ ہے چاک چاک اپنا گریباں ہو چکا
(شوق)

لہ۔ ان تین کے علاوہ دیوانے کتے کے کاٹنے کو بھی جو مرض ہو جاتا ہے، وہ بھی دیوانگی ہی کے نام سے موسوم ہوتا ہے اور اس میں اکثر نشانات بھی اس کے پائے جاتے ہیں، مگر اس کا سبب خون میں زہر کا اثر ہو جانے سے ابخرات کا دماغ کو چڑھ جانا ہوتا ہے علاوہ ازیں سخت بخار کی حالت میں سرسام ہو جاتا ہے وہ مالیخولیا سے مشابہ ہوتا ہے، اس کا سبب دماغ کی خشکی بھی ہوتا ہے۔ اگر دونوں کو بھی اقسام جنون میں شامل کرلیں تو گویا پانچ مختلف قسموں کا جنون کہنا چاہیئے، نیز فلسفۂ جذبات میں عبدالماجد صاحب نے عشق کو بھی جنون کی ایک قسم قرار دیا ہے۔ جو عام نشانات کے لحاظ سے بہت بڑی حد تک درست ہے۔

سر شوریدہ پائے دست پیمانِ شامِ ہجراں تھا کبھی گھر تھا بیاباں میں کبھی گھر میں بیاباں تھا
(غالب)

روحانی صدمات یا عشق میں ناکامی وغیرہ اس قسم کی وارفتگی کے عام طور پر اسباب ہوتے ہیں یہ قسم جنوں کی سب سے زبردست اور مشکل سے قابلِ اصلاح ہوتی ہے۔

(۳) **مالیخولیا** ۔ دماغ کی خشکی، اعصاب کی کمزوری، صدمات کی زیادتی سے نفس کا قابو اپنی قوتِ متخیلہ پر سے اٹھ جاتا ہے، یعنی توجہ کسی خاص طرف نہیں لگ سکتی۔ خیالات پریشان ہر وقت الفاظ کا جامہ پہن کر منہ سے نکلتے رہتے ہیں۔ اسی حالت کے بابت غالب کہتا ہے:۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

خود بخود باتیں کرنا، گالیاں بکنا، اپنی ناکامی کی داستان ہر وقت بیان کرتے رہنا مالیخولیا کے عام نتائج ہیں، مالیخولیا کا مریض عموماً۔ یاس۔ ناامیدی چڑچڑے پن سب کا آماجگاہ ہوتا ہے اور بقول اطبا، یونانی مزاج میں صفرا اور سوداوی مادہ بڑھ جاتا ہے۔ بڑھاپے میں (جیسا کہ بقول غالب)۔

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب اب عناصر میں اعتدال کہاں

بہت لوگ اس مرض ہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں، بچپن کی سی ضد اور بات بات پر بگڑنا بھی اسی میں داخل ہے، لیکن تندرست بوڑھوں کی بابت جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں یہ درست نہیں۔ ان کی اصابتِ رائے کو جوان کبھی نہیں پہنچ سکتے، کیونکہ بچپن اور جوانی کا تجربہ ان کو حاصل ہو چکا ہوتا ہے، وہ زندگی کے نشیب و فراز سے کماحقہٗ واقف ہو چکے ہوتے ہیں۔

(۴) بعض لوگوں کے جنون میں مندرجہ بالا تینوں صورتیں پائی جاتی ہیں۔ ایسے لوگوں کا مرض لاعلاج ہو جاتا ہے۔

غزل

از جناب سید ضمیرالدین احمد صاحب عرشؔ گیاوی شاگرد استاد تسلیم

مرے نالوں سے گُل اک دن چراغِ آسماں ہوگا
جہاں ہیں کثرتِ ظلمت سے شورِ الاماں ہوگا

نہ جب اہلِ مکاں ہوں گے نہ کوئی بھی مکاں ہوگا
جہاں کا رنگ کیا اس وقت اے اہلِ جہاں ہوگا

جدا ہوتا چلا آیا ہے مسلک عشق والوں کا
ہمارا مقبرہ دیر و حرم کے درمیاں ہوگا

میں وہ گُل ہوں نہ فرصت دی خزاں نے جسکو ہنسنے کی
چراغِ قبر بھی جل کر نہ اپنا گلفشاں ہوگا

کروگے جب کسی سے عشق تب دیکھوگے رنگ اس کا
یہ سو پردے میں جھلکیگا یہ چھپ کر بھی عیاں ہوگا

بگولوں کی طرح صحرا میں مارے مارے پھرتے ہیں
ہمارا دکھ وہی سمجھیگا جو بے خانماں ہوگا

نہیں آساں، پانا حشر میں یارانِ رفتہ کا
وہاں تو ہر قدم پر کارواں در کارواں ہوگا

کھلیگا حشر میں ناز و نیاز عشق کا عقدہ
میں اس کا میہماں ہونگا وہ میرا میزباں ہوگا

یہی پہچان بحرِ غم میں ہوگی میری کشتی کی
نہ اس پر ناخدا ہوگا نہ اس میں بادباں ہوگا

اسی سے پوچھنا کیا شئے ہے الفت میں پشیمانی
پسِ دیوار رکھے سر پہ ہاتھ ایک نوجواں ہوگا

عدم کیا حشر میں بھی روئیں گے یارانِ رفتہ کو
کہاں ہم ہوں گے جائیں، قافلہ اپنا کہاں ہوگا

وہ گھر کی راہ لیگا اور عدم کی راہ ہم لیں گے
ہمارا فیصلہ شب درمیاں، وقت اذاں ہوگا

جہاں ہیں محوِ نغمہ بلبلیں گُل جس میں خنداں ہیں
اسی گلشن میں کل زاغ و زغن کا آشیاں ہوگا

جسے صرصر نے ٹھکرایا تھا جو گر گر پڑا اُٹھ کے
وہ اِس کوچے میں میرا ہی غبارِ ناتواں ہوگا

اسی جانب چلے جائیں گے وحشی تیرے بے کھٹکے
جدھر خارِ بیابانِ جنوں دامن کشاں ہوگا

مقامِ امتحاں خالق نے عالم کو بنایا ہے
یہاں جب تک رہیں گے امتحاں ہی امتحاں ہوگا

تلاشِ یار سے فارغ نہ ہوں گے بعد مردن بھی
جدھر جائے گی اپنی روح لاشہ بھی رواں ہوگا

ترے کوچے میں اکثر اک بگولہ خاک اڑتا ہے
مٹایا جس کو تونے یہ وہی بے خانماں ہوگا

یہی کیا عرشؔ تھا جو پڑھ گیا انداز مومن میں
تھیں ترکیبیں الگ سب سے، وہی جادو بیاں ہوگا

ہنسی

از

جناب ابوالمکارم فیض محمد صاحب صدیقی بی۔ اے عثمانیہ

قدما میں وہم پرستی کا مرض عام تھا۔ اور وہ ہر واقعہ کو کسی نہ کسی واقعہ سے متعلق کر دیتے تھے چنانچہ گھر سے باہر نکلتے وقت ٹھوکر کا لگ جانا، کسی کام کو جاتے وقت بلی کا آڑے آنا اور دن کے وقت مرغ کا بانگ دینا ــــ، غرض اس قسم کے سینکڑوں ایسے واقعات ہیں جن کو منحوس خیال کیا جاتا تھا اور اب بھی بعض لوگ ان پر ایمان لاتے ہیں!) حالانکہ ہمارے باہر نکلنے کو ٹھوکر سے، بلی کو کام سے اور مرغ کی بانگ کو کسی مصیبت سے کیا واسطہ، اعتقادات کی اس کمزوری کی اصل وجہ علم کا فقدان ہے، اسی طرح ہنسی کو بھی قدما نے سال نو سے متعلق کیا ہے، حالانکہ علمی نقطۂ نظر سے ہنسی کو سال نو سے، بالواسطہ یا بلا واسطہ کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے، خیر ہمیں ان جھگڑوں میں پڑنے کی چنداں ضرورت نہیں، ہم ہنسی کی علمی توجیہ چاہتے ہیں۔

ہنسی کیا ہے؟ جسم کی مختلف رگوں کی تشنجی کیفیت کا نام ہنسی ہے، ہنستے میں سب سے پہلے آنکھ اور دہن کی رگیں متاثر ہوتی ہیں جس کی وجہ آنکھیں نصف کی قریب بند ہو جاتی ہیں اور ہونٹ کے نیچے اوپر کی طرف حرکت کرنے سے منہ اتنا کھل جاتا ہے کہ دانت صاف طور پر دکھائی دینے لگتے ہیں اس کے بعد تنفسی نظام متاثر ہوا اور دم پھولنے لگا اور جب اس کا اثر زیادہ ہو جاتا ہے ۔۔۔۔۔۔ قہقہہ کی آواز نکلتی ہے۔ آخر میں بازو یا کندھے متاثر ہو کر حرکت کرنے لگتے ہیں اور انسان پیر ٹپکتے ٹپکتے بے تاب ہو کر زمین پر لوٹنے لگ جاتا ہے، اس دوران میں وہ زور زور سے تالیاں بھی بجاتا ہے۔ لیکن یہ فعل ہنسی سے کوئی راست تعلق نہیں رکھتا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہنسنے والا دوسروں کو اپنے ہنسنے کی وجہ سمجھانا یا اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے زمین یا میز پر زور سے ہاتھ مارتا یا تالیاں بجانا شروع کرتا ہے، ہنسی ایک ناگہانی فعل ہے، کیونکہ اس کا تعلق ہماری قوت ارادی سے نہیں ہے، لیکن بعض انسان ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں اپنے اعصاب اور عضلات پر پورا قابو ہوتا ہے، اور اس ناگہانی

جذبہ کو اپنے تابع رکھتے ہیں اور اس کیفیت کو روک سکتے ہیں، ہنسی کو باعتبار اس کے مدارج کے تین قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) تبسم (۲) ہنسی (۳) قہقہہ۔ خوشی کے جذبات کا اظہار بلحاظ نوعیت بالعموم انہی سے کیا جاتا ہے۔

یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ انسان میں ہنسنے کی یہ غیر ارادی صلاحیت کہاں سے آگئی اور ہنسی فی الحقیقت ہے کیا چیز؟ ہنسنے سے ہمیں کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے؟ ہم اپنے خوشی کے جذبات کا اس طرح پر کیوں اظہار کرتے ہیں، سیلون کی خارج الوطن قوم تو کبھی نہیں ہنستی، ان کے متعلق نہایت سنجیدگی لیکن کسی قدر غلطی سے یہ کہا گیا ہے کہ ان کے چہرے پر وہ رگیں نہیں ہوتیں جو ہنسی کی محرک ہوتی ہیں ایک روز ایک کسان ان لوگوں میں سے چند کو اپنے کمرہ میں لے گیا تاکہ ان کے خصائل زبان اور اعتقادات کے متعلق کافی معلومات حاصل کر سکے۔ اس نے سوال کیا "تم وید لوگ ہنستے نہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ وحشی آدمی نے جواب دیا "یہ بالکل سچ ہے کہ ہم ہنستے نہیں، لیکن یہ تو بتلاؤ کہ ہمیں ہنسانے والی یہاں کونسی ایسی چیز موجود ہے"۔ یہ جواب اداسی اور مردہ دلی کی کس قدر سچی تصویر ہے! بات یہ ہے کہ ہر ملک اور ہر قوم کے نزدیک ہنسی کی حقیقت دراصل جذبات خوشی کا اظہار رہے، اچھی غذا کا ملنا، دھوپ کا نکلنا، اور موسم کا پرلطف ہونا بھی انسان کو بغیر ہنسائے نہیں رہ سکتا۔

اس مسئلہ پر مزید روشنی ڈالنے سے قبل ہنسی کی استثنائی صورتوں کو بیان کر دینا ضروری ہے پہلی صورت وہ ہے جب کہ کوئی میکانی پیچ ہنسی کی تحریک کرے، اس میں کوئی ذہنی جذبہ عمل نہیں کرتا بلکہ خارجی عمل سے یہ فعل سرزد ہوتا ہے، مثلاً گدگدانے سے آدمی ضرور ہنس دیتا ہے لیکن بعض دفعہ انسان کچھ ایسی حالت میں ہوتا ہے کہ اس پر گدگدانے کا مطلق اثر نہیں ہوتا، ہم یہاں اس بات کو تفصیل سے بیان کرنا نہیں چاہتے کہ گدگدانے سے ہنسی کیوں آتی ہے۔ بس اتنا کہنا کافی ہوگا کہ جس طرح کسی مشین کو چلانے کے لئے کسی خاص کل مثلاً اس کے پہیئے کو گردش دیتے ہیں، اسی طرح ہنسی کے آلہ کو جب گدگدانے کے ذریعہ حرکت دیجاتی ہے تو بعض اعضاء مثلاً رگ پٹھے وغیرہ حرکت کرنے لگتے ہیں اور ہنسی کی مشین چالو ہو جاتی ہے۔

ہنسی تقلیدی بھی ہوتی ہے، بعض لوگ ہنستے ہیں صرف اس لئے کہ دوسرے ان کے سامنے ہنس رہے ہیں۔ لیکن جانتے نہیں کہ کیوں، اس سے ہنسی کے مفہوم پر کافی روشنی پڑتی ہے، وہ بالکل

تقلیدی ہوتی ہے، یعنی دوسرے کو ہنستا دیکھ کر خود بھی ہنسنا گویا اس کا جواب دینا ہے، شاذ صورتوں میں لوگ تنہائی میں ہنسا کرتے ہیں، بعض باتوں پر لوگ دوسروں کی موجودگی میں، خوب ہنستے ہیں۔ اور جی کھولکر قہقہے لگاتے ہیں، لیکن تنہائی میں انہی باتوں پر ان کو ہنسی نہیں آتی برخلاف اس کے بعض سلیم الطبع اور متین آدمی تنہائی میں قہقہے لگاتے ہیں اور اس قدر ہنستے ہیں کہ صرف سو جانے کے بعد ان کی ہنسی رک سکتی ہے، اس کے علاوہ ہنسی کی ایک خاص حالت بھی ہے جس کو "خندۂ بے اختیار" یا کھلکھلاہٹ، کہتے ہیں، اس میں انسان ہزار کوشش کریں اس کی سب کوششیں بیکار ہو جاتی ہیں اور ہنسی کھلکھلاہٹ کی صورت میں نمودار ہو جاتی ہے۔ یہ بات بالکل اسی طرح ہے کہ جب انسان کو کسی خاص لفظ یا جملہ کو استعمال کرنے کی ممانعت کیجاتی ہے تو وہ عمداً خواہ مخواہ استعمال کرتا اور ہنستا ہے، قدیم زمانہ سے یہ "ضد" انسان کی فطرت کا جزو ہی ہوئی ہے، انسان ہزار کوشش کرتا ہے کہ اپنے اعصاب پر قابو پا کر ہنسی کی مدافعت کرے، لیکن ہمیشہ نتیجہ اس کے خلاف نکلتا ہے، اور وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگتا ہے۔

قدیم زمانے لوگ بھی ہنسا کرتے تھے اور ہنسی ہنسنے والے کے جذبات خوشی کا اظہار بھی ہوتی ہم کسی کے متعلق کوئی خوشی کی خبر سنتے ہیں تو ہماری محبت اور خلوص کا اظہار آنکھ اور کان کے ذریعہ ہنسی کے صورت میں ہوتا ہے، جانوروں کی بھی یہی حالت ہے۔ چنانچہ بندر ہنستے ہیں، اور ان کی ہنسی تو مشہور ہی ہے، جب بندر کے دولت یا شناسائی اس کے قریب آتے ہیں تو وہ بے اختیار ہو کر ہنسنے لگتا ہے اگر گدگدی کی جائے تو وہ کھلکھلا کر ہنستا ہے، یہ بات بندروں ہی پر کیا موقوف ہے، کتے بھی ہنسا کرتے ہیں لیکن ان کی ہنسی عام طور پر ظاہر نہیں ہوتی، و کوئی آواز نہیں نکلتی لیکن بعض کتے بچوں اور بوڑھوں کی طرح ہنستے ہیں، بچے ہنستے وقت اچھلتے کودتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جب کھانا ان کے آگے آتا ہے تو وہ سب کچھ بھول جاتے اور کھانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ان کی توجہ منتقل ہو جاتی ہے۔

یوں تو اصل میں ہنسی کسی شخص کی موت یا خوشی کا لوگوں پر اظہار ہے لیکن برخلاف اس کے بعض مواقع ایسے بھی ہیں جبکہ انسان بجائے رونے کے ہنستا ہے۔ اس کی اصل وجہ کسی سرسری تعریف کی مدد سے سمجھانا قدرے مشکل ہے، تاہم اس کو حتی المقدور وضاحت سے بیان کیا جائے گا۔ لوگ

ریل کے کسی حادثہ، زلزلہ یا اسی قسم کے بعض دہشت ناک حادثات کے بعد جن کی وجہ سے انسان کے ہوش پراں ہو جاتے ہیں ہنسنے لگتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان حادثات کے دھکوں سے عصبی توازن ٹوٹ جاتا ہے اور ان سے ایک قسم کی چورہائی اور جھٹکا زائل جاتا ہے اور زندگی کی امید بندھ جاتی ہے تو انسان میں خوشی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ ہنسنے لگتا ہے ایک دفعہ فرانس کی کسی کان میں ایک مزدور کو کسی جرم کی پاداش میں بیس دن کی قید تنہائی کی سزا دی گئی تھی، بیس روز تک اسے ہزار فٹ زمین کے اندر ایک ایسے مقام پر بند کیا تھا جہاں روشنی نام کو نہیں آتی تھی، اس عرصہ میں اس کو کھانا بھی نہیں دیا گیا۔ لیکن جب مدت گزر جانے کے بعد اس کو باہر نکالا گیا تو وہ بے ساختہ ہنستے ہوئے باہر آیا، شعراء بھی اکثر ہنسی کا ذکر کرتے ہیں چنانچہ موسم بہار میں جب پھول کھلتے ہیں تو شاعر کہتا ہے۔ وہ ہنس رہے ہیں، یہ صرف اس لئے کہ ان کو نئی زندگی حاصل ہوئی ہے، اور تبسم یا ہنسی سے اس کا اظہار کر رہے ہیں، قدیم زمانہ میں لوگ اپنے بزرگوں، اپنے ماں باپ کو ان کے گناہوں کے الزام میں قتل کر کے "رسمی ہنسی" ہنستے تھے، یہ بالکل رسمی چیز تھی، حتیٰ کہ جلاد بھی ہنستا تھا، ہندو بیوہ بھی جب جلتی ہے تو وہ آئندہ زندگی کا دلچسپ خواب دیکھکر ہنستی ہے، جون آف آرک اپنے حلفیہ انکار کے بعد، ان لوگوں کے سامنے جو اس کو نذر آتش کرنے والے تھے ہنسنے لگی، اس کو اطمینان ہو گیا تھا کہ اب ایذا رسانی کا خاتمہ ہو گیا اور مستقبل قریب میں حشر کے دن اس کے مخالفین سے بدلہ لیا جائے گا، یہ خیال اس کے لئے باعث مسرت تھا۔

خوشنما مناظر، دلچسپ واقعات، مذاقیہ سوانگ حسد اور کینہ کی ہنسی کی توجیہ کسی قدر مشکل ہے، کسی مشہور آدمی کی مذاقی تصویر کو دیکھکر جاہل اور عالم دونوں ہنس پڑتے ہیں ایک شخص جس کی ٹوپی سر پر رکھی ہو اور اسٹیج پر اس کو ڈھونڈ رہا ہو تو ہمیں ہنسی کیوں آتی ہے؟ جب کوئی شخص موز کے چھلکے کی وجہ سے پھسل کر زمین پر گر جاتا ہے تو ہم کیوں ہنستے ہیں؟ بات یہ ہے کہ جب ہم ان واقعات کا کا مشاہدہ کرتے ہیں تو پہلی آن میں ہمیں حیرت اور استعجاب ہوتا ہے، لیکن جب واقعہ کی حقیقت سے آگاہی ہو جاتی ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ بالکل اتفاقی یا فرضی خبر تھی اور اس سے کسی کو کچھ گزند نہیں پہونچا تو ہمارے دل کو اطمینان ہو جاتا ہے اور ہم "اطمینانی ہنسی" ہنسنے لگتے ہیں،

ان واقعات سے ہمارا ذہنی توازن ٹوٹ جاتا ہے کسی کو مصنوعی تکلیف میں مبتلا دیکھکر ہم ہنسنے سے باز نہیں آسکتے۔ چنانچہ تھیٹروں میں مذاقیہ کام کے وقت جب کوئی روتا ہوا اسٹیج پر آتا ہے تو بجائے اس کے کہ ہم کو اس کا رنج ہو ہم ہنستے ہیں، برخلاف اس کے اگر ان واقعات میں ذراسی اصلیت ہوتی ہے تو ہم متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے، کسی عجیب و غریب سوانگ یا کسی مہذب آدمی کی مضحکہ خیز تصویر کو ہم انہی اثرات کے تحت ہنستے ہیں جو خلاف قانون کسی کام کو کرنے سے ہمارے ذہن میں مرتب ہوتے ہیں وہ یہ کہ اگر سوسائٹی نے ہمارے لئے سنجیدگی، متانت خودداری کے خاص خاص اصول بتادئیے ہوں اور ہم ان کی پرواہ نہ کرکے ان کے خلاف عمل کریں تو اس سے لازمی طور پر دوسرے دیکھنے والوں کے دل میں ہماری طرف سے نفرت اور حقارت پیدا ہوجائے گی اور ہمیں ان کے اٹھا کرنے سے ہنسی آئے گی اگر اور لوگ بھی ہمارا ساتھ دیں تو بے ساختہ ہنسنے لگتے ہیں۔

مذاق یا مذمت کی ہنسی فتح و شادمانی کی ہنسی سے بالکل مختلف ہوتی ہے، یہ عمل انسان کے خاص خاص جذبات کے تحت عمل میں آتا ہے، ان کے علاوہ بناوٹی ہنسی بھی ہوتی ہے۔ یعنی یعنی یہ کہ بعض لوگ لڑنے جھگڑنے کے بعد ایک دوسرے کو چڑاتے ہیں اور دانت بتاتے ہیں، اس میں حسد اور بغض کو زیادہ دخل ہے۔ کسی شاعر نے اس چیز کو اس طرح ادا کیا ہے۔

لگے ہو منہ چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی سو بگڑی تھی خبر لیجئے دہن بگڑا

شاعروں ادیبوں کا اجتماع

کمالِ ذوقِ نظارہ ہی خود منظور ہو جانا

از جناب محمد جمیل احمد خان صاحب کوکب شاہجہانپوری

فنا کیا ہے؟ بس احساسِ خودی کا دور ہو جانا
صدائے ہر نفس کا نعرۂ منصور ہو جانا

بنائیں دیدۂ حیراں کو آئینہ، تماشائی!
کمالِ ذوقِ نظارہ ہے خود منظور ہو جانا

تصور اور پھر کس کا تصور، اے دلِ ناداں
غنیمت ہے بس اس کی یاد سے معمور ہو جانا

اگر ہے صرف ترکیبِ عناصر پردۂ حائل
تو کیا مشکل ہے اس کا درمیاں سے دور ہو جانا

ادھر پیہم کسی کے جلوۂ رنگیں کی ارزانی
ادھر قیدِ تعین سے مرا مجبور ہو جانا

غضب کی او نگارِ عالم آرا خود نمائی ہے
حجاباتِ مجازی میں ترا مستور ہو جانا

کہاں تسکینِ خاطر، ہمدمو! جھوٹی تسلی ہے
ہنسی ہے! چارۂ دردِ دلِ رنجور ہو جانا

اثر دکھلائے گا! ہاں اک نہ اک دن رنگ لائے گا!
تغافل کیش! خونِ حسرتِ مہجور ہو جانا

طلسمِ فکر ہے انسان کی نیرنگیٔ فطرت
کبھی مختار ہو جانا، کبھی مجبور ہو جانا

محبت میں شکستِ اولیں کیا حیرت افزا تھی
نگاہوں کا وہ لڑنا، شیشۂ دل چور ہو جانا

نہ ہوں لب آشنا جوش و خروشِ دل سے اے کوکب
کہ آئینِ ادب میں ننگ ہے منصور ہو جانا

تلاش خدا

از
جناب ڈاکٹر محمد عبد الحق صاحب ڈی لیس ۔ سی (پیرس) ڈی ۔ ایف ۔ ایچ (الزن) لندن وغیرہ

عرصہ مدید سے یورپ میں کئی انسانی زندگیاں عقلیات سے رسیاں تڑا کر کشاکش انکار و اقرار اور کشمکش ریب و یقین کی بھول بھلیاں میں پھنس چکی ہیں "مذہب و سائنس" کے عنوان "سے کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، جس سے ظاہر ہے کہ یوروپی دماغ اسبابت پر کوشاں ہے کہ ہر دینی و دنیاوی مسئلہ کو بذریعہ تجربات عملی یا شاہداتِ ظاہری حل کیا جائے گو اکثر مواقع پر یہ مساعی بار آور ثابت نہیں ہوئی تاہم ان کے نزدیک خدا شناسی، انسانی فہم و ادراک اور طاقت سے باہر نہیں۔

اٹھارویں صدی میں جب سائنس کے حیرت انگیز ایجادات نے مغربی تخیل کو بہت بلند پرواز بنا دیا تو اس وقت حکیمان فرنگ خدا کو بذریعہ مشاہدات عملی ثابت کرنے کے درپے ہوئے۔ کانٹ نے "دنیا کی فطری تاریخ اور آسمان کی حقیقت" Haiaese naturelle du monde el-theorie du ciel ایک کتاب لکھی جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ دنیا مشین کے پرزوں کی طرح ایک خاص طریق پر چلنے کے لئے مجبور ہے، اس میں شک نہیں کہ کانٹ جا بجا خدا کی قدرت اور جلالت کا اقرار کرتا ہے، مگر اس کے نزدیک خدا نے دنیا کے لئے قوانین مقرر کر دئے ہیں جو کسی طرح تبدیل نہیں ہوتے۔ اور اب خدائی طاقت ہمیشہ ان قوانین کے زیر اثر عمل پیرا ہوتی ہے، ۱۷۳۵ء میں لینے نے نظام قدرت "Le Systeine de la nature" میں انڈے کی حقیقت کی توضیح کی ۱۸۳۸ء میں شلائیڈن نے اسی مضمون کو وسعت دیتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جملہ مخلوقات کی ابتدائی صورت انڈا ہی ہے، چنانچہ یہ دکھایا گیا کہ انسان، حیوان، پودے وغیرہ ابتدا میں انڈے کی صورت اختیار کرتے ہیں، یہی نہیں بلکہ ایک خاص آلہ کے ذریعہ انڈے میں زندگی پیدا ہونے کے اوقات اور وجوہات پر غور و خوض کیا گیا، الغرض اس طرح عقل بلند پرواز فلسفیانِ فرنگ کو مادہ پرستی کی طرف لے اڑی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ ابتدائے دنیا ایک ہی طریقے سے ہوئی مگر مادہ پرستوں کے لئے ایک اور اہم مسئلہ درپیش ہوا، یعنی ایک ہی مادہ نے کس طرح مذکر و مونث پیدا کر دئے ۱۸۰۹ء میں لامارک

فلاسفی زوالوجی میں حیات کی توضیح اس طرح کی کہ فی الحقیقت ایک مذکر مادہ ہی موجود تھا مگر کئی صدیوں کے بعد بعض ایسے کیمیکل تبدلات وقوع پذیر ہوئے جن سے مونث کی تمیز رونما ہوئی ہکسلے اور ڈارون نے اپنے خیالات کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ انسان بندر سے نسبت دیا جا سکتا ہے، اور اس موضوع پر بیشمار دلائل و براہین اختراع کئیں۔ جین مولر، کیٹور اور ریپر نے ڈارون کے اقوال کی تائید کی، حال کی تحقیقات نے عملی تجربات سے بتا دیا کہ ہر ذرہ بجلی کی لہروں سے آباد ہے، بجلی مقناطیس پیدا کر سکتی ہے، مقناطیس بجلی پیدا کر سکتا ہے، بجلی کے ذریعہ سے بولنے والی تصاویر (Television.) ہزارہا کوس پر پہنچائی جا سکتی ہیں اور اس قسم کی سینکڑوں حیرت انگیز ایجادات ہیں جن کو زمانہ ماضی میں کرامات کہا جاتا، ان نئے انکشافات نے از سر نو دہریت اور لامذہبیت کے گھر کو بے چراغ کر دیا ہے اور مغرب کی سائنسدان دنیا یہ خیال کرنے لگی ہے کہ فی الحقیقت ان معجزہ نما قوی کے پروردگار اور منتظم کا ہونا ضروری ہے، البتہ ہنوز یہ یقین کامل سمجھا جاتا ہے کہ جس کو ہم خدا کہتے ہیں وہ حقیقت میں ایک "قوت" ہے جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ چند مہینے ہوئے کہ ڈاکٹر میتھو (امریکہ) نے ایک ملاقات کے دوران میں کہا کہ "ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ہم خدا کو اسی طرح عامۃ الناس کے سامنے پیش کر سکیں جس طرح سائنس کے طلباء کو لیبارٹری میں تجربہ دکھایا جا سکتا ہے" ڈاکٹر میتھو یہ کہتے ہوئے غالباً کسی ایسی طاقت" کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو قوتی زمانہ اکثر حیرت انگیز احکام کے سرانجام دینے کا موجب ٹھیری ہے۔ مگر یہ خیال کس قدر طفلانہ ہے، جب جمشید کے وقت آگ چقماق کے پتھر سے نکلی تو پارسیوں کے ذہن نارسا میں اس کی حقیقت نہ آسکی اس لئے انہوں نے آگ کو متبرک سمجھکر حضرت ایزد قرار دیا اور اس کی پرستش شروع کر دی آج یورپ اور امریکہ کے بلند پرواز دماغ بھی اسی قوت کے متلاشی ہیں جو جملہ قوائے ظاہری کے منتظم ہیں اور اس قوت کی تلاش میں سائنس کی لیبارٹری کا چپہ چپہ ڈھونڈ رہے ہیں سائے کاش وہ اسے اپنے دل میں ڈھونڈھتے ع کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمہ را

گوئٹے ایک جگہ انسان کو مخاطب کر کے کہتا ہے "دیکھ دیکھ، تو نے اپنے برباد کن ہاتھوں سے خوشنما چیزوں کو جو ہماری دنیا کی زینت تھیں روئی کے گالوں کی طرح پریشان کر دیا، ہم نے ان کو نیست کا پردہ پہنا دیا، اور اب ان کی کھوئی ہوئی خوبصورتی پر آنسو بہا رہے ہیں مگر ہمت، او زمین کے رہنے والو ہمت، آؤ ایک جہان ظاہری کے تباہ کرنے کے بعد ایک نئی دنیا اپنے سینوں میں آباد کریں" سنٹ آگسٹن انہی خیالات کا اعادہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "اگر ہم اپنے خیالات کو درون سینہ کی طرف مبذول کریں تو اور بھی رفعت پر پہونچ جائیں، یعنی ایک ایسی منزل میں جا اتریں جہاں قلوب مطمئن ہوں"

اور سچ یہ ہے کہ ؎

اس سینہ میں کائنات رکھ لی میں نے کیا ذکر صفات ذات رکھ لی میں نے
ظالم سہی، جاہل سہی، ناداں ہی سہی سب کچھ سہی تیری بات رکھ لی میں نے

تنقیدیں

منتخبات ہندی کلام از ڈاکٹر سید جعفر حسین صاحب پی۔ایچ۔ڈی (ہیڈن برگ) پروفیسر کلیہ جامعہ عثمانیہ عمدہ طباعت خوبصورت جلد یونیہ تقطیع ضخامت (۲۲۵) صفحات قیمت (عہ) مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن سڑک یا حیدرآباد بک ڈپو چادرگھاٹ حیدرآباد سے مل سکتی ہے۔

یہ ایک دلچسپ کتاب ہے جس میں ابتداً مولف نے تمہید کے عنوان کے تحت ہندی کی خصوصیات اور ہندی سے مسلمانوں کے تعلق پر بحث کی ہے، پھر جذبات عالیہ، فلسفیانہ مسائل، عاشقانہ تخیلات، عشقیہ دوہے اور متفرقات کے جدا جدا عنوانات سے ہندی کے مختلف مشاہیر شعراء کی چیدہ ابیات ہندی اور اردو دونوں رسم الخط میں دی ہیں، تقریباً تمام ابیات کے مشکل ہندی الفاظ کے اردو میں معنے بیان کئے گئے ہیں اور ہر دوہے اور دیگر ابیات کی اردو میں شرح لکھی ہے اور شاعر کے مضمون کو پھیلا کر بیان کیا ہے کہیں کہیں تشریح بہت مختصر سی ہے۔ اردو دانوں کے آگے ہندی شاعری کو پیش کرنے کی یہ کوشش نہایت پسندیدہ ہے۔ اگرچہ اس موضوع پر یہ پہلی کوشش نہیں اور اس سے قبل مختلف صورتوں میں کئی لوگوں نے ہندی شاعری کو اردو دنیا میں لانے کی کوشش کی ہے لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس کو بڑے سلیقہ سے مرتب کیا ہے۔ اس کے لئے جو نام پسند کیا گیا ہے وہ نہ تو رومانوی ہے نہ خالص علمی۔ شاعری اور نظم کے لئے کلام کا لفظ بے شک استعمال ہوتا ہے لیکن اصطلاحی حیثیت سے نہیں بلکہ عرفی اور عام حیثیت سے۔ ہندی شاعری کا میدان نہایت وسیع اور گوناگوں دلچسپیوں سے مملو ہے اگر اس طرح اردو دنیا میں اس کو رفتہ رفتہ روشناس کیا گیا تو ہمارے شعراء اس سے خاصا فایدہ اٹھائینگے اور آیندہ کی شاعری پر اس کا خاص اثر بھی پڑ جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

سیرنبوی اور مستشرقین از جناب مولوی عبد العلیم صاحب احراری بڑی تقطیع ضخامت (۱۱۲) صفحات قیمت (عہ) حالی ملنے کے پتے مکتبہ جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی اور مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن سڑک حیدرآباد دکن۔

جامعہ ملیہ دہلی کا متعلقہ ادارہ "اردو اکاڈمی" جن مفید کتب کی اشاعت کر رہا ہے ان میں یہ کتاب

جو حضرات مکتبۂ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا ساٹھ
روپے کی عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائینگے اُن کے
نام رسالہ سال بھر کے لئے بلا قیمت جاری ہوسکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس
روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی درسی دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خرید
کرینگے اُن کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلہ مکتبہ بلا قیمت حاضر ہوگا۔ یکمشت خریدنیوالے
حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کردیا جائے گا۔ جو حضرات بدفعات کتابیں خریدینگے
اُن کو ایک رسید دیجائیگی جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔
خریدار صاحبین کو چاہیئے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب اعلان
رقم معینہ کی تکمیل ہوجائے وہ رسیدیں منتظم مجلہ مکتبہ کے پاس بھیجدیں رسالہ انکے نام جاری
کردیا جائے گا۔ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہوسکتی ہیں اس طرح سے کئی اشخاص
مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

مجلہ مکتبہ
کی
خریداری میں مزید سہولت

جو حضرات مکتبۂ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پچاس روپے کی عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائینگے اُن کے نام رسالہ سال بھر کے لئے بلاقیمت جاری ہوسکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی درسی و دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خرید کرینگے اُن کی خدمتیں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلہ مکتبہ بلاقیمت حاضر ہوگا۔ یکمشت خریدنے والے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کردیا جائے گا۔ جو حضرات بدفعات کتابیں خریدینگے اُن کو ایک رسید دیجائیگی جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔ خریدار صاحبین کو چاہئیے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب احکام بالا رقم معینہ کی تکمیل ہوجائے وہ رسیدیں منتظم مجلہ مکتبہ کے پاس بھیجدیں رسالہ انکے نام جاری کردیا جائے گا۔ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہوسکتی ہیں اس طرح سے کئی اصحاب ملکر بھی اس رعایت سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

دارالاشاعت مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود حیدرآباد دکن
کا
ماہوار علمی و ادبی مجلہ
مکتبہ
مدیر
عبدالقادر سروری ام اے ال ال بی
شرکاء
سید محمد ام اے
عمر یافعی

یہ دارالاشاعت مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود کا ماہوار رسالہ ہے۔
یہ علمی وادبی رسالہ ہے جس میں علم وادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوں گے۔ حجم کم از کم چار جز کا ہوگا۔
بنظر احتیاط پرچہ بذریعہ سرٹیفکٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا۔ اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو ہر فصلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالۂ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔
قیمت سالانہ (للعہ/) مع محصولڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے (عاہ) فی پرچہ ۶/
اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (صہ/) نصف کیلئے (سے) اور چوتھائی کے لئے (عہ/) ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲½ فیصدی سے ۲۵ فیصدی تک کمی ہوسکے گی۔
ترسیل زر ومضامین اور جملہ خط وکتابت منتظم مجلہ مکتبہ۔ مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ۔ حیدرآباد دکن سے کیجئے۔

رجسٹرڈ نشان ٹپہ سرکار آصفیہ (۶۵)

رجسٹرڈ نشان ٹپہ انگلشیہ

مجلّہ مکتبہ

جلد ۶ | بابت ماہ اسفندار ۱۳۴۰ ف مطابق جنوری ۱۹۳۱ء | شمارہ (۴)

تصاویر

(۱) حکیم عمر خیام (۲) شوکت بلگرامی (۳) قبر محمود گاوان

فہرست مضامین

شذرات

مولانا محمد علی جوہر کی وفات سے ہمارے ملک و ملت کو جو نقصان پہنچا ہے اس پر جس قدر بھی افسوس کیا جائے کم ہے، مولانا نہ صرف ہندوستان کے ایک بڑے سیاسی قائد اور مسلمانوں کے رہنما تھے بلکہ شاعری اور صحافت میں بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا، ان کے انگریزی کامریڈ اور اردو ہمدرد نے ملک و قوم کی شاندار خدمات انجام دیں۔ مولانا کا کلام جو ان کے قلبی کیفیات احساسات کا آئینہ ہوتا تھا کتنوں کو سرگرم عمل نہیں بنایا مولانا کی پرزور خطابت کی کیا ہندوستان اور کیا انگلستان ہر جگہ شہرت تھی، ان کے انتقال سے ہندوستان بلاشبہ ایک فقید العصر ہستی سے محروم ہوگیا۔

ہندوستانی اکیڈیمی نے جس علمی و ادبی خدمات کا بیڑا اٹھایا ہے، بڑی مسرت کی بات ہے کہ اس میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جا رہا ہے، اکیڈیمی کے اغراض و مقاصد میں ایک اعلیٰ علمی رسالے کا اجرا بھی شامل تھا بحمد اللہ یہ رسالہ جو سہ ماہی ہے "ہندوستانی" کے نام سے جاری ہو گیا ہے، اس کا پہلا نمبر ہمیں وصول ہو چکا ہے جس پر انشاء اللہ آئندہ نمبر میں تبصرہ کیا جائے گا۔ یہ رسالہ ایک خاص نصب العین کو پیش نظر رکھ کر شائع کیا گیا ہے۔

مولوی اصغر حسین صاحب اصغر گونڈوی اس کے مدیر و مہتمم ہیں۔ ان کے علاوہ ایک مجلس ادارت بھی جو جناب ڈاکٹر تارا چند صاحب ام اے ڈی فل صدر اور ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی ام اے پی ایچ ڈی پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ام اے اور منشی دیا نارائن صاحب نگم بی اے مدیر زمانہ پر مشتمل ہے۔ محققانہ مقالات کے علاوہ تنقیدوں کا بھی بطور خاص اہتمام کیا گیا ہے، رسالہ ٹائپ میں ہے اور بہت ہی خوشنما ہے۔

لاہور سے رسالہ چندن بھی شائع ہو گیا ہے جس کی اشاعت کا ذکر گزشتہ مہینہ انہی صفحات میں کیا جا چکا ہے جناب سدرشن صاحب اپنے اس رسالہ کو بہ ہمہ وجوہ دلچسپ اور کارآمد بنانے میں کوشاں نظر آتے ہیں اس پر انشاء اللہ آئندہ نمبر میں تبصرہ کیا جائے گا۔

حیدرآباد میں باوجود طباعت کی گوناگوں دقتوں کے صحافت کی رفتار ترقی موجب مسرت ہے۔ دارالسلطنت کے روزآنہ ہفتہ وار اخباروں کے علاوہ اضلاع سے بھی اخبار اور فنی رسالوں کا اجرا عمل میں آرہا ہے۔ گزشتہ مہینہ ناندیڑ سے مولوی حکیم عفرآن احمد صاحب انصاری کی ادارت میں ناندیڑ گزٹ (ہفتہ وار) نکلنے لگا ہے جو اپنے مقالات، کوائف و لطائف کے لحاظ سے امید ہے کہ دلچسپ ثابت ہوگا۔

ناندیڑ گزٹ کی اشاعت سے امید بندھتی ہے کہ اضلاع ممالک محروسہ سرکار عالی میں اصلاح و تنظیم کے کاموں میں بہت مدد ملیگی۔ اور دارالسلطنت کے ساتھ اضلاع میں بھی تمام بیداری پیدا ہوجائے گی۔ ناندیڑ گزٹ کا سالانہ چندہ پانچ روپیہ اس کی موجودہ ضخامت اور دلچسپ مضامین کے لحاظ سے بالکل واجبی ہے۔

اس مہینے جامعہ عثمانیہ کے تین قابل فرزند یعنے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم اے پی ایچ ڈی، مسٹر سید محمد علی خاں بی اے۔ بی ایس سی (آنرز) اور مسٹر سید یسین علی خانصاحب بی اے۔ بی ایس سی (آنرز) یورپ سے حیدرآباد واپس ہوئے۔ ہم ان تینوں احباب کی کامیابی اور کامران مراجعت پر انہیں مبارکباد دیتے اور ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

ڈاکٹر زور نے لسانیات و صوتیات کی اعلیٰ تعلیم پانے کے بعد اپنے جامعاتی مقالات کے علاوہ اردو کی صوتیات پر انگریزی میں ایک معرکۃ الآرا کتاب ہندوستانی صوتیات (ہندوستانی فونیٹکس) تالیف کی ہے جو یورپ ہی میں شائع ہوی ہے، اردو کی صوتیات پر یہ پہلی منظم و مربوط کتاب ہے جس کو علمائے صوتیات کے حلقوں میں خاص طور پر پسند کیا گیا اس دلچسپ کتاب میں چار ابواب ہیں اور ہر باب میں دو فصلیں ہیں پہلا باب تمہیدی ہے، جس میں اردو کے تاریخی ارتقا اور شمالی اور جنوبی ہند کی اختلافی صورتوں کو بیان کیا گیا ہے، دوسرے اور تیسرے بابوں میں اصوات، حروف علت و حروف صحیح اور ان کے مخارج و صفات پر بحث کی گئی ہے، چوتھا باب متعلقات اصوات پر ہے، کتاب کے شروع میں یورپ کے مشہور عالم صوتیات یعنے ڈاکٹر جوس بلوک صدر شعبہ علوم مشرقیہ و پروفیسر صوتیات و ہند آریائی لسانیات (جامعہ پیرس) کا دیباچہ ہے، جس میں انہوں نے کتاب کی خوبیوں اور اس موضوع پر کہ صوتیات کا علمی مضامین میں کیا درجہ ہے بحث کی ہے۔ اس کتاب کے ملنے کے مقام لندن میں کگن پال ٹرنچ اینڈ کمپنی متصل برٹش میوزیم اور پیرس میں آدری، ڈی، ڈیے واقع رودلا سوربون اور حیدرآباد میں مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن سڑک حیدرآباد ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کے مختلف شعبے اپنے طور پر نہایت گراں قدر علمی کام میں مصروف ہیں، ان میں خاص طور پر بزم تاریخ اور بزم قانون قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر تقاریر اور علمی مجالس کے علاوہ خزینۂ تاریخ کے نام سے ہر سال ایک سالانہ صحیفہ شائع کرتی ہے۔ ثانی الذکر نے بھی مستقل طور پر سلسلۂ نشرات کی ابتدا کی ہے اور اس کا ایک پہلا کارنامہ "ردمی اور اسلامی ادارۂ غلامی" ایک محققانہ مقالہ ہے جو مولوی محمد حمید اللہ صاحب ایم اے۔ ایل ایل بی ریسرچ اسکالر کے زور قلم کا نتیجہ ہے، مولوی حمید اللہ صاحب جامعہ کے ان ہونہار سپوتوں میں خاص طور پر قابل الذکر ہیں جو خاموش علمی کام میں ہمہ تن مصروف ہیں اور جن کی علمی مصروفیات کا دائرہ بحث سے اس سلسلہ میں بعض اور مقالے قریب میں بزم قانون شائع کرنے والی ہے جو امید ہے کہ علمی حلقوں میں خاص مقبولیت حاصل کریگی

گذشتہ ماہ میں حیدرآباد کے مشہور شاعر اور انشا پرداز مولانا سید غلام مصطفیٰ ذہین کا انتقال قابل صد ہزار تاسف ہے۔ مولانا جدید حیدرآباد کے اولین شعرا میں سے تھے۔ بچوں کے لئے آپنے اخلاقی اور دلچسپ نظموں کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اس سے آپ ملک بھر میں "ناظم اخلاق" کے لقب سے بے حد مشہور ہوے۔ آپ کی حیات تنگی اور فراخی میں ایک شاعر اور ادیب کی حیات کا بہترین نمونہ تھی۔ آپ بے حد خاموشی کے ساتھ ادبی مشاغل میں مصروف رہتے تھے۔ آپکی تصنیفات مختلف موضوع پر ہیں۔ اور اکثر وقعت کی نظروں سے دیکھی جاتی ہیں۔ آپ کے کارناموں کی تفصیل کے لئے یہ موزوں موقع نہیں ہے۔ مولوی ظفریاب خانصاحب سابق مدیر "ادیب" (حیدرآباد دکن) نے ازراہ کرم مولانا کی حیات اور تصنیفات پر مکتبہ کے لئے ایک بسیط مضمون لکھنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ جو تصویر کے ساتھ شائع ہوگا۔ امید ہے کہ یہ مضمون مولانا ذہین کی شخصیت کو عوام پر بے نقاب کرنے میں بے حد مفید ثابت ہوگا۔

مولانا ذہین عرصہ سے بیمار تھے۔۔ اور جس خاموشی سے کام کرتے تھے اسی خاموشی کے ساتھ دنیا سے چل بسے۔ خدا مرحوم کو مغفرت فرمائے!

وجدانات اور ان کا عمل

جناب شیخ عبدالحمید صاحب شوق ہوشیارپوری۔ بی۔ اے۔ آنرز۔ صدر مدرس وسطانیہ احمدپور (بھیدر)

وجدان اور جذبہ

جذبہ کا وجدان کے ساتھ وہی رشتہ ہے جو ادراک استحالی کا فیصلہ یا حکم سے جذبہ کی حالت میں کوئی واقعہ پیش نظر ہوتا ہے جو بالکل ذہن پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اور ہم مجبوراً اس کی طرف متوجہ ہو کر حرکات کرنے لگتے ہیں۔ خارجی اور داخلی تاثرات کی وجہ سے ایک بڑھتی ہوئی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ وجدان کی حالت میں بھی کوئی واقعہ پیش نظر ہوتا ہے مگر اس کی طرف توجہ فعلی طور پر عاید کی جاتی ہے۔ اس کے مختلف پہلوؤں پر بار بار نظر ڈالتے ہیں تاکہ ہم اس پر بالکل حاوی ہو جائیں۔ باقی باتیں سب جذبہ کی سی ہوتی ہیں۔ یعنی واقعہ سے متاثر ہو کر حرکات کرتے ہیں۔ اور حرکات کی وجہ سے اثر و تاثر پیدا ہوتا ہے اور ایک متاثر ترقی پذیر کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن ایک فرق ان دونوں میں یہ ہے کہ وجدان تخیلات کے تلازم مفصل پر مبنی ہوتا ہے۔ لیکن جذبہ کی بنیاد کسی حکم اور قضیے یا علمی تخیل پر نہیں ہوتی۔ وجدان کا درجہ اعمال ذہنی میں بہت ارفع و اعلیٰ ہے۔ حیوانوں اور غیر مہذب انسانوں کی رسائی جذبہ سے آگے نہیں یعنی وجدان اُن کے نفوس میں پیدا نہیں ہو سکتا کیونکہ (توجہ فعلی، حافظہ، فہم اور معرفتِ ذات ان سب باتوں کی وجدان میں ضرورت ہے اور یہ تخیل فعلی سوائے عاقل بالغ اور مہذب انسان کے اور کسی میں پیدا نہیں ہو سکتا اس لئے وجدان تمام مخلوق میں عاقل بالغ و مہذب انسان ہی کا خاصہ ہے۔

یہاں اس امر کی توضیح بیموقع نہ ہوگی کہ اکثر افکار و خیالات ہم کو نسلی، قومی، ملی اور لسانی وراثت کے طور پر ملتے ہیں اسی طرح ہمارے اکثر وجدانات ہم کو سوسائٹی میں تیار ملتے ہیں جن کو ہم بعینہٖ قبول کر لیتے ہیں اور ان کے لئے ہمیں خود حکم لگانے اور فعلی توجہ کی ضرورت نہیں پڑتی مثلاً اپنے والد

کے لیئے وجدان ادب و تعظیم مجھ کو سوسائیٹی کی روایات ہی سے حاصل ہوا ہے اور اس کے اظہار کا طریق مودبانہ حرکات سے کرنا بھی انہیں روایات سے میں نے سیکھا ہے پھر یہ مودبانہ حرکات بھی ویسی ہی ہوتی ہیں جیسی کہ اس سوسائیٹی میں مروج ہوں جس میں ہماری بود و باش ہوتی ہے بعض دفعہ ہم جذبہ اور وجدان میں تمیز نہیں کرتے اور کسی زبردست وجدان کو مثلاً انتقام کو جذبۂ انتقام اور کسی دیرپا جذبہ مثلاً غصہ کو وجدانِ غیظ کہہ دیتے ہیں بعض دفعہ کسی فوری حکم کو بھی وجدان کا نام دیدیتے ہیں مثلاً مقابلہ اور مقاومت لیکن نفسیات ان الفاظ کے غلط طور پر استعمال کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔

اقسام وجدان

وجدانات کی چار قسمیں ہیں۔

(۱) عقلی یا منطقی ۔ INTELLECTUAL OR LOGICAL

(۲) اخلاقی یا ملی ۔ ETHICAL OR SOCIAL

(۳) مذہبی یا دینی ۔ RELIGIOUS

(۴) جمالی اور تقبیحی ۔ ASTHETIC

(۱) وجدانات عقلی یا منطقی (INTELLECTUAL) جن کے متعلق واقعہ حائلہ دنیا کی اشیاء یا ان کے ذہنی اعمال سے پیدا نہیں ہوتا ۔ بلکہ ہم ان خارجی واقعات کو جب علوم متعارفہ کے مسلمات کی روشنی میں سوچتے ہیں تو یہ مسلمات تخیل عالمانہ کا نتیجہ ہوتے ہیں ۔ مرکزی فیصلہ جس کے گرد تمام متکیف متغیرات ذہنی کا اجتماع ہوتا ہے یہ ہے کہ یہ بات درست ہے یا غلط ان دونوں کے درمیان کشاکش میں توجہ کبھی ایک طرف فیصلہ کرتی ہے کبھی دوسری طرف۔ ان دونوں کے درمیان بھی ایک درجہ وجدان کا ہے ۔ مثلاً :—

انتہائے اول	وسط	انتہائے آخر
اطمینان	پریشانی	افتاد
یقین	شک	بے اعتباری
سچ	ابہام	جھوٹ
مطابقت	خلط (اختلاف)	تضاد

صاف ظاہر ہے کہ جذبہ محض انفعالی توجہ کی حالت میں فوری طور پر پیدا ہوتا ہے ۔ اور اس کا درمیانی درجہ کوئی نہیں ہوتا ۔ دو متضاد صورتوں میں سے ایک غصہ ہے یا خوشنودی ۔ محبت ہے یا حقارت ۔ انبساط ہے یا رنج

(۲) وجدانات اخلاقی یا ملّی (SOCIAL) میں مسلمات علمی کی جگہ قومی اور ملکی رسم و رواج لے لیتے ہیں اور ہم واقعہ حائلہ کو رسم و رواج اور قوانین کے نکتہ نگاہ سے دیکھتے ہیں مرکزی حکم یا فیصلہ یہاں یہ ہوتا ہے کہ یہ کام اچھا ہے یا برا۔ (سوسائیٹی کی نگاہ میں) اس میں بھی وہی تین درجہ ہیں مثلاً:-

تکبر	نرم مزاجی	انکسار
ادب	مروّت	بے ادبی
حمایت	غیر جانبداری	مخالفت
انتقام	تنبیہ	عفو

(۳) وجدانات دینی اور مذہبی (RELIGIOUS) میں فیصلہ کسی کے افعال کی بابت معتقدت پر ہوتا ہے یعنی یہ کام خدا کے نزدیک ٹھیک ہے یا نہیں۔ اس قسم کے جذبات کا اخلاقی اور ملی جذبات سے ہمیشہ گہرا تعلق رہا ہے۔ کیونکہ محض رسمی باتوں کو ہم رفتہ رفتہ جزو مذہب قرار دے لیتے ہیں لیکن نفسیات اس بات کو نظر انداز نہیں کرسکتا کہ رسم و رواج خدا کے حکم کے برابر نہیں سمجھے جاتے مذہبی وجدانات کی مثالیں:

تقوٰی	حرمت	عدوان
عجز	دعا	تمرّد
معصومیت	پرہیزگاری	بدکاری

(۴) وجدانات جمالی (EASTHATIC) ان میں وجدان حسن اور بدصورتی شامل ہیں۔ مرکزی حکم اور جو حکم کہ ہم صادر کرتے ہیں یہ ہوتا ہے کہ یہ شئے خوبصورت ہے یا بدصورت (ان کے علاوہ (۵) ایک وجدان شوکت GRANDEUR کہنا چاہیئے جو وجدان جمالی اور وجدان منطقی کا مرکب ہوتا ہے (اور اس میں وجدان ملّی بھی کسی قدر شامل ہوتا ہے) دو قسم کے اور وجدانات ہیں ایک کو وجدانِ طرب (COMIC) اور دوسرے کو وجدانِ حزن (TRAGIC) کہنا چاہیئے۔ ان میں جذبات حسن اور بدصورتی جذبات منطقی سے ملکر طبیعت کو بے حد متاثر کرتے ہیں۔

بادی النظر میں وجدانات جمالی بالکل فضول چیز ہیں اور بعض دفعہ تعجب ہوتا ہے کہ آخر ان کی کیا ضرورت ہے۔ مگر ارتقار طبعی میں ان کا باقی رہجانا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ ہم کو ان سے ضرور فائدہ پہنچتا ہے

جس طرح کہ نر پرندہ ہر سال نئے نئے پر نکال کر اپنے جوڑے کو لبھاتا ہے اس طرح وحشی انسان اپنے جسم پر رنگ برنگ کی تصویریں کھینچکر عورت کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے جب کچھ کچھ تہذیب اس کو آتی ہے تو وہ جسم کی بجائے لباس اور مکان کی آراستگی کی طرف متوجہ ہوتا ہے جس کا مطلب وہی دوسروں کی توجہ کو کھینچنا ہوتا ہے۔ مگر جب علحدہ علحدہ مکانات اعلیٰ درجہ کے خوبصورت بنانے ہر شخص کے مقدرت سے باہر ہوئے تو قبائل اور اقوام نے ملکر مشترک مکانات بنائے اور ان کو اپنے معبود کے نذر گزرانا مسجد، مندر اور کلیسہ ہر جگہ بستی کی سب سے عمدہ عمارت ہوتی ہے۔ گویا وجدانِ جمالی کو اس طرح خدمت مذہب سپرد ہوئی اور وجدان شوکت اس کا شریک خدمت قرار پایا۔

جب لوگ گاؤں میں مستقل بودوباش کر کے کھیتی باڑی یا دیگر پیشے اختیار کر کے معاش حاصل کرنے لگے اور ضروریات زندگی محنت سے حاصل ہونے لگے تو کام کے بعد تفریح کی ضرورت پڑی مگر دل بہلانے کے لئے آدمی وہی کھیل نہیں کھیل سکتے جو بچے کھیلتے ہیں۔ وجدانات جمالی اور وجدانات طرب وحزن کی مدد سے شاعری، مصوری، فسانہ گوئی، موسیقی، تھیٹر، ڈرامہ وغیرہ اشغال قایم کئے گئے جو بچپن کے بعد بھی دلگی مذاق اور کھیل کے طور پر ثقہ لوگوں نے شغل اختیار کئے۔ ادب اور اخلاق کو جو فائدہ ان سے پہنچ گیا وہ محض ضمنی ہے ابتدا میں ہرگز کسی کی مرضی نہ تھی۔

وجدانات حزن اور وجدانات طرب کے ساتھ وجدان شوکت نے ملکر قومی، مذہبی، ملی تیوہاروں پر ناظرین سے داد تحسین ہمیشہ حاصل کی ہے غرضکہ علوم وفنون کی ایجاد ترقی اسی شریف جذبہ کی مرہون منت رہی ہے۔ اگرچہ اس کا بیجا استعمال سامان عیش وعشرت مہیا کرنے کا بھی موجب بن جاتا ہے وجدان جمالی طربیہ اور حزنیہ کی روح کی غذا ہیں اور تمام رنجشوں کو مٹاتے اور جذبہ میں تبدیل ہوجانے کی خاصیت بہت زیادہ رکھتے ہیں۔ معمولی تعریف سے انبساط کا پیدا ہوجانا اور معمولی کراہت سے غصہ اور حقارت کا پیدا ہوجانا بہت قرین قیاس ہے۔

الفت وجدانات میں سے الفت کا وجدان ذرا زیادہ قابل غور ہے۔ الفت توجہ سے اور عموماً انفعالی توجہ سے پیدا ہوتی ہے اور انفعالی توجہ کا مورد جب فعلی توجہ کو جذب کرنا شروع کردیتا ہے اور اس کے متعلق خیال اور تصور عادت بلکہ طبیعت ثانیہ بن جاتا ہے اور اکثر اوقات جوش کی شکل میں مستقل ہوکر گریہ یا دیگر نشانات بیقراری کے اظہار کا باعث ہوتا ہے تو اس کو محبت کہتے ہیں۔ عام حالات میں محبت کے

معنی یہ ہیں کہ ہم محبوب سے اکثر اوقات ملنا چاہتے ہیں اپنے حالات سے اس کو واقف کرنا اور اس کے حالات سے خود واقف ہونا اور اس کی مدد کرنا یا مدد لینا چاہتے ہیں لیکن جب ان میں سے سب یا کوئی باستثنا نہ ہو سکے تو ایک قسم کی بےچینی سی پیدا ہوتی ہے اور اس بےچینی کا درجہ عادت یا طبعی حالت سوسائٹی کے رواج اور وقت کی پابندی پر منحصر ہوتا ہے۔ الفت کی عشق تک ترقی وجدان کے جذبہ میں تبدیل ہونے کی نہایت عمدہ مثال ہے۔ عشق عموماً جوانی میں ہم عمروں کے ساتھ ہوتا ہے خواہشات فطری اور شدت توجہ کو بہت زیادہ اس میں دخل ہوتا ہے۔

غزل

از

علامہ نواب ضیا یار جنگ بہادر

بحسرتم گذرد عمر آرزو چه کنم — بشیشه باده ندارم تهی سبو چه کنم

فریب آئینه ام می دهند چون طوطی — مرا که خواب عزیز است گفتگو چه کنم

کرا سری که کند فکرِ خرقه دوزیِ هوش — زبسکه در خورِ آتش بود رفو چه کنم

ز آبِ آئینه نتوان غبارِ خاطر شست — به اشک شوئی دل صرفِ آبرو چه کنم

مرا که آتشِ دل بر زبان گره شده است — حریفِ ناله نیم سرمه در گلو چه کنم

بسے تلاشِ دهانِ تو آرزو خون کرد — رهیکه بوسه نبرد است جستجو چه کنم

دو روز بیش ندارد ضیا زمانهٔ بهار

بسانِ لاله و گل نازِ رنگ و بو چه کنم

عمر خیام

از

علامہ نواب حیدر یار جنگ بہادر نظم طباطبائی

یہ مضمون علامہ نظم طباطبائی نے سید کاظم علی شوکت بلگرامی مرحوم کے رباعیات خیام کے اُس اُردو ترجمہ کے لئے لکھا تھا جس کو مرحوم فٹزجیرالڈ کے انگلش ترجمہ کے ساتھ "مے دو آتشہ" کے نام سے شائع کرنا چاہتے تھے افسوس کہ مرحوم کو زمانہ نے اتنی مہلت نہ دی کہ اس مجموعہ کو اپنی زندگی ہی میں چھپوا لیتے مکتبہ ابراہیمیہ اس مجموعہ کو مرحوم کے فرزند سے حاصل کر کے شائع کر رہا ہے علامہ محترم کی علمی و ادبی کاوشوں سے اُردو ادبی دنیا بخوبی واقف ہے گو یہ مضمون مختصر ہے لیکن حضرت علامہ کی جنبش قلم اور ان کی عالمانہ تحریر کا ایک جامع نقش ہونے کے لحاظ سے گرانقدر شاہکار ہے اس لئے ناظرین مکتبہ کی بصیرت کے لئے ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

(مکتبہ)

عمر خیام مشاہیر فلاسفۂ اسلام میں حکیم فیلسوف اور مہندس صاحب زیج ہے۔ افعال عباد میں جبر کا قائل یا اسی مذہب کی طرف مائل ہے صوفیہ کرام کے کسی سلسلہ میں اس کا شمار نہیں لیکن مسئلۂ جبر میں اصرار اور معاد جسمانی کے انکار میں یہ بھی اسی طبقۂ عالیہ کا ہم نوا ہے۔ اور یہی سبب ہوا کہ یورپ کے اکثر افراد جو قید مذاہب سے آزاد ہیں اس کے کلام کے شیفتہ و وارفتہ ہو گئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ خیام شمشیر برہنہ ہے صداقت میں لگی لپٹی نہیں رکھتا۔ یورپ کے نامور شعرا بھی اس آزادہ کے ساتھ قید مذہب سے باہر نہ ہو سکے۔

اس کے رباعیات کا بڑا موضوع یہ ہے کہ انسان خاک میں ملنے والا ہے۔ یہ غریب قابل رحم ہے

اسے دنیا میں پھر نہیں آنا ہے۔ لذات دنیا میں سے جس نعمت پر دست رس ہو اس سے باز نہ رہے اور بس مغتنم سمجھے۔ دنیا سے ترستا ہوا نہ جائے۔

اس ایک مضمون کو کتنے اسلوبوں سے شاعر نے بیان کیا ہے۔ ایک سے ایک بڑھ کر ایک سے ایک بہتر بلاغت اسی کا نام ہے کہ معنی مقصود کو متعدد اسلوبوں سے بیان کر کے دکھا دے کہ دیکھو مطلب کو اس طرح واضح یا واضح تر کر دیتے ہیں مطلب شعر ایک نازنین ہے کبھی اس نے جھلک دکھا دی کبھی آواز سنا دی کبھی آغوش میں چلی آئی شاہد معنی کے یہ سب جلوے دلکش و دل فریب ہیں اس لحاظ سے خیام کا کلام منتہائے درجہ بلاغت کو پہنچا ہوا ہے۔ یہ فارسی و عربی دونوں زبانوں میں اپنے ہی رنگ کے شعر کہتا تھا۔

خیام کے سال ولادت و وفات کا پتہ لگانے میں مولوی اکرام اللہ صاحب صدیقی نے بہت کاوشش کی ہے۔ ان کی تحقیق کے موجب اگر ۴۰۹-۱۰ھ سنہ ولادت اور ۵۲۶-۲۷ھ وفات سمجھ لیا جائے تو خیام کی عمر ایک سو اٹھارہ یا سترہ برس کی نکلتی ہے گو یہ بات محالات میں سے نہیں لیکن مستبعد ضرور ہے اس میں شک نہیں کہ اُس کا زمانہ انہیں دونوں سنوں کے درمیان کا ہے نیشاپور کو اوس کے مولد و مدفن ہونے کا فخر ہے۔ الپ ارسلان و ملک شاہ سنجر سے سلاطین اسکا اعزاز و احترام کرتے تھے۔ امام غزالی کا معاصر ہے، تجرد و عزلت میں اوس نے عمر بسر کی کبھی ملکی خدمات کو قبول نہیں کیا۔

لطف تغزل[۱]

از مولانا حکیم محمد وحید الدین عالیؔ مرحوم حیدرآبادی

پی کے حالت کیا سنبھالی جائیگی　　　مے کی بوتل توڑ ڈالی جائے گی

گر یہی شور و فغاں دن رات ہے　　　باغ سے بلبل نکالی جائے گی

مُردے اُٹھ بیٹھیں گے لاکھوں خاک سے　　　ان کی اک ٹھوکر نہ خالی جائے گی

جنس دل کی اُس پری پیکر کے ہاتھ　　　او نے پونے بیچ ڈالی جائے گی

نام سے صور اُن کے پھونکا جائیگا　　　جان یوں مردوں میں ڈالی جائے گی

میکشوں میں قبر میری بعد مرگ　　　اک زیارتگہ بنالی جائے گی

ڈر کے حسن پردہ در سے بول اُٹھے　　　قید روپوشی اٹھالی جائے گی

دیکھکر صورت مری کہنے لگے　　　اب کوئی صورت نکالی جائے گی

یہ غزل لکھتی ہے جو لطف سخن　　　لطف کی پیشی میں عالیؔ جائے گی

[۱] عالیؔ مرحوم نے یہ غزل جس کا شان نزول عنوان اور مقطع سے ظاہر ہے کہہ کر نواب لطف الدولہ بہادر کے ملاحظہ میں پیش کی تھی (مکتبہ)

(از والیٹر)

مترجمہ جناب عزیز احمد صاحب

والیٹر، پارس میں پیدا ہوا۔ اور یہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اوائل عمر ہی سے شعر لکھنا شروع کر دیا تھا، باپ اس کو قانون پڑھانا چاہتا تھا، مگر اس کا رجحان ادبیات کی طرف ہو گیا۔ ہجو نگاروں میں شمار ہوتا ہے، ہجو نگاری کی وجہ وہ کئی دفعہ قید ہوا، اور جلا وطن بھی کیا گیا۔ نصف صدی تک وہ اپنے ڈراموں، قصیدوں، ہجوؤں، تاریخوں اور رسالوں سے یورپ کی ادبی اور حسن کاری کی فضا میں ہل چل مچاتا رہا۔ جدید فلسفیوں میں اس کا بڑا رتبہ ہے، اس کے قصے تعداد میں کئی اور سب کے سب ہجویں ہیں "فلسفی" ایک فلسفیانہ قصہ ہے، اور والیٹر کی ہجو نگاری کا بہترین نمونہ۔

یہ ترجمہ انگریزی سے عزیز احمد صاحب نے کیا ہے۔

(مکتبہ)

ایک دن میمنان کو فلاسفر بننے کا خبط سمایا۔ دنیا میں بہت کم لوگ ہونگے، جنھوں نے کبھی نہ کبھی اس قسم کا وحشیانہ ارادہ نہ کیا ہو۔ میمنان، اپنے آپ سے کہتا ہے "مکمل فلاسفر بننے اور مکمل پر آسایش زندگی بسر کرنے کے لئے صرف یہی ضروری چیز ہے کہ میں اپنے تئیں جذبات سے بالکل معرا رکھوں، اور یہ ایک آسان سی بات ہے، اول تو یہ کہ میں عاشقی چھوڑ دونگا، اگر کوئی خوبصورت عورت نظر آئے گی تو میں اپنے دل میں کہونگا کہ کسی دن ان رخساروں پر جھریاں پڑجائیں گی، ان آنکھوں میں روشنی باقی نہ رہے گی، یہ سر فالج زدہ اور سفید ہو جائے گا، بس میں اس کو اسی تخیلاتی نقطۂ نظر سے دیکھونگا، اور پھر کوئی خوبصورت چہرہ میرے سر میں سودا پیدا نہ کر سکے گا۔

دوسرے یہ کہ میں ہمیشہ معتدل رہونگا، گپ شپ نفیس شرابیں، یا سوسائٹی کی مصروفیتیں مجھے اپنی طرف مائل نہ کر سکیں گی۔ میں ہمیشہ حد سے تجاوز کرنے کا نتیجہ اپنی نظروں کے سامنے رکھونگا، یعنی درد سر نفخ شکم یا عقل صحت اور وقت کی تضیع، میں صرف بقدر سد رمق کھانا کھاؤنگا، میری صحت ہمیشہ اچھی

رہے گی، میرے خیالات صاف اور بلند پایہ ہونگے ۔ یہ سب اسقدر آسان ہے کہ اس کا پورا کرنا کوئی خاص بات نہیں ۔

لیکن میمنان اپنے آپ سے کہتا ہے کہ "مجھے یہ تو سوچنا پڑیگا کہ کیونکر اپنے خواہشات کو معتدل بناؤں اور اپنی زندگی کی تشکیل کروں، مجھے آزاد زندگی بسر کرنے کی ضرورت ہوگی اور یہ بہت بڑی نعمت ہے مجھے کبھی اس کی ضرورت لاحق نہ ہوگی کہ میں جلسہائے رقص میں شامل ہوں یا عدالتوں میں جاؤں میں کسی سے حسد نہ کرونگا، نہ کوئی شخص مجھ سے حسد کریگا، اور پھر یہ کس قدر آسان ہے، اپنے دوستوں کی حفاظت کرونگا اور ان سے اپنے تعلقات میں فرق نہ آنے دوں گا، ان کے کسی قول یا فعل پر میں برا نہ مانونگا اور وہ بھی میرے ساتھ یہی سلوک کرینگے ۔ ان سب باتوں کے پورا کرنے میں کوئی مشکل سد راہ نہیں

فلسفہ کا یہ نقشہ اپنے ذہن میں کھینچ کر میمنان نے کھڑکی سے باہر سر نکالا اور دو عورتوں کو مکان سے قریب درختوں کے نیچے جاتے دیکھا، ان میں سے ایک بڈھی اور مطمئن تھی اور دوسری نوجوان کسی قدر رنجیدہ تھی، وہ آہیں بھر رہی تھی، رو رہی تھی اور اس وجہ سے اور زیادہ خوبصورت معلوم ہو رہی تھی ہمارا فلسفی بہت متاثر ہوا، عورت کے حسن سے نہیں بلکہ اس کی مصیبت کی وجہ سے، (کیونکہ فلسفی نے حسن سے متاثر ہونے کا عہد کرلیا تھا) وہ نیچے اترا اور نازنین نینوا کی فلسفے سے تسکین کرنا چاہی ۔ اس حسین ہستی نے ایک سادگی کے انداز سے متاثر انگیز لہجے میں اپنے ایک فرضی چچا کی فرضی داستان ظلم و ستم سنانا شروع کی ۔ اس کیا دی اور مکاری کا قصہ سنایا، جس سے اس کے فرضی چچا نے فرضی جائداد پر قبضہ کرلیا تھا ۔ اور اس پر ظلم و ستم کر رہا تھا، اور پھر بولی آپ مجھے ایسے دانشمند آدمی نظر آتے ہیں کہ اگر آپ میرے گھر تشریف لائیں میرے حالات دیکھیں تو مجھے اس ظالمانہ کلفت سے بچا لینے کی کوئی نہ کوئی سبیل نکال ہی لیں گے ۔" میمنان ۔ اس کے حالات دیکھنے اور فلسفیانہ طور پر اس کو نصیحت کرنے کے لئے اس کے ساتھ بلا پس و پیش روانہ ہوگیا ۔

رنجیدہ خاتون نے اسے ایک پر تکلف کمرے میں لے جاکر، بہت ادب سے ایک بڑے صوفے پر بٹھایا، وہ دونوں ایک دوسرے کے بالمقابل بیٹھ گئے، اور گفتگو میں مصروف ہوگئے ۔ ایک اپنی کہانی کہنے میں مصروف تھی اور دوسرا پوری توجہ سے سن رہا تھا، خاتون سر جھکائے ہوئے تھی، کبھی،

کبھی کبھی اس کی آنکھ سے ایک آنسو نکل جاتا تھا اور کبھی کبھی وہ ہمت کرکے آنکھیں اونچی کرتی تو وہ درویش میمان کی نگاہوں سے مل جاتیں، ان کی گفتگو نرمی سے پُر تھی۔ میمان کے دل پر اس کے حالات کا بہت اثر ہوا، اور ہر لمحہ اس کا خیال بڑھتا جاتا تھا کہ وہ اس قدر نیک اور بد نصیب ہستی پر مہربانی کرے۔ رفتہ رفتہ گفتگو کی تیزی کے ساتھ وہ نزدیک تر ہوتے گئے، اور ان کے قدم اپنے پہلے کی طرح مڑے ہوئے نہ تھے میمان نے اس کو اس قدر قریب سے مشورہ دیا اور اس کو ایسے سچے دل سے نصیحتیں کیں کہ رفتہ رفتہ انکی للکارو باری باتوں کے احاطہ سے باہر نکل کر کہیں سے کہیں پہنچ گئیں۔

اب خیال تو کرو کہ ایسے پر لطف موقع پر سوائے چچا کے اور کون دخل در معقولات کرسکتا، وہ سر سے پیر تک مسلح تھا اور داخل ہوتے ہی اس نے یہ بیان کیا کہ وہ فوراً درویش میمان اور اپنی بھتیجی کو قتل کر دیگا اور یہی شیوہ انصاف ہے، آخرالذکر جو صفائی سے نکل گئی تھی کہنے لگی کہ ایک بڑی رقم دے کر میمان اس سزا سے بچ سکتا ہے، مجبوراً میمان کو وہ تمام چیزیں ان کے حوالے کرنا پڑیں جو اس کے پاس تھیں، ان دنوں میں لوگوں کو ایسی آسانی سے نجات مل جاتی تھی، جب تک امریکہ دریافت نہ ہوا تھا، اور مصیبت زدہ خواتین اس قدر خطرناک نہ سمجھی جاتی تھیں جیسی کہ اب سمجھی جاتی ہیں۔

میمان، شرم اور پریشانی میں غرق غرق گھر پہنچا تو اسے اپنے دوستوں کی طرف سے ایک دعوتی رقعہ ملا۔ "اگر میں گھر پر کھانا کھاتا" اس نے اپنے دل میں کہا " تو ایک لقمہ بھی میری حلق سے نہ اتر سکتا مگر اپنے گہرے دوستوں کی صحبت میں اپنا غم غلط کردوں گا، چنانچہ دعوت میں شریک ہوا، تھوڑی سی شراب پی اور شراب کے اثر سے فلسفی میمان مدہوش ہوگیا، باتوں باتوں میں کسی بات پر لڑائی ہوگئی، طرفین لڑتے لڑتے بہت زیادہ گرم ہوگئے، اس کے ایک دوست نے ایک صندوقچہ اس کے منہ پر دے مارا جس سے اس کی ایک آنکھ پھوٹ گئی۔ فلسفی میمان کانا، مدہوش اور بالکل غریب ہو کر گھر پہنچا۔

وہ اپنے صحن میں سوتا ہے اور صبح کو جب ذرا ہوش آتا ہے تو وہ اپنے نوکر کو بنک کے خازن کے پاس بھیجتا ہے، مگر جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ بنک کا دیوالہ نکل گیا ہے اور ہزاروں خاندان مٹی میں مل گئے تو وہ بادشاہ کے پاس فریاد لے کر جاتا ہے، راستے میں اسے بہت سی مہربان عورتیں ملتی ہیں جو اسقیت اس کو دیکھ کر کہتی ہیں " اخاہ کیا خوفناک شیطان ہے" ایک عورت جس سے وہ اچھی طرح واقف تھا، اس سے سوال کرتی ہے "میاں میمان، ہاں میاں میمان، تمہاری آنکھ کیسے پھوٹی؟" میمان نے اپنے

آپ کو ایک گوشہ میں چھپا لیا اور موقع کا انتظار کرنے لگا کہ بادشاہ کے قدموں پر گر پڑے، آخر وہ موقع آگیا، بادشاہ نے اس کی فریاد سنی اور اپنے ایک درباری کو حکم دیا کہ اس کی شکایتوں کو رفع کردے، درباری نے میناں کو الگ لے جا کر کہا کہ تم عجب قسم کے کتے ہو کہ بجائے میرے پاس فریاد لانے کے براہِ راست بادشاہ کے پاس فریاد کی۔ خبردار اب سے پھر اس ایمان دار بنک کے منیجر کی شکایت نہ کرنا، کیونکہ وہ میری معشوقہ کی کی لونڈی کا بھتیجا ہے۔ ورنہ تمہاری دوسری آنکھ کی بھی خیر نہیں۔

اس طرح فلسفی میناں جس نے عورتوں سے نہ ملنے، شراب نہ پینے، بھکنے اور لڑنے، اور دربار جانے کی قسم کھائی تھی، چوبیس گھنٹوں کے اندر ایک شریف عورت کے ہاتھوں لوٹا بھی گیا، دوستوں سے لڑ کر اپنی آنکھ بھی گنوائی اور دربار میں جا کر ذلیل بھی ہوا۔

رنجیدہ ہو کر میناں فلسفی گھر واپس ہوا، اس کے گھر کا تمام سامان قرق ہو گیا، اس کو درخت کے سایہ میں آرام کرنا پڑا، صبح کو اس نے شریف عورت کو دیکھا جو اپنے پیارے چچا کے ساتھ چہل قدمی کر رہی تھی، اس نے میناں کو دیکھ کر قہقہہ لگایا، رات کو میناں گھاس کے بچھونے پر اپنے مکان کے قریب ہی سویا۔ اس نے تکلیف دہ خواب دیکھا اور آخر کار اس نے ایک لطیف روح کو خواب میں دیکھا۔

اس روح کے چھ خوبصورت پر تھے، مگر سر تھا نہ دم تھی۔ میناں نے اس سے پوچھا، "تو کون ہے؟" روح نے جواب دیا، "میں تیری خوش قسمتی ہوں"۔ میناں نے کہا "تو پھر میری آنکھ میری دولت، میری عقل اور میری قسمت مجھے واپس دے۔"

روح نے جواب دیا "تمہاری قسمت جلد تبدیل ہو جائے گی، اگرچہ تمہاری آنکھ تم کو واپس نہ مل سکیگی تاہم تم بالکل خوش وخرم زندگی بسر کر سکو گے۔ بشرطیکہ پھر تم کامل فلاسفر بنے کا ارادہ نہ کرو۔

"تو کیا فلسفی بننا ناممکن ہے"؟ میناں نے سوال کیا۔

"مکمل فلاسفر بننا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا کہ مکمل عقلمند بننا یا کامل طاقتور بننا، یا کامل خوش قسمت بننا۔ ہاں اٹھارہ ہزار دیناروں میں جو کائنات بھر میں بھری ہوئی ہیں یہ بالکل ناممکن ہے۔ ان میں ایک دنیا ایسی ہے جہاں یہ ممکن ہے"

"تو پھر شاعروں کا یہ کہنا کہ ہر چیز کامل بننا چاہتی ہے غلط ہے"؟

"نہیں ان کا کہنا غلط نہیں، ہر چیز کامل بننا چاہتی ہے، مگر بن نہیں سکتی" روح نے جواب دیا۔ بیچارے میناں نے کہا "تو پھر میں اپنی آنکھ کی بینائی حاصل نہ کر سکوں گا"۔

غزل

از جناب محمد عبد الحمید خاں صاحب خیالی تلمیذ حضرت صفی اورنگ آبادی

اس نے کیا جانے میری جاں تجھے کیا کیا جانا
جس نے آنکھوں کو تری ساغر صہبا جانا

تیرے عاشق نے تجھے لاکھ میں اچھا جانا
تو بھی اتنا تو بتا تو نے اسے کیا جانا

بیشک اتنی تو خطا مجھ سے ہوئی بندہ نواز
بے سبب آپ کو چاہا بھی پھر اپنا جانا

رائیگاں جائے گی کیا یونہی ہماری محنت
کام آئے گا کسی دن تو وہاں کا جانا

اب بھی کیا آپ کو نا قدر نہ سمجھے عاشق
دل گم گشتہ کا رستہ میں پڑا پایا جانا

اپنی ہر ایک ادا پر جو ہوے داد طلب
مہرباں آپ نے شاید مجھے اندھا جانا

اے مرے دوست نما دشمنِ ارباب وفا
تو نے اچھا مجھے سمجھا مجھے اچھا جانا

غیر لاحول ولا تجھکو بھلا کیا جانے
جس نے جانا ہے تجھے اسے ستم آرا جانا

جان جاتی تو نہ ہوتا مجھے اتنا صدمہ
روٹھ کر ہائے مرے گھر سے کسی کا جانا

محفلِ غیر کی تصویر کوئی یوں کھینچے
میرا جانا کسی بد عہد کا گھر آجانا

تجھ کو تڑپائے گی عاشق کے تڑپنے کی ادا
کھیل سمجھا اِسے کوئی کہ تماشا جانا

جب سنی تم سے زمانہ کی برائی ہی سنی
تم نے اچھا کسے سمجھا کسے اچھا جانا

غیب دانی یہ نہیں ہے تو پھر آخر کیا ہے
جو مرے دل میں تھی تو نے اسے کیسا جانا

میں نے کی تیری شکایت تجھے باور آیا
واہ اے کان کے کچے مجھے ایسا جانا

اے خیالی وہ زمانہ نہیں وہ دل ہی نہیں
ایک مدت سے وہاں بند ہے آنا جانا

ذاتی اخلاق

از جناب رشید احمد صاحب حیدرآبادی

(۲)

خیال کی وسعت نہیں، دراصل عمل کی وسعت ہے اخلاقیات ان دونوں پر محتوی ہے اور یہ فریضہ اخلاقیات ہے کہ ہم نیک اور پاکیزہ خیالات ہروقت ہر جگہ رکھیں۔ علم الاخلاق ہمارے روزمرہ کے چھوٹے سے چھوٹے اور معمولی سے معمولی کام کے لئے بھی بہترین طریقہ پر رہنمائی کرتا ہے۔ ہم میں سے اکثر کے لئے اصلی دنیا محدود ہے۔ اور وہ اس قدر محدود اور معمولی ہے کہ ہم اس کو نظرانداز کردیتے ہیں ہماری اصلی دنیا جس سے ہم کو روزانہ سابقہ پڑتا ہے مشتمل ہے ہمارے گھر، چند دوست احباب، چند شناسا اور خود ہم پر لیکن یہیں ہم پر کامل ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔

گھر سے بڑھکر قریبی چیز ہمارے لئے کوئی نہیں ہوسکتی۔ اور یہی خاندان کے ہر فرد کا مامن ہے۔ باہر کی دنیا نے اگر ہمارے متعلق رائے قایم کرنے میں غلطی کی ہے اور ہم غیر واقعی طور پر سمجھے گئے ہیں اور ہمیں اس کا ملال ہے تو یہ ملال گھر میں قدم رکھتے ہی ان صورتوں کو دیکھ کر جو ہم سے بخوبی واقف ہیں اور ہم پر اعتبار کرتے ہیں کافور ہوجانا چاہیئے۔ والدین اپنی اولاد سے اور بڑے بھائی بہن اپنے چھوٹے بھائی بہنوں سے کیا کچھ نہیں کرسکتے۔ اور ہم ان کے لیے کیا نہیں کرسکتے جو دوسروں کے مقابلہ میں جسمانی ودماغی حالت سے ضعیف ہیں یا جن میں ایسی کمزوری ہے جس کی وجہ سے دنیا ان کی تحقیر کرتی ہے اور دنیا کی تحقیر کو برداشت کرنے کی ان میں قوت نہیں اور وہ بوکھلاتے رہتے ہیں۔ ہم کو کس قدر انہیں مزید صدمہ نہ دینے کا خیال رکھنا چاہیئے۔ اور ہم کو کیسی کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ آپ کو نظروں سے نہ گرائیں کہ خودداری ہی تمام عمدہ اوصاف کی جڑ ہے۔ اس سے بڑھکر ظلم اور کیا ہوسکتا ہے کہ بچہ اپنے ہی گھر میں حقارت اور بےبسی کے ساتھ رہے۔ لیکن حیرت ہے کہ ہم بعض اوقات انہیں سے جن سے ہمارے قریبی تعلقات رہتے ہیں اور جس کے لئے ہم بہت کچھ کرسکتے ہیں۔ بہت سرد مہری سے پیش آتے ہیں۔ اکثر اشخاص جو دوسری عورتوں کیساتھ مجسم اخلاق رہتے ہیں۔ اپنی بیویوں سے بیگانگی

سے پیش آتے ہیں۔ بہت سے فرزند لیسے ہیں جو عام طور پر دوسرے آدمیوں کے ساتھ خوش اخلاقی کا برتاؤ کرتے ہیں اور اپنے باپ سے نہیں۔ بہت سی نوجوان عورتیں جو اور عورتوں کی کمزوریوں کا خیال رکھتی ہیں خود اپنی بہنوں کے ساتھ نرمی وملاطفت کو بالائے طاق رکھتی ہیں۔ کاش ہم معلوم کرتے کہ ہمارے قریب ترین فرایض اعلیٰ ترین فرایض ہیں کاش ہم خیال رکھتے کہ وہی لوگ جن سے ہم ہر روز اور ہر ساعت ملتے ہیں ہماری محبت کے زیادہ مستحق ہیں۔ ہم کو چاہیئے کہ ان کا احترام کریں ان کے مصائب کو اپنے مصائب سمجھیں اور ہر وقت ان کے ساتھ بھلائی کے خیال کو مدنظر رکھیں۔ باپ ماں بیوی بچے بھائی بہن ان سے بڑھکر ہیں کون ہوسکتا ہے اور ان سے بڑھ کر ہم کس سے محبت کرسکتے ہیں۔

آدمی کے لئے اس سے بہتر بات نہیں ہوسکتی کہ اپنے ملنے والوں کے ساتھ وسیع النظری کے ساتھ پیش آئے۔ آدمی کی سرشت ایسی واقع ہوی ہے کہ اگر ہم اس کے متعلق برا خیال کریں تو اس میں ضرور برائی پائیں گے اور اگر بھلائی کا خیال کریں تو بھلائی پائیں گے۔

وسیع النظری سے مطلب بھلائیوں کی طرف نظر رکھنا ہے۔ اگر کسی شخص کے رویے کے متعلق اچھے اور برے دونوں قیاسات قایم ہوسکتے ہیں تو وسیع النظری سے مطلب یہ ہے کہ نیکی کی خاطر نہیں بلکہ فراخ حوصلگی کی خاطر اچھے قیاسات کو دل میں جگہ دیجائے۔ وسیع النظری اپنے نقصان کو نظرانداز کردینے ہی میں نہیں بلکہ نقصان کو نقصان نہ سمجھنے میں ہے۔ شیکسپیر کہتا ہے۔ وہ چھوٹی باتیں جو ہوا کی طرح سبک ہوتی ہیں تنگ نظروں کے لئے براہین قطعی ہوتی ہیں۔ لیکن وسیع النظر لوگوں کے پاس جارج الیٹ کے قول کے مطابق چھوٹی باتیں کچھ حقیقت نہیں رکھتیں اور ان کا کھلی اور خوش آیند فضا میں خاتمہ ہوجاتا ہے۔

میں نے ایسے شخصوں کو آپس کی غلط فہمیوں میں مبتلا دیکھا ہے جو فی نفسہ ایک دوسرے کی برائی کے درپے نہ تھے لیکن چونکہ ہر شخص اپنے حقوق کی حمایت کا ضرورت سے زیادہ طلبگار اور دوسرے کے متعلق یہ خیال جاگزیں کئے ہوئے تھا کہ وہ اس کی برائی کے درپے ہے اس لئے باہمی رنجشیں تھیں۔ ان رنجشوں کے دور کرنے کا طریقہ میرے خیال میں حق وناحق پر غور کرنا نہیں بلکہ فراخ دلی ہے۔ بغیر وسیع النظری کی عادت بنائے کے گزر نہیں۔ دنیا میں بہت سے ایسے حساس لوگ ہیں جن کی وجہ سے ہمیشہ ہر وقت دوسروں کو تکلیف ہوتی ہے اور وہ خود بھی تکلیف میں رہتے ہیں۔ ان کی نظر ہمیشہ اس بات پر رہتی ہے کہ کوئی ان کے حقوق پر چھاپہ تو نہیں مار رہا ہے۔ وہ ہمیشہ دوسروں کے بارے میں سوء ظن رکھتے ہیں

اور بادی النظر میں ان کی حالت افسردہ رہتی ہے جو اگر تکلیف دہ نہ ہو تو ہنسی کے قابل ہے اور یہ بالکل وسیع النظری کے خلاف ہے۔ وسیع النظر کبھی یہ خیال نہیں کرتا کہ دوسرے اس کی عزت کرتے ہیں یا نہیں۔ جزئی باتوں کو اہمیت دینے والا اس کو اچھا نہیں معلوم ہوتا اس میں استقامت ہوتی ہے اور باوجود ظاہری حالات ناموافق ہونے کے وہ دوسروں کو بھی صاحب استقامت سمجھتا ہے۔

دوست احباب کے ساتھ بحث مباحثے اور اختلاف رائے میں وسیع النظری کو دخل دیئے بغیر چارہ نہیں۔ ہمارے بہت سے مباحث بے سود و بے نتیجہ ہوتے ہیں کیونکہ ہم اپنے نقطۂ نظر پر اڑے رہتے ہیں اور دوسرے کا اصلی مطلب سمجھنے تک کی کوشش نہیں کرتے۔ ہم اپنی تائید میں جزئی غلطی اور معمولی فروگزاشت پر گرفت کرتے اس کو اہمیت دیتے اور بحث کے اصلی نتیجہ کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ کس قدر تبدیلی ان مباحث میں ہوگی اگر ہم جس سے بحث کر رہے ہیں اس کی اصل حجت پر انصاف کے ساتھ غور کریں اور سمجھیں۔ یقیناً جو شخص کہ دوسرے کی بحث پر کان دھرنے کے لئے آمادہ نہیں ہے اس کو اپنی حجت پر بھی اعتماد نہیں ہو سکتا۔ بحث جھگڑے کی صورت اختیار نہ کرنی چاہیئے۔ اگر جھگڑے کی صورت پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو اس کو وہیں ختم کیا جائے۔ تنگ نظری کا تنگ نظری سے قلع قمع نہیں کیا جا سکتا۔ تنگ نظری کا علاج وسیع النظری ہے۔ احرار کو چاہیئے کہ عیسائیوں یا یہودیوں کے ساتھ تنگ نظری سے پیش نہ آئیں۔ ہم کو قدیم مذاہب میں جو صداقتیں ملتی ہیں اور جو خدمات انسانی یہودی کے ان مذاہب نے انجام دئے ہیں۔ اور جو خدمات ان کے شریف پیرو اب بھی انجام دے رہے ہیں ان کو نظر تعمق سے دیکھنا چاہیئے۔ اور یہ ہم کو بادل ناخواستہ نہ کرنا چاہیئے گویا کہ ہم ان کے ساتھ احسان کر رہے ہیں۔ صداقت کیشی ہمارا شعار ہونا چاہیئے۔ اور ممکن ہے کہ ہماری صداقت کیشی کا ان پر بھی اثر ہو اور وہ بھی ہم سے خلوص سے پیش آئیں۔ سب سے بڑی حجت ہماری تائید میں ہمارا شریفانہ برتاؤ ہے جس کو ہم ہر وقت ظاہر کر سکتے ہیں۔ نیز ہم کو عیاریوں سے نفرت ہے جس کی وجہ سے دوسروں کے جذبات برانگیختہ ہوں۔ ہم کو چاہیئے کہ دوست دشمن سب سے وسیع النظری کے ساتھ پیش آئیں اور دوسری بات جس سے ہماری روزمرہ زندگی آرام و اطمینان کے ساتھ گزر سکتی ہے جزئی امور کی طرف توجہ ہے۔ ایک شریف مرد اور شریف عورت کی تعریف میں بہت کچھ خرافات سے کام لیا گیا ہے۔ شریف مرد اور شریف عورت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ معمولی اور جزئی باتوں کا خیال زیادہ رکھیں جس کی ایک گندہ پوست مرد یا عورت سے توقع نہیں ہو سکتی۔ اخلاق کی جز خودداری کے

بعد اگر ہے تو وہ دوسروں کے ساتھ ہمدردی ہے۔

ہماری اہم غلطی ہے کہ ہم اپنی خوشی کے لیے بڑے امور کی بجا آوری کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ایک عورت اپنے مرد سے جو کچھ چاہتی ہے وہ اس کی محبت ہے۔ اور اس کا اظہار مختلف معمولی طریقوں سے کیا جاسکتا ہے۔ تم اپنے دوست سے کسی بڑے کام یا مہربانی کے طلبگار ہی نہیں رہتے بلکہ ایک معمولی کام یا مہربانی جو مخلصانہ دوستی کے ساتھ ہو تمھیں ممنون احسان بنانے کے لئے کافی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم میں سے اکثر کی خوشی جہانتک اس کا تعلق دوسروں سے وابستہ ہے ان کے ہمارے ساتھ برتاؤ ان کی نگاہ، ان کی آواز اور ان کی ظاہر دوستی کی حدتک منحصر ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ ہم ان سے نہیں چاہتے۔ اور ہماری طمانیت اور ہماری خوشی کا بھی اسی پر دارومدار ہے کہ ہم دوسروں کے ساتھ شیریں کلامی سے پیش آئیں۔ جزئیات کی طرف توجہ کریں اور معمولی سے معمولی امور کی بجا آوری میں حصہ لیں جنہیں کرنے کے بعد ہمیں کہنے کو شرم آئے۔ ورڈزورتھ کہتا ہے چھوٹا کام حقیقی کام ہے جب تک وہ رہتا ہے یہی چھوٹے کام دوستوں کو اتحاد کی رسی میں جکڑ دیتے اور محبت کو ہمیشہ تازہ رکھتے ہیں۔ ورڈزورتھ کہتا ہے:

ایک نیک آدمی کی زندگی کا بہترین حصہ وہ ہے جو معمولی بے نام فراموش شدہ محبت اور مہربانی کے کاموں پر مشتمل ہو۔

اکثر لوگ اپنی بے بضاعتی سے پریشان رہتے ہیں۔ وہ بڑے کام کرنا چاہتے ہیں لیکن روزانہ معمولی فرائض ان کا تمام وقت لے لیتے ہیں۔ اور جس بڑی ضروری چیز کو نظر انداز کیا جاتا ہے وہ صداقت ہے۔ صداقت کا اظہار ادنی اور اعلی کام میں ہوسکتا ہے اور معمولی سی معمولی اور حقیر سی حقیر زندگی کو بھی محنت، استقلال، صبر کے ذریعہ اعلی بنایا جاسکتا ہے۔ دنیا میں بڑے سے بڑے آدمیوں کو بڑے کاموں کی انجام دہی کے لئے یا چھوٹے کاموں کی انجام دہی کے لئے چھوٹے آدمیوں کی ضرورت نہیں بلکہ ضرورت ہے بڑے آدمیوں کی جو عالی ظرفی کے ساتھ چھوٹے کام کریں جو یہ ثابت کر دکھائیں کہ کس قدر عزت، نیکی اور مسرت روزمرہ معمولی کام کی ادائی میں ہوسکتی ہے جن کے صباح الخیر سے ہم خوش ہوں۔ اور جس کی الوداع سے ہمیں امن کی بارش میسر ہو۔ جن کی روزانہ زندگی میں محبت، ثبات قدم اور امن کا جلوہ نظر آئے۔ اے دوست، زندگی کے گمنام گوشے میں

ثبات قدم کے ساتھ مقابلہ کر خود اپنے ساتھ اور اپنی بے چینی اور مخالف کے ساتھ کر اور اپنے نصیب پر شاکر رہ۔ یہ صحیح ہو کہ تجھے اپنے نصیب پر اختیار نہیں لیکن تو اپنے سپرد کردہ کام کو حسن طریق انجام دینے پر تو قادر ہے۔ پس انجام دو کہ انسانی زندگی کا اصل اصول وفاداری ہے جس پر کاربند ہونے سے تو اہل قابلیت کا مالک ہو جاتا ہے جو زندگی میں لازوال اور موت کے بعد لافانی رہتی ہے۔ حضرت عیسیٰ کا قول ہے وہ شخص جو چھوٹے سے کام میں اپنی صداقت کا ثبوت دیتا ہے وہ بڑے کام میں بھی دے سکتا ہے یہ وہ زبردست قول ہے جس نے دنیا کے معیار اور دنیا کے اخلاق زیروزبر کر دیئے یہی ایک قول ہے ان کو ہر دل عزیز بنانے کے لئے کافی ہے۔ کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دلوں کو دیکھتے تھے اور لوگوں کی موجودہ حالت کے لحاظ سے رائے قایم کرتے تھے نہ کہ ان کی قوت قابلیت کے اعتبار سے۔

دوسری خوبی جس کی ضرورت ہم کو دوسروں کے ساتھ روزانہ تعلقات میں پڑتی ہے وہ اپنے قصور کا اعتراف ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہم آپ کو دوسروں کی اور خود اپنی نگاہ میں تذلیل کرنا نہیں چاہتے اس سے زیادہ بری بات ہمارے لئے نہیں ہو سکتی۔ اور اس لئے اس سے بڑھکر اصلی اخلاقی تجربہ نہیں ہو سکتا کہ ہم اعتراف قصور کریں اور ہمارا اعتراف قصور مجبوری کے تحت ہو۔ اعتراف قصور نام ہے اپنی آپ سرزنش کا اور اس کے لئے احساس ضروری ہے۔ اکثر لوگ جب برا کام کرتے ہیں تو جانتے ہیں کہ برا کام ہے لیکن اس پر وہ نادم نہیں ہوتے اور اس کا اعتراف نہیں کرتے اور اگر کرتے بھی ہیں تو اس وقت جبکہ احساس ندامت کم ہو جائے اور اعتراف کی اصل خوبی باقی نہ رہے۔ انجیل کا یہ فقرہ کس قدر پر اثر ہے تمہارا غصہ غروب آفتاب سے پہلے ہی فرو ہو جائے۔ ہماری زندگی کا ہر روز اپنے لحاظ سے مکمل ہے جس میں کوئی برائی نہ ہونی چاہیئے جو دن کے ختم ہونے سے پہلے عرق انفعال سے نہ دھوئی جائے۔ اگر ہم مان لیں کہ اعتراف طفلانہ حرکت ہے تو کون ایسا شخص ہے جو نہیں چاہتا کہ اس کا دل معصوم بچے کا اور اس کے عادات معصوم بچے کی نہ ہوں جو حضرت عیسیٰ یا کسی برگزیدہ بزرگ یا اعلیٰ ترین تصویر تصور کے آگے، جو اس کی بپتا سننے کے لئے کان دھرے ہوئے ہے۔ اپنے رنج والم اور گناہ کا اعتراف کرنا چاہیئے گا لیکن بڑے اور بچے میں فرق صرف اس قدر ہونا چاہیئے کہ بچہ اپنے باپ یا اپنی ماں کے آگے اعتراف کرتا ہے تو بڑا خود اپنے آگے آپ کرے۔ بڑا آدمی بڑا اس لئے ہے کہ وہ خود مجرم ہے اور خود حاکم۔ بچہ اپنے والدین کے آگے شرمسار اس وقت تک نہیں ہوتا جس وقت تک وہ اس کے ضمیر کو بیدار

نہ کریں۔ بڑا آدمی اسی وقت بڑا کہلائے جانے کا مستحق ہو سکتا ہے جب کہ اس کا ضمیر خود بیدار رہے۔
کیا اپنے افعال کا آپ فیصلہ کرنا ناممکن یا دشوار کام ہے؟ ناممکن تو نہیں البتہ دشوار ضرور ہے۔ میرا خیال ہے کہ آدمی اپنے افعال پر ایسی ہی نگرانی کرسکتا ہے جیسا کہ خدا یا ملائکہ۔ اور اپنے حق میں ایسی ہی بے لوثی اور اپنے مطالبات کو ایسے ہی ارفع اور اپنی خطاؤں پر ایسی ہی سرزنش کرسکتا ہے جیسی خدا یا ملائکہ سے توقع ہو سکتی ہے۔ ہر شخص کا دل ایک خدا ہے اور یہ ہمارا کام ہے کہ اس کی سنیں اور عمل کریں اور جب تک کہ ہم ایسا نہ کریں ہماری ہستی کا اصل منشا ہم سے دور رہے گا۔
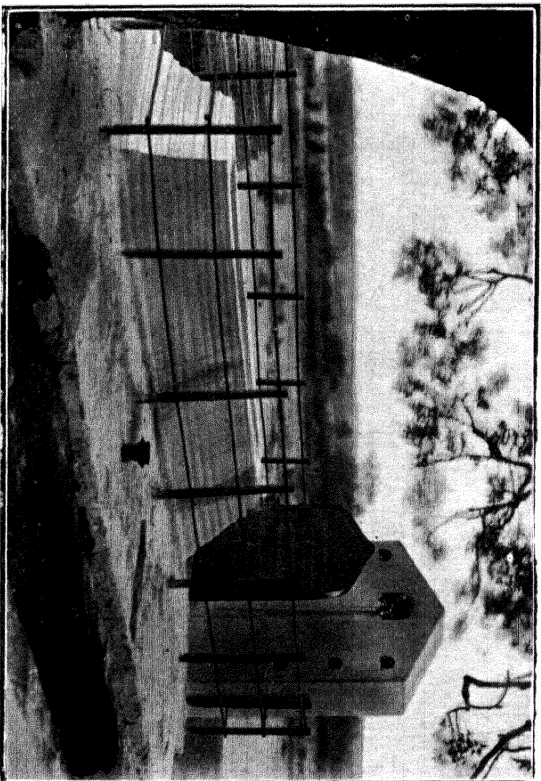
قبر خواجہ محمود گاوان

خواجہ محمود گاواں کا قتل

جناب سید بادشاہ حسن صاحب حیدرآبادی

خواجہ عماد الدین المعروف بہ محمود گاواں سلاطین بہمنیہ کا نامور وزیر گزرا ہے۔ اس کے کارنامے تاریخ فرشتہ، مآثر برہانی اور کرنل میڈوز ٹیلر کی وجہ سے زبان زد خاص و عام ہیں۔ اکثر مورخین میڈوز ٹیلر کی اس رائے سے متفق ہیں کہ "خواجہ سلطنت بہمنیہ کا مہر تاباں تھا۔ اس کے زوال سے سلاطین بہمنیہ کی دنیا تیرہ و تار ہو گئی۔" سرخ زمین بیدر آج بھی خواجہ کے خون ناحق کی یاد تازہ کر رہی ہے۔ اسی عبرت کدہ کی سرخی ہمارے اس مضمون کی محرک ہے۔

جب عماد الدین کو خواجہ جہاں کا خطاب ملا تو درباریوں میں ہر طرف خوشی کا غلغلہ اور تہنیت کا شور بلند تھا، اور خواجہ خود بھی اس الطاف خسروانہ اور عنایت شاہانہ سے سرخرو تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم کھیل رہا تھا۔ لیکن خدا معلوم کیوں دل اندر ہی اندر بیٹھا جا رہا تھا کہ یکایک ہاتف غیبی کی یہ صدا کان میں آئی:

"سلطان عماد الدین بن احمد شاہ بہمنی کے زمانہ میں یہ خطاب خواجہ مظفر علی کو ملا تھا جو چند ہی روز بعد شہزادہ محمد خاں کے ظالم ہاتوں سے بیگناہ قتل ہوا۔ اس کے بعد ایک ترک نژاد نے خواجہ جہاں کا خطاب پایا۔ اس کا انجام بھی حسرتناک ہوا۔ اے خواجہ! دیکھ کہ اب تیرا کیا حال ہوتا ہے!"

خواجہ گھر واپس ہوا تو ملول اور دل گرفتہ تھا۔ رہ رہ کے یہی الفاظ اس کے دماغ میں چکر لگاتے۔ ساتھ ہی دل دھڑکنے لگتا اور خوفناک اندیشے پردۂ تخیل پر سینما کی متحرک تصویروں کی طرح تیزی کے ساتھ گزرتے۔ کبھی گھبرا کر آنکھیں بند کر لیتا لیکن دیدۂ تصور پر قابو نہ ہونے سے مجبور تھا۔ آخر ایک مرتبہ آرزو کی چوٹی سے تنہائی کی سہمی صدا نیچے سروں میں اس کے کان میں آئی، یہ ملکۂ امید کا جانفزا نغمہ تھا۔ خوفناک اندیشوں اور امید کے روح پرور سروں میں ایک کشمکش برپا ہوئی۔ بڑی دیر بعد خواجہ نے محسوس کیا کہ امید نے فتح پائی، فوراً ہی اس کے دل نے ملامت کی "پیش از مرگ واویلا" سے کیا فائدہ۔ وہم و گمان اور اندیشے

یہ سب فضول اور لغو ہیں۔

ایک عرصہ گزر گیا اور خواجہ پر کوئی آنچ نہ آئی۔ اس کا رسوخ بھی اب کافور ہو گیا۔ بادشاہ برائے نام تھا خواجہ امور سلطنت میں جزو کل کا مختار اور سفید و سیاہ کا مالک تھا، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ رتبہ اس کی ذات کے لئے باعث فخر تھا لیکن دوسرے عہدہ داروں کے لئے موجب حسد ہوا بعضوں کی تحقیق میں حسد ہی کا نام شیطان ہے اور بعض اس کو ایک ایسی وبا سمجھتے ہیں جس سے آنکھوں کا نور سلب اور دل سیاہ ہو جاتا ہے جو کچھ بھی ہو بلائے بد ضرور ہے۔ اراکین دربار جن کی آنکھیں روزآنہ چار ہوتی تھیں اب اس کی اقبال مندی کو دیکھ نہ سکے۔ دوسرے اہم عہدہ دار بھی آپس میں کانا پھوسی کرنے لگے۔

اس کے علاوہ خواجہ کی اصلاحات نے بعض خود پسندوں اور خود غرضوں کے سینے میں دشمنی کی آگ روشن کر دی کیونکہ اس کا مقصد خود سروں کی طاقت توڑنا، مغروروں کا سر جھکانا اور اہم عہدہ داروں پر سخت ترین نگرانی رکھنا تھا منجملہ ان اصلاحات کے خواجہ نے تلنگانہ کا صوبہ دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک ایک نظام الملک کے تفویض ہوا اور دوسرا اعظم خاں کو ملا اس سے پہلے پورا تلنگانہ نظام الملک ہی کے قبضہ میں تھا۔ اپنی طاقت یوں ٹوٹتی دیکھکر اس کی آنکھوں میں انتقام کی آگ بھڑکنے لگی، نظام الملک بھی اک گرگ باراں دیدہ تھا اس نے دشمن کی تاک میں کمین گاہ میں چھپے رہنے کی ٹھان لی اور محمد شاہ سے عرض کیا "خانہ زاد حضور اقدس و اعلیٰ کے قدوم میمنت لزوم سے جدا ہونا نہیں چاہتا۔ سرحدی مہموں کے لئے بندہ زادہ کافی ہے۔

بادشاہ نے درخواست منظور کر لی، یکسوئی پاکر نظام الملک نے سازشوں کا جال پھیلانا شروع کیا۔ ظریف الملک اور مفتاح حبشی سے جو بادشاہ کے مقرب تھے، اتحاد پیدا کیا۔ انہوں نے غلامانِ شاہی کو جن پر بادشاہ کی نظر التفات تھی سمجھا دیا کہ کبھی کبھی موقع پاکر خواجہ کے خلاف کان بھریں، اس کے علاوہ ان لوگوں نے ایک اور چال چلی وہ یہ کہ خواجہ کے ایک غلام سے جس کے یہاں مہر رہتی تھی میل جول بڑھایا اور زر و جواہر سے زیر بار منت کیا، ایک روز خواجہ کی عدم موجودگی میں صحبت شراب گرم ہوئی۔ جب خواجہ کا غلام نشہ میں چور ہو گیا تو مفتاح حبشی سفید کاغذ جیب سے نکالکر کہنے لگا کہ یہ ہمارے فلاں دوست کی برأت ہے، اکثر عہدہ داروں کی مہریں اس پر ثبت ہیں لیکن کیا ہی اچھا ہوتا جو خواجہ جہاں کی مہر بھی لگ جاتی۔ یہ سنکر غلام مدہوشی کے عالم میں جھومتا ہوا اٹھا اور یہ کہتے ہوئے "کون بڑی بات ہے" بغیر سوچے سمجھے خواجہ کی مہر ثبت کر دی۔

ظریف الملک اور مفتاح حبشی نے جب دیکھا کہ چال چل گئی تو وہ دوڑے ہوئے نظام الملک کے یہاں گئے اور اس کے مشورہ سے اس کاغذ پر حسب ذیل خط رائے اڑیسہ کے نام لکھا۔

"محمد شاہ کی شراب خواری اور ظلم نے ہم سب کو متنفر کر دیا ہے، دیکھئے دکھن فتح کرنے کا اس سے اچھا موقع آپ کو نہ ملے گا، کیونکہ سرحد پر کوئی ہوشیار افسر نہیں ہے۔ رہا دار السلطنت کے امرا تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ان پر میرا کتنا اثر ہے، آپ کے آنے کے بعد ہم سب متحد ہو کر علم بغاوت بلند کر دیں گے ...... لیکن شرط یہ ہے کہ فتح کے بعد آدھی سلطنت آپ کو اور آدھی ہماری"

جب یہ کارستانی ہو چکی تو ظریف الملک اور مفتاح حبشی دربار میں ایسے وقت حاضر ہوئے جب کہ نظام الملک بھی باریاب تھا موقع پا کر انہوں نے یہ جعلی خط بادشاہ کے آگے گزرانا۔ محمد شاہ اس کے دیکھتے ہی لال پیلا ہو گیا۔ مارے غصہ کے آنکھوں سے چنگاریاں اڑ رہی تھیں، اس وقت دربار میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو ایک لفظ بھی خواجہ کی تائید میں کہکر بادشاہ کو سنبھالتا کیونکہ یوسف عادل خاں اور دوسرے حضور رس خواجہ کے خیر خواہ بیجانگر کی مہم پر روانہ ہو چکے تھے۔ ملکہ مخدومہ جہاں بھی جو خواجہ کی طرفدار تھی فوت ہو چکی تھی۔ ایسے وقت پر نظام الملک نے چنگاریوں پر تیل چھڑکا اور وہ شعلوں کی صورت میں بھڑک اوٹھیں۔ محمد شاہ نے آپے سے باہر ہو کر خواجہ کو فوراً طلب کیا۔

خواجہ کے رفیقوں نے مشورہ دیا کہ آج کسی طرح دربار نہ جائیے۔ لیکن وہ اپنی بے گناہی کے نشہ میں ایسا چور تھا کہ کسی کی بات نہ سنی اور یہ شعر پڑھتا ہوا چلدیا ؎

چوں شہید عشق در دنیا و عقبیٰ سرخروست — خوش دمے باشد کہ ما را کشتہ زیں میداں برند

"مآثر رحمانی" میں لکھا ہے کہ جب خواجہ گھوڑے پر سوار ہو رہا تھا تو ایک نجومی آگے بڑھا اور دست بستہ عرض کیا "سرکار آج دربار تشریف نہ لیجائیں۔ کسی نہ کسی طرح ٹالدیں۔ ستارے گردش میں ہیں خدا معلوم کون سی بلا سر پر پڑے" مگر خواجہ نے جوش میں آکر جواب دیا "یہ بال جو محمد شاہ کے باپ ہمایوں شاہ کی خدمت گزاری میں سفید ہوئے ہیں اگر محمد شاہ کی بدولت خون کے خضاب سے رنگے جائیں تو باعث سرخروئی ہے۔ مقدر میں جو ہونا ہے وہ ہو کر رہیگا۔"

چند بڑے بڑے امرا نے جو بادشاہ کی تیکھی چتون سے ہونے والا حادثہ تاڑ گئے تھے خواجہ کے یہاں کہلا بھیجا کہ اگر ارشاد ہو تو ہم معہ ہزار سوار جناب کو گجرات تک بخیر و عافیت پہنچانے کے لیئے حاضر ہیں۔ لیکن خواجہ جہاں نے فرار ہونا بزدلی سمجھکر انکار کیا اور جواب دیا "مجھکو اس سرکار ابد پائدار کی خدمت میں برسوں گذر گئے۔ کبھی حضور پرنور نے غضب کا برتاؤ نہیں کیا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ جہاں پناہ فقط میرے

دشمنوں کے تہمت باندھنے پر بلا تحقیق و دریافت میری دغا بازی کا یقین کرلیں۔ اور اگر بالفرض ایسا کیا بھی تو غصہ کو برداشت کرنا اس آخری وقت میں نمک حرامی کرنے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔"

دربار میں پہنچا تو بادشاہ نے پوچھا " اگر کوئی شخص اپنے آقا کے ساتھ نمک حرامی کرے تو اس کی کیا سزا ہے؟"

" اگر یا یہ ثبوت کو پہونچ جائے تو اس بدبخت کو تلوار کے گھاٹ اوتارنا چاہیئے"۔ خواجہ نے جواب دیا۔ یہ سنا بادشاہ نے وہ خط دکھلایا۔ خط دیکھتے ہی خواجہ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اور سر چکرا گیا۔ یہ آیت تلاوت کی " سبحانک ھٰذا بھتان عظیم ...... الخ" اور کہا۔

بخدائے کہ جوہر امرش | اہل معنی بخون دل سفتند
کہ چو بہتان یوسف و گرگ است | آنچہ از بندہ دشمنان گفتند

محمد شاہ اول تو شراب سے گرم ہو رہا تھا تو پھر غصہ کی آگ نے اور بھی بدحواس کر دیا۔ جوہر نامی غلام کو حکم دیا کہ خواجہ قتل کر دیا جائے اور خود اٹھکر محل سرا کی طرف چلا۔ خواجہ بیچارہ کہتا ہی رہا کہ " غلام تو عمر طبعی کو پہونچ چکا ہے۔ آج قتل نہ ہوا تو کل مرجائیگا لیکن خیال رکھیئے بندہ کا بے گناہ قتل۔ ملک کی تباہی و خرابی کا باعث ہوگا۔" لیکن بادشاہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ خواجہ قبلہ رو دوزانو ہو بیٹھا اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھا۔ جوہر تو اشارے کا منتظر تھا۔ چشم زدن میں تلوار سر پر چمکی تو کہا " الحمد للہ علیٰ نعمۃ الشھادۃ " اور بس ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ تو ۹۔ صفر ۱۱۶۳ھ ہجری مطابق ۱۴ اپریل ۱۷۵۱ء عیسوی کا حادثہ جانکاہ تھا جبکہ اس کی عمر بہتّر سال تھی۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ خواجہ جہاں نے مرنے سے دس برس پہلے محمد شاہ کی مدح میں جو قصیدہ کہا تھا اس میں یہی دو بیت ہیں۔

شد شکل ضرب تیغت بر دوش جاں حائل | ہیکل ز حرز سیفی و آنگہ ہراس ایدل
تیغ تو آب حیواں مردم ز حسرت آں | آرے بعہد من شد آب حیات قاتل

ملا عبدالکریم ہمدانی مؤلف تاریخ محمود شاہی نے جو خواجہ کے شاگردوں میں بلکہ مریدوں میں سے تھا۔ دو تاریخیں نکالی ہیں۔

قطعہ

شہید بیگناہ مخدوم مطلق — کہ عالم را ز جودش بود رونق
وگر خواہی تو تاریخ وفاتش — فرو خواں قصۂ قتل بناحق

(۸۸۶ھ)

بیت

سال فوتش گر کسے پرسد بگوے — بیگناہ محمود گاواں شد شہید
۸۸۶ھ

اور ملّا سامعی نے جو اس کا قدیم اور ملازم تھا یہ تاریخ کہی :۔

قطعہ

چوں خواجہ جہاں راہرگز حرام خواری — در دل نبود میکرد پیوستہ جانسپاری
گشت او شہید مغفور اے سامعی بتحقیق — تاریخ کشتن او جو از حلال خواری

محمد شاہ کا غصہ ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا بلکہ اعلان کیا کہ سوائے شاہی ساز و سامان کے باقی سب خواجہ جہاں کا مال و اسباب لوٹ لیا جائے۔ اس خبر سے خواجہ کے رفیقوں میں ایک تہلکہ پڑ گیا۔ اور اُنھوں نے اپنی جانوں پر کھیل کر خواجہ کے محل کی نگرانی کرنے کا عہد کیا۔ لیکن بادشاہ کی فوج نے انھیں زبردستی منتشر کر دیا۔ بعض یوسف عادل خاں کو اُبھارنے کی نیت سے روانہ ہوئے مگر قسمت سے مقابلہ بے سود ہوا آخر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ وہی لوگ جو کل تک خواجہ کے آگے سر جھکاتے تھے آج اسی کا اسباب مال غنیمت سمجھکر لوٹ رہے ہیں۔ جب لوٹ کھسوٹ ختم ہوئی تو بادشاہ نے نوکروں کو حکم دیا کہ خواجہ جہاں کا نقد اندوختہ حاضر کریں۔ تعجب کی جگہ ہے کہ وہ وزیر جس کے ہاتھ میں خزانۂ شاہی کی کنجیاں تھیں۔ صرف تین سو لاری (اس زمانہ کا چاندی کا سکہ) چھوڑ گیا۔ البتہ ساڑھے تین ہزار کتابوں کا ذخیرہ پبلک کیلئے وقف کر چکا تھا۔

یہ دیکھکر بادشاہ کی آنکھیں کھلیں اور نشہ ہرن ہوا۔ اُسے افسوس ہونے لگا کہ اس کے ناحق شناس ہاتھوں نے ایک اہل اللہ کی جان لی۔ حکم دیا کہ تابوت عزت و احترام کے ساتھ بیدر کو روانہ کیا جائے۔ ایک تالاب کے کنارے جس کو خواجہ ہی نے رفاہ عام کی غرض سے بنوایا تھا عالیشان مقبرہ میں دفن کر دیا گیا۔

خواجہ جہاں کی یادگار مدرسۂ محمودیہ اور اس کی گراں قدر تصانیف ہیں۔

اس نے بیدر میں ایک نہایت عالیشان مدرسہ ۸۷۶ھ میں تعمیر کروایا۔ اس کا طول شرقاً و غرباً (۰ ۲ ۲) اور عرض شمالاً و جنوباً (۵ ۰ ۲) گز ہے۔ مدرسہ کے سامنے دو بلند منار تھے جن میں سے ایک اب بھی موجود ہے جو تقریباً ۱۰۰ فیٹ بلند ہے۔ اس پر سبز و زرد زمین پر سفید حرفوں میں کلام اللہ کی آیتیں لکھی ہوئی ہیں۔ صحن میں مسجد تھی اور چاروں طرف علما، فضلا۔ اور طلبا کے رہنے کے لئے کمرے تھے۔ اسلامی طریقہ کے موافق ایک مقررہ رقم اس کے مصارف کے لئے وقف تھی۔ جس سے اکثر لوگوں کو کھانا اور کپڑا مفت دیا جاتا تھا۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں اس کا ایک حصہ بارود خانہ بنایا گیا لیکن ۱۱ ہر رمضان ۱۰۰۷ھ کو بجلی گری اور آتشزدگی سے بہت سا حصہ منہدم ہوگیا۔"

خواجہ کی تصانیف میں بقول فرشتہ کے دو کتابیں مشہور ہیں۔ ایک روضۃ الانشار۔ اور دوسری دیوان۔ بعض مورخین نے روضۃ الانشار کا نام مناظر الانشاء بتایا ہے۔ بہر صورت یہ یقینی ہے کہ ایک کتاب فن انشار سے متعلق ہے۔" اس میں ایک مقدمہ۔ دو مقالے۔ اور ایک خاتمہ ہے۔ مقدمہ میں اہل انشار کے طریقہ پر کلام کی تقسیم کی ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ کن شرائط سے کلمات کا استعمال کرنا چاہیئے۔ دوسرے مقالہ میں اقسام و ارکان و شرائط مکاتیب کی بیان کی ہیں۔ اور خاتمہ میں خط کی ماہیت اور ضوابط کا ذکر ہے۔"

خواجہ کا دیوان جو غزلیات۔ اور قصائد پر مبنی تھا چاہ گمنامی میں غرق ہوگیا۔ لیکن بعض پرانی تاریخوں میں اس کے دو چار قصیدے، رباعیات۔ اور قطعے، مل جاتے ہیں۔ نمونہ کے طور پر ہم ایک رباعی۔ ایک قطعہ۔ اور قصیدے کے چند شعر نقل کرتے ہیں:۔

رباعی

چو بشنوی سخن من اگر بفعل آری ‌‌‌ کلید گنج سعادت در آستین آری
وگر تو از نصیحت بدرنج دل نہی ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ بسے خوری زکف دہر سیلی خواری

قطعہ

فضل و علم نقص و عیب از شد بہ ہندوستاں چہ باک ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ زانکہ ایں جا بود و باشد فضل فضلہ علم عار
از بیاض لوح ہستی محو باد تا ابد ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ صورت ما ہیئت زشت سواد ایں دیار

قصیدہ

اے مہر بے زوال توام طالع از ازل ... یا مہر انجنیں عنسم از ظلمت اجل

کے لائق عروض زوال است سرعشق ... مافی الازل چگونہ بود غیر لم یزل

برصورتیکہ عقل تصور کند زحسن ... باشد بہ نزد معنی حسن تو مبتذل

ان کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ زمانہ کی رفتار کے مطابق صنائع و بدائع لفظی و معنوی اور الفاظ کی بندش کی طرف اس کی خاص توجہ تھی لیکن بعض بعض جگہ دنیاوی تجربے۔ حکیمانہ نصیحتیں اور لطیف نکتے بھی دکھائی دیتے ہیں۔

خواجہ جہاں کی علم دوستی دکن یا ہند تک ہی محدود نہ تھی بلکہ عراق و خراسان تک چرچا تھا مشہور شاعر ملا عبدالرحمٰن جامیؒ سے بے حد خلوص تھا۔ انشاء جامی میں ایک خط خواجہ جہاں کے نام موجود ہے۔ جس کے ذریعہ سے جامی نے اپنی ایک تصنیف خواجہ کے تذکر رانی تھی۔

خواجہ نے جامی کو بیدر آنے کی دعوت دی تھی۔ جس کے جواب میں جامی نے معذرت کے ساتھ ایک قصیدہ روانہ کیا۔ جس کا مطلع یہ ہے۔

مرحبا ای قاصد ملک معانی مرحبا ... الصلا کز جان و دل نذر تو کردم مرحبا

رباعیات

از

جناب قتیل حیدرآبادی

میرا دل زار لے کے جانے والے ... ساتھ اپنا شکار لے کے جانے والے

پائے نہ قرار تو بھی اللہ کرے ... او صبر و قرار لے کے جانے والے

گھر ہے ترا اے آئینہ رو آنکھوں میں ... کرتا ہوں میں تیری جستجو آنکھوں میں

پردے میری آنکھوں کے ہیں گویا پردے ... آنکھیں تجھے ڈھونڈتی ہیں تو آنکھوں میں

پندارِ غلط

از

جناب سید علی اختر صاحب اختر

کس درجہ بے خبر ہے، ظاہر پرست دنیا، اُس اشک غم سے اختر جو دل میں چھپ رہا ہو!

محرومیوں کے نالے ہیں، رہبر تبسم! ویرانیوں میں جیسے شیطاں کا قہقہا ہو

ہیہات! ابن آدم، نازِ جمالِ فطرت باطل پہ جان دیدے، صنعت پہ مٹ رہا ہو!

حوا کی بیٹیاں ہوں، مردانگی پہ مائل فردوس کی تجلی، ظلمت سے آشنا ہو!

شہرت کی وادیوں میں، بھٹکے ضمیرِ انساں پیمانۂ صداقت، صرف مئے ریا ہو!

بجائے نقشِ باطل ہر سرمدی حقیقت تکمیل زندگانی، بازیچۂ فنا ہو

طوفان کشمکش ہو، خوابِ سکوں میں غافل نذرِ جمود مطلق، بحر خود آزما ہو!

آئین زندگی کے اجزا بکھر رہے ہوں رفتارِ نبض دوراں، وقفِ رہِ خطا ہو!

وہ دل کہ دردِ تنہا ہے کائنات جس کی آہوں پہ مسکرائے، عشرت گہِ جفا ہو!

اختر خموش، دنیا، اُس کی ہے جو سخنگو

رازِ قبول جانے، شہرت سے آشنا ہو

واسدیو گوبند آپٹے

ادب کے مختلف شعبوں میں بچوں کے ادب کا درجہ کچھ کم اہم نہیں ہے۔ بچوں کے ادب کے قلمبند کرنے کا کام نہایت ذمہ دارانہ ہے۔ کیونکہ بچہ ہی بنی نوع انسان کا باپ ہے۔ وہی ہمارے طرز نو و اداکے ملک کا شہری ، حاکم اور رہنما ہے۔ اگر اس کے پڑھنے کے لائق لٹریچر پیدا کرنا بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ بچوں کا لٹریچر ایسا ہونا چاہیئے جو چھوٹے چھوٹے کم عقل بچوں کی سمجھ میں آسانی سے آجائے۔ وہ ایسا دلچسپ ہونا چاہیئے۔ جن سے لڑکے لڑکیاں خود بخود اس کی طرف مائل و متوجہ ہوں۔ ساتھ ہی اس میں ایسا مواد ہونا چاہیئے ہے جو ان لڑکے لڑکیوں کی زندگی میں ممد ومعاون ہو کر انھیں بہترین شہری بنا سکے۔

مرہٹی زبان کے اس دور جدید میں " واسدیو گوبند آپٹے " انجہانی بچوں کا ادب قلمبند کرنے میں بہت کامیاب ہوئے ہیں۔ آپ کی ولادت ۱۸۷۱ء میں صوبہ بمبئی کے ضلع خاندیس مشرق کے " دھرن گاؤں " نامی مقام پر ایک کوکنی برہمن کے خاندان میں ہوئی تھی۔ آپ کے والد کا نام گوبند راؤ اور ماں کا نام رادھا بائی تھا۔ واسدیو راؤ کی پیدائش کے وقت آپ کے والد دھرن گاؤں میں پولیس کے محکمہ میں ملازم تھے۔ خاندان بڑا ہونے سے ان کی معاشی حالت معمولی تھی۔ کچھ عرصہ بعد گوبند راؤ کی اچانک موت کے باعث واسدیو راؤ کا بچپن اور تعلیم و تربیت کا زمانہ تکلیف سے گزرا۔ آپ کی والدہ بڑی دیندار، راسخ الاعتقاد اور صابر خاتون تھیں۔ اُنھوں نے اس تکلیف کی حالت میں بھی کئی مشکلات کا مقابلہ کرکے واسدیو کی پرورش و پرداخت کی اور انھیں بے راہ ہونے نہیں دیا۔ واسدیو راؤ کو لڑکپن ہی سے راماین۔ مہابھارت وغیرہ کتابیں پڑھنے کا چسکا انھیں کی بدولت لگ گیا تھا۔ واسدیو راؤ نے مرہٹی کی ابتدائی تعلیم دھرن گاؤں میں ہی ختم کی۔ بعد ازاں انگریزی پڑھنے کے لئے " دھلیہ " (دھلیاں) گئے دھلیاں میں چند سال تعلیم پاکر اندور گئے۔ وہاں آپ ۱۸۹۵ء تک رہے۔ وہیں سے ایف۔ اے کا امتحان

پاس کرکے ۱۹۱۰ء میں ناگپور گئے۔ وہاں آپ نے ہسلاپ کالج سے ۱۹۱۳ء میں بی۔اے کی
ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد آپ اسی کالج میں رفیق (فیلو) بھی ہوگئے۔ اس طرح اپنے بل بوتے پر
تعلیم ختم کرچکنے کے بعد آپ کو تنگیٔ معیشت ہوئی۔ ناگپور میں ایک سال تک رہنے کے بعد آپ پونا گئے
اور وہاں کے مشہور "نوتن مراٹھی ودیالہ" میں مدرس ہوگئے۔ اس مدرسہ میں چار برس تک کام کیا۔
اس اثنا میں آپ اپنی خاموش اور ملنسار خصلت اور تعلیمی سلیقہ کی بدولت ہردلعزیز ہوگئے۔ بدقسمتی
سے آپ اس زمانے میں ضعف معدہ کے مرض میں مبتلا ہوگئے۔ جس کا انجام یہ ہوا کہ آپ پونا
چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ اس مرض نے آپ کا اس قدر پیچھا کیا کہ اس کی وجہ سے آپ کو مرتے
دم تک پریشان ہونا پڑا۔ ۱۹۱۸ء میں آپ پونا چھوڑ کر بمبئی آئے۔ یہاں آپ کو REPOTER ON THE (NATIVE PRESS
کی دفتری جگہ ملی۔ لیکن آپ وہاں ٹک نہ سکے۔ اپنی سخت اور تیز مزاجی کی بدولت حکام سے اَن بن
ہوگئی۔ بالآخر نوکری چھوڑ دینی پڑی۔ اس ملازمت کے زمانہ میں آپ نے "اشوک چرتر" نام
کتاب کا مواد جمع کرکے اس کو شائع کرایا۔ اس کتاب کے ذریعہ آپؒ نے میدان ادب میں قدم
رکھا۔ گو اس کتاب کی ایک رسالے کی سی حیثیت تھی۔ تاہم اُس وقت اس کی بڑی شہرت ہوئی
مراٹھی میں مہاراجہ اشوک کی یہ پہلی سوانح عمری تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس رسالہ کی بہت قدر ہوئی اور بڑے بڑے
علماء نے اس کی تعریف کی تقریباً (۲۰) برس کے بعد ۱۹۲۹ء میں آپ نے اس میں ترمیم واضافہ کرکے
اس کا دوسرا ایڈیشن نکالا۔ اس اثنا میں آپ لائف کے لئے تھوڑا تھوڑا مواد جمع کرتے رہے۔
افسوس ہے کہ اس (۲۰) سال کی وسیع مدت میں بھی کسی دوسرے مصنف نے مہاراجہ اشوک
کی سیرت پر قلم نہیں اُٹھایا۔ اور آج بھی 'اشوک چرتر' کے لئے واسدیو راؤ ہی کی کتاب پر نظر
پڑتی ہیں۔ پھر کچھ دنوں بعد واسدیو راؤ کو اندور کے راجہ شیواجی ہولکر کی راجکماری کی
اتالیقی کی خدمت عطا ہوئی۔ اس وقت راجکماری الہ آباد میں رہتی تھیں۔ اب اس خدمت پر کام
کرتے ہوئے آپ کو کافی فرصت ملنے لگی۔ آپ راجکماری کو دو تین گھنٹے تعلیم دیتے اور باقی وقت
تصنیف و تالیف میں صرف کرتے۔ ایک مرتبہ مشہور انگریز ناول نگار مسٹر ہنری وڈ کا ایسٹ لین EAST
LYNNE نامی عمدہ ناول پڑھتے وقت وہ کہنے لگیں "ناول اتنا اعلیٰ ہے کہ اس کا اصل کے مطابق مراٹھی
میں چربہ اُتارنا ناممکن سا ہے" راجکماری کی یہ خام خیالی سادگی پر محمول تھی۔ مگر واسدیو راؤ نے یہ

گہرا اثر پڑا۔ آپ اپنے دل میں سوچنے لگے۔ کیا سچ مچ مرہٹی زبان کے الفاظ کا ذخیرہ اس قدر کم مایہ ہے کہ اس میں اس ناول کے اصل محاسن قائم رکھنے کی قابلیت نہیں ہے؟ آخر بہت سوچ بچار کے بعد خود ہی اس ناول کا ترجمہ کرنا شروع کیا اور اس کو تھوڑے دنوں میں ختم بھی کر دیا۔ راجکماری کو اس بات کا کچھ علم نہ تھا۔ بعد میں جب اس انگریزی ناول کی پڑھائی ختم ہوگئی۔ تب آپ نے اپنا مرہٹی مخطوطہ راجکماری کو پڑھنے کے لیئے دیا۔ راجکماری نے اس کو بڑے شوق سے پڑھا۔ جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ وہ "دا ایسٹ لین" کا ہی مرہٹی ترجمہ ہے تو وہ دنگ رہ گئیں۔ اور واسدیو راؤ کے طرز تحریر و انداز بیان کی بڑی تعریف کی۔ یہ ناول بعد میں کاشی ناتھ آنجہانی رگھوناتھ ترکے دفتر منورجن سے (مانک باغ) کے نام سے شائع ہوا۔

الہ آباد کے قیام کے زمانہ میں واسدیو راؤ کا "ماڈرن ریویو" کے مشہور مدیر مسٹر رامانند چٹرجی سے تعارف ہوا۔ موصوف نے "ماڈرن ریویو" کے لیئے مرہٹی کتابوں کی تنقید کا کام آپ ہی کے سپرد کیا۔

اندور میں کچھ دنوں رہنے کے بعد آپ ۱۹۰۵ء میں آپ گوکھلے آنجہانی کی عنایت سے پونا لوٹ آئے اور "سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی" کے "گیان پرکاش" ہفتہ وار اخبار کے مدیر مقرر ہوئے۔ کچھ عرصے بعد آپ نے مرہٹی کے مشہور ناول نگار ہری نارائن آپٹے آنجہانی کی امداد سے اس کو روزانہ کی شکل میں پیش کیا "گیان پرکاش" اعتدال پسند طبقہ کا نامی گرامی پرچہ تھا۔ لیکن واسدیو راؤ اس کی ادارت بڑی آزادی و بے خوفی سے کرتے تھے۔ اُس زمانے کے ہندوستان کے وائسرے لارڈ کرزن کی مُستبدانہ سیاسیات پر آپ نے سخت تبصرہ کیا۔ جس کی وجہ سے آخر میں خود گوکھلے آنجہانی کو آپ کی تنقید و نکتہ چینی کی روک تھام کے لیئے تار کے ذریعہ یہ کہنا پڑا کہ اس طرح کی سخت تنقید رعایا اور سرکار کے خیر خواہوں کے حق میں مضرت رساں ہے۔ اُس زمانے میں جنگ روس و جاپان چھڑی ہوئی تھی۔ اس جنگ میں سوشیا کی بحری لڑائی میں جاپانیوں نے غیر معمولی فتح پائی تھی۔ اس کے اظہار مسرت کے لیئے پونا میں ایک پبلک جلسہ کیا گیا تھا۔ اس جلسے کے وقتی اعلانات پر لوکمان تلک، شیو چپلونکر، کیلکر اور واسدیو راؤ آپٹے صرف ان ہی تین اشخاص کے دستخط تھے۔ گوکھلے آنجہانی اور انکے طبقہ والوں نے اس اعلان پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس مثال سے آپٹے صاحب کی

آزادپسندی کا پتہ چلتا ہے۔ "گیان پرکاش" کی کچھ عرصے تک ادارت کرنے کے بعد آپ کی صحت خراب ہوگئی۔ ساتھ ہی اس زمانے کے سودیشی اور مقاطعی تحریکات کے باعث آپ نے "گیان پرکاش" کی ادارت سے قطع تعلق کیا۔

اس کے بعد آپ پھر پونا گئے "نوتن مرہٹی ودیالیہ" میں مدرس ہوئے اور اس درس گاہ کے دائمی خدمتگزار ہو گئے۔

سنہ ۱۹۰۶ء میں بچوں کے لیے آپ نے "آنند" نامی مشہور مصور ماہوار رسالہ نکالا۔ قبل ازیں مرہٹی میں خاص کر بچوں کے لیے کوئی رسالہ نہیں تھا۔ مرہٹی کے مشہور ادیب اور مصنف ونایک کونڈ دیواوک "بالبودھ" نام کا ایک چھوٹا سا رسالہ نکالتے تھے۔ گو وہ قابلیت کے ساتھ مرتب کیا جاتا تھا۔ تاہم بچوں کے رسالہ کے نقطہ نظر سے وہ ناکامیاب ہی رہا۔ اس میں بچوں کے لیے 'بودھ (علم)' تھا۔ لیکن 'آنند (تفریح)' نہ تھا۔ ان نقائص کو رفع کرنے کے لیے واسدیوراؤ نے اوک صاحب سے جن کو وہ بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اس کے بارے میں توجہ دلائی، لیکن صاحب موصوف نے اپنا پرانا ڈھنگ نہ چھوڑا۔ بالآخر واسدیوراؤ نے اپنے خیالات کے موافق سنہ ۱۹۰۶ء کی جولائی سے (آنند) ماہوار رسالہ نکالنا شروع کیا اور اپنی دلی خواہش کو پورا کیا۔ آپ اس کام میں خوب کامیاب ہوئے۔ آپ کا (آنند) ابتدا ہی سے بچوں میں مقبول ہونے لگا۔ اور لڑکے اسے بڑے شوق سے پڑھنے لگے (آنند) کے نام کے موافق لڑکوں کو اس میں (آنند) حاصل ہوتا تھا۔ اس میں ماتمی گیت، مرگ و وفات کے مضامین، دردناک کہانیاں وغیرہ کے سے اور اس اور منحوس مضامین شائع نہیں ہوتے تھے۔ ایسے مضامین کی اشاعت کے متعلق واسدیوراؤ نے قاعدہ ہی بنالیا تھا۔ رفتہ رفتہ (آنند) کی اشاعت بڑھنے لگی اور بہت جلد اس نے مہاراشٹر کے اعلیٰ رسائل میں ایک اونچی جگہ حاصل کرلی۔

بمبئی اور صوبجات متوسط کے سرکاری تعلیمی اداروں نے اور کچھ دیسی ریاستوں نے اسے مدارس اور کتب خانوں کے لیے منظور کیا۔ اس طرح (آنند) کی دن دونی رات چوگنی ترقی ہونے لگی اور وہ بچوں کا اعلیٰ پرچہ مانا جانے لگا۔ (آنند) کے بعد بیسوں پرچے نکلے، لیکن کوئی بھی اس کے معیار کو نہیں پہنچ سکا۔ یہ سب کا سرتاج بنا رہا۔ (آنند) کے اس عروج و ترقی کا سہرا واسدیوراؤ کے ہی سر ہے

اس کے لیئے آپ کو متعدد تکالیف و مصائب اُٹھانی پڑیں۔ پہلے پانچ سال تک تو آپ کو گھاٹا ہی ہوتا رہا پھر تدریج کچھ نفع ہونے لگا۔ آخر کار "آنند" اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ اس طرح چند سال گذرنے کے بعد "آنند" پر ایک بڑی مصیبت آپڑی۔ ان کے سالانہ چندہ کی رقم حق نمک ہی رہتی تھی۔ اس کا دوالہ نکل گیا! جس سے واسدیو راؤ کو کئی ہزار سے ہاتھ دھونا پڑا۔ لیکن اس خطرناک مصیبت میں بھی آپ نے ہمت نہ ہاری۔ "آنند" کو اسی اُمنگ اور جوش و خروش کے ساتھ چلاتے اور دلچسپ اور مفید مضامین شائع کرتے رہے اور اپنی زندگی ہی میں خاص خاص اشاعتوں مثلاً دسواں انک (دو دسواں انک) (شواجی انک) اور (دیمان انک) کے ذریعہ (آنند) کو مقبول عام و مفید انام بنانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔

سنہ ۱۹۱۳ء میں پھر آپ کی صحت خراب ہو گئی، اور آپ پونا چھوڑ کر اندور چلا گئے۔ اندور جیسے خوب صورت مقام میں رہ کر "آنند" دوسرے مطبع میں چھپواتا اور اس کو خوش اسلوبی سے شائع کرنا دقت طلب سمجھ کر آپ نے اپنا ذاتی مطبع "آنند پریس" قایم کیا اور اس کا انتظام گوپال بلونت جوشی کے سپرد کیا۔ اس وقت سے "آنند" اپنے ذاتی پریس سے شائع ہونے لگا ہے۔ اندور میں پہلے آپ "چندر ادتی ہیلا ودیالیہ" میں مدرس ہوے۔ اس مدرسہ میں کچھ دنوں کام کرنے کے بعد اندور گورنمنٹ نے آپ کو "ملار مارتند" کا مدیر بنایا۔ اس خدمت پر آپ نے تقریباً پانچ چھ سال تک کام کیا۔ ان دنوں ریاست اندور میں مرہٹی کا نام و نشان مٹانے کے لیئے غیر معمولی کوشش کی گئی تھی۔ اس کے خلاف آپ نے صدائے احتجاج بلند کی اور اپنے مقالوں کے ذریعہ بڑے زور و شور سے اس کا چرچا کیا۔ اس طرح آپ نے قیام اندور تک "آنند" اور "ملار مارتند" کے ذریعہ مرہٹی زبان کی کافی خدمت کی۔ پھر حکیموں کے مشورے پر آپ خدمت مذکور سے مستعفی ہو گئے اور سنہ ۱۹۱۹ء میں پونا واپس آئے۔ اس کے بعد آپ پونا ہی میں اقامت گزیں ہو گئے۔ اور اپنا "آنند" چلاتے رہے۔

(آنند) رسالہ کے علاوہ واسدیو راؤ نے اپنی زندگی میں بچوں کے لیئے بیسوں بہترین کتابیں لکھیں۔ اس کے قبل مرہٹی زبان میں بچوں کا لٹریچر نفی کے برابر تھا۔ علی الخصوص بچوں کیلئے آسان اور دلچسپ زبان میں اصل کتابوں کی بڑی کمی تھی، اس کمی کو واسدیو راؤ نے محسوس کر کے

اس ادب کے استحکام کے لئے عزم بالجزم کیا۔ اور مرہٹی کے ادبیات اطفال کے رہنما بنے۔ آپ نے اس ادب کو اس قدر مستحکم کیا کہ وہ مرہٹی کے ادبیات اطفال کے موجد کے نام سے مشہور ہو گئے۔ آپ بچوں کی نفسیات سے بخوبی واقف تھے۔ ان کے عادات و اطوار، ان کے جذبات اور ذہنیات کا خاص مطالعہ کیا تھا۔ بچوں کے عادات واطوار کے مطالعہ کی بدولت آپ ادبیات اطفال کے بڑے ماہر مصنف بن سکے۔

آپٹے کے "آنند" کے دفتر سے جو بچوں کے لائق کتابیں شائع ہوئیں، ان کی فہرست نیچے دی جاتی ہے۔ ان میں "تیجو بھنگ" و "بال بیر" وغیرہ دو چار کتابوں کے علاوہ باقی کتابیں "کتب خانہ رادھا گوبند" سے شایع ہوی ہیں۔ مندرجہ ذیل فہرست میں کہانیاں، مکالمے، ناٹک، تاریخ، لطیفے، سائنس وغیرہ سب قسم کی کتابیں ہیں۔ اور یہ بچوں میں بڑی مقبول ہوی ہیں۔ بعض کتابوں کے مسلسل کئی ایڈیشن بھی نکلے ہیں :—

(۱) اگدین سونین راماین۔ (۲) بال راماین۔ (۳) بال بھارت۔ (۴) بال بھاگوت۔ (۵) ناٹے راماین۔ (۶) ناٹے بھارت۔ (۷) رامایتراں تیل سوشیا گوشٹی۔ (۸) بھارتا تیل سوشیا گوشٹی۔ (۹) موجیشیا گوشٹی (۱۰) سدھوسنتاچیا گوشٹی۔ (۱۱) بال منورجن۔ (۱۲) مھرشیچا پرساد۔ (جلد ۱ — ۲) (۱۳) مہاراشٹراچا بالبودھ اتہاس۔ (۱۴) پیشوائیچی ہلیگت۔ (۱۵) ہندوستان چا منورجک اتہاس (۱۶) ویرانچیا کتھا۔ (۱۷) تیجو بھنگ (۱۸) بال بیر (۱۹) دون چٹکے (۲۰) چنتر نج او دھے (۲۱) پنچا مرت۔ (۲۲) ایکا دوساچیات سنٹیت (۲۳) منی آئی موتیا (۲۴) ملا کرتیان گوشٹی (۲۵) مولانچا ویودھ گیان سنگرہ (۲۶) ناٹئے روپ بھارت ورش (۲۷) مراٹھیانچا درارا۔ (۲۸) گاندھی گیتا (۲۹) اوترگیتا (۳۰) روپچے اجول کرن۔ (۳۱) اروبند بابوچیں آپلیا تینیس تیریں۔ (۳۲) درشا وریریم کان کرادین (۳۳) دیشا وریریم گیتین کرادین ! (۳۴) دیش بھکتا چیاں کتھا (۳۵) دیش بھکتیچی کسوٹی (۳۶) کاؤں کیس ؟ (۳۷) تا پٹیچا سنسار (۳۸) ملانچی اودیوگک کرھنوک (۳۹) ملانچیں سنسکار سادھان (۴۰) بھارت گیتا اور (۴۱) گیان دیپ اتیادی۔

ان کے علاوہ "راشٹر شکشنا چی واچن پستکین" نام سے ابتدائی تعلیم کی کچھ ریڈریں اور 'بال ونود مالا'، اور 'بال وہار مالا' میں چھوٹے چھوٹے بچوں کے لئے آٹھ کتابیں اور شائع ہوئیں۔

مذکورہ بالا ادبیات اطفال کے علاوہ واسدیو راؤ نے مختلف موضوع پر متعدد نہایت اہم کتابیں لکھی ہیں۔ مرہٹی اور انگریزی زبانوں کے علاوہ آپ کو بنگلہ زبان میں بھی کافی مہارت تھی۔ بنگلہ سیکھنے والوں کے لئے آپ نے 'مرہٹی۔ بنگالی شکشک' نامی ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ مندرجہ ذیل کتابوں میں 'اشوک چرتر'، 'لیکھن کلا' وغیرہ کتابیں وست سہائیتے گرنتھ مالا' کے سلسلے میں شائع ہوئی ہیں۔

ناول ۔ (۱) مانک باغ (۲) دکھانتی سکھ (۳) دلکش بھلینیاں (۴) نویگ۔ (۵) مورتی منت دیشا بھیمان (۶) بالمیکی چا جے اور (۷) سمپورن بنکم چندر (۱-۴ جلد)

سیرت وعلوم وفنون ۔ (۱) اشوک چرتر (۲) بدھ پروو (۳) مندر سے پلٹ کلا اور (۴) لیکھن کلا و لیکھن دیو سائے۔

لغات ۔ مرہٹی شبد رتناکر (۲) مرہٹی شبدارتھ چندریکا (۳) مرہٹی بھاشیچے سمپردائے دھی (۴) سنسکرت مرہٹی کوش (۵) بنگالی مرہٹی کوش (۶) مرہٹی بنگالی شکشک۔

واسدیو راؤ کے تقریباً سب ناول انگریزی اور بنگالی تراجم ہیں۔ آپ کے 'مانک باغ' کے بارے میں پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے۔

'دکھانتی سکھ' بھی مسز ہنری وڈ کے ایک انگریزی ناول 'مسز ہائی برٹنس ٹربلس' کا ترجمہ ہے۔ ....

.... یہ ناول پہلے 'منورنجن' میں بالاقساط نکلا۔ بعد میں ستمبر ۱۹۰۸ء میں اس کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔

'دلکش بھلینیاں' سموئل لیور کے 'HANDY ANDY' کا ترجمہ ہے۔

'نویگ' ناول کلکتہ کے مشہور عالم پنڈت شیوناتھ شاستری ام۔ اے کے 'یگانتر' نامی بنگلہ ناول کے مدنظر لکھا گیا ہے۔

'مورتی منت دیشا بھیمان' آپ کا طبعزاد تاریخی ناول ہے۔ 'بالمیکی چا جے' مہا مہا پدھیائے پنڈت ہر پرشاد شاستری کے 'بالمیکیر جے' نامی بنگلہ کتاب کا ترجمہ ہے۔

آپ نے مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ مرہٹی کے مشہور اخبارات میں مختلف موضوعات پر

سینکڑوں مقالے و مضامین شایع کیئے ہیں ۔ یہ مضامین دلچسپ قابل مطالعہ اور مفید ہیں ۔ درمیان میں آپ نے کچھ عرصے تک ' دچار ساوھن ' نامی ایک ہفتہ وار اخبار بھی جاری کیا ۔ خاندانی مصائب کے باعث یعنے آپ کی چہا ہیتی بیٹی کے انتقال کی وجہ سے اس کی اشاعت بند کر دی ۔

۱۹۲۱ء میں جب مہاتما گاندھی کی مقاومت مجہول تحریک کا ملک میں پرچا ہوا ۔ تب آپ گاندھی جی کے بھکت بن گئے ۔ آپ نے طلبا کو گاندھی جی کے اصول و خیالات سے آگاہ کرنے کے لیئے ' گاندھی گیتا ' تصنیف کی ۔ آپ نے مرھٹی ادب کی اصلاح و ترقی کے لیئے ' مرھٹی ساہیتے سمیلن ' کے انعقاد کی کوشش کی اور آپ مسلسل کئی سال تک اس کے معتمد رہے ۔

مقاومت مجہول تحریک کے زمانہ میں جب پونے میں ' تلک مہاودیالیہ ' قایم ہوا ' تو آپ اس ادارہ میں مرھٹی کے مدرس مقرر ہوے ۔ اس اثناء ۱۹۲۳ء میں آپ کو اپنے چاہیتے رسالہ ' آنند ' کی مفارقت گوارا کرنی پڑی ۔ اس مفارقت کا صدمہ آپ پر اس قدر ہوا کہ آپ کی صحت روز بروز خراب ہونے لگی ۔ بالآخر ۱۹۲۶ء میں آپ نے مدرسی کی خدمت ترک کر دی ۔

۱۹۲۹ء میں ساہیتے سمیلن کے اجلاس میں شرکت کرنے کے لیئے بلگام گئے ۔ یہ آپ کی آخری شرکت تھی ۔ اسی منحوس ساعت میں بیماری نے زور پکڑا ۔ اور مرتے دم تک وہ گلے کا ہار بنی رہی ۔ تیس چالیس سال تک اسی طرح بیماری سے سخت مدافعت کرتے ہوے بالآخر ۱۹۳۰ء فروری کی شام کے سات بجے (۵۸) برس کی عمر میں رہ گرائے عالم جاودانی ہوے ۔

آپ کے خصائل و عادات خاموش ' سادہ ' اور ملنسار تھے ۔ آپ بڑے منکسر المزاج تھے ۔ آپ کا طرز زندگی سیدھا سادھا پرانے ڈھنگ کا تھا ۔ اور آپ کا مطمع زندگی بقول Plain living and high thinking کے تھا ۔ خدا پر آپ کو کامل اعتقاد تھا ۔ روزانہ علی الصباح حسب معمول اسی طریقہ پر وہ اپنے مرض لاحقہ کی مدافعت کرتے ہوے بیسوں کتابیں لکھیں سخت اور صبر آزما علمی خدمات انجام دیں ۔ وہ اپنے مقالے اور کتابیں بڑی دانائی ' کامل غور و خوض اور مہارت و واقفیت کے بعد لکھتے تھے ۔ اناپ شناپ لکھنا آپ کو پسند نہ تھا ۔ اس قدر محنت و وقت طلب کام کے ساتھ آپ کی لگن اور دھن قابل ستایش ہے ۔ کسی کام کو اختیار کرنے کے بعد تا وقتیکہ وہ ختم نہ ہولے دوسرے کی طرف توجہ تک نہ کرتے تھے ۔ وہ صابر و شاکر بھی تھے اور اس صفت کی بدولت

آپ نے منفعت بخش مراتب وخدمات کو ترک کر دیا تھا۔ اپنے متمول اور معزز رشتہ داروں کی اعانت وامداد کی پروا نہ کرتے تھے۔ دھرم کے نام سے جو ھند و سماج میں بیجا سختی ہوتی اس کے وہ سخت مخالف تھے۔ پابندی مذہب آپ کا اصول تھا۔ بدھ مت سے آپ کو بڑی عقیدت تھی۔

(ماخوذ)

غلام رسول (سٹی کالج)

قدیم افسانے

رسالہ ' زمانہ ' کانپور کی رائے :۔

مرتبہ مولوی عبد القادر سروری۔ ایم اے ال ال بی۔ کراؤن سائز ضخامت (۲۸۱) صفحات قیمت۔ (عہ)

" مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد کے اہتمام سے دنیا کی مختلف زبانوں کے مختصر افسانوں کا ایک سلسلہ (دنیا کے شاہکار افسانے) شایع ہو رہا ہے۔ یہ کتاب اسی سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ اس میں مصری، یونانی، رومی، ہندی، ایرانی، اور عربی کے قدیم مختصر قصوں کا ترجمہ سلیس وسادہ اردو میں پیش کیا گیا ہے۔ ہر زبان کے افسانوں سے پہلے قدیم زمانہ کی ادبیات کے متعلق ضروری نوٹ بطور تمہید کے درج ہیں۔ اور ہر افسانہ کے شروع میں اسکے مصنف کا نام اور بہت مختصر حال ہے نیز جس کتاب سے افسانہ یا ترجمہ اخذ کیا گیا ہے اس کا حوالہ دیا گیا ہے۔

افسانوں کے انتخاب میں بہت کد و کاوش سے کام لیا گیا ہے اور حتی الامکان بہترین دلچسپ افسانوں کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ یوں تو قریب قریب سب قصے دلچسپ و نتیجہ خیز ہیں۔ مگر بعض میں یہ خصوصیات بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ قدیم زمانہ کے افسانوں کا فراہم کرنا اور عمدہ افسانوں کا ترجمہ کرنا بجائے خود ایک قابل قدر کام ہے۔ اہل ذوق اس سلسلہ کے مطالعہ سے فائدہ اٹھائیں گے۔" (مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن)

غزل

(از)

از جناب سید وحید اللہ قادری صاحب وحید

تو چہ پرسی؟ من چرا این اشکباری میکنم　　دشتِ دل چوں کربلائے لالہ کاری میکنم

برق بر ابر بہاری رقص کردہ نغمہ خواند　　ہستیٔ من بین کہ نذرِ بیقراری میکنم

زنگ مے از گردن مینا کند افشائے راز　　آبگینہ گفت چوں من پردہ داری میکنم

چشم در روئے صنم دل در نماز بے نیاز　　بت پرستی میکنم ہم دینداری میکنم

اے فروغ دیدۂ من از درون جاں بیا　　بزم دل آراستہ شد انتظاری میکنم

جلوہائے طور بینم در کمالِ بے خودی　　چوں بیاد چشم مستت بادہ خواری میکنم

قطرۂ خوں میچکد از جنبش کلک وحید
از طفیلِ رحم دل رنگیں نگاری میکنم

سنہری مینا

(از)

جناب عابد مسیح صاحب بی۔اے

شہزادہ حامد شکار کھیلتا ہوا جنگل میں بہت دور نکل گیا، رفتہ رفتہ وہ ایک پہاڑی کے دامن میں جا پہنچا اور آرام لینے کے لیئے گھوڑے سے اُتر کر سرسبز وادی میں ایک پُرفضا مقام پر گھاس میں لیٹ گیا تھوڑی دیر میں کیا دیکھتا ہے کہ سُنہرے پروں والی ایک خوب صورت چڑیا اُس کے قریب پھدک رہی ہے اُس نے غور سے دیکھا تو وہ چڑیا ایک جنگلی مینا تھی، لیکن اُس کے سُنہرے پروں نے شہزادے کو حیرت میں ڈال دیا۔ کیوں کہ ایسی خوبصورت مینا اپنی زندگی میں دیکھی کیا سُنی بھی نہ تھی۔

فوراً اُٹھ کر اُسے پکڑنے کی کوشش کرنے لگا، مینا نے پہاڑی کا رُخ کیا اور شہزادہ اُس کے تعاقب میں چلا۔ مینا تھوڑی تھوڑی دور اُڑ کر رُک جاتی اور جب شہزادہ قریب پہنچتا تو ذرا اور آگے بڑھ جاتی۔ غرض کہ شہزادہ پہاڑی کے اوپر پہنچ گیا۔

یہاں چڑیا تو نظر سے اوجھل ہو گئی، لیکن ایک عجیب و غریب منظر دکھائی دیا، اُس کے سامنے کچھ فاصلے پر سنگ مرمر کے چند نہایت خوب صورت مجسمے ایک حلقے میں استادہ تھے، شہزادے کو سخت تعجب ہوا کہ ایسے غیر آباد مقام پر یہ مجسمے کہاں سے آئے۔ جیسے ہی اُس نے اس راز کو سمجھنے کی نیت سے مجسموں کی طرف قدم اُٹھایا اُس کے کان میں ایک آواز آئی "خبردار نادان آگے نہ بڑھنا۔" اِدھر اُدھر دیکھا تو کچھ دور ایک جھونپڑا نظر آیا، وہاں ایک بڈھا بیٹھا ہوا اُسے ہاتھ سے اشارہ کر رہا تھا کہ آگے نہ جانا۔ شہزادے نے پوچھا کہ "تو کون ہے اور مجھے آگے بڑھنے سے کیوں روکتا ہے؟" بڈھے نے جواب دیا کہ "سنگ مرمر کے جو مجسمے تجھے دکھائی دیتے ہیں یہ سب تیری طرح جوشیلے نوجوان تھے، اُنھوں نے میرا کہنا نہ مانا، آگے بڑھے چلے گئے، آخر پہاڑی ساحرہ نے ان کو پتھر بنا دیا"

شہزادہ۔ "یہ ساحرہ کون ہے؟ کیا یہ مجھ سے طاقتور ہو گی؟"

بڈھا۔ "ساحرہ ایک سنہری مینا کو پیچھے اُڑا دیتی ہے۔ اس خوب صورت چڑیا کو پکڑنے کی

کوشش میں نوجوان پہاڑی پر چڑھ آتے ہیں۔ میں منع کرتا ہوں کہ خبردار آگے نہ جاؤ مگر اپنی طاقت کے گھمنڈ میں وہ میری نیک صلاح کی کچھ پرواہ نہیں کرتے۔"

شہزادہ کو یقین ہوگیا کہ بڈھا میرا خیر خواہ ہے اور اس سے یوں گویا ہوا:۔

شہزادہ۔ "آگے تو میں ضرور جاؤں گا۔ چڑیا کو پکڑنے کے لیے نہیں بلکہ اس ساحرہ کو مارنے کے لیے"

بڈھا۔ "ساحرہ کی نظر پڑتے ہی تو پتھر ہو جائیگا، البتہ اُس کو قابو میں لانے کی ایک ترکیب ہے، تو دہنے ہاتھ کو مڑ جا اور گھوم کر ساحرہ کی پشت کی طرف سے پہاڑی کی چوٹی پر چڑھ جا، اس طرح آہستہ آہستہ جا کہ ساحرہ کو تیرے پاؤں کی آہٹ نہ سنائی دے، پیچھے سے اس کی چوٹی خوب زور سے پکڑ لینا، جیسے ہی اس کے بال تیرے ہاتھ میں آئیں گے وہ تیرے بس میں ہو جائے گی۔"

شہزادہ دہنے ہاتھ والے رستے سے گیا اور بڈھے کی ہدایت کے بموجب اس نے ساحرہ کے بال پیچھے سے مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیے۔ ساحرہ اس قدر زور سے چیخی کہ پہاڑی ہلنے لگی مگر شہزادے نے اس کی چوٹی نہ چھوڑی۔ آخر وہ مجبور ہو کر کہنے لگی کہ "بتا تو کیا چاہتا ہے" شہزادہ بولا "یہ چڑیا مجھے دیدے اور سنگ مرمر کے ان مجسموں کو پھر سے آدمی بنا دے"۔ شہزادے نے فرط محبت سے سنہری مینا کے خوب صورت سر کو بوسہ دیا، لبوں کے لگتے ہی وہ مینا ایک خوب صورت شہزادی کی شکل میں تبدیل ہوگئی، یعنے اپنی اصلی صورت پر آگئی۔ یہ دیکھتے ہی حامد اس پر سو جان سے عاشق ہوگیا، لیکن اُسے خیال آیا کہ مجھے ابھی ایک اور ضروری کام کرنا ہے۔ پس اس نے ساحرہ کو حکم دیا کہ "ان مجسموں کو فوراً آدمی بنا دے"۔ ساحرہ نے اپنے جادو کے زور سے کچھ دھواں سا اُڑایا اور وہ مجسمے معًا اپنی اصلی شکل میں آگئے۔ یہ کل نوجوان شہزادے کو دیکھ کر تعظیم بجا لائے۔ حامد نے ساحرہ کو رہا کردیا، پھر شہزادی کو اور ان نوجوانوں کو اپنے ساتھ شاہی محل کو لے گیا۔ وہاں دھوم دھام کے ساتھ حامد اور شاہزادی کی شادی ہوگئی اور وہ کل نوجوان درباریوں میں شامل کر لیے گئے۔

غزل

(از)

جناب میر محرم شاہ صاحب قادری النظامی اُمید حیدرآبادی

میری وہ آنکھ، محوِ تماشا کہیں جسے　　تیرا وہ حُسن، برقِ تجلا کہیں جسے

کس دن رہی وہ چشمِ حقیقت نگر سے دور　　برقِ جمال آئینہ سیما کہیں جسے

عشاق کی کمی نہیں، لیکن وفا شعار　　ایسا کہاں سے لاؤ گے مجھ سا کہیں جسے

کانٹوں کو پھول جانتے ہیں اہلِ امتیاز　　تنزیہ کا مقام ہے صحرا کہیں جسے

بیخود پڑا ہوں سجدہ گہِ شوق جان کر　　سنگِ حرم ہے نقشِ کفِ پا کہیں جسے

سیکھوں میں برق سے کہ دلِ بیقرار سے　　آتا نہیں ہے مجھ کو تڑپنا کہیں جسے

دل کا ترے غبار ستمگر نہ جائے گا　　یہ آئینہ وہ ہے کہ سب اندھا کہیں جسے

یہ سب کرشمے ہیں نگہِ نازِ یار کے　　اعجازِ موسوی یدِ بیضا کہیں جسے

دیکھا ہے ہم نے چاہنے والے کی آنکھ میں　　وہ عکسِ روئے یار کہ جلوا کہیں جسے

ہیں اصل میں یہ عشق کے ادنیٰ سے رنگ روپ　　وحشت کہیں جنوں کہیں سودا کہیں جسے

عاشق مزاج یوں تو سب اچھے ہیں خلق میں　　کیا پوچھنا ہے اُس کا وہ اچھا کہیں جسے

باور نہیں تو مردمکِ چشم میں مری　　دیکھو تم اُس کو خود ہی کہ، تمنا کہیں جسے

اُمید! تیرے در سے رہے نا امید کیا

داتا اُسے وہ دے! منّ و سلویٰ کہیں جسے

صنف نازک اور ادب لطیف

ذیل میں ایک چھوٹی سی موج جو دل کے سمندر میں مولانا نیاز فتحپوری کی کیوپڈ اور سائک کی تمہید کے دیکھنے سے اٹھی تھی وہ تحریر کی شکل میں پیش کی جاتی ہے ۔۔۔ (فدا)

کیا انسان دنیا میں صرف اس لیئے پیدا ہوا ہے کہ اپنی اس مقررا ور محدود حیات کو جانوروں کی طرح کھاتے پیتے ہی میں گذار دے اور پھر موت کے آتے پر اس کو الوداع کہے؟ نہیں ۔ اگر غایت آفرینش پر غور کریں تو ضرور اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ فطرت کا صحیح مطالعہ انسان کا اولیں فرض ہے ۔ اگر اس مقصد کو پورا کرنے میں ہم نے تساہل کیا تو یقیناً اپنے وجود کا کوئی مصرف نہیں ۔ اور یوں ہی اپنی زندگی رائگاں گئی ۔

ادب (LITERATURE) اور فطرت (NATURE) کا مطالعہ ایک ہی ہے اور دونوں کا تعلق بھی ایک ہی چیز سے ہے ۔ جس کی عظمت ظاہر ہے ۔ فرق ہے بھی تو صرف اتنا کہ ان میں سے ایک (فطرت کا مطالعہ) تخیل اور احساس سے متعلق ہے تو دوسرا (ادب) اس تخیل اور احساس کے اظہار اور بیان سے ۔ ایک صرف اپنی ذات ہی تک محدود ہے گویا وہ خودغرض ہے، جس چیز سے لطف اندوز ہوتا ہے اس کو اپنی ذات ہی کے لیئے رکھتا ہے ۔ لیکن دوسرا (ادب) ایسا فیاض ہے کہ خودغرضی، ذاتی نفع کے خیال اور تنگ نظری کو ترک کر کے اپنے فیض عالمگیر سے مستفیض کرتا، اور دل کھول کر سب کو سیراب کرتا ہے ۔ اس کی عظمت کا اندازہ خود اس کی فراخ دلی اور فیاضی سے بخوبی ہو سکتا ہے ۔

ادب کئی نوع کا ہوتا ہے ۔ تاریخی، مذہبی، سیاسی، اور لطیف (LIGHT LITERATURE) ہر ایک کی عظمت ان کے اپنے کام سے متصور ہوتی ہے ۔ تاریخی ادب ملک و قوم سے متعلق ہے، مذہبی وہ ہے جو اپنے پاکیزہ اور قابل تسلیم حقایق سے جن میں وعظ و نصائح کے علاوہ روحانیات بھی داخل ہے، بحث کرتا ہے ۔ اسی طرح سیاسی، ملک و حکومت سے متعلق ہے ۔ لیکن چوتھا ادب کا وہ پاکیزہ شعبہ ہے جو دل سے متعلق ہے (THAT SPEAKS TO THE HEART.) اس دل سے جس سے تمام جذبات، خواہشات اٹھتے ہیں، جوش، سرگرمی اور ولولوں کے دریا کے دریا امنڈتے ہیں، جن کی فیض رسانی کی دنیا مشکور و ممنون ہے اور رہے گی ۔

اس قسم کے ادب (LIGHT LITERATURE) پر کئی اعتراض عاید ہوتے ہیں، جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ "یہ ادب صنف نازک ہی سے بحث کرتا ہے" اور اگر یہ عنصر اس سے علٰحدہ کرلیا جائے تو اس میں کچھ نہیں رہتا، لیکن اس ادب کے حامی اس اعتراض کا یوں جواب دیتے ہیں کہ "فطرت کی نیرنگیاں اس عالم کی جلوہ آرائیاں اور اس کی گوناگوں ساری کی ساری لطافتیں اس صنف ہی سے متعلق ہیں۔ جن کی نزاکت مُسلّم اور جن کا حُسن ثابت ہے۔ حقیقت ہے، جب اس کو علٰحدہ کرلیں تو اس دنیا میں رہ کیا جاتا ہے، اسی ذات اور اسی صنف سے دنیا کی دلچسپی قایم ہے۔ ورنہ یہ نہیں تو پھر کچھ نہیں۔"

یہی جواب ہمارے رئیس التحریر کے قلم سے نکلتا ہے۔ جو علم الاصنام کے لذت چشیدہ ہیں۔ لیکن جب ہم غور کرتے ہیں تو یہ بیان صرف اسی حد تک ٹھیک معلوم ہوتا ہے کہ "صنف نازک کا دنیا میں بہت بڑا حصہ ہے۔ اس کو علٰحدہ کرنا ضرور کسی نہ کسی حد تک اس عالم میں کمی کرنا ہے" لیکن یہ بیان اس کو نکال دینے کے بعد کائنات میں کوئی چیز دلچسپ اور حسین باقی نہیں رہتی اور سارا عالم بے رونق اور پھیکا رہ جاتا ہے۔ غلط اور لغو ہے۔ "لیلیٰ را بچشم مجنوں باید دید" ان لوگوں کی نگاہوں سے عالم آرا کی عالم آرائی کا تماشا دیکھئے، جنہوں نے اس کا خوب مطالعہ کیا ہے اور لُطف اندوز ہوکر کہہ اُٹھے ہیں ؎

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار ۔۔۔۔ ہر ورق دفتریست معرفت کردگار

تمام کائنات سے صنف نازک کو نکال دیا جائے، جب بھی اس محفل نشاط کا سرور ویسا ہی رہیگا ایک نہیں لاکھوں حسینوں کا دنیا میں ماتم رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ بقول غالب ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں ۔۔۔۔ خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

لیکن ایک گھڑی کے لیئے اس کی رونق کم ہوی ہے نہ ہوگی۔

جس طرح کائنات میں رونق افزائے بزم جہاں صنف نازک ہوسکتی ہے ویسے ہی عالم معنی میں، کائنات تخیل میں، مصنوعات کی دنیا میں کتنے نزاکت بھرے اصناف زینت بخش بزم نظر ہیں، مگر ہاں نظر شرط ہے۔ اگر کسی کی آنکھیں اُن کو نہ دیکھیں تو حقیقت کا کیا قصور؟ نعوذ باللہ اس سے کائنات حسن کے پردہ نشینوں، دنیائے جمال کے نازک اندا موں کے عشوہ و ادا، غمزہ و ناز، حسن و جمال کا انکار مقصود نہیں، کون ان کی جادو اثر نگاہوں سے مکر سکتا ہے، کس کو ان کے محیر العقول جلوؤں سے

انکار کی جرأت ہو سکتی ہے، جن کے مخصوص اور ہوش ربا تماشے عالم کی نظروں نے ہمیشہ دیکھے ہیں، لیکن کہنا یہ ہے کہ اس محفل وجود میں ان ہی کا وجود باعث رونق نہیں ہے، بلکہ کائنات کا ہر منظر عالم کا ہر رُخ، موجودات کا ہر ذرہ، عالمے دارد کہ در گفتن نمی آید۔ اس خیال کو خدائے سخن میر تقی میر نے ایک شعر میں اس طرح بیان کیا ہے کہ اس ساری حقیقت کا انکشاف ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ؎

سرسری تم جہان سے گذرے ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

بے مبالغہ ہر ہر قدم پر ایک دنیا نظر آسکتی ہے۔ جنھوں نے ایسا دعوے کیا ہے سچ مچ اپنی آنکھوں سے اُنھوں نے دیکھ لیا ہے، اور دیکھنے والے بفضل خدا دنیا میں کم نہیں ہیں۔ ہر شخص اس کو دیکھ سکتا ہے۔ لیکن شاہین نظر ہونا شرط ہے۔ بعض طبیعتیں ایسی بھی ہیں کہ قدرت کی چھوٹی چھوٹی باتوں اور چھوٹے چھوٹے کرشموں سے بھی دل آویز نتیجے نکالنے کی عادی ہیں۔ چونکہ مناظر قدرت سے بھی شاعری ایک خاص نسبت رکھتی ہے اس واسطے جو شاعر ایسی طبیعت اور ایسا مذاق رکھتے ہیں وہ مناظر قدرت سے ایک خاص راہ نکالتے اور خاص منزل پر جا پہنچتے ہیں۔ جنھیں مناظر قدرت سے دلبستگی رہتی ہے وہ جب سرزمین شاعری میں قدم رکھتے ہیں تو قدرتی دل آویزیوں سے خزانہ شاعری کو مالا مال کر دیتے اور ہر منظر سے وہ دلچسپی، وہ خوبی، وہ نزاکتیں ڈھونڈھ نکالتے ہیں کہ سامعین کے واسطے ایک خاص دلچسپی کا سامان مہیا ہو جاتا ہے۔

ہاں ادب لطیف (Light Literature) کی دنیا میں عورت ہی کی رنگینی اور اس کا پُربہار وجود ہی نزاکت کا پہلو نہیں رکھتا بلکہ اور بھی بہت ساری چیزیں ہیں جو اس کی رونق کی ذمہ دار ہیں، بقول حالی جب تک نیچر کی کان کھلی ہوئی ہے اس بات کا خوف نہیں ہو سکتا، صنف نازک کا نکال لینا باعث بے رونقی نہیں ہوگا جیسا کہ کسی نے کہا ہے ؎

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور ہزاروں جانور اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اُڑ جائینگے

دلکشی، خوشنمائی، نزاکت، اور دلفریبی یہ ایسی چیزیں ہیں جن سے ایک قسم کی سنسناہٹ بدن میں پیدا ہوتی ہے، دل، روح، دماغ، ان سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ آنکھیں جب ان سے دوچار ہوتی ہیں تو اپنا رقص شروع کر دیتی ہیں، دل پھڑکنے لگتا ہے، ایک رعشہ سا طاری ہونے لگتا ہے، اور جگر اپنی جگہ چھوڑ دیتا ہے اب رہا اس کا سبب وہ نفسیات سے متعلق ہے۔ یہ دل آویزی یہ جذب اور یہ کشش کسی خاص چیز سے مختص نہیں۔ جب انسان پھول کی نزاکت دیکھتا ہے تو اُف اُف کرتا رہ جاتا ہے، کسی سبزہ زار کو دیکھتا ہے تو

حضرت غفراں مآب اپنے اشعار کی اصلاح کے لئے ہندوستان کے مشہور شاعر داغ دہلوی کو حیدرآباد طلب کیا۔ داغ کے ساتھ امیر مینائی اور ظہیر دہلوی اور کئی چھوٹے بڑے شاعر حیدرآباد آگئے۔ یہاں کے شعرا میں بھی نئی سرگرمی پیدا ہوئی۔ ہر جگہ مشاعرے ہونے لگے۔ غزلوں کے گلدستے اور ماہوار رسالے جاری ہوگئے اور خود مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر جیسے شعر نوازکی کوشش سے ایک نفیس گلدستہ غزلیات طرحی ہر ماہ بڑے آب وتاب سے نکلنے لگا جس کو حضرت غفراں مآب کا کلام شاہانہ سے عزت بخشی جاتی تھی۔

شوکت بلگرامی بھی ان شاعروں میں خوب چمکے اور اساتذہ کے روبرو خراج تحسین حاصل کیا ایک مشاعرے میں داغ دہلوی نے مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے اپنا یہ شعر عام کردیا اور قافیہ کے اشکال کے پیش نظر ساتھیوں کو مسابقے کی صلائے عام دی۔

خدا جانے انہیں کیا لکھ دیا ہے زباں پکڑی نہیں جاتی قلم کی

امیر مینائی کے ممتاز شاگرد موجود تھے۔ سب نے زور طبع دکھایا۔ اس موقعے پر شوکت نے بھی فی البدیہ اپنا کمال دکھایا اور خود داغ کی زبان سے خراج تحسین پایا۔

تری توصیف جب ہم نے رقم کی خوشی سے کھل گئیں باچھیں قلم کی

شوکت کا کلام جو تقریباً کل اصناف سخن پر مشتمل ہے۔ مرتب ہے مگر ابھی تک شایع نہیں ہوا وہ شعر گوئی کا تو ذوق رکھتے تھے مگر نام و نمود کی خاطر دیوان شایع کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کی غزلیں کسی ادبی رسالے میں شایع نہیں ہوئیں صرف مولانا حسرت موہانی کے رسالہ اردوئے معلیٰ میں جو کئی برس سے بالالتزام شعرا کے دواوین کے انتخاب شایع کرتا ہے، چند غزلیں ایک بار طبع ہوئی تھیں۔ ان کا ایک دلچسپ اور قابل مطالعہ کارنامہ عمر خیام رباعیات کا اردو ترجمہ ہے۔ اس مجموعے میں جس کو ان کے فرزند سید محمد علی صاحب نے مرتب کیا ہے۔ صرف (۶۳) رباعیاں ہیں۔ یہ ان کے آخری زمانے کا کلام ہے اور وہ اتنی ہی رباعیاں بڑی کاوش سے ترجمہ کرسکے تھے کہ ان کا انتقال ہوگیا اور یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔

شوکت نے 'پیری وصد عیب' میں قدم بھی نہیں رکھا کہ عوارض و امراض نے ان کی صحت بگاڑ دی۔ اور دمے کے مرض نے اس قدر زور پکڑا کہ کئی علاجوں کے باوجود شفا نہیں ہوئی اور بالآخر کم وبیش (۴۹) برس کی عمر میں کلکتے میں بتاریخ ۱۳ ؍ جمادی الثانی ۱۳۲۲ھ داعی اجل کو لبیک کہنا پڑا جہاں وہ اسی جان لیوا مرض کا علاج کرانے گئے تھے وہیں انہیں پیوند کیا گیا۔ ان کی قبر مٹیا برج میں واقع ہے اور زبان حال سے

ان کی اس شعر کی وضاحت کر رہی ہے۔

مٹ گیا کون غریب الوطنی میں شوکت　　بیکسی گور غریباں سے عیاں ہوتی ہے

ذیل میں غزلوں کے چند اشعار لکھے جاتے ہیں ان میں دنیا کی ناپائیداری، دنیا والوں کی بیوفائی دنیا سے بیزاری اور خدا ترسی کے خیالات کو دیکھئے کس خوبی سے نظم کیا ہے۔

بیٹھ جا فرش زمین پر خس و خاشاک نہ دیکھ　　خاک ہونا ہے تجھے جانب افلاک نہ دیکھ

اے عندلیب باغ جہاں میں نہ دل لگا　　ناپائدار رنگ ہے، بے اعتبار گل

اس کی خوشی کو دیکھ ہوتا ہے دل کو رنج　　جس مست آرزو کو غم انتہا نہ ہو

بیزار اہل درد سے اے بیوفا نہ ہو　　ہم آپ زندگی سے خفا ہیں خفا نہ ہو

تلاش مہر و وفا ہے ہمیں زمانہ میں　　چلے ہیں ڈھونڈنے عنقا کو آشیانہ میں

عمر بھر مورد جفا ہی رہے　　ہم کو رسم وفا نہ آئی راس

اسیران قفس کی راہ نے کیا گل کھلائے ہیں　　ذرا صحن چمن میں پھول یہ ٹوٹے ہوئے دیکھو

دور تک جانا ہے او سفاک تیر بے صدا　　ان سے ڈر جو خوف سے کرتے نہیں فریاد بھی

آشنائی اس زمانہ کے نہیں نا آشنا　　بلکہ اب بیگانۂ تاثیر ہے فریاد بھی

فقیر عشق کو کیا چاہئے، وہ اور کیا مانگے　　زمین و آسماں قبضہ میں تیرے اور تو میرا

کریم میں تری رحمت سے نا امید نہیں　　کئے کی شرم تھی اندیشۂ مآل نہ تھا

شعرائے فارسی میں سے یورپ نے عمر خیام کو جس قدر چمکا یا ہے، اس سے قطع نظر ہندوستان میں بھی اسے وسیع شہرت و مقبولیت حاصل ہے، اردو میں اس کے ترجمے نثر اور نظم میں متعدد اشخاص نے کئے اور ایک زبان کی شاعری کو دوسری زبان کی شاعری میں بدلنے میں جو دشواریاں ہیں ان کے باوصف، بعض کوششیں بری نہیں کہی جا سکتیں، شوکت نے گو صرف (۶۳) رباعیاں اردو میں ڈھالی ہیں، مگر جس کاوش سے بندش الفاظ، ترکیبوں کی موزونی کے ساتھ اصل کے خیالات کو نقل میں پیدا کیا ہے، وہ ضرور ان کے ترجمہ کو دوسروں کے ترجمہ پر برتری دلانے والی ہے۔

شوکت	خیام
(۱)	(۱)
سورج نے کمند پھینکی سر بام	خورشید کمند صبح بر بام افگند
کیخسرو روز نے بھرا نور کا جام	کیخسرو روز بادہ در جام افگند
آوازہ اٹھ ہوا چلا دور اٹھے	مئے خور کہ منادی سحر کہ خیزاں
ہے دفع خمار شب صبوحی کا پیام	آوازہ اشربوا در ایام افگند
(۲)	(۲)
اے چرخ بتا یہ کس خطا کی تھی سزا	ای چرخ چہ کردہ ام ترا راست بگوی
رکھا جو ہمیں اسیر گرداب بلا	پیوستہ فگندہ مرا در تگ و پوی
ایک پارہ نان خون دل پیکے ملا	تا تم نہ دہی تا نہ بری کوسے بہ کوی
اک جرعۂ آب ابرو بیکے دیا	آبم ندہی تا نہ بری آب زروی

سید محمد

غزل

جناب محمد حنیف صاحب فروغ مرحوم

آپ کے پہلو میں جو وہ راحت جاں بیٹھ گیا
درد بھی دل میں مرے اُٹھ کے تہاں بیٹھ گیا

ہند میں کر کے جو میں آہ و فغاں بیٹھ گیا
ملک ایراں میں فغانی کا مکان بیٹھ گیا

اپنے اظہار غم و درد کو اٹھا دل زار
حال غم اپنا جو میں کر کے بیاں بیٹھ گیا

ناتوانی کا کیا حال جو خط میں تحریر
لیکے خط اٹھ نہ سکا نامہ رساں بیٹھ گیا

مرے نالوں سے وہ طوفان جہاں میں اٹھا
کہ اُبل کر دہن ہر ایک کنواں بیٹھ گیا

صورت نقش قدم رہگذر عالم میں
میں نہ اٹھا کبھی اُس جا سے جہاں بیٹھ گیا

دام صیاد اجل میں نہ گرفتار ہوا
اُڑ کے طوبیٰ پہ مرا طائر جاں بیٹھ گیا

جان لینے ملک الموت تو آتا تھا ادھر
آتے آتے نہیں معلوم کہاں بیٹھ گیا

اس کی دہلیز پہ کل گریہ و زاری کی تھی
آج سنتے ہیں کہ نالوں سے مکاں بیٹھ گیا

میکدے میں مجھے زاہد نے جو آتے دیکھا
چھپکے جلدی سے پس پیر مغاں بیٹھ گیا

وہ جب اُٹھے تو میں سایہ کی طرح ساتھ اٹھا
وہ جہاں بیٹھ گئے میں بھی وہاں بیٹھ گیا

فتنۂ حشر کا ملتا نہیں محشر میں پتا
ٹھوکریں یار کی کھا کھا کے کہاں بیٹھ گیا

غیر محفل سے مرے درد کے مانند اٹھا
میرے پہلو میں جو وہ جان جہاں بیٹھ گیا

عمر سب خانہ بدوشی میں گذاری ہم نے
کل وہاں بیٹھ گیا آج یہاں بیٹھ گیا

عرصۂ حشر میں آنیکو تو نکلا تھا فروغ
نہیں معلوم کہ رستہ میں کہاں بیٹھ گیا

راجہ صاحب کی ہتنی

تیسرا سبق

از جناب ناکارہ حیدر آبادی

عاشقانِ ادب یہ سن کر نہایت مسرور ہوں گے کہ "اردو کی پہلی کتاب" کا ایک نیا ایڈیشن مناسب ترمیم اور اصلاح کے بعد عنقریب زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر قارئین کرام کے ہاتھوں بلکہ پیروں میں پہنچ جائے گا۔ یہ مضمون اس کتاب کا تیسرا سبق ہے۔ کتاب مصور ہوگی اور تصاویر آرٹ پیپر پر نہایت شاندار شائع ہوں گی قیمت بعد میں لکھی جائے گی ہم دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آج تک دنیا بھر میں کوئی کتاب اس آب و تاب و شان و شوکت سے نہیں شائع کی گئی۔ بے چینی سے انتظار کیجئے ——— "ن"

ذرا سننا۔ گھنٹوں کی آواز آتی ہے۔ شاید کوئی ہاتھی آرہا ہے۔ چلو تماشا دیکھیں اور ممکن ہوا تو خوب گھوریں۔ ابلو! وہ آیا۔ نہیں نہیں! وہ آئی۔ کیا جھومتی جھامتی خراماں خراماں چلی آتی ہے۔ جیسے کوئی نازنین مستانہ وار چلی آرہی ہو! اوہو! کتنی بڑی ہتنی ہے! اُفوہ! اس کا یہ حال ہے تو خیال کرو اس کے میاں کا ڈیل ڈول کس بلا کا ہوگا۔ توبہ! کیا لمبے لمبے دانت ہیں! اُن پر سنہری چوڑیاں کیا بہار دیتی ہیں۔ گلے میں چاندی کی ہیکل پڑی ہے گویا سہاگ کا لچھا ہے دونوں طرف گھنٹے لٹک رہے ہیں۔ انہی میں سے ٹن ٹن کی آواز نکلتی ہے اور پر چاندی کا ہودا کسا ہوا ہے۔ راجہ صاحب اسی میں بیٹھتے ہیں۔ لیٹ نہیں سکتے۔ یہ ہودا تو بڑا اونچا ہے راجہ صاحب ہتنی پر کیوں کر چڑھتے ہوں گے؟ میاں یہ راز کی بات ہے کہنے کی نہیں۔ یہ ہتنی اپنے خاوند سے زیادہ مہاوت کا کہنا بہت مانتی ہے۔ اشارے پر کام کرتی ہے۔ اٹھتی ہے بیٹھتی ہے۔ لیٹتی ہے۔ سوتی ہے چلتی ہے تھم جاتی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر حوائج ضروری سے فارغ بھی ہوتی ہے۔ راجہ صاحب اس کو بہت چاہتے ہیں کبھی کبھار اس کو شکار میں لے جاتے ہیں۔ شیر کی آواز سنتی ہے تو فوراً دم دبا کر بھاگتی ہے اور راجہ صاحب ارے ارے! کہتے رہ جاتے ہیں جب مہاوت کہتا ہے تو سونڈ ماتھے پر رکھ کر راجہ صاحب کو سلام کرتی ہے، اور وقتاً فوقتاً سونڈ میں اٹھا کر زمین پر دے مارتی ہے۔

تذکرہ سیفی — مرتبہ طیب علی عبدالرسول صاحب شاکر پونیہ تقطیع ضخامت (۱۱۲) صفحات قیمت ۸/
پتہ مطبع نادری جبل پور۔ سی۔ پی۔

یہ بوہرہ جماعت کے پیشوائے اعظم مولانا ابو محمد طاہر سیف الدین صاحب کے سفر دہلی و شملہ کے حالات ہیں جو زیادہ تر مختلف مقامی اخبارات وغیرہ سے ماخوذ کرکے ترتیب دیئے گئے ہیں مولانا سیف الدین صاحب کے اس سفر کا مقصد ملت اسلامیہ کی تنظیم و خدمت تھا اور اس سلسلے میں آپ نے کئی روز سفر کرکے دہلی اور شملے میں علما اور معززین وغیرہ سے تبادلہ خیالات کیا۔ اس رسالے کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نہ صرف بوہرہ جماعت بلکہ عام مسلمانوں میں کس قدر ہردلعزیز ہیں اور مختلف طور پر انہوں نے مسلمانوں کی کیا کیا خدمات انجام دی ہیں۔

سفر انگلستان — از جناب منشی رشید احمد صاحب بی، اے، چھوٹی تقطیع ضخامت (۳۱۸) صفحے
قیمت ۱۲/ پتہ دفتر رہنمائے تعلیم رام گلی لاہور۔

یہ دلچسپ سفرنامہ اور انگلستان جانے والے طلبہ کے لئے مفید رہنمائے سفر ہے۔ مولف نے اگرچہ اپنے سفر کے حالات لکھے ہیں لیکن ان کا مقصد انگلستان جانے والے طلبہ کے لئے کارآمد رہنمائے سفر مرتب کرنا ہے اس لئے ہر موقع پر ان امور کو وضاحت سے لکھا گیا ہے۔ جو انگلستان جانے والوں کو جاننے ضروری ہیں۔ لندن اور اکسفورڈ نیز اڈنبرا کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے۔ ہوائی سفر کے متعلق بھی ایک باب ہے۔ نوعمر مسافران انگلستان اس سے خاصا فایدہ اٹھا سکتے ہیں۔

طائر خیال — از جناب منشی سدرشن صاحب چھوٹی تقطیع ضخامت (۲۷۰) صفحے۔ قیمت عہ پتے
سدرشن پبلشنگ ہوس لاہور اور مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد۔

جناب سدرشن صاحب اردو دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔ موجودہ دور کے ہندو افسانہ نویسوں

میں پریم چند کے بعد انہی کی شہرت سب سے زیادہ ہے اور ان کے افسانوں کے متعدد مجموعے مثلاً چندن، بہارستان، چشم و چراغ شایع اور مقبول ہو چکے ہیں۔ طائر خیال بارہ تازہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ یہ افسانے بھی کم و بیش اردو رسالوں میں ایک بار شایع ہو کر پسند عام کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ ابتدا میں ایک مختصر سا دیباچہ بھی ہے جس میں افسانہ نویسی سے بحث کی گئی ہے۔ طرز بیان کی سادگی اور دلکشی ان افسانوں کو خاص و عام دونوں کے لئے یکساں پسندیدہ بنانے والی ہے۔

قافیہ متبول

از ڈاکٹر سید سخاوت علی صاحب شوخ اکبر آبادی چھوٹی تقطیع (۶۸) صفحے قیمت ۸/ پتا مولف صاحب محلہ چڑی مار ٹولہ آگرہ۔

اس چھوٹے سے رسالے میں مولف نے قافیے کے متعلق وہ ضروری مواد جو طلبائے مدارس اور نو عمر شعرا کے لئے نہایت مفید ہے، بڑے سلیقے سے جمع کیا ہے۔ محاسن و عیوب قافیہ پر خوب بحث کی ہے اور ضروری مثالیں بھی دی ہیں وہ اس سلسلے میں دو اور رسالے ایک عروض کے متعلق اور دوسرا صنایع بدایع پر لکھنا چاہتے ہیں۔ تینوں حصے متعلقات شعر کے متعلق طلبہ کے لئے ایک مفید مطالعہ چیز ہوگی۔ پہلا وہ حصہ چھپ کر شایع ہو گیا اور دوسرے دو ترتیب پا رہے ہیں۔ ہماری رائے میں طلبہ اس کے مطالعے سے بہت جلد قافیے ردیف کے متعلق ضروری معلومات حاصل کر سکتے اور اس فن پر دیگر بسیط اور ان کتابوں کے مطالعے کی زحمت کے بغیر اپنا مطلب نکال سکتے ہیں۔ مولف نے بھی ان کی ضروریات کو مد نظر رکھ کر یہ رسالہ مرتب کیا ہے۔

تاریخ نثر اردو حصہ اول

از مولانا احسن مارہروی لکچرار اردو انٹرمیڈیٹ کالج جامعہ اسلامیہ علی گڑھ اوسط درسی تقطیع ضخامت (۶۱۰) صفحے سادہ جلد۔ قیمت پانچ روپے مولف صاحب یا مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ سے ملسکتی ہے۔

مولانا احسن مارہروی ایک عرصے سے اردو نثر کی تاریخ مرتب کرنے میں مشغول تھے۔ ان کی مساعی کا پہلا حصہ جو ۱۸۰۰ء سے لیکر زمانہ موجودہ تک کی نثر نویسی کے مختلف نمونوں پر مشتمل ہے، شایع ہو گیا ہے۔ آغاز میں فاضل مولف نے کوئی چالیس صفحات میں آغاز زبان لفظ اردو کی تحقیق، اردو کے رواج، اردو کی باقاعدہ تدوین وغیرہ پر بحث کی ہے۔ پھر اردو کے مختلف دوروں کی نثر کے گوناگوں نمونے پیش کر کے ان پر مختصر سا تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ یہ حصہ ہنوز نامکمل ہے اور تکملہ یعنے دوسرا حصہ زیر طبع ہے،

اور خود مولف نے ناقدین کو اس کی اشاعت تک اور کسی مخالف رائے کے قایم کرنے" سے روک دیا ہے اس میں جہاں تک ہر دو کی اردو نثر کے نمونوں کا تعلق ہے، بڑا قیمتی مواد جمع ہو گیا ہے۔ اردو نثر پر کام کرنے والوں کے لئے فاضل مولف کی تلاش سے بڑی مدد ملے گی۔

خزینۂ تاریخ دوم مرتبہ جناب سید یوسف الدین صاحب متعلم کلیہ جامعہ عثمانیہ اوسط تقطیع ضخامت (۱۴۸) صفحے، قیمت عہ۔ پتے دفتر بزم تاریخ کلیہ جامعہ عثمانیہ اور مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن۔

کلیہ جامعہ عثمانیہ کی بزم تاریخ کوئی دس گیارہ برس سے جو اعلیٰ تاریخی ذوق پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہے اس سے اہل ذوق اچھی طرح واقف ہیں۔ ابھی چند مہینے ہوئے اس نے اپنی دس سالہ جوبلی منائی اور اس سلسلے میں بڑی کامیاب تاریخی نمایش کی۔ خزینۂ تاریخ کے نام سے سالانہ صحیفہ جس میں اعلیٰ تاریخی مضامین اور تاریخی نظمیں ہوتی ہیں، اس بزم کی طرف سے مستقلاً شایع ہونے لگا ہے اس کے پہلے نمبر پر ہم قبل ازیں تبصرہ کر چکے ہیں۔ یہ دوسرا نمبر ہے اور پہلے کی طرح عمدہ تاریخی مضامین اور بلند پایہ تاریخی نظموں کا مجموعہ ہے۔ مضامین اساتذہ اور طلبہ دونوں کے ہیں! اور کم و بیش تمام محنت اور سلیقے سے لکھے گئے ہیں۔ بزم تاریخ اپنی ان مساعی کے لئے نہ صرف جامعہ عثمانیہ کے لئے قابل مباہات ہے بلکہ اچھے تاریخی ذوق کے نشوونما کے مدنظر ہر طرح لایق مبارکباد ہے۔

تحریر النسا از صغرا ہمایوں مرزا صاحبہ پونیہ تقطیع ضخامت (۱۲۰) صفحے قیمت (۱۲/) پتا دفتر عصمت دہلی۔
اس رسالے کی تحریر کا مقصد عورتوں کو خط و کتابت سکھانا ہے۔ اس کی مولف صغرا بیگم صاحبہ نے ابتدا میں ایک مقدمہ لکھ کر خط و کتابت کی ضرورت اور خط لکھنے کی نسبت چند ضروری ہدایتیں بیان کی ہیں۔ اس کے بعد نو ابواب میں مختلف دینی اور دنیوی ضرورت کے مسائل پر (۸۵) خطوط، کارڈ اور رقعے لکھے ہیں۔ یہ خطوط نمونے بھی ہیں اور متعدد مسائل پر چھوٹے چھوٹے مضامین بھی مولف رسالہ نے اپنے مقدمے میں اس امر پر زور دیا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو عورتوں کو صاف اور سادہ خط لکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ عبارت آرائی کی ضرورت نہیں۔ نمونے کے خطوط میں بھی اس کا لحاظ رکھا گیا ہے اور ہر چیز صاف اور سلیس پیرایے میں پیش کی گئی ہے۔ کم استعداد خواتین اور عام عورتیں اس کے مطالعے سے خطوط نویسی کے علاوہ دلچسپ مضامین پڑھنے کا لطف بھی حاصل کر سکتی ہیں۔

سرگزشت وزیرخان لنکران

مرتبہ مولانا عبدالقوی صاحب فانی ام، اے، پروفیسر جامعہ لکھنو بڑی تقطیع ضخامت (۱۰۹) صفحے۔ قیمت (عہ) پتہ آسی پریس محمودنگر، لکھنو۔

سرگزشت وزیرخان لنکران فارسی جدید کے مشہور ڈراموں میں ہے اور اکثر جامعات کے اعلیٰ فارسی امتحانوں میں شریک نصاب ہے۔ پروفیسر فانی صاحب نے طلبائے جامعہ اور عام قارئین کے لئے اسے بڑے سلیقے سے مرتب کیا ہے۔ ابتدا میں (۳۲) صفحات کا ایک جامع مقدمہ ہے جس میں مختلف ایشیائی ممالک میں ڈرامانویسی، کردارنویسی اور ایران میں ڈراموں کی ابتدا اور تدریجی ترقی پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد اصل فارسی ڈراما اور اس کے ساتھ ساتھ اردو ترجمہ ہے پھر جدید الفاظ اور لغات کی فرہنگ دی گئی ہے۔ ہر چیز عمدگی کے ساتھ حل کر دی گئی ہے۔ طلبائے جامعہ اس سے بہت فایدہ اٹھا سکتے ہیں۔ مشرقی ادبیات کی چیدہ کتابوں کی اس طرح ترتیب و اشاعت سے امید ہے کہ علوم مشرقیہ سے عام لوگوں کی دلبستگی میں بڑا اضافہ ہوگا اور ان کی موجودہ کس مپرسی کی بجائے طلبہ اور عامتہ الناس میں گہری دلچسپی پیدا ہو جائے گی۔

پطرس کے مضامین

از پروفیسر اے۔ ایس۔ بخاری۔ ام، اے۔ چھوٹی تقطیع ضخامت (۱۵۵) صفحے۔ خوبصورت جلد قیمت عا پتا دارالاشاعت پنجاب ریلوے روڈ لاہور۔

پطرس (پروفیسر بخاری) کے ظریفانہ مضامین سے اردو رسائل کے قارئین بخوبی واقف ہیں اور بالخصوص ان کی پیروڈی (جو اردو کی پہلی کے ایک مضمون پر لکھی گئی تھی) بہت شہرت رکھتی ہے۔ دارالاشاعت پنجاب نے ان کے کل مضامین جمع کر کے ان کو خوبصورت طریقے پر شایع کیا ہے اس مجموعے میں بعض مضامین بہت ہی عمدہ نمونہ انشاپردازی ہیں۔ ظرافت نگاری بڑی مشکل چیز ہے اس میں قدم قدم پر اس کا اندیشہ رہتا ہے کہ تبسم کی بجائے قہقہہ اور لطافت کی بجائے کثافت بیانی نہ ہو جائے اگرچہ آج کل اردو میں ایسے لکھنے والوں کی خاص تعداد پیدا ہو گئی ہے لیکن بہت کم ایسے ہیں جنھیں کامیابی سے قریب سمجھا جا سکتا ہے پطرس کا مذاق اس بارے میں بڑا سلجھا ہوا ہے۔ ان کی تحریریں بعض دوسرے ظرافت نگاروں کی طرح بھونڈے مذاق اور لغو چٹکلوں کا مجموعہ نہیں ہوتیں۔ کام کی باتیں بھی ہوتی ہیں اور دل خوش کن انداز سے کہی جاتی ہیں۔ پڑھنے والا مسکراتا اور خاموش لطف اٹھاتا جاتا ہے

اضلاع سرکار عالی کا اولین اور واحد ہفتہ وار اردو اخبار

ناندیڑ گزٹ

۹ بہمن ۱۳۴۰ ف سے شائع ہو رہا ہے جو ہر ہفتہ مملکت آصفیہ کے اہم حالات کے علاوہ ہندوستان ۔ عالم اسلام ۔ واقعات عالم کے تحت مختصر اور ضروری خبریں ناظرین تک پہنچاتا ہے ۔ دلچسپ و سلیس مضامین نظم و نثر اور افسانے شائع کرتا پر جوش مقالات سے ملک و مالک' قوم و ملت کی خدمت کرتا' رعایا کی ضروریات و تکالیف سے ارباب مقتدر کو مطلع مخالفین ملک و مالک کی ریشہ دوانیوں کا پردہ چاک کرتا ہے بعنوان راز و نیاز تفریحی مواد قابل مطالعہ ہوتا ہے ۔ کاغذ حجم وغیرہ کافی اطمینان بخش باوجود ان تمام خوبیوں کے ملک میں سب سے ارزاں ہے یعنی سالانہ (صہ) ششماہی (سے)

منتظم ناندیڑ گزٹ ضلع ناندیڑ

فہرست کتب موجودہ دفتر رسالہ اردوئے معلی کانپور

جلد رسالہ اردوئے معلی بابت ۱۹۲۵ء و ۱۹۲۶ء مکمل و مجلد (للعہ) بابت ۲۷ء و ۲۸ء و ۲۹ء مکمل و مجلد (للعہ) بابت ۳۰ء مکمل و مجلد (للعہ)

دیوان غالب معہ شرح از حسرت موہانی مع مقدمہ مفید و حالات غالب و تنقید کلام غالب۔ (عہ)

کلیات حسرت موہانی یعنی مجموعہ دوادین حسرت از حصہ اول تا حصہ دہم معہ ضمیمہ مکمل (سے)

انتخاب کلیات حسرت موہانی معہ ترجمہ انگریزی از ہاشمی چھاپا ٹائپ قابل دید (عہ)

انتخاب سخن از حسرت موہانی گیارہ جلدوں میں

یعنی اردو زبان کے جملہ مستند اور صاحب دیوان شعرا کے نایاب کلام کا انتخاب حسب تفصیل ذیل

انتخاب سخن جلد اول (سلسلہ شاہ حاتم) یعنی انتخاب دوادین بقا۔ رنگین۔ نثار۔ بیدار۔ تاباں۔ ماہر۔ امیر۔ افسر۔ بیتاب۔ عشرت۔ طالب۔ معروف و شاہ نصیر۔ (۱۰/) جلد دوم (سلسلہ ذوق) دیوان ذوق جملہ دوادین داغ۔ رسا۔ جگر۔ قیمت (۱۰/) جلد سوم (سلسلہ مومن) دیوان مومن نسیم۔ تسلیم و حسرت موہانی قیمت (عہ) جلد چہارم (سلسلہ مظہر) دیوان حسرت۔ یقین۔ حزیں۔ شاعر و بیان شاگردان مظہر قیمت (۴/) جلد پنجم (سلسلہ جرأت) دیوان حسرت۔ استاد جرأت۔ دیوان جرأت۔ غضنفر۔ رضا۔ رقت۔ رضوی۔ محنت۔ نصرت۔ معروف۔ محبت۔ جلال۔ شائق۔ ناسخ و وحشت۔ قیمت (۱۰/) جلد ششم (سلسلہ مصحفی) دیوان مصحفی و مسرور۔ منتظر۔ قیمت (۱۳/) جلد ہفتم (سلسلہ آتش) دیوان آتش۔ صبا۔ حنا۔ ماہ۔ قمر۔ فروغ۔ قیمت (۶/) جلد ہشتم (سلسلہ اسیر و امیر) دیوان اسیر۔ امیر۔ جلیل قیمت (۱۲/) جلد نہم (سلسلہ ناسخ) دیوان ناسخ۔ برق۔ جلال و آرزو قیمت (۱۲/) جلد دہم (سلسلہ غالب) مجروح۔ سالک۔ حالی۔ ذکی۔ شغل۔ رشکی۔ اسمٰعیل۔ قیمت (عہ) جلد یازدہم۔ (اساتذہ متفرق) دیوان فغاں۔ راسخ۔ رونق۔ صمیم۔ مست۔ خاکی۔ عزیز و محشر۔ (۱۰/)

دیوان شاہ حاتم قیمت (۶/)

دیوان علی میاں کامل لکھنوی۔ " (۸/)

دیوان میر و راسخ عظیم آبادی۔ " (۱۰/)

دیوان نوبت رائے نظر لکھنوی " (۲/)

دیوان سودا و میر درد (۴/)

دیوان نازش بدایونی (۲/)

دیوان میر سوز (۲/)

رسالہ محاسن سخن از حسرت موہانی (۶/)

رسالہ مرکات سخن موہانی (۶/)

رسالہ معائب سخن (۶/) رسالہ انتخاب سخن یعنی فہرست شعرائے اردو قیمت (۴/)

ملنے کا پتہ: حسرت موہانی دفتر رسالہ اردوئے معلی کانپور

مجلۂ مکتبہ

کی

خریداری میں مزید سہولت

جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپیہ کے مطبوعات مکتبہ یا ساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائیں گے، ان کے نام رسالہ سال بھر کے لئے بلاقیمت جاری ہوسکے گا۔ اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی درسی و دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خرید کریں گے۔ ان کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کے لئے مجلہ مکتبہ بلاقیمت حاضر ہوگا۔ یکمشت خریدنیوالے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کر دیا جائے گا۔ جو حضرات بدفعات کتابیں خریدیں گے، ان کو ایک رسید دیجائیگی۔ جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔

خریدار صاحبین کو چاہئے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب صراحت بالا رقم معینہ کی تکمیل ہوجائے وہ رسیدیں منتظم مجلہ مکتبہ کے پاس بھیجدیں رسالہ ان کے نام جاری کر دیا جائے گا۔ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہوسکتی ہیں۔ اس طرح کئی اشخاص مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

مطبوعہ

مطبع مکتبہ ابراہیمیہ امدادِ باہمی اسٹیشن روڈ

حیدرآباد دکن

دار الاشاعت مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود حیدرآباد دکن

کا

ماہوار علمی و ادبی مجلہ

مکتبہ

مدیر

عبدالقادر سروری ایم اے ال ال بی

شرکاء

سید محمد ایم اے

عمر یافعی

مجلّہ مکتبہ

یہ دارالاشاعت مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود کا ماہوار رسالہ ہے۔
یہ علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں علم و ادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین
درج ہوں گے۔ حجم کم از کم چار جز کا ہوگا۔
بنظر احتیاط پرچہ بذریعہ سرٹیفکٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا۔ اگر اتفاقاً وصول
نہ ہو تو ہر فصلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالہ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔
قیمت سالانہ (للعہ) مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے (عاں) فی پرچہ ۶ر
اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (صہ) نصف کیلئے (سے)
اور چوتھائی کے لئے (عہ ۱۲) ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ
میں ۱۲½ فیصدی سے ۲۵ فیصدی تک کمی ہوسکے گی۔
ترسیل زر و مضامین اور جملہ خط و کتابت **منتظم مجلہ مکتبہ** مکتبۂ ابراہیمیہ
امداد باہمی اسٹیشن روڈ۔ حیدر آباد دکن سے کیجئے۔

رجسٹرڈ نشان ٹپہ سرکار آصفیہ

(۶۵)

رجسٹرڈ نشان ٹپہ انگلشیہ

(.......)

مجلہ مکتبہ

شمارہ (۵)	بابت ماہ فروردی ۱۳۴۳ف مطابق فروری ۱۹۳۴ء	جلد (۲)

تصویر حاجی سید علی شبیر

(فہرست مضامین)

شذرات

ابھی ہندوستان اپنے ایک قائد اعظم مولانا محمد علی کے ماتم سے فارغ بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک اور بزرگ رہنما اور بڑے سیاسی لیڈر پنڈت موتی لال نہرو نے بھی عین اس وقت انتقال کیا جبکہ سیاسیات میدان کی رائے اور مشورہ کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ پنڈت جی کی افسوسناک وفات سے ملک کو جو عظیم سیاسی نقصان پہنچا اس سے قطع نظر بھی وہ اپنی علمی اور قانونی شخصیت، کردار، شائستگی، کلچر کے لحاظ سے خاص امتیاز رکھتے تھے۔ باوجود اپنی رئیسانہ معاشرت اور امیرانہ طرز زندگی کے جس میں ان کے بچپن اور شباب کا زمانہ گزرا، انہوں نے قومی تحریک کے لئے اپنا سب کچھ لٹا دینے میں دریغ نہیں کیا۔ لباس فاخرہ پر کھدر کو ترجیح دی۔ آنند بھون کی آسائشوں کو چھوڑ کر جیل خانہ کی سختیاں اٹھائیں۔ ان کی زندگی نوجوان نسل کے لئے سرتاپا درس عمل ہے۔ نہرو رپورٹ جو ان کی دستور سازی کی قوت کا اعلیٰ نمونہ ہے، ہندوستان کی دستوری تاریخ میں رہتی دنیا تک یادگار رہے گی!

---

۷ جنوری کو شاہی مجلس علمیہ (رایل اکیڈیمی) کے زیر اہتمام دیوان برلنگٹن (لندن) میں حسن کاری ایران کی، اس عظیم الشان بین الاقوامی نمائش کا افتتاح عمل میں آیا جس کی ترتیب و تنظیم کے لئے دنیا کی تیس متمدن و مہذب اقوام مشرق و مغرب نے ہمہ تن تعاون کیا ہے اور جو اپنی عظمت و رفعت کے لحاظ سے ساری دنیا میں واحد ہے۔ ایران کی سرزمین اپنی قدرتی بہار کی وجہ سے ابتدا ہی سے فنون لطیفہ کا گہوارہ رہی ہے۔ کئی سو برس قبل مسیح کے زمانے سے لے کر اس وقت تک کوئی عہد ذوق حسن کاری سے خالی نظر نہیں آتا۔ موسیقی، شاعری، مصوری، آذری اور معماری کسی فن میں ایران پیچھے نہیں رہا۔ مگر اب سے پہلے ایران کے ان بیش بہا خزانوں سے جو صدیوں سے حرم سراؤں، شاہی محلوں، مزاروں اور کتب خانوں میں پوشیدہ تھے دنیا تقریباً ناواقف تھی اور بالخصوص اہل یورپ کی آنکھوں نے کبھی انہیں دیکھا ہی نہ تھا۔ ایرانی اپنے ذوق کی ان چیزوں کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے رہے اور کبھی گوارا نہیں کیا کہ کسی غیر کی نظر بھی ان پر پڑ جائے جب لارڈ کرزن نے ایران کی سیاحت کی تو باوجود ہندوستان کے ویسرائے اور تاریخ و ادب

ایران کے صاحب ذوق ہونے کے انہیں شاہی کتب خانے کی صرف سیڑھیوں تک آنے کی اجازت دی گئی تھی۔ مگر آج حالات بالکل بدل چکے ہیں۔ عام سیاسی بیداری کے پیدا ہوتے ہی قدامت پسندی اور جاہلانہ توہم و بدگمانی بھی جاتی رہی۔ آج ایران امریکا و یورپ کی فرمائش پر اپنے لاقیمت خزاین حسن کاری کو نہ صرف لندن بھیجنے پر راضی ہو گیا بلکہ اس نمائش کو حقیقی معنوں میں کامیاب بنانے کے لئے بڑی مستعدی و فیاضی سے اہل مغرب کا ہاتھ بٹایا۔ ہز ہائینس رضا شاہ اور کابینۂ ایران نے نمائش کی اسکیم کو منظور کرتے ہوئے کتب خانوں محل سراؤں اور عجائب خانوں کے علاوہ بزرگان دین کے مزارات سے بھی وہ نادر اشیاء جو کبھی وہاں سے ہٹائی نہیں گئی تھیں، ذوق آشناؤں کے لئے وقف ملاحظہ کر دیں۔

امریکہ والوں نے اس اسکیم کی مالی اعانت میں اپنے تمول کا قرار واقعی ثبوت دیا اور ہزاروں مقامات سے اشیاء نمائش فراہم کرنے اور انعقاد نمائش کے مصارف میں بڑا حصہ انہوں نے ہی برداشت کیا۔ امریکہ ہی کے مشہور عالم ماہر حسن کاری مسٹر اے۔ یو۔ پوپ اس نمائش کے ناظم مقرر کیے گئے۔

اُردو زبان ترقی کے جس زینہ پر پہنچ گئی ہے، اس کے لحاظ سے اس کو علمی اصطلاحات کی جس قدر ضرورت ہے ظاہر ہے۔ ہندوستان بھر میں اُردو کے علمی سرمایہ کو ترقی دینے کی مسلسل کوشش ہو رہی ہے۔ کئی ادارے مختلف مقامات میں اپنے اپنے طور پر کام کر رہے ہیں۔ جن میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن، انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن اور ہندستانی اکیڈمی صوبۂ متحدہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن ان اداروں کے آپس میں کوئی اتحاد نہ ہونے کی وجہ سے، جدید علوم کی اصطلاحات بنانے کا کام مرکزیت حاصل نہیں کر سکا۔ اس طرح کی تنظیم کا فقدان، آیندہ انتشار کا خطرہ بن رہا ہے۔ عموماً ایک ہی مفہوم کے لئے مختلف مقامات میں مختلف اصطلاحیں رائج ہو رہی ہیں۔ مثلاً کو آپریٹو کے لئے کہیں اتحاد، کہیں اتحاد باہمی اور کسی جگہ امداد باہمی کی اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں۔ یا "رومانس" کے لئے کہیں داستان، کہیں اساطیر اور کہیں صرف رومان کے الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں۔ ایک ہی مفہوم کے لئے زبان میں کئی کئی اصطلاحوں کا موجود ہونا، اس میں شک نہیں کہ زبان کی وسعت کی دلیل ہے۔ لیکن خالص علمی اصطلاحات کے متعلق یہ مسلّم ہے کہ وہ بین القومی ہوں۔ اُردو کی اصطلاحوں کے لئے اگر بین القومی ہونا ضروری نہیں تو کم از کم بین اداری ہونا کئی وجوہ سے ناگزیر ہے۔ اس سے نہ صرف اصطلاحات معیّن ہو جاتے ہیں، بلکہ انفرادی اور خود طورانہ

مساعی کا سدِّ باب ہوجاتا ہے۔ اس ضرورت کے مدِ نظر ہم ڈاکٹر سر راس مسعود (نواب مسعود جنگ بہادر) نائب امیر جامعہ علی گڑھ کم سے کم اس بات پر زور دینا چاہتے ہیں۔ جو موصوف نے گذشتہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے خطبہ صدارت میں خاص طور پر پیش کی تھی۔ ہم امید کرتے ہیں کہ مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو، ناظم صاحب دارالترجمہ (جامعہ عثمانیہ) اور معتمد اراکین عاملہ، ہندستانی اکیڈمی، ایک مرکزی ادارہ کی تشکیل پر پوری توجہ منعطف فرمائیں گے۔ ہر ایسا مسئلہ جو اردو کے اہم پہلوؤں سے متعلق ہو اس کا ایک مرکزی حل نکل آسکے گا۔ اس مرکزی مجلس کی رائے کا ہر بہی خواہ اردو خوشی کے ساتھ خیر مقدم کرنے کے لئے تیار رہے گا۔ یہ مجلس اپنی مساعی کی اشاعت کا ذریعہ رسالہ "اردو" یا ایک سے زیادہ مستند رسالوں کو بنا سکتی ہے تاکہ اس کی اشاعت ہر گوشے میں ہوسکے۔ اسی ضمن میں دارالترجمہ کی اصطلاحات کو وقتاً فوقتاً شایع کروانا بھی ضروری ہے۔ ورنہ دارالترجمہ کی اصطلاحات کے متوازی کئی اور علمی اصطلاحیں بھی رائج ہوتی چلی جائینگی اور ہر شخص کی ذاتی طور پر وضع کی ہوئی اصطلاحوں کو بازار زبان بن جانے کا اچھا موقع نصیب ہوجائیگا۔

اس نمبر میں مولوی سید علی شبیر صاحب پر جناب ابوالمحاسن متین صاحب کا ایک بسیط مضمون شایع کیا جارہا ہے۔ مولوی علی شبیر صاحب ایک کہنہ مشق اہل قلم اور مشہور شاعر ہیں۔ وہ باوجود ملازمت کے بکھیڑوں کے برسوں سے مسلسل لکھتے رہے اور ان کا یہ مشغلہ اس وقت بھی اسی طرح جاری ہے۔ جس طرح شباب کے زمانے میں تھا۔ متین صاحب نے ان کے حالات زندگی، مذہب، نثر و نظم ہر چیز پر تفصیل سے لکھا ہے جس کی وجہ سے یہ مضمون خاصا طویل بھی ہوگیا مگر اس کے ساتھ اس نمبر کا حجم بھی بڑھا کر (۸۰) صفحے کردیا گیا تاکہ دیگر مفید مضامین بھی شایع ہوجائیں اور تنوع برقرار رہے۔

حاجی سیدعلی شبیر

حیدرآباد کا ایک شاعر مورخ

(حاجی سید علی شبیر)

(از)

جناب ابوالمحاسن محمد محسن خاں صاحب متین

حیات - تصانیف - شاعری

تمہید ہمارے اس مضمون کا اصلی محرک، ملک کے مشہور انشاپرداز مولوی میرزا فرحت اللہ بیگ صاحب (بی - اے) کا وہ مضمون ہے جو رسالہ ہمایون ۱۹۳۰ء میں "ایک گمنام شاعر" کے عنوان سے شایع ہوا ہے۔

میرزا صاحب نے اپنے اس مضمون میں، حاجی سید علی شبیر صاحب کے مختصر حالات اور اُن کے مزاحیہ کلام کا نمونہ پیش کرتے ہوئے صفحہ (۹۲۸) پر یہ رائے ظاہر فرمائی ہے کہ "اکبر کے بعد اگر اس رنگ میں کوئی لکھنے والا ہے تو وہ صرف یہی حضرت ہیں" اس سے ہمیں پورا اتفاق ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی عرض کریں گے کہ حاجی شبیر کو محض ایک ظریف شاعر کی حیثیت سے پیش کرنا اُن کے کمالِ علم کو تمامہ نمایاں نہیں کرسکتا تا وقتے کہ اُردو صحافت کو ان کے سنجیدہ کلام اور ان کی تاریخ دانی سے روشناس نہ کیا جائے۔ اگرچہ انھوں نے اس وعدہ کے اظہار کے ساتھ کہ "اگر زمانہ نے فرصت دی اور دماغ نے کام دیا تو پھر کبھی دکھاؤں گا کہ ان کا متین رنگ بھی مزاحیہ رنگ سے کم نہیں ہے" اپنے طویل مضمون کو ختم فرمایا ہے۔ تاہم اُن کی سہولت کے مدنظر، آیندہ صفحات میں حاجی سید علی شبیر کے حالاتِ زندگی، شاعری اور ان کی تصانیف سے متعلق (ہمیں جس قدر علم ہے) ایک اجمالی خاکہ پیش کریں گے۔

عنوان بالا پر خامہ فرسائی کرنے سے پہلے، ہم اس خصوصیت کو، جو حیدرآباد کی نسبت سے پیدا ہو رہی ہے، بیان کرنا ضروری خیال کرتے ہیں: حاجی سید علی شبیر، اس میں ذرا شبہ نہیں (جس کو ہم آگے ظاہر کریں گے) کہ آگرہ کے رہنے والے ہیں، ان کا بچپن بھی وہیں گزرا اور ان کی تعلیم و تربیت بھی

وزیں ہوئی ہے، چونکہ سولہ سال کی عمر (تقریباً ۴۰ سال) سے قیام حیدرآباد کے باعث قانون ملکی کے مدنظر، انھیں وطنیت کے حقوق حاصل ہو گئے ہیں نیز زیادہ تر انھیں حیدرآباد ہی میں امن و سکون کے ساتھ رہ کر اظہار قابلیت کا موقع ملا ہے۔ اس اعتبار سے ہم اپنے مضمون کے عنوان کو حیدرآباد کی نسبت سے سربلند کرتے ہیں تاکہ قارئین پر یہ واضح ہو سکے کہ حاجی شبیر کو حیدرآباد کی فضا میں رہ کر اپنے جوہر قابلیت کے نمایاں کرنے میں کس قدر کامیابی ہوئی؟

حالاتِ زندگی

ولادت ۔ وطن ۔ خاندان حاجی سید علی شبیر سنہ ۱۳ ہجری میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی سید علی نظر مرحوم ریاست ناتھ دوارہ کے رئیس، سری گردھاری جی مہاراج کے معتمد تھے۔ باغراض سرکار اُن کا قیام زیادہ تر آگرہ میں رہتا تھا۔ حکومت ہند نے بھی اُن کو بلحاظ ان کے علم و فضل کے شاہان اسلام کی تیار کردہ مساجد و معابد موقوعہ آگرہ کا اعزازی منتظم مقرر کیا تھا اُن کا انتقال ۱۷ جنوری ۱۹۰۹ء کو ہوا۔ ان کے چچا حکیم سید شمشاد حسین مرحوم حیدرآباد دکن کے مشہور طبیب و منصب دار تھے، پچاس سال تک خلق اللہ کی خدمت کر کے شعبان ۱۳۴۶ ہجری میں بمقام حیدرآباد اسّی برس کی عمر میں انھوں نے انتقال کیا۔ حاجی شبیر کی عمر اُس وقت تقریباً (۹۴) سال کی ہے اور شکل و صورت سے بھی ان کی عمر اسی قدر معلوم ہوتی ہے۔

حلیہ ان کا قد میانہ، جسم دوہرا، رنگ گندمی، چہرہ پُر گوشت، اونچی ناک اور بڑی بڑی آنکھیں ہیں۔ داڑھی چگی مگر ہمیشہ منڈاتے ہیں۔ البتہ سفر حج میں رکھ لی تھی۔ مونچھیں چھدری تل چانولی ہیں۔ بڑھاپے نے اوپر نیچے کے بہت سے دانت توڑ دئے ہیں مگر صرف ایک دانت سامنے کا بنوالیا ہے تاکہ آواز صاف نکلے باقی یوں ہی چھوڑ دیے ہیں۔ بصارت بھی کم ہے، عینک استعمال کرتے ہیں۔ مولوی مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے ان کی صورت کا نقشہ کھینچنے کے بعد ان کی سیرت کی نسبت یہ تحریر فرمایا ہے: "ان کی صورت دیکھکر ہرگز کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ اس بلا کا آدمی ہے"

تعلیم و تربیت حاجی شبیر، چونکہ آگرہ کے تعلیم یافتہ خاندان میں پیدا ہوئے تھے اس اعتبار سے ذکاوت و ذہانت کا ان کے ورثہ میں آنا معمولی سی بات تھی۔ چھٹپن ہی میں، جب کہ

ان کی عمر چار پانچ سال کے درمیان تھی اور ابھی تو تلا پن باقی تھا۔ قرآن شریف ختم کر لیا۔ میرزا یاد علی نور مرحوم سے، جن کے والد ناسخ مرحوم کے مشہور شاگرد میرزا حاتم علی مہر تھے، اکبر آباد کے رہنے والے تھے۔ غالب مرحوم کے رقعات میں ان کے موسومہ بہت سے رقعے ہیں۔ اردو، فارسی، عربی پڑھی اور دس سال کی عمر میں فارسی کے متداول نصاب کی تکمیل کے ساتھ ساتھ انشا بھی سیکھی۔ ان کی شاعری کی بنیاد بھی اُن ہی کے مکتب میں پڑی۔ بیت بازی کے باعث ہزارہا اشعار نوک زبان ہوگئے تھے جن سے شعر موزوں کرنے کا ملکہ پیدا ہوگیا تھا مگر شاعری میں ان کو کسی سے تلمّذ نہیں جیسا کہ "نظم شبیر" کے دیباچے سے ظاہر ہے۔ گیارہ برس کی عمر میں مڈل اور پندرہ سال کی عمر میں میٹرک پاس کیا۔ ایف سال ایف اے میں تعلیم پائی مگر چھٹپن میں دماغ پر چونکہ غیر معمولی بار پڑ گیا تھا، اس وجہ سے اختلاج قلب و درد سر کی شکایت پیدا ہوگئی اور اس اثنا میں ان کے والد کا انتقال بھی ہوگیا۔ مجبوراً مدرسہ چھوڑ دیا اور ۱۳۰۶ فصلی مطابق ۱۸۹۶ء میں اپنے چچا حکیم سید شمشاد حسین مرحوم کے پاس حیدر آباد چلے آئے۔

کتب بینی کا شوق اگرچہ ترک مدرسہ کے ساتھ ہی حاجی شبیر کی باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ ختم ہوگیا مگر اس سے ان کی طالب علمانہ زندگی میں کبھی فرق ہی نہ آیا، بلکہ وہ ہمیشہ اپنے معلومات میں تھوڑا بہت اضافہ کرتے رہے۔ کیونکہ انھیں بچپن سے مطالعہ کتب کا بڑا شوق ہے، اُس زمانے میں جو کچھ انھیں پیسے ملا کرتے وہ تقریباً تمام کے تمام کتابیں خریدنے میں صرف ہو جایا کرتے تھے۔ وہ اب بھی اپنے اوقات فرصت میں، تھکا دینے والی سرکاری مصروفیتوں کے باوجود، تصنیف و تالیف یا مطالعہ کتب میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کا مطالعہ زیادہ تر کتب تواریخ، تذکروں، سوانح، سفرناموں، مذہبی کتب اور عام معلومات کی کتابوں پر مشتمل ہے۔ انھیں افسانوں اور ناولوں کے پڑھنے سے دلی نفرت ہے۔ جس کو انھوں نے ایک قطعہ میں "فحش ناولوں پر ایک نظر" کے عنوان سے ظاہر کیا ہے۔ یہ امر ظاہر ہے کہ تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کی صداقت پسند طبیعت کو فوق فطری باتوں سے کیوں تنفر نہ ہوگا؟ مولوی میرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے ان کے اسی قطعہ کی نسبت ان الفاظ میں رائے ظاہر فرمائی ہے: "آج کل اردو زبان میں ناول جس طرح حشرات الارض کی طرح نکل رہے ہیں اُن کا اس خوبی سے خاکہ اُڑایا ہے کہ تعریف نہیں ہوسکتی۔"

قطعہ بھی ملاحظہ ہو۔

ترقی علم نے کی یاں تک اِس زمانے میں | کہ دیکھے جاتے ہیں ناول نانخانے میں
بُرا نہ ماننا ناول نویس صاحب تم | جو فقرہ ہم کوئی کہہ بیٹھیں دوستانے میں
بنانا جانتے ہو بات کا بتنگڑ خوب | کمال رکھتے ہو تم حاشیہ چڑھانے میں
جو پڑھ سکے ان کو نہ بہکے قصور ہے اُن کا | بھرا ہے تم نے تو جادو ہر اک فسانے میں
اُڑا کے لائے تھے لوگ اگلے قاف سے پریاں | نہ چُوکے پردہ نشینوں کو تم اُڑانے میں
حرم سرا سے بہو بیٹیوں کو تا بازار | کیا نہ تم نے تامّل گھسیٹ لانے میں
شریف زادیوں پر تم نے باندھے وہ طوفاں | سُنے نہ دیکھے جواب تک کسی گھرانے میں
تمھارے علم و لیاقت کے جائیے صدقے | دکھایا خوب ہنر مال و زر کمانے میں
تمھاری قوم جو رسوا ہوئی تو جُوتی سے | تمھارا ایک گیا ناول تو چار آنے میں

ملازمت

نومبر ۱۸۹۸ء میں مدرسہ آصفیہ[۱] واقع ملک پیٹھ حیدر آباد میں سیکنڈ ماسٹر کی جا بلا مواجبی چالیس خالی تھی۔ حاجی شبیر نے بھی درخواست دی۔ متعدد امیدواروں میں سے ان کا انتخاب اس وجہ سے ہوگیا کہ ان کی عمر تمام اُمیدواران میں کم تھی۔ یعنے سولہ برس۔ خیال یہ کیا گیا کہ اس کم عمر اُستاد کے وجود سے طلبا پر جن میں بعض بڑی بڑی عمر کے تھے اچھا اثر پڑیگا۔ حاجی شبیر کو ریاضی و حساب سے بہت دلچسپی تھی اس وجہ سے ثانوی جماعتوں کی تعلیم ریاضی و حساب ان کے سپرد ہوئی۔ کچھ عرصے کے بعد ان کے عادات و اطوار پسندیدہ کے اعتبار سے ان کو ہوس ماسٹر (خانہ اُستاد) بھی مقرر کردیا گیا۔ اور اب ان کی تنخواہ بشمول الونس ساٹھ روپیہ ہوگئی۔ ۱۳۱۵ف میں مدرسہ نسوان[۲] واقع ملک پیٹھ میں

---

[۱] یہ مدرسہ حیدرآباد کے جانب مشرق ایک پرفضا، بلند اور خوش آب و ہوا مقام پر واقع ہے۔ بورڈنگ ہوس (اقامت خانہ) بھی یہاں بہت اچھا ہے۔ اس مدرسہ کا انتظام علیگڈہ کالج کے نمونہ پر کیا گیا ہے۔ کسی زمانے میں جب کہ مولنا عبدالحق بی۔ اے یہاں کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ اس مدرسے کی بڑی شہرت تھی۔

[۲] اس مدرسہ کی لڑکیاں عموماً کم عمر تھیں۔ یہاں کا انتظام جناب میجر نواب ممتاز یار الدولہ بہادر کے سپرد تھا۔

مضمون خوانی و وعظ سکھانے کی خدمت ان کے تفویض کی گئی ۔ حاجی شبیر کو مولانا عبد الحق سے جو اُس وقت مدرسۂ آصفیہ کے ہیڈ ماسٹر تھے بیحد خلوص تھا۔ جب سنہ ۱۳۱۶ ف میں مولینا ممدوح محکمۂ سرکار (ہوم آفس) میں مترجم ہو گئے تو ان کی طبیعت بھی اس مدرسہ سے اُچاٹ ہو گئی اور استعفا دیدیا۔ حاجی شبیر کی یہ ملازمت ساڑھے نو برس رہی۔ مدرسہ آصفیہ کی ملازمت چھوڑتے ہی ایک بڑے امتحان کے بعد جو لکھنے پڑھنے کے علاوہ بھیس بدلنے پر بھی مشتمل تھا، حاجی شبیر خفیہ پولیس اضلاع کی امینی پر نامزد ہو کر پولیس بائز ٹریننگ اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہو گئے، مگر بوجہ علالت ایک سال میں اس نوکری کو بھی استعفاً دے دیا۔ اُس زمانے میں جنوبی افریقہ میں انگریزی پڑھوں کی بڑی ضرورت تھی۔ خاطر خواہ تنخواہ ملجاتی تھی۔ حاجی شبیر نے بھی وہاں درخواست بھیجدی جو منظور ہو گئی مگر بعض احباب نے وہاں کی خطرناک آب وہوا سے ڈرا کر ان کو روک لیا۔ سنہ ۱۳۱۸ ف میں نواب سربلند جنگ مرحوم میر مجلس عدالت العالیہ نے ازراہ قدردانی ان کا تقرر مددگار مترجم انگریزی عدالت عالیہ مواجبی پچاس پر فرمایا۔ اس کے بعد مختلف حاکموں کے زمانے میں بلا کسی سعی و سفارش کے محض اپنی لیاقت و کارگزاری سے ترقی کرتے کرتے سررشتہ دار انتظامی کی خدمت پر جو عدالت العالیہ کی اہم ترین خدمت ہے مامور ہوئے اور تاحال یہ اس خدمت پر کارگزار ہیں۔ البتہ اب یہ عہدہ صدر منتظمی کہلاتا ہے اور اس کی تنخواہ تین سو تا چار سو ہے۔ اور حاجی شبیر کو اس وقت پورے چار سو ملتے ہیں۔

عیال و اطفال

شعرائے فارسی اور خصوصاً صوفیائے کرام کا کلام پڑھتے پڑھتے حاجی شبیر کا خیال رہبانیت کی طرف مائل ہو گیا تھا اور بال بچوں کے بکھیڑے سے مدتوں بھاگتے رہے آخر سنہ ۱۳۱۹ ف میں حکیم سید شمشاد حسین مرحوم کی لڑکی فاطمہ صغرا سے ان کی شادی ہو گئی اور دو لڑکے حامد بن شبیر اور محسن بن شبیر اور ایک لڑکی عاجرہ تولد ہوئی۔ بڑے لڑکے حامد نے (۱۴) سال کی عمر میں میٹرک کامیاب کیا اور تمام ممالک محروسہ میں اول رہکر سونے کا تمغہ اور دو سال تک بیس روپیہ ماہانہ وظیفہ پایا۔ سولہ برس کی عمر میں ریاضی و کیمیا و سائنس لیکر ایف۔ اے۔ اور اٹھارہ سال کی عمر میں خالص ریاضی سے ساتھ بی۔ اے۔ پاس کیا۔ اب یہ ال۔ ال۔ بی میں پڑھ رہا ہے۔ چھوٹا لڑکا محسن اس وقت ایف۔ اے میں ہے۔

مذہب

حاجی شبیر کو مذہب سے بڑی دلچسپی رہی ہے۔ مختلف مذاہب کی اور خصوصاً مذاہب اسلامیہ کی کتب کا مطالعہ انھوں نے بہت غور سے کیا ہے۔ مگر تعصب مذہبی سے ان کو سخت نفرت

رہی ہے جس کی شاہد ان کی نظم "تعصب" ہے جس میں وہ لکھتے ہیں۔

تعصب ہم سمجھتے ہیں تجھے شعلہ جہنم کا
جلایا تو نے شیرازہ ستمگر سارے عالم کا

خدا کی مار تجھ پر تو نے پانی کی طرح ظالم
بہایا خون سطح ارض پر اولاد آدم کا

شہیدان جفا تیرے جہنم کو ڈبو دیں گے
جو پہنچا حشر میں سیلاب ان کی چشم پرنم کا

ہوائے دشمنی تیری بدولت پھر ہے زوروں پہ
دھواں اب عرش تک پہنچا چراغ بزم ماتم کا

حاجی شبیر ایک آزاد خیال شخص ہیں۔ وہ صرف مسلم ہیں اور ان کا مذہب خالص اسلام ہے۔ ان کو صحابہ سے محبت۔ اہلبیت اطہار سے عقیدت اور آنحضرت کی غلامی پر فخر ہے۔

ان کو ہر مسلمان کے ساتھ خواہ وہ سنی۔ شیعہ۔ وہابی۔ مہدوی یا احمدی ہو۔ نماز پڑھ لینے میں تامل نہیں ہوتا۔ مکہ معظمہ میں بھی انھوں نے بجائے کسی ایک مطوف کے حنفی۔ وہابی۔ شیعہ۔ تین مطوفوں سے جن کو معلم یا رہنما بھی کہتے ہیں کام لیا تھا مگر عبادت میں وہ کسی خاص مطوف کے پیرو نہ تھے۔

حاجی شبیر کی صلح مشربی کا دائرہ صرف یہیں تک محدود نہیں بلکہ ان کو غیر مشرب والوں کے ساتھ بھی خلوص و اتحاد رہا ہے چنانچہ ان کے بعض نہایت گہرے دوست ہندو تھے۔ زمانہ طالب علمی میں یہ ان کے تہواروں میں دامے درمے قلمے قدمے شریک ہوتے تھے۔ ہولی کے موقع پر ہولی کھیلتے اور ہولی کے گیت بناتے تھے[1]۔ جنم اشٹمی کے موقع پر بارہا یہ سری کرشن کنھیا جی کے اوصاف بھری سبھا میں بیان کر چکے ہیں۔ اور رام لیلا وغیرہ کے تہوار میں انھوں نے سری رامچندر جی کی دردناک کہانی موثر الفاظ میں سنا کر رقیق القلب

---

[1] ۔ حاجی شبیر کی ہولی کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

آیو پھاگن چھوڑ دو جھگڑا رے
لال کسومی باندھو پگرا رے

باجن لاگے ڈھپ کھنجری۔
گونج اٹھا سارا نگرا رے

بُرربُر برست عبیر گلال۔
کھڑکھڑا کے بھنگ پہ رگرا رے

رنگ کی گلا پہ ماری پچکاری
بھجو نے ڈارو گرتا سگرا رے

ہولی کھیلیں آیو شبیر
رنگ سے بھرے رہیا گھگرا رے

ہندوؤں کو آٹھ آٹھ آنسو رلایا ہے۔

سری کرشن کی تعریف میں ان کی یہ رباعی قابلِ ملاحظہ ہے ؎

دنیا ہی میں مل جاتی ہے ظالم کو سزا فرعون جہاں ہو وہیں آئیں موسیٰ
جب کنس نے لوگوں کا کیا ناک میں دم متھرا میں ہوئے کرشن کنھیا پیدا

بعض اوقات عیسائی دوستوں کے ساتھ کرسمس کے تہوار میں پُرجوش عیسائیوں کی طرح یہ گرجوں میں گئے ہیں۔ حضرت مریم کے قدم چومے ہیں اور یوم صلیب کے تہوار میں صلیب مقدس کو اپنی آنکھوں سے لگایا ہے۔ انھوں نے حضرت عیسیٰؑ کی شان میں ایک بڑا قصیدہ بھی میلاد مسیح کے نام سے لکھا تھا۔ اب اس میں سے صرف یہ چند شعر رہ گئے ہیں:۔

مرحبا ماہ دسمبر، اے کرسمس السلام اے زہے صبح مبارک اے خہے فرخندہ شام
اے خوشا ساعت۔ کہ عالم میں ہوئے اجلوہ گر چارہ ساز دردمنداں عیسیٰ گردوں مقام
مژدۂ جاں بخش پہنچا اب مریضوں کے لیئے جانفزا و رُوح پرور آیا مُردوں کو پیام

اُن کی اب تکمیل انجیل مقدس سے ہوئی
باتیں جو توریت میں کچھ رہ گئی تھیں ناتمام

حاجی شبیر کی بے تعصّبی ہمیشہ ان کو غیر مذہب کے علما اور پیشواؤں کی ملاقات کا بھی شوق دلاتی رہی ہے۔ آگرے میں ایک پادری صاحب سے ان کی بڑی دوستی تھی[۱]۔ اُنھوں نے ان کو اپنے کام کا آدمی سمجھ کر اپنے زمرہ میں شریک کرنا چاہا تھا اور ترغیب دی تھی کہ اگر تم عیسائی ہو جاؤ تو تمکو بڑی خدمت دی جائے گی۔ اسی طرح حیدرآباد میں جب حاجی شبیر ایک رسالہ "صلیب عیسیٰ" کے نام سے مرتب کر رہے تھے اور دورانِ تالیف میں تبادلۂ خیالات کے لیئے یہاں کے ایک مشہور پادری صاحب[۲] کے پاس جایا آیا کرتے تھے تو اُنھوں نے بھی اسی قسم کی فرمائش کی تھی۔

---

[۱]۔ ان کا نام ہے۔ ایم پیٹرسن صاحب تھا۔ آگرے کے مقدسول لائن واقع ہری پربت میں ان کا بنگلہ تھا۔ ضلع آگرہ کے یہ سب سے بڑے پادری تھے۔

[۲]۔ پادر گولڈ اسمتھ صاحب۔

حاجی شبیر کے اس قسم کے آزادانہ خیال سے بعض سُنّی ان کو شیعہ سمجھتے ہیں اور شیعہ ان پر سُنّی ہونے کا گمان کرتے ہیں ان کی حجاز سے متعلق تصنیفات میں چونکہ نجدی حکومت اور سلطان ابن سعود کے انتظامات کی تعریف اور حجاز کے امن وامان کا تذکرہ کیا گیا ہے ان وجوہ سے بعض مسلمان ان کو وہابی مذہب کا داعی اور سلطان ابن سعود کا ہمنوا یا ایک مبلغ تصور کرتے ہیں لطف یہ ہے کہ مولوی میرزا فرحت اللہ بیگ صاحب بی۔ اے مددگار معتمد امور عامہ سرکار عالی نے بھی حاجی شبیر کے مذہب کی نسبت یہ پر لطف خیال ظاہر فرمایا ہے۔ "بلحاظ اپنی سسرال کے شیعہ۔ بلحاظ اپنے خاندان کے سُنّی۔ بلحاظ اپنے خیالات کے صوفی۔ بلحاظ اپنی تحریر کے وہابی۔ اور بلحاظ اپنی تقریر کے کچھ بھی نہیں۔ کبھی ابن سعود کا خلعت زیب تن کئے اور حجاز کی سند ہاتھ میں لئے وہابی سلطنت کی خوبیوں کا پرچار کر رہے ہیں" اس میں شک نہیں ہے کہ حاجی شبیر کی تصانیف ومضامین پر جلالۃ الملک سلطان ابن سعود نے بذریعہ فرامین اظہار مسرت فرمایا ہے اور حاجی شبیر کو خلعت عطا فرما کر ان کی قدر افزائی فرمائی ہے جس سے عام لوگوں کے شبہات کی تائید ہوتی ہے۔ حاجی شبیر نے رفع اشتباہ کے لیے اپنی ایک فارسی نظم میں ان خیالات کی اس طرح تردید کی ہے۔

من چہ گفتم و یاراں چہ جوابم دادند — جرعۂ آب ندادند و شرابم دادند
عاشق گنبد خضرا و وہابی ہیہات — طرفہ قومے است کہ ایں طرفہ خطابم دادند
منت ایں راہزناں راکہ زراہ احساں — مال من جملہ ببردند و حجابم دادند

حاجی شبیر کے بعض احباب جب حج وزیارت کے متعلق اُن کے ترغیب دلانے کو مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگے تو ناچار انھوں نے بھی اُن پر یہ تعریض کی۔

صوفی ہوٹل میں اگر جائے شرابی سمجھو — گوشت کا نام لے بنیا تو کبابی سمجھو
جن کی الماری میں رکھی ہوئی دیکھو انجیل — اُن مسلمانوں کو کفار کتابی سمجھو
عہد نجدی میں جو دے حج وزیارت کی صلاح — پیرزادہ بھی اگر ہے تو...... وہابی سمجھو

قومی و مذہبی خدمات

الف۔ انجمن اصلاح خیالات۔ ۱۹۰۵ء میں حاجی شبیر اور ان کے بعض ہم خیال احباب نے مسلمانوں کی تمدنی اصلاح کی غرض سے بمقام بازار عیسیٰ میاں، واقع حیدرآباد دکن ایک انجمن قایم کی تھی جس کا نام انجمن اصلاح خیالات تھا۔ اس انجمن کے سب سے پہلے صدر اور رکن انتظامی حاجی شبیر تھے۔ یہ انجمن کوئی پانچ سال تک قایم رہی۔ محکمہ تعلیمات نے

مدرسہ وسطانیہ رزیڈنسی اس کے لیئے وقف کر دیا تھا۔ ہر جمعے کو وہاں اس کے جلسے ہوا کرتے تھے۔ جن میں تقریریں کی جاتی تھیں۔ لکچر دیئے جاتے تھے۔ مضامین نظم و نثر پڑھے جاتے تھے۔ ایک نئی بات یہ بھی کہ چھوٹے چھوٹے قومی و اصلاحی ایکٹ (تماثیل) بھی اس انجمن میں ہوا کرتے تھے۔ منجملہ دیگر مقاصد کے خلاف شرع رسوم سے بچنا۔ ملک میں نیچرل شاعری کو رواج دینا۔ صنعت و حرفت و تجارت کی طرف اہل ملک کو راغب کرنا اس انجمن کے خاص مقاصد تھے۔ سب سے پہلے حاجی شبیر نے ہی اس انجمن میں نیچرل شاعری کے نمونے پیش کیے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ جو شاعر اس انجمن کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے ان میں سے اکثروں نے پرانی شاعری ترک کر کے جدید شاعری اختیار کی۔ اس انجمن کے ہر جلسے میں حاجی شبیر کا بھی کوئی نہ کوئی مضمون نظم و نثر ضرور ہوا کرتا تھا یا کسی ایکٹ میں بہ حیثیت ایکٹر (ممثل) وہ حصہ لیا کرتے تھے۔ یہ ایکٹ بھی انھیں کے مرتبہ ہوا کرتے تھے۔ ان کی پُرجوش تقریروں اور پُرلطف نظموں کی وجہ سے بعض صاحبوں نے ان کا نام "انجمن کا شیر" رکھا تھا۔

ب ۔ **مدرسہ آصفیہ کے جلسے** ۔ مدرسہ آصفیہ اپنے جلسہائے پبلک ریڈنگ (مضمون خوانی) کی وجہ سے تمام دکن میں ممتاز رہ چکا ہے۔ اس کے بڑے بڑے جلسوں میں عموماً حاجی شبیر کی نظمیں پڑھی جاتی تھیں اور انھیں کے بنائے ہوئے ایکٹ کیے جاتے تھے۔ ان جلسوں میں عملاً وہ خود بھی بہ حیثیت شاعر و ڈراما نویس و ایکٹر سب طرح حصہ لیا کرتے تھے۔

ج ۔ **مدرسہ نسوان ملک پیٹھ کے جلسے** ۔ حاجی شبیر مدرسۂ نسوان[له] واقع ملک پیٹھ حیدرآباد کے جلسہائے مضمون خوانی کے مہتمم بھی رہ چکے ہیں۔ اس مدرسہ میں ایکٹ (تماثیل) جو زنانہ زبان میں کیئے جاتے تھے اور اُن کے مضامین جو بالخصوص مفید نسوان ہوتے تھے وہ سب ان ہی کے قلم کے لکھے ہوئے ہوتے تھے۔ بہت سی نظمیں بھی خاص اسی مدرسہ کی لڑکیوں کے لیئے حاجی شبیر نے لکھی تھیں۔ اس مدرسہ کا ایک بڑا سالانہ جلسہ ۱۳۱۵ف میں بصدارت محل محترمہ کرنیل سرافسر الملک مرحوم منعقد ہوا تھا۔ جس سے مسلمان مستورات کے تمدن و معاشرت میں ایک حد تک اصلاح ہوگئی تھی اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ حیدرآباد کے مدارس نسوان میں مضمون خوانی، وعظ گوئی اور تماثیل پیش کرنے کے موجد حاجی شبیر ہی ہیں۔

له ۔ اس مدرسہ میں زیادہ تر چھوٹی چھوٹی کم عمر لڑکیاں پڑھتی تھیں۔

۱۹۰۳ء سے قبل یہاں کے نسوانی مدرسوں میں اس قسم کے جلسوں کی مثال غالباً نہ ملے گی۔

د - **انجمن دار التمثیل** - مولوی میرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے اپنے مضمون میں حاجی شبیر کی نسبت ایک جگہ یہ تحریر فرمایا ہے :

"بہروپیا بننے میں ان کو شرم نہیں ایکٹر ہونے میں ان کو دریغ نہیں عجیب شگفتہ طبیعت پائی ہے۔"

میرزا صاحب کا مذکورۂ بالا فقرہ کسی قدر توضیح طلب ہے۔ ہندوستان میں قومی مدارس کے لیے کھیل تماشے کو غالباً سر سید احمد خاں مرحوم و مغفور نے سب سے پہلے جائز قرار دیا تھا۔ اور ایک مرتبہ مدرسۃ العلوم علیگڈھ کے واسطے روپیہ فراہم کرنے کے واسطے اشتہار دیکر علیگڈھ میں تماشا کیا تھا جس میں خود سر سید مرحوم بدوی عرب کا بھیس بنا کر ایک دنبہ کندھے پر رکھے یہ اشعار پڑھتے اسٹیج پر آئے تھے :

ساقیا برخیز در دہ جام را ‏ ‏ خاک بر سر کن غم ایام را

گرچہ بدنامی است نزد عاقلاں ‏ ‏ مانمی خواہیم ننگ و نام را

اس تماشے میں مولوی شبلی مرحوم، علیگڈھ کالج کے بعض پروفیسر اور طالب علم بہ حیثیت ایکٹر شریک تھے۔ اس موقعے پر مولوی شبلی نے ایک نظم پڑھی تھی جس کا ایک بند یہ ہے :

ہائے کیا سین ہے یہ بھی کہ گروہ شرفا ‏ ‏ صاحب افسر و اورنگ تھے جن کے آبا

قوم کے عقدۂ مشکل کے ہیں جو عقدہ کشا ‏ ‏ ایکٹر بن کے وہ اسٹیج پہ ہیں جلوہ نما

قوم کے خواب پریشاں کی یہ تعبیریں ہیں

ایکٹر یہ نہیں عبرت کی یہ تصویریں ہیں

اسی طرح حاجی شبیر اور بعض دوسرے ہمدردان ملک نے بغرض اصلاح ابنائے وطن اور قومی مدارس کی اعانت کے لیے جون ۱۹۱۰ء میں بمقام حیدرآباد دکن انجمن دار التمثیل قایم کی تھی۔ اس میں اصلاحی و نتیجہ خیز قومی ڈرامے کیے جاتے تھے جن سے لوگوں کے خیالات میں عجیب و غریب تغیر ہو گیا تھا اور اہل ملک ایکٹ و ڈراما کو بجائے تمسخر اور نقالی کے اصلاح قومی کا بہترین ذریعہ تسلیم کرنے لگے تھے۔ ان ڈراموں میں گانا بجانا، پردے وغیرہ سب کچھ تھے مگر نہ فحش گیت تھے نہ عاشقانہ قصے۔ نہ زنانہ پارٹ۔ مگر دلچسپی و ظرافت کی بھی کمی نہ تھی۔ عام طور پر لوگ اس کو شرعی ناٹک کہا کرتے تھے۔ حاجی شبیر اس انجمن کے

ڈراما نویس، منیجر، اسٹیج منیجر (منتظم تقریرگاہ) اور ایکٹر تھے۔ خاص طور پر انھوں نے اس انجمن کے لیئے کئی ڈرامے لکھے تھے جن کا ذکر ہم ان کی تصنیفات میں کریں گے۔ حاجی شبیر دار التمثیل کے تماشوں میں مولوی، واعظ، شاعر، سیاسی، مرچڑا فقیر، ٹھگ، ہر بھیس میں جلوہ گر ہو چکے ہیں۔ اس انجمن کے جلسے کوئی ڈہائی مہینے تک ہوتے رہے تھے۔ اس شرعی ناٹک کے جواز اور اس کی ضرورت کے متعلق حاجی شبیر نے ایک معرکتہ الآرا نظم بھی لکھی ہے جس کا عنوان "زمانہ سازی" ہے۔ یہ نظم قوم وملک کے خیالات پلٹ دینے والی نظموں میں سے ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ حاجی صاحب اگرچہ خود ایک ناٹک کر چکے ہیں (گو وہ شرعی ناٹک ہی سہی) مگر عام ناٹکوں کے تماشے دیکھنا وہ حرام سمجھتے ہیں۔ عمر بھر میں انھوں نے تین چار تماشوں سے زیادہ نہیں دیکھے وہ بھی دوستوں کی مجبوری سے۔ عام ناٹکوں کی نسبت انھوں نے اپنی نظم زمانہ سازی میں یہ خیال ظاہر کیا ہے۔

ملک میں موجود ہیں اس وقت جتنی ناٹکیں — فحش اور ناپاک باتوں سے بھری ہیں سربسر
جن کی ہر آن وادا کرتی ہے سوکلی کا کام — نوجوانان وطن کے خرمن پندار پر

انھوں نے ایک اور شعر میں بھی ناٹکوں کی برائی بڑے مزے سے کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

اور تو کچھ بھی نہیں یاروں کے کرتوں کا ثبوت — چھٹے مہینے سے یہاں موجود اک ناٹک تو ہے

اُس کے ساتھ ہی یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حاجی شبیر کو گانا سُننے کا بہت شوق ہے مگر طوائف کا گانا نہیں سنتے۔ لڑکپن میں بھی اس سے نفرت ہی رہی۔ البتہ حال وقال کی محفلوں میں بڑے شوق سے شریک ہوتے ہیں اور نعتیہ کلام کے سوا بمشکل ان کو کوئی نظم پسند آتی ہے۔ محفلِ سماع سے جو کچھ اثر ان کی طبیعت پر ہوا ہے اُس کا اشارہ اُنھوں نے اس شعر میں کیا ہے۔

یکہ بگریختم از صحبت واعظ شبیر — سبق وعظ ھم از چنگ و رباہم دادند

(ھ) انجمن ہدایت الاسلام۔ ۱۹۰۸ء میں دہلی و آگرہ میں ایک انجمن ہدایت الاسلام کے نام سے قایم ہوی تھی جس کا مقصد تبلیغ واشاعت اسلام اور دیہاتی مسلمان خصوصًا ملکانوں کو جنھیں اُس وقت آریا اپنے مذہب میں شریک کرنے کی کوشش کر رہے تھے اسلام پر قایم رکھنا تھا۔ اس زمانے میں حاجی شبیر علیل ہو کر بغرض تبدیل آب وہوا آگرے گئے تھے۔ ارکان انجمن نے ان کو اپنے ڈھب کا آدمی سمجھ کر استدعا کی کہ انجمن مذکور کا وفد جو دیہات میں دورہ کرنے والا ہے اس کے ساتھ

تم بھی چلو تاکہ زبان بھاشا میں جو دیہاتیوں کی زبان ہے، تقریر کرکے اسلام کی خوبیاں ان کے ذہن نشین کی جا سکیں۔ غرضکہ اس وفد نے مضافات آگرہ میں بمقام صالح نگر، فتحپورہ، وسانڈھن کئی بڑے بڑے جلسے کئے جن میں اطراف واکناف کے دیہاتی لاکھ کے مسلمان جمع ہوئے۔ اس وفد میں صرف حاجی شبیر ہی ایک ایسے مقرر تھے جنھوں نے اسلام کے فضائل پر بھاشا زبان میں دلچسپ طویل تقریریں کی تھیں اور دوہروں، اشلوکوں، بھجن وغیرہ سے اپنے مفہوم کو دیہاتیوں کے ذہن نشین کیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ اسلام پر جم گئے۔ اپنے گاؤں میں انھوں نے مدرسے قایم کئے۔ مسجدیں بنوائیں اور ان مقامات سے آریوں کا خطرہ رفع کیا۔

ان جلسوں کے نتائج اور حاجی شبیر کی دلچسپ تقریروں کی کیفیت اخبار مفید عام آگرہ مطبوعہ ۲۰ جون ۱۹۲۸ء میں تفصیل کے ساتھ شایع ہوئی ہے۔ اس وقت ان کی زبان بھاشا میں تقریریں اس قدر دل آویز تصور کی گئی تھیں کہ آگرہ کے شہری لوگوں نے بھی بعض مقامات پر زبان بھاشا میں وعظ بیان کرنے کی ان سے فرمایش کی اور اس کے بعد آگرہ کے مختلف محلوں سیدپارہ، پائے چوکی، ڈولی کہار، سلطان پورہ وغیرہ میں بزبان اردو حاجی شبیر کے جلسہائے وعظ ہوئے۔

(۹) **مجالس عزا** ۔ اصلاحی تقاریر کے علاوہ بارہا مجالس عزا میں بھی حاجی شبیر نے فضائل ومصائب اہلبیت علیہم السلام پر موثر و دلچسپ بڑی بڑی تقریریں کی ہیں جن کو مبصر و نقاد ذاکرین نے پسند فرمایا ہے۔ حضرت سید محمد جونپوری، ایک زبردست بزرگ گزرے ہیں ان کو بعض مسلمان مہدی موعود تصور کرتے ہیں۔ یہ لوگ مہدوی کہلاتے ہیں۔ حضرت مہدی کے متبعین کا ایک گروہ محلہ چنچل گوڑہ وبیگم بازار میں بھی سکونت رکھتا ہے۔ ان لوگوں میں ۱۴ شوال کو حضرت مہدی کے خلیفہ صدیق ولایت سید خوندمیر شہید کی یادگار میں جلسہ ہوا کرتا ہے جس میں وہ پٹکا بھی زیارت کے لئے نکالا جاتا ہے جو بوقت جنگ حضرت خوندمیر باندھے ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ بمقام چنچل گوڑہ حاجی شبیر نے اس جلسے میں بھی پُرجوش تقریر کی تھی جس کا خاص اثر حاضرین جلسہ پر ہوا تھا۔

سفر حج ۔ حاجی شبیر کو زمانۂ طفولیت سے حج بیت اللہ وزیارت بیت الرسول کا بیحد اشتیاق ہے جس کا اندازہ ان کی نعتیہ واشتیاقیہ نظموں ہی سے کچھ ہو سکتا ہے۔ متعدد مرتبہ انھوں نے ارادہ کیا مگر ہر دفعہ کام بن بن کر بگڑ گیا۔ اس مایوسی پر فرماتے ہیں:

ترے لطف وکرم کا سُنکے اذنِ عام بیٹھے ہیں　　مگر اب تک الٰہی ہم یونہی ناکام بیٹھے ہیں
امیروں کے کئی حج ہو چکے - ہم بے نوا اب تک　　اُسی اک فکر میں لینے کی قرض و دام بیٹھے ہیں
خداوندا اجازت ہو کہ یہ ناخواندہ مہماں بھی　　پئے طوفِ حرم باندھے ہوئے احرام بیٹھے ہیں

ایک دفعہ ۱۹۰۰ء میں اشتیاقِ حرمین شریفین نے بہت بے چین کیا تھا مگر اس وقت بیماری نے امیدوں کا خون کر دیا - اور ان کی جمع کردہ پونجی سب علاج معالجہ میں صرف ہو گئی جیسا کہ وہ کہتے ہیں:

جو روپے حج کے لیے ہم نے لگا رکھے تھے　　وائے قسمت کہ وہ قیمت میں دوا کی اُٹھے

اس دفعہ بیماری نے ایسی شدت اختیار کر لی تھی کہ کوئی توقع زندگی کی باقی نہیں رہی تھی حاجی شبیر نے یہ وصیت کی کہ بجائے کفن کے ان کو احرام پہنا دیا جائے - ان واقعات کو انھوں نے ایک نظم میں ادا کیا ہے جس کے دو شعر یہ ہیں:

ضعف نے کر دیا خورشید لبِ بام مجھے　　چاہتا ہے کہ کرے غرقِ سرِ شام مجھے
عرش پر تا کہیں کہتا ہوا پہنچوں لبیک　　دوست پہنا دیں بجائے کفن احرام مجھے

اس کے بعد بھی مدینے کی یاد ہمیشہ ان کو تڑپاتی رہی - خدا خدا کر کے ۱۳۴۵ھ میں اُن کی یہ تمنا پوری ہوئی - وقت روانگی ان کا بڑا لڑکا ایف - اے کا امتحان دے رہا تھا - اور چھوٹا لڑکا محسن آٹھ دس مہینے سے میعادی بخار میں مبتلا تھا - اس کی بیماری تشویشناک ہو گئی تھی، اطباء و احبا کو تردد تھا - اعزا و اقربا ان کو سفرِ حج سے باز رکھنے کی فکر میں تھے مگر انھوں نے جواب دیا کہ "میں خدا و رسول سے حاضری کا وعدہ کر چکا ہوں اور اب صرف زبان سے ہی نہیں بلکہ میرے قلب سے بھی آوازِ لبیک آ رہی ہے - میں اب نہیں رُک سکتا - بیمار کو شافیِ مطلق کے حوالے اور تندرستوں کو حافظِ حقیقی کے سپرد کرتا ہوں" - ان واقعات و جذبات کی تصویر حاجی شبیر نے ان الفاظ میں کھینچی ہے:-

آمادۂ سفر ہے مکے کا اک مسافر　　باندھے ہوئے کمر ہے مکے کا اک مسافر
ہیں جمع اہلِ اُلفت طاری ہے سب پہ رقت　　ہوتا ہے سب سے رخصت مکے کا اک مسافر
منہ سب سے موڑتا ہے سب رشتے توڑتا ہے　　بچوں کو چھوڑتا ہے مکے کا اک مسافر
شبیر دشت پیما شیدائے خاکِ بطحا　　مشتاقِ حج کعبہ، مکے کا اک مسافر

جاتے وقت حاجی شبیر کو دریائی سفر سخت ناموافق ہوا تھا جس سے ایک بُری قسم کا ضیق النفس ہو گیا تھا اور راہ میں سخت

ضعف قلب اور ضعف دماغ وغیرہ عوارض بہت سے اُٹھ بیٹھے مگر سفر حرمین انھوں نے بڑے استقلال سے پورا کیا۔ ہر قابل زیارت چیز کی زیارت کی اور ملنے کے قابل اشخاص سے ملے۔ جلالۃ الملک سلطان ابن سعود کے دربار میں بھی باریاب ہوئے۔ سلطان نے ان کی اسلامی خدمات و تالیفات سے خوش ہوکر ان کو خلعت عطا فرمایا اور بذریعہ فرمان اظہار مسرت فرمایا۔[1]

سفر حج کے تجربات "تاریخ مزارات حرمین"، "تاریخ غلاف کعبہ" اور مختلف مضامین کی صورت میں اہل ملک کے سامنے پیش کئے ہیں۔ سفرنامہ ہنوز طبع نہیں ہوا۔

مضمون نگاری و ادارت

الف۔ مضمون نگاری۔ حاجی شبیر کو مضمون لکھتے ہوئے تقریباً تہائی صدی گزر چکی ہے۔ ان کا مشہور مضمون "فرنگی حجاج" اور بعض دوسرے مضمون "ستارہ پرست قوم" "ہندوستان کی قدیم رصدگاہیں" وغیرہ۔ اب سے کوئی تیس اکتیس برس قبل رسالہ "افسر" حیدرآباد میں شایع ہوئے تھے۔ اس کے بعد سے اب تک ان کی مضمون نگاری نظم نگاری کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ ان کے مضامین زیادہ تر تاریخی ہوتے ہیں جو حیدرآباد و بیرونجات کے مختلف رسایل و اخبارات مثل رسالہ اصلاح خیالات۔ ترقی۔ ترجمان۔ رسالہ صحیفہ۔ ارشاد۔ تحفہ۔ تاج۔ لسان الملک۔ دور ترقی۔ مکتبہ و صحیفہ روزانہ حیدرآباد و صبح دکن و دکن پنچ و توحید امرتسر۔ انقلاب و زمیندار لاہور وغیرہ میں شایع ہوئے ہیں۔ ان مضامین میں قابل ذکر حسب ذیل مضمون ہیں:

آنحضرتؐ کی نسبت بعض عیسائیوں کی رائے۔ مصر میں میلاد النبی۔ گنبد خضرا۔ حجاز کے فرنگی سیاح۔ کعبہ و داخلی کعبہ۔ حجاز میں مذہبی آزادی۔ سفر حجاز۔ مدینے والوں کا ایک پیغام۔ حرمین کے مُصلّوں پر ایک تاریخی نظر۔ اختلاف نماز کے متعلق مسلمانوں سے اپیل۔

(ب) ادارت۔ ۱۳۱۶ف میں حاجی شبیر کے زیر ادارت حیدرآباد سے ایک ہفتہ وار اخبار "المحبوب" کے نام سے جاری ہوا تھا جو ان کے چھوٹے بھائی علی قاسم مرحوم کے مطبع قاسم پریس واقع چیلی گوڑہ سے چھپکر شایع ہوتا تھا۔ "المحبوب" محض اخبار ہی نہ تھا بلکہ اعلیٰ درجہ کا ایک باتصویر ادبی رسالہ تھا۔ اس کے مستقل عنوان۔ مشاہیر عالم۔ دیار و امصار۔ مشہور عمارات۔ ایجاد و اختراع۔

---

[1] اس کے بعد حاجی شبیر کے بعض تالیفات پر سلطان ابن سعود نے ان کو ایک اور خلعت عطا کیا اور دو فرمان نافذ کیے ہیں۔

وحوش وطیور۔ اصلاح تمدن۔ صنعت وحرفت۔ دکن کے ہونہار بچے۔ شعروشاعری۔ عالم نسوان وغیرہ تھے۔ اور ہر مقتہ ان تمام عنوانات پر مضمون درج ہوا کرتے تھے۔ اس اخبار نے تھوڑے سے ہی دنوں ملک میں بڑی شہرت ومقبولیت حاصل کرلی تھی اور ہر سوسائٹی میں بڑی قدر کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ یہ تقریباً ایک سال تک چلا، مگر اس کے ایک سرپرست کے دفعتہً انتقال اور بعض دیگر معاونین کے سیاسی تغیر وتبدل کی وجہ سے بند ہوگیا۔

تصنیفات وتالیفات

حاجی شبیر کی تصنیفات کے متعلق اگرچہ مولوی مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے کوئی تفصیلی تبصرہ نہیں فرمایا ہے تاہم وہ نہایت جامع وبلیغ الفاظ میں رائے ظاہر فرماتے ہیں: "اب ان کی طبیعت کی تیزی اور براقی ملاحظہ ہو۔ نثر یہ لکھیں، نظم یہ لکھیں، تاریخ میں ان کو دخل، کبھی انگریزی نظموں کو اردو میں نظم کررہے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ ایک لفظ نہ چھوٹے اور محاورے میں پوری اتریں، کبھی برکھارٹ کے سفرنامے کا ترجمہ کررہے ہیں اور اس پر ایسے نوٹ لکھ رہے ہیں کہ دیکھکر طبیعت لوٹ ہوجاتی ہے"۔ اس کے بعد ایک اور جگہ نہایت برجستہ الفاظ میں تحریر فرماتے ہیں۔ "ان کا قلم مذہبی مضامین پر بھی ایسا ہی چلتا ہے جیسا مذاقیہ مضامین پر اور وہ نثر بھی ایسی ہی دلکش ودلچسپ لکھتے ہیں جیسی نظم"۔

مولوی میرزا فرحت اللہ بیگ صاحب جیسے ماہر ونقادِ نظم ونثر کے مذکورہ بالا رائے کو پیش کرنے کے بعد ہم حاجی شبیر کی تصنیفات پر کوئی تبصرہ غیر ضروری سمجھ کر صرف اس کی تفصیل پر اکتفا کرتے ہیں۔

حاجی شبیر کی تصنیفات کے چار عنوان قرار دیئے جاسکتے ہیں:۔

(الف) نثر۔ (ب) تراجم۔ (ج) نظم ونثر مشترک (ڈراما)۔ (د) نظم۔

اولاً ہم حاجی شبیر کی تالیفات پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالتے ہیں، اس کے بعد دوسرے اصناف کا ذکر کریں گے۔

نثر

(۱) محاکمہ قطعات ابن یمین وسعدی۔ اگرچہ ہے تو یہ صرف سو صفحے کا رسالہ مگر ایک معرکۃ الآرا چیز ہے۔ تقریباً چھ سو برس سے تمام اہل ذوق وتذکرہ نویس ومورخ اس پر متفق تھے کہ "فارسی قطعات ابن یمین سے بہتر آج تک کسی نے نہیں لکھے اور جس طرح کہ رباعیات کی استادی عمر خیام پر ختم ہے اسی طرح قطعات کے استاد ابن یمین ہیں"۔ مگر حاجی شبیر نے سعدی وابن یمین کے قطعات کا تقابلی مطالعہ کرکے ان پر ایک

زبردست محاکمہ تحریر کیا ہے جسکے ذریعہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ بمقابلہ ابن یمین قطعات میں بھی اُستادی کے زیادہ مستحق سعدی ہی ہیں۔ دو اہل زبان اُستادوں کے کلام کی تنقیص و تعریف و تنقید کرنا ایک ہندی کے لئے بڑا دشوار کام تھا مگر حق یہ ہے کہ انھوں نے حق محاکمہ نویسی ادا کر دیا۔ جن حضرات نے اس محاکمہ کو پڑھا ہے وہ ان کی رائے سے بالکل متفق ہیں۔ محکمہ تعلیمات سرکار عالی کی مجلس انتخاب کتب نے ازراہ قدردانی بذریعہ گشتی تمام مدارس فوقانیہ کے کتب خانوں کے لئے اس کتاب کی خرید منظور فرمائی ہے۔ اس محاکمہ میں ابن یمین کی تفصیلی سوانح حیات بھی شریک ہے۔

(۲) **رسالہ محاسب** ۔ یہ کتاب اگرچہ ایک فنی کتاب ہے اور نظم و نثر کی تعریف سے خارج ہے تاہم اس کا شمار ہم نے نثر میں ہی کیا ہے۔ حاجی شبیر نے ۱۳۱۲ف میں زبانی حساب کے متعلق ایک جامع کتاب محاسب کے نام سے لکھی تھی جس میں اس قسم کے اُصول اور گُر تحریر کئے تھے کہ کاغذ و قلم کی مدد بغیر ناپ تول۔ قیمت وزن وغیرہ معلوم ہوسکے۔ اس طرح اُس کمی کو پورا کر دیا تھا جو ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں میں موجود ہے اور ذرا سے حساب لگانے کے لئے ان کو کاغذ پنسل کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ کتاب تین حصوں پر منقسم ہے جو ابتدائی جماعتوں سے لگاکر وسطانیہ جماعتوں تک کارآمد ہوسکتی ہے۔ نواب عماد الملک مرحوم ناظم تعلیمات نے اس کتاب کو بہت پسند فرمایا تھا اور کمیٹی نصاب میں پیش کرنے کا حکم دیا تھا مگر حاجی شبیر کے تساہل سے یہ مرحلہ طے نہ ہوا۔ محاسب طبع ہوچکا ہے۔

(۳) **اُردو شاعری کے ہندی خصوصیات** ۔ یہ رسالہ ۱۳۱۵ف کی تالیف ہے اور ایک دلچسپ بیش بہا لغت یا کتاب معلومات کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں بحوالہ اشعار خصوصیات ہند کی توضیح کی گئی ہے۔ اس میں مختلف عنوان ہیں۔ مثلاً ہندوستان کے اوتار و معبود۔ ہندوستان کے دیوتا اور دیبیاں۔ ہندوستان کے قدیم مشاہیر ہندوستان کے دریا، پہاڑ، شہر وغیرہ۔ ہندوستان کے میلے اور تہوار۔ ہندوستان کی رسوم و توہمات۔ وغیرہ...... ہر عنوان کے تحت مختلف اساتذہ کے اشعار درج ہیں اور ان اشعار میں جو تلمیحات یا قصہ طلب باتیں آئی ہیں یا جس اوتار، معبود وغیرہ کا ذکر آیا ہے۔ اس کی شرح نہایت خوبی کے ساتھ کی گئی ہے۔ اس رسالہ کے دیکھنے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ حاجی شبیر کو صاحبان ہنود کے اعتقادات و روایات کے متعلق کس قدر معلومات حاصل ہیں اور ہندوستان کے رسوم و توہمات وغیرہ کی نسبت ان کا تبحر کہاں تک ہے۔ یہ رسالہ ۱۳۱۶ف میں جزو جزو اخبار "المحبوب" حیدرآباد میں شایع ہوا تھا۔ چونکہ اس میں صاحبان ہنود کے

پیشواؤں کا ذکر بڑے احترام و ادب کے ساتھ کیا گیا ہے اس وجہ سے اس کے مضامین پڑھ کر اہل ہنود کے دلوں پر خاص اثر ہوا تھا اور اُس زمانے میں اضلاع کے رہنے والے بعض اصحاب جب حیدرآباد آئے تھے تو محض اس مضمون کی وجہ سے حاجی شبیر سے بھی ملاقات کیا کرتے تھے۔

(۴) **حجاز کے فرنگی سیّاح** ــ یہ کتاب اولاً ایک مضمون کی صورت میں نومبر سنہ ۱۹[illegible]ء میں سالہ افسر حیدرآباد میں شایع ہوئی تھی۔ جس سے بعض دوسرے اخبارات و رسایل نے بھی نقل کی تھی۔ اس کے بعد حاجی شبیر نے باوقات مختلف اس میں اضافہ و ترمیم کی اور اب یہ کوئی تین سو صفحے کی کتاب ہوگئی ہے۔ اسمیں اُن تمام فرنگی سیّاحوں کے حالات اور اُن کے واقعات سفر پر تبصرہ درج ہے جنھوں نے مسلمانوں کا بھیس بناکر سفر حجاز کیا ہے۔ اس کتاب میں مورخانہ حواشی، جغرافی تعلیقات، تردیدی و اصلاحی توضیحات جو تحریر کیے گئے ہیں وہ بھی ان ہی کا حصہ ہے۔ ان کی تمام تالیفات میں صرف یہی ایک کتاب ایسی ہے جس کی تکمیل میں تقریباً تین سال صرف ہوئے ہیں۔ اس کتاب کے نقش اوّل کے گیارہ برس بعد یعنی سنہ ۱۹[illegible]ء میں اسی مضمون پر "اے رالی" صاحب کی کتاب کرسچنز ایٹ مکہ (پیروان مسیح مکہ میں) بزبان انگریزی شایع ہوئی جس میں ان ہی سیّاحوں کے حالات درج ہیں۔ وہ بھی ایسے بسیط نہیں جیسے کہ انھوں نے لکھے ہیں حواشی، تعلیقات، تردید و تصحیح کا تو ذکر کیا ہے۔ حاجی شبیر کی اس تالیف کے چیدہ چیدہ اجزا حیدرآباد کے مختلف رسایل، ترقی، ترجمان، دور ترقی اور مجلۂ مکتبہ میں شایع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب میں مسلمانوں کے لیئے بصارت و بصیرت سب کچھ موجود ہے۔ اور اپنی نوعیت میں اُردو میں تو کیا کسی اور زبان میں بھی یہ پہلی کتاب ہے۔

(۵) **تاریخ غلاف کعبہ** ــ یہ تاریخ سنہ ۱۹۲۳ء میں اولاً رسالۂ لسان الملک حیدرآباد میں شایع ہوئی تھی، جس کا حجم کوئی پچھتر صفحے تھا۔ بحیثیت مجموعی اُس وقت بھی یہ مکمل سمجھی گئی تھی اور اہل ملک نے اس کی نسبت بہت اچھے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ ہندوستان سے باہر حجاز میں بھی اس کی قدر ہوئی۔ جلالۃ الملک سلطان عبدالعزیز ابن عبدالرحمٰن ابن سعود ملک حجاز و نجد کے حکم سے اس کا ترجمہ عربی میں کیا گیا۔ اور اس کا اقتباس اُس جلسہ میں پڑھا گیا جو بتاریخ ۴ ذی الحجہ سنہ ۱۳۴۶ھ مکۂ معظمہ میں اس تقریب میں منعقد ہوا تھا کہ غلاف کعبہ بجائے مصر کے مکۂ معظمہ میں تیار ہو۔ حاجی شبیر کی جن تالیفات پر سلطان ابن سعود نے بذریعہ فرامین اظہار خوشنودی فرمایا ہے اور خلعت عطاء فرمائی ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔

سات سال کے بعد حاجی شبیر نے نظرثانی کر کے اس کتاب کو زیادہ مکمل و جامع بنا دیا ہے۔ اب اس کا حجم تقریباً ڈیڑھ سو صفحے ہو گیا اور غلافِ کعبہ و محمل مصری وغیرہ کے ضروری تصاویر سے کتاب کی رونق و دلکشی میں بہت کچھ اضافہ ہو گیا ہے۔

(۲) تاریخ حجرِ اسود۔ ۱۹۲۷ء میں یہ تالیف بھی رسالہ لسان الملک میں شایع ہوئی تھی۔ اپنی نوعیت میں یہ بھی بے مثل کتاب ہے۔ اس میں حجر اسود کے متعلق تفصیلی واقعات و تاریخی حالات درج ہیں۔ اسکے ساتھ ان اعتراضات کی تردید بھی مورخانہ انداز سے کر دی گئی ہے جو غیر مذہب والے مسلمانوں کی اس پتھر کی تعظیم کے بارے میں کرتے ہیں۔ یہ دلچسپ واقعات و مفید معلومات سے لبریز کتاب ہے۔

(۷) تاریخ مزاراتِ حرمین۔ یہ کتاب حاجی شبیر کی تالیفات میں نہایت معرکۃ الآرا ہے۔ اس نے ہندوستان سے لے کر حجاز تک دھوم مچا دی ہے اور یہی وہ کتاب ہے جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کے خیالات میں بڑی حد تک اصلاح کر دی ہے۔ اس میں مکۂ معظمہ و مدینۂ منورہ کے تمام مشہور مزارات و مقابر اور ان کے مدفونین کے تفصیلی حالات و تاریخی واقعات زمانۂ حضور سرورِ عالم صلعم سے اب تک درج ہیں۔ اس کتاب کے ملاحظہ سے ان مزارات کی تمام کیفیت آئینہ ہو جاتی ہے کہ کتنی صدیوں تک یہ مزارات بغیر گنبدوں کے رہے؟ یہ گنبد کب بنے، کب ٹوٹے، پھر کب بنے؟ حضور سرورِ عالم کے روضۂ مبارک کے جس قدر تفصیلی حالات اس کتاب میں درج ہیں کسی کتاب میں آج تک نہیں لکھے گئے۔ غرضکہ حرمین شریفین کے مزارات کی حد تک اس کتاب کے دیکھنے کے بعد اردو، فارسی، عربی، انگریزی کی کسی کتاب کے دیکھنے کی حاجت باقی نہیں رہتی۔ سوا تین سو صفحے کی کتاب ہے۔ ملک کے مشہور مورخ علماء، اخبار و رسائل نے اس کتاب کی نسبت بہترین الفاظ میں رائے ظاہر فرمائی ہے۔

ان کی اس کتاب اور بعض دوسری تصانیف کا جو کچھ اثر حجاز میں ہوا ہے اس کی نسبت عالیجناب الحاج نواب ناظر یار جنگ بہادر ایم اے ال ال ڈی بیرسٹر ایٹ لا (رکن عدالت العالیہ سرکار عالی) ارشاد فرماتے ہیں:

"مولوی علی شبیر صاحب صرف سررشتہ دار مجلس عالیہ عدالت ہی نہیں بلکہ وہ دوسرے طور پر ملک کی اعلیٰ ترین خدمات انجام دے کر مملکت آصفیہ کی نیک نامی کا باعث ہوئے ہیں۔ میں نے ان کی عمدہ تصانیف کا خود مطالعہ کیا اور مملکت حجاز میں متعدد اصحاب سے حیدرآباد کی تعریف ان کی مفید و

عمدہ تصانیف کے تعلق سے بنی جس کا مجھ پر خاص اثر ہوا۔"

تاریخ نگاری میں باعتبار تحقیق و تلاش حاجی شبیر کا جو کچھ ڈھنگ ہے اُس کا نمونہ ہم مزارات حرمین سے اس جگہ پیش کرتے ہیں :۔

بیت الحزن ۔ حضرت علیؓ کا یہ مکان جنت البقیع میں مقبرۂ اہلبیت کے داہنی جانب کوئی بیس قدم کے فاصلہ پر واقع تھا اور جناب سیّدہ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد یہاں گریہ وزاری و عبادت الٰہی میں مصروف رہا کرتی تھیں ۔ ایک روایت کے بموجب ان کی قبر شریف یہاں بھی بیان کی جاتی ہے۔ امام محمد غزالی نے ۵۰۵ھ میں احیاء العلوم میں اس کو مسجد فاطمہ سے تعبیر کیا ہے اور اس میں نماز پڑھنے کی ہدایت کی ہے (احیاء العلوم عربی مطبوعہ مصر جلد دوم صفحہ ۲۴۵) ۔ ابن جبیر نے ۵۸۰ھ میں بیت الحزن کا ذکر کیا ہے مگر یہ نہیں لکھا کہ اُس وقت یہ کس شکل کا تھا ۔ اس پر کوئی قبہ تھا یا نہ تھا ۷۲۶ھ میں ابن بطوطہ نے صرف اس کے نام پر اکتفا کی ہے ۔ ۸۸۶ھ میں سمہودی بھی اس کا دوسرا نام مسجد فاطمہ لکھتے ہیں ۔ اس وقت یہاں قبہ موجود تھا اور قبہ کے اندر حضرت فاطمہ کی قبر بھی بنی ہوئی تھی ۔ (وفاء الوفا عربی مطبوعہ مصر جلد دوم ذکر بقیع) جذب القلوب میں ۱۰۰۱ھ میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے قبر کا ذکر نہیں کیا ۔ ۱۲۱۹ھ میں جب سعود اول امیر نجد کا مدینہ منورہ پر قبضہ ہوگیا تو اس وقت بقیع کے دوسرے قبوں کے ساتھ قبۂ بیت الحزن بھی منہدم کر دیا گیا ۔ اس کے دس گیارہ برس بعد تخمیناً ۱۲۳۱ھ میں محمد علی پاشا والی مصر نے نجدیوں کا قبضہ حجاز سے اُٹھا دینے کے بعد دوسرے قبوں کے ساتھ اسے بھی تعمیر کرا دیا ۔ مگر غالباً قبر کی علامت اس میں نہیں بنوائی کیونکہ ۱۲۸۰ھ میں جعفر برزنجی اپنی کتاب نزہتہ الناظرین میں بیت الحزن کے اندر علامت قبر کی عدم موجودگی ظاہر کرتے ہیں ۔ مگر ۱۳۱۹ھ میں ڈاکٹر نور حسین صاحب صابر اس میں مزار جناب فاطمہؓ کا وجود لکھتے ہیں ۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

"قبہ بیت الحزن میں سیڑھیوں سے اُتر کر داخل ہوتے ہیں ۔ قبلہ کی طرف مزار پر انوار خاتون قیامت ہے۔" (رفیق الحجاج ذکر جنت البقیع ۔)

اس کے چھ برس بعد مولوی صبغتہ اللہ صاحب ساکن مدراس اپنی کتاب السکینہ باخبار مدینہ میں لکھتے ہیں کہ :۔

"بیت الحزن میں قبر کا نشان نہیں ہے۔"

اس کے چار برس بعد قبر کا وجود پھر تا یا جاتا ہے چنانچہ خواجہ غلام الثقلین مرحوم اپنے روزنامچہ میں بیت الحزن کے ذکر میں فرماتے ہیں۔

"اس مقام پر ایک مختصر سنگین مسجد جس کے در پر ترکی کتبہ ہے۔ اندر مثل محمل کے ایک مقام دو گز لانبا ایک گز چوڑا اور سوا گز بلند بنا ہوا ہے جس کا آہنی دروازہ ہے اور اوپر سبز مخمل کا غلاف پڑا ہوا ہے۔ یہاں بھی دو رکعت نماز پڑھی۔ مسجد کے در پر کتبہ سلطان عبدالحمید خاں[1] کے زمانہ کا ہے۔"

تقریباً ۱۳۴۲ھ میں اہل نجد کا قبضہ حجاز پر دوبارہ ہوگیا اور قبۂ بیت الحزن بھی دوسرے قبّوں کے ساتھ پھر منہدم کر دیا گیا۔ اس گنہگار نے ۱۳۴۵ھ میں اس مقام پر جہاں یہ مکان واقع تھا کوئی علامت کسی قسم کی نہ پائی سطح زمین تھی۔

(۷) تاریخ نماز حرم۔ حاجی شبیر کی یہ تالیف ہنوز شائع نہیں ہوئی ہے مگر دو سو صفحے کی مکمّل موجود ہے۔ اس میں حضور سرورِ عالم و خلفائے راشدین و خلفائے بنی اُمیّہ و بنی عبّاس و خلفائے اسماعیلیّہ مصر و فرقۂ زیدیّہ و قرامطہ و ملوک سلاطین و سلاطین عثمانیہ وغیرہ کے زمانہ سے لیکر اب تک جس جس طرح حرم بیت اللہ میں نماز ادا ہوئی ہے اُس کے تفصیلی واقعات اور حرم میں حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، مُصلّیات کی تعمیر و ترمیم کے تاریخی حالات بڑی وضاحت سے بیان کیے گئے ہیں۔ زمانہ حج میں جن جن مساجد ماثورہ میں حُجّاج نمازیں پڑھتے ہیں اُن کی کیفیت اور نماز عیدین و نماز جمعہ و نماز جنازہ کے حالات بڑے دلچسپ پیرایہ میں بیان کیے گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید اس میں فقہ کے پیچیدہ مسائل بیان کئے ہوں گے مگر ایسا نہیں ہے۔ حاجی شبیر نے دائرۂ تاریخ سے آگے قدم نہیں رکھا ہے۔ اس کتاب کا ایک باب جس کا عنوان "مسلمانوں سے اختلاف نماز کے متعلق اپیل" ہے۔ ذیقعدہ ۱۳۴۸ھ میں اخبار صحیفہ حیدرآباد کے کئی نمبروں میں باقساط شایع ہوچکا ہے۔ اور یہ ایک ایسی تحریک ہے جس پر مسلمانوں کو اب نہیں تو آیندہ توجہ کرنی پڑے گی۔ اپیل یہ کیا گیا ہے کہ ہاتھ باندھنے، کھولنے، سینے پر یا ناف پر ہاتھ رکھنے اور آمین وغیرہ کے کل اختلافات مسلمانوں کو مٹا دینے چاہئیے اور آنحضرت کے متواتر یا آخری عمل سے جو طریقہ نماز ثابت ہو اسی ایک طریقہ پر تمام دنیا کے مسلمانوں کو عمل پیرا ہوجانا چاہیئے تاکہ کم از کم نمازیں تو ہر فرقہ کے

---

[1] عبدالحمید خاں ثانی کا عہد ۱۲۹۳ ہجری سے ۱۳۲۷ ہجری تک ہے۔

مسلمان متحد ہو جائیں، یہ کتاب ابھی طبع نہیں ہوئی، توفیق الٰہی درکار ہے۔

(۸) میرا پہلا حج ۔ حاجی شبیر کا یہ سفرنامۂ حج ہے۔ ۱۳۵۸ھ میں انہوں نے حج کیا تھا۔ اور اس اُمید پر کہ اللہ تعالیٰ آئندہ بھی ان کو حج سے مشرف فرماتا رہیگا اس سفرنامہ کا یہ نام رکھا ہے حاجی شبیر کا یہ سفر کوئی معمولی نہ تھا۔ باوجود شدید علالت کے حرمین شریفین میں اُنھوں نے کوئی لمحہ بیکار نہ جانے دیا۔ جس جگہ ان کا قدم پڑا وہاں انھوں نے کچھ سوچا اور جو چیز ان کے سامنے آئی اس میں انھوں نے کچھ دیکھا۔ مکہ و مدینہ میں انھوں نے متعدد اشخاص اپنے رہنما مقرر کئے تھے۔ جن سے وہ نادر معلومات حاصل کرنے میں یہ مصروف رہتے تھے۔ حاجی شبیر کی اس تحقیق و تلاش کے اعتبار سے مجلۂ مکتبہ نے اسفندار ۱۳۴۸ف میں ان کے مضمون "گنبد خضرا" پر یہ ریمارک کیا تھا:

"مولوی علی شبیر صاحب اُن افراد سیر میں سے ہیں جنھوں نے ارض حجاز کے
چپہ چپہ کی جغرافیائی اور وہاں کے قبور کی ایک ایک اینٹ کی اپنے عینی مشاہدہ کے
ذریعہ سے تاریخی تطبیق کی ہے۔"

حاجی شبیر کا سفرنامۂ حجاز ایسا مکمل و جامع سفرنامہ ہے جس میں روانگی سے واپسی تک ضروری واقعات منازل و مزارات و اماکن مقدسہ و مراسم مروجہ کے تاریخی حالات، مناسک حج، اور حجاز کے تمدن و معاشرت وغیرہ کا تفصیلی تذکرہ کامل تحقیق کے ساتھ نہایت دلچسپ پیرایہ میں تحریر ہے۔ ہنوز یہ سفرنامہ طبع نہیں ہوا۔ البتہ اس کے بعض اجزا، باوقات مختلف اخبار صحیفہ حیدرآباد و اخبار توحید امرتسر اور اخبار ام القریٰ مکہ معظمہ میں شایع ہو چکے ہیں۔

ب۔ تراجم ۔ اگرچہ حاجی شبیر نے بعض انگریزی نظموں کے ترجمے بھی کئے ہیں جن کی نسبت جناب مولوی میرزا فرحت اللہ بیگ صاحب تحریر فرماتے ہیں: "کہیں انگریزی نظموں کو اُردو میں نظم کر رہے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ ایک لفظ نہ چھوٹے اور محاورے میں پوری پوری اُتریں۔" مگر اس جگہ ہم صرف ترجمہ نثر سے بحث کریں گے۔

(۱) ترجمۂ سفرنامہ برکھارٹ ۔ یورپ میں برکھارٹ ساکن سوئزرلینڈ اپنے وسیع معلومات اور زبردست تحقیقات کے لحاظ سے عرب کے سیاحوں کا بادشاہ کہلاتا ہے۔ اس نے مسلمانوں کے بھیس بنا کر شیخ ابراہیم ابن عبداللہ کے نام سے ملک شام و نوبہ و حجاز کا سفر کیا تھا۔ اور ۱۸۱۴ء میں شریک حج تھا۔

تلاش و تحقیق برکھارٹ کی طبیعت کا جزو تھی۔ خصوصاً حجاز کے حالات جس تفصیل سے اس نے لکھے ہیں اسکی نظیر نہیں ملتی۔ برکھارٹ کی تحریر میں تعصب بھی کم پایا جاتا ہے۔ مصر میں یہ عام طور پر مسلمان مشہور تھا۔ اور لوگ اس کو ابراہیم برکات یا شیخ برکات کہا کرتے تھے۔ ۱۸۱۷ء میں بمقام قاہرہ اس نے انتقال کیا اس کی تجہیز و تکفین اسلامی طریقہ سے ہوئی اور شیخ یونس کے مقبرے میں دفن ہوا۔ اس کے سنگ مزار پر اس کا نام ابراہیم بن عبداللہ بورک ہارٹ کندہ ہے۔

سرسید احمد خاں مرحوم نے برکھارٹ کے علم و فضل کی وجہ سے اپنی کتاب خطبات احمدیہ میں اس کے نام کے ساتھ "رضی اللہ عنہ" لکھا ہے۔ برکھارٹ کا سفرنامہ حجاز تقریباً نایاب ہے۔ یہ سنہ ۱۸۲۹ء میں بزبان انگریزی دو جلدوں میں شایع ہوا تھا۔ جس کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں بھی ہے۔ حاجی شبیر نے اس نسخہ کا ترجمہ سنہ ۱۳۲۲ف میں نہایت عجلت کے ساتھ صرف (۱۹) دن میں کیا تھا۔ یہ صبح سے شام تک کتب خانہ میں بیٹھے ترجمہ کیا کرتے تھے دونوں جلدوں کے ترجمہ کی ضخامت معمولی تقطیع پر ساڑھے چار سو صفحے ہے۔ یہ ترجمہ اولاً رسالۂ افادہ حیدرآباد میں شایع ہونا شروع ہوا تھا۔ چند اجزا طبع ہونے پائے تھے کہ رسالہ کو مرگ مفاجات نے آلیا۔ اور وہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ ۱۳۳۵ف رسالۂ دور ترقی حیدرآباد نے اس ترجمہ کی پہلی جلد جس کی ضخامت تخمیناً دو سو صفحے ہے۔ تاج پریس حیدرآباد میں طبع کرائی جس پر حیدرآباد کے مشہور مورخ مولوی سید شمس اللہ صاحب قادری نے دیباچہ تحریر کیا ہے۔ اس سفرنامہ میں حاجی شبیر نے جو محققانہ نوٹ تحریر کئے ہیں۔ مدیر رسالہ نے آخر کتاب پر ان کے طبع کرنے کا وعدہ کیا تھا مگر افسوس ہے کہ اس سفرنامہ کی دوسری جلد شایع نہ ہوسکی اور وہ نوٹ بھی رہ گئے۔ جناب مولوی میرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے اس ترجمے کے متعلق یہ تحریر فرمایا ہے۔ "کبھی برکھارٹ کے سفرنامے کا ترجمہ کر رہے ہیں اور اس پر ایسے نوٹ لکھ رہے ہیں کہ دیکھکر طبیعت لوٹ ہوجائے"۔ اس سفرنامہ کی جلد اوّل میں جدّہ و طائف و مکہ کے حالات ہیں۔ دوسری جلد میں سفر مدینہ اور مدینے سے قاہرہ تک واپسی کے حالات ہیں۔ اس ترجمے کے متعلق بڑے بڑے مبصروں کی رائے ہے کہ اس سے بہتر ترجمہ کسی سفرنامے کا نہیں ہوسکتا۔ شروع سے آخر تک پڑھتے چلے جائیے یہ پتہ نہیں لگتا کہ یہ اصل کتاب ہے یا ترجمہ۔ پھر لطف یہ ہے کہ لطافت زبان اور محاورے کہیں ہاتھ سے نہیں گئے۔ اور لفظی پابندی کا بھی لحاظ رکھا ہے۔

(۲) ترجمہ تاریخ وہابیہ مصنفہ برکھارٹ۔ یہ تاریخ سیّاح عرب برکھارٹ کی انگریزی کتاب " نوٹس آن دی بیڈوئنس اینڈ وہابیز" یعنی " بدویوں اور وہابیوں کے حالات" کا ترجمہ ہے۔ جس زمانہ میں برکھارٹ حجاز گیا ہوا تھا اُن ہی دنوں میں حرمین سے وہابیوں کا قبضہ اُٹھ چکا تھا۔ مگر ابھی محمد علی پاشا والی مصر ترکوں کی فوج لئے طائف میں پڑے ہوئے تھے اور کہیں کہیں وہابیوں اور ترکوں میں لڑائیاں بھی ہو رہی تھیں۔ برکھارٹ نے اسی عہد کی تاریخ لکھی تھی جس میں وہابیوں کے مذہب، ان کی فتوحات حجاز، ان کے انتظامات اور ان کے عادات واطوار اور حجاز سے ان کی واپسی وغیرہ کے تفصیلی حالات درج ہیں۔ چونکہ برکھارٹ ایک غیر جانب دار معاصر کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے اس کی تاریخ ایک خاص وقعت واہمیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب بھی کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ حاجی شبیر نے اس کا ترجمہ جس کی ضخامت ڈیڑھ سو صفحے ہے پانچ دن میں ختم کیا تھا لیکن اس محنت شاقہ کی وجہ سے وہ سخت بیمار ہو گئے تھے اور تین مہینے تک کسی کام کے نہ رہے۔ یہ کتاب بھی طبع نہیں ہوئی ہے۔ اس کے پڑھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہابی جن کو عام مسلمان ہوّا سمجھتے ہیں اُن کی نسبت ایک فرنگی کیا لکھتا ہے اور جن سے آج تک بھی مسلمان واقف نہیں ہوئے ہیں۔ اُن سے ایک سمندر پار رہنے والا شخص اب سے سو برس پہلے کس قدر واقف تھا۔

(۳) ترجمہ سفرنامہ برٹن۔ یہ کپتان برٹن صاحب کے سفرنامہ عرب کا اُردو ترجمہ ہے جنھوں نے ۱۸۵۳ء میں حکیم عبداللہ خاں کے نام سے سفر حجاز کیا تھا۔ برٹن صاحب اپنی غیر معمولی شہرت کی وجہ سے محتاج تعارف نہیں ہیں۔ ان کا سفرنامہ حجاز کئی مرتبہ انگریزی میں شایع ہو چکا ہے۔ اس سفرنامہ کے ترجمے کی نسبت حاجی شبیر تاریخ مزارات حرمین میں لکھتے ہیں:

"۱۹۱۱ء میں اس درویش نے اُردو میں اس سفرنامے کا ترجمہ شروع کیا تھا اور تقریباً نصف کتاب کا ترجمہ بھی کر ڈالا تھا مگر اُس وقت اشاعت کا انتظام ہو نہیں سکتا تھا اس لئے کچھ عرصے کے لئے ملتوی کر دیا ۱۹۱۲ء میں دفتر اخبار وطن لاہور کی کتب مطبوعہ کی فہرست میں سفرنامہ برٹن کے ترجمے کا اشتہار شایع ہوا جسے دیکھ کر میں اس کے ترجمے کے خیال سے دست بردار ہو گیا۔ میں نے ترجمہ شدہ حصّے کو کسی مناسب مقام پر دفن کرا دینے کے لئے رکھ چھوڑا ہے۔ اللہ بس باقی ہوس"

د۔ ڈراما (نظم و نثر مشترک)۔ حاجی شبیر نے مدرسۂ آصفیہ اور مدرسۂ نسوان لال پیٹھ کے جلسہائے مضمون خوانی اور انجمن اصلاح خیالات وانجمن دار التمثیل کے لئے چھوٹے بڑے بہت سے ڈراما لکھے تھے جن میں چار ڈرامے

(الف) فسانۂ عبرت۔ (ب) دور آخری۔ (ج) بہار دلفریب۔ اور (د) کشت زعفران۔
خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ ۱۹۰۸ء میں انجمن دارالتمثیل واقع رزیڈنسی حیدرآباد میں پبلک طور پر کئے گئے تھے۔ ہر ڈراما سر شام شروع ہو کر آدھی رات کو ختم ہوتا تھا۔ یہ قومی و اصلاحی ڈرامے تھے جن کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں نہ کوئی فحش گانا تھا نہ فحش حرکت نہ عشقیہ قصہ کہانی تھی نہ زنانہ پارٹ۔ باپ اپنے بچوں کے ساتھ اور لڑکیاں اپنی ماؤں کے ساتھ یہ تماشے دیکھ سکتی تھیں۔ ان میں بدتہذیبی اور بیہودگی سے بچکر ظرافت بھی کافی تھی۔ ان ڈراماؤں کی زبان نہایت شستہ تھی اور ان میں غزلیں، ٹھمریاں، گیت، ناٹکی وزن کی چیزیں، ہارمونیم کی گت پر گانے۔ بہت کچھ دلگی کا سامان تھا۔ حاجی شبیر نے یہ تماشے محض قومی اصلاح اور قومی مدارس کی اعانت کے لئے کئے تھے۔ افسوس ہے کہ یہ چاروں ڈرامے حاجی صاحب کے ایک شاگرد کے پاس سے رمضان ۱۳۲۶ ہجری میں رود موسیٰ کی نذر ہو گئے۔ اب ان ڈراماؤں کے منتشر اجزا اور کچھ گانے وغیرہ ان کے پاس پڑے ہوئے ہیں جن میں سے بعض گیت اور نظمیں بھی...... ان کے مجموعۂ کلام میں مختلف عنوان سے شایع ہو چکی ہیں۔ مثلاً اُجکا مرشد۔ پورب والے شاہ صاحب۔ عالِ کالِ۔ سرتاج قلندر۔ چنو میاں سیندھی نوش۔ شاہ صاحب کی لن ترانیاں وغیرہ
حاجی شبیر کی نثر کا ڈھنگ مختلف کتابوں میں مختلف ہے۔ وہ کتب تواریخ میں نہایت جچے تلے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ انہوں نے دوران تحریر میں افراط و تفریط سے سخت احتراز کیا ہے۔ تراجم میں بے تکلف روزمرّہ زبان استعمال کی ہے۔ مذہبی مضامین میں اعتدال سے آگے قدم نہیں رکھا۔ ڈراما کی زبان کچھ اور ہی ہے۔ بطور نمونہ فسانۂ عبرت سے ہم بگڑے نواب "طالع یار خاں" کے کسی دوست کی تقریر اس جگہ لکھتے ہیں جس میں اُس نے اپنے بدنصیب دوست کی خانہ ویرانی پر اس طرح آنسو بہائے ہیں
" او گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والے زمانے! کسے معلوم تھا کہ تو نواب طالع یار خاں کو بنا کر یوں بگاڑ یگا۔ مکھیوں کا جھلنے والا اس طرح جوتیاں چٹخاتا پھریگا۔ جس کے دروازے پر دربان پہرہ دیتے تھے۔ اب قرضخواہ ڈھٹی دیتے ہیں۔ وہ عالیشان مکان کھنڈر ہو گیا۔ جس جگہ گھوڑے ہنہناتے تھے اَب وہاں گدھے رینگتے ہیں۔ عشرت کدہ ماتم کدہ بنگیا۔ نغمۂ شادی نوحۂ غم میں تبدیل ہو گیا۔ جس مکان میں زمزمے سنائی دیتے تھے اَب وہاں سر شام سے رونے کی آوازیں ہوا میں گونجکر ہمسایوں کے کان

پھوڑتی ہیں۔ پچھلے پہر سے چکی کی دلخراش گھمر گھمر پڑوسیوں کی نیند حرام کرتی ہے۔

ہائے طالع یار خاں بدنصیب، کون کہہ سکتا تھا کہ تو اُس بلند مینار سے اِس بُری طرح گریگا تیرے نازوں کے پالے چھوٹے چھوٹے بچے خدمتگاری کی تلاش میں در در پھرینگے۔ اے حرماں نصیب، تیرے نوکر بریانیاں کھاتے تھے، مگر تیرے بچوں کو سوکھے ٹکڑے نہیں ملتے۔ اے طالع یار خاں کے بدنصیب مکان، نالہ و فریاد کر، تجھ پر گدھے کے ہل چل گئے، تیری اینٹ سے اینٹ بجگئی۔ تو کھنڈ کھنڈ ہو کر کھنڈر رہ گیا۔ تیرا آراستہ کرنے والا خاک مذلت پر بیٹھا ہے۔ تجھ میں رہنے بسنے والوں پر بلائیں نازل ہو رہی ہیں۔

اے اُجڑے گھر! ماتم کر، تیرے پردے کباڑیوں کی دکان پر ٹنگے ہوے ہیں۔ اب تیرے در و دیوار پر مکڑی کے لمبے لمبے جالے لٹک رہے ہیں۔ اے برباد مسکن سر پر خاک ڈال، تیرے جھاڑ فانوس اُتار لئے گئے، اُن کی جگہ چمگادڑیں لٹکا دی گئیں۔"

حاجی شبیر کی سرکاری تحریریں کچھ اور ہی قسم کی ہوتی ہیں۔ دیباچے وغیرہ کا کچھ اور ہی رنگ ہوتا ہے مثلاً نظم شبیر کا دیباچہ اوّل ملاحظہ ہو:-

"بیابان میں ایک پکارنے والے کی آواز۔ جب پیغمبروں کے قول و فعل کو لوگوں نے جنون سے تعبیر کیا تو ہم کو امید نہ رہی کہ ہمارے کام وقعت کی نظر سے دیکھے جائیں گے۔ یہ کون کہہ سکتا ہے کہ واقعی کوئی کام اچھا یا کوئی بُرا ہے۔ بہت سی باتیں جن کو ہم باعث فخر سمجھتے ہیں۔ دوسرے لوگ اُن کو باعث ذلت جانتے ہیں۔ بہت سے کام جو غیر ملکوں میں تہذیب و شائستگی کا نتیجہ سمجھے جاتے ہیں ہمارے ہاں اوّل درجے کی بدتہذیبی میں داخل ہیں۔ بہت سی بُری عادتیں دیکھتے دیکھتے ہماری طرز معاشرت میں شریک ہوگئیں اور بہت سی عمدہ رسمیں ہمیشہ کے لئے صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس کام کو چار آدمی اچھا کہیں وہی اچھا ہے اور جسے بُرا کہیں وہ بُرا "جو آگے ہیں[۵] وہ پیچھے ہٹائے جائیں گے اور جو پیچھے ہیں وہ آگے بڑھائے جائیں گے"۔

بہت سے تارے ذرّے بنکر خاک میں ملیں گے اور بہت سے ذرّے تارے بنکر آسمان پر

---

[۵]۔ انجیل شریف۔

چلیں گے۔ بیشمار آدمی جو مسند عزت پر بیٹھے ہیں۔ ذلت کے اندھیرے گڑھے میں گرائے جائیں گے اور ذلیل آدمیوں کو صف اوّل میں جگہ دی جائے گی' بدنصیب ہے وہ جس نے ہنر کو عیب سے بدل دیا اور مبارک ہے وہ جس نے عیب کو ہنر کر کے دکھایا۔

ہم کو یقین ہے کہ علمائے اُمّت مرحومہ ہماری بعض نظموں کو مجذوب کی بڑ سے زیادہ وقعت نہ دینگے اور ہمارے معاصرین لعنت ولاحول کے پھول ہماری درگاہ پر چڑھائیں گے' مگر آنے والی نسلیں ہم کو دعائے خیر سے یاد کریں گی اور مشرق و مغرب سے ایسے لوگ اٹھیں گے جو ہمارے اقوال و اقوال کی سند لیں گے۔ یہ کمزور آواز جو آج چنچل گوڑے کی ایک جھونپڑی سے بلند ہوئی ہے کسی زمانہ میں ہندوستان کے درودیوار سے سنائی دے گی اور یہ شراب جو اس وقت سستے داموں نہیں بک رہی ہے پرانی ہو کر انشاء اللہ چوگنی قیمت پر جائے گی۔ زیادہ حد ادب۔

کلام اور شاعری

دربارہ نظم — اگرچہ حاجی شبیر اپنی مورخانہ تالیفات کو جو بالخصوص حجاز مقدس سے متعلق ہیں سرمایہ دنیا و آخرت تصوّر کرتے ہیں مگر ان کا کلام نظم بھی مذہبی' اخلاقی اور ادبی افادیت کے اعتبار سے ان کو حیات [illegible] کے لئے کیا کم ہے؟ بحیثیت شاعر ملک میں حاجی شبیر کی جس قدر شہرت ہونی چاہیے تھی نہیں ہوئی۔ اس وجہ سے مولوی میرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے "ایک گمنام شاعر" کے عنوان سے ان کا تعارف اردو صحافت سے کرایا ہے۔ میرزا صاحب نے حاجی شبیر کی عدم شہرت کی وجہ یہ تحریر فرمائی ہے:۔

"ہم مشرقی لوگ مردہ پرست ہیں زندوں کی قدر نہیں کرتے۔ مُردوں کو بانس پر چڑھا دیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ علی شبیر صاحب اپنے قلم سے دریا بہاتے ہیں لیکن وہ سارے کا سارا پانی ساحل پر جذب ہو کر رہ جاتا ہے۔ اپنے گلستان خیال سے گل فردوس چُن کر لاتے ہیں لیکن یا تو وہ یونہی پڑے پڑے مرجھائے جاتے ہیں یا کسی قبر پر چڑھانے کے کام آتے ہیں۔ سچ ہے کہ بڑا ہونا ایک چیز ہے اور بڑا بنایا جانا دوسری چیز۔"

اس رائے سے ہم بالکل متفق ہیں لیکن اس میں اس قدر اور اضافہ کرتے ہیں کہ اگرچہ زمانے نے حاجی شبیر

کی مساعدت نہیں کی لیکن خود انہوں نے بھی اپنا ساتھ نہ دیا یعنے انہوں نے کوئی اپنا علیحدہ تخلص اختیار نہیں کیا جس سے لوگ ان کو شاعر سمجھتے بلکہ اپنے نام کا جز ہی بطور تخلص استعمال کرتے ہیں جب تک باصرار کوئی طلب نہ کرے کسی پرچے یا رسالے کو کبھی اپنے آپ کوئی نظم نہیں بھیجتے۔ خواہ مخواہ لوگوں کو اپنا کلام نہیں سناتے۔ مدتوں تک اپنے کلام کے طبع کا انتظام نہیں کیا۔ یہاں تک کہ جب پریشان پرچے اور منتشر پرزے گم ہونے لگے اور بعض بے غیرت اشخاص ان کی نظمیں چرا چرا کر اپنے نام سے سنانے لگے تو اس وقت ان کو اپنے کلام کی ترتیب کا خیال ہوا۔

حاجی شبیر ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کی عمر تقریباً چالیس سال ہے۔ فن شاعری میں انہوں نے کسی کے سامنے زانوئے ادب تہ نہیں کیا۔ گزشتہ چالیس برس میں جو کچھ انہوں نے لکھا تھا اگر وہ سب موجود ہوتا تو کئی ضخیم جلدیں ہوتیں، مگر کھو کھوا کر اور دریا برد ہونے کے بعد جو کچھ بچا کھچا ہے وہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ ۱۳۴۶ف میں انہوں نے اپنے کلام نظم کا حصۂ اوّل "نظم شبیر" کے نام سے شایع کیا ہے۔ اس مجموعے کے علاوہ اور بھی بہت سا ذخیرہ اُن کے پاس موجود ہے جو بشرط توفیق ممکن ہے حصۂ دوم کے نام سے آیندہ کبھی شایع ہو جائے۔ نظم شبیر حصۂ اول کی اشاعت کے بعد جو نظمیں اُنہوں نے لکھی ہیں ان میں "قینچی واُسترے کی زبان درازی" "ڈاڑھی مونچھوں کی جھڑپ" "بریدہ گیسو" وغیرہ خاص شہرت حاصل کر چکی ہیں۔ ان کے علاوہ حسب فرمایش مولانا عبدالحق بی۔ اے پروفیسر عثمانیہ کالج حاجی صاحب نے جو نظمیں اُردو ریڈروں کے لئے لکھی ہیں ان میں "فقیر اور کتا" "لومڑی اور بندر" "بلی اور مرغا" "شریر بچہ" قابل ذکر ہیں۔ یہ ریڈروں میں طبع ہوئی ہیں۔ اور بعض رسائل نے بھی ان کو شایع کیا ہے۔ مجموعۂ نظم شبیر کی حیدرآباد میں کافی قدر ہو چکی ہے۔ محکمۂ تعلیمات نے بھی مدارس کے کتب خانوں کے لئے اور انعام میں تقسیم کرنے کے لئے بذریعہ گشتی اس کی خرید کے متعلق احکام جاری کئے ہیں۔

ابتدا میں حاجی شبیر فارسی زیادہ کہا کرتے تھے مگر فارسی شعرائے ہند کے انجام پر نظر کر کے فارسی لکھنا چھوڑ دیا۔ اب کبھی کبھار سے اگر کوئی نظم ہو جائے تو اس میں مضایقہ بھی نہیں سمجھتے۔ مثلاً یہاں ہم چند فارسی اشعار پیش کرتے ہیں:۔

گزشتہ سال اعلیٰحضرت بندگان عالی نے اخبار صبح دکن کو یہ مصرعۂ طرح عنایت فرمایا تھا:

ع ساقیا بادہ دریں دور طرب زود بیار۔

غزل نویسی کے لئے قافئے بھی مقرر فرما دئے گئے تھے ۔ اس پر حاجی شبیر نے بھی غزل لکھی تھی اس کا مطلع ملاحظہ ہو:

ساقیا آب شدم آتش بے دود بیار　　　خیز، بشتاب، بیا، زود بدہ، زود بیار

محامد و مدائح حاجی شبیر نے نواب حاکم الدولہ مرحوم میر مجلس عدالت عالیہ کے استقلال پر ایک فارسی قصیدہ لکھا تھا ۔ اس کے یہ تین شعر ملاحظہ ہوں ۔ سعدی کے رنگ میں کہنے کی کوشش کی ہے :۔

این سعادت کے بہ ہر در خور در خاصان رسید　　　کے بود ہر کس سزاوار قبول خاص و عام

در نہ از جاہ و حشم سہل است تا کیوان رسید　　　تا دل ارباب حاجت راہ بردن مشکل است

اے خوشا مردے کہ تا ساحل ازیں طوفان رسید　　　بحر تو اے است دنیا در ظهارش حق العباد

علامہ نواب ضیا یار جنگ بہادر سابق رکن عدالت عالیہ حیدرآباد نے ایک قطعہ تحریر فرمایا تھا جو اپنی نوعیت میں لاجواب سمجھا گیا تھا ۔ حاجی شبیر نے اس قطعے کے جواب میں لکھا ہے، یا یوں کہئے کہ نواب صاحب ممدوح نے جو سوال کیا تھا حاجی صاحب نے اس کا جواب دے دیا ہے اِس جگہ دونوں قطعے لکھے جاتے ہیں ۔ نواب ضیا یار جنگ بہادر فرماتے ہیں :

این نبی و آں ولی ۔ این آفتاب آں ماہتاب　　　کے تواں شرح مقام مصطفیٰ و بوتراب

یارب این قصر خلافت را چرا شد چار باب　　　شہر علم مصطفیٰ را حیدر علی باب بود

اب حاجی شبیر کا قطعہ ملاحظہ ہو ۔ اس کا عنوان "قصر خلافت کے چار دروازے" ہے ۔

زیب ترمش چار یار و زیب دل نقش بوتراب　　　شاہی و فقر است شان حضرت امی خطاب

می سزد قصر خلافت را و لیکن چار باب　　　بیش از یک در نہ زیبد کلبۂ درویش را

حاجی شبیر کی اُردو نظمیں بلحاظ معنی تین ابواب پر مشتمل ہیں : (۱) مدائح و محامد ۔ (۲) تجربات و مشاہدات اور (۳) جذبات مذہبی ۔ ہر باب کی کئی کئی فصلیں ہیں اور باعتبار اصناف شعر، قصاید ۔ غزلیات ۔ قطعات ۔ رباعیات ۔ مثنوی ۔ مسدس ۔ ترکیب بند ۔ مستزاد وغیرہ سب کچھ لکھا ہے ۔ مگر تمام اصناف میں اصلاحی جز و کسی نہ کسی طرح ضرور شریک ہے ۔ جن مضامین پر حاجی شبیر نے قلم اُٹھایا ہے وہ تقریباً اچھوتے ہیں ۔ جن واردات قلبی اور کیفیات دلی کی تصویریں انہوں نے کھینچی ہیں غالباً دوسرے شعرا کے ذہن وہاں تک بہت کم پہنچیں گے ۔ یہی وجہ ہے کہ نہ ان کا مضمون کسی سے لڑتا ہے اور

نہ کسی دوسرے کا مضمون ان کے مضمون سے دست و گریباں ہوتا ہے۔ حاجی شبیر نے اپنے کلام کے رنگ کے متعلق نظم شبیر کے دیباچے میں جو صراحت کی ہے یہاں اُس کی نقل کر دینا غالباً بے محل نہ ہوگا:

”عموماً میں نے واقعات و تجربات و مشاہدات نظم کئے ہیں یا کسی خاص پیرایہ میں کوئی نصیحت کی ہے مگر نہ واعظ کی حیثیت سے اور نہ چچا بنکر۔ میں نے سلاطین و اُمراء کی مدح میں بے ضرورت نہ خامہ فرسائی کی اور نہ بجز دو چار غزلوں کے کسی مشاعرے کی طرح پر کوئی غزل لکھی۔ میں جھوٹ اور مبالغے سے بچتا رہا۔ شعر میں اصلیت قایم رکھنے کی کوشش کی اور خلاف عقل و عادت مضمون باندھنے سے پرہیز کیا۔ عاشقانہ شاعری سے متمتع ضرور رہا مگر تغزل و تعشق کے مضامین مجھے کبھی سوجھے نہیں۔ اگر سوجھے بھی تو بندھے نہیں۔ اور اگر بندھے بھی تو مجھے پسند نہ آئے۔ اس قسم کے اشعار میں سے اس وقت یہ ایک قطعہ رہ گیا ہے جو آج سے تیس پینتیس برس قبل لکھا تھا:۔

گو عشق بتاں میں ہوئے اس درجے پریشاں | جس شخص نے دیکھا ہمیں ڈر کر وہی چونکا
بتخانے میں [illegible]وں نے ہمیں منہہ نہ لگایا | مسجد میں کبھی پہنچے تو زاہد وہیں بھونکا
پر عشق سے واقف ہوئے شبیر نہ اب تک | دلّی میں رہے بارہ برس بھاڑ ہی جھونکا

ہمارا یہ مضمون بہت طویل ہوگیا ورنہ ہم حاجی شبیر کے مختلف اصناف کلام پر تبصرہ کرتے مگر اب بطور نمونہ ہر قسم کے کچھ اشعار لکھکر اپنا مضمون ختم کر دیں گے۔ اوّلاً مدائح و محامد سے شروع کرتے ہیں۔ ”بارگاہ آصفی میں حاضری کی تمنا“ ملاحظہ ہو:

کہتا صبا یہ آصف گردوں جناب سے | شاہا پڑے ہیں دُور ترے آستاں سے ہم
برسوں زباں پہ لائے نہ ہم شکوۂ فراق | آخر کو چیخ ہی اُٹھے جوشِ فغاں سے ہم
یارانِ ہم سفر سرِ منزل پہنچ گئے | بچھڑے ہیں نقش پا کیطرح کارواں سے ہم
گُل ہیں اگر نہ زینت باغ و چمن ہوئے | کمھلا رہے ہیں دشت میں جورِ خزاں سے ہم
ہوتے نہیں شریک گُل آرائی چمن | واقف ہیں گرچہ رسم و رہ گلستاں سے ہم
حالانکہ ہم بھی خوان سخن کے ہیں میزباں | دکھلائی دے رہے ہیں مگر میہماں سے ہم
پڑتی نہیں نظر شہ جوہر شناس کی | گویا ہنوز نکلے نہیں بحر و کاں سے ہم
آئے ادھر بھی دورِ مئے فیض آصفی | چکرا گئے ہیں گردش دورِ زماں سے ہم

ایک قصیدے میں حضور پرنور کی بذل و عطا پر لکھتے ہیں:

یومیۂ منصب و تنخواہ و وظیفۂ انعام — روز و شب پاتے چلے جاتے ہیں پانے والے
کرتے کرتے ترے احکام سخا کی تعمیل — تھک گئے اہل حساب و خزانے والے

عدالت عالیہ کی جدید عمارت کے افتتاح کے لئے حضور پرنور کی تشریف آوری پر جو قصیدہ لکھا ہے اس کے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تجھ میں اب فصل بہار اے گلستاں آنکو ہے — بہر گلگشت آج شاہ کامراں آنکو ہے
جس کی انگشت شہادت ہے کلید باب عدل — آج وہ انصاف گستر میہماں آنکو ہے
السّلام! اے پیشگاہِ عدل و انصاف السّلام! — بخشنے کو شرف تجھے توقیر و شاں آنکو ہے
ہے عدالت قصر شہ کا اک لقب حیرت یہ ہے — بنکے مہماں اپنے گھر خود میزباں آنکو ہے
آسماں سے کیوں نہ سرگوشی کرے اب یہ مکاں — شاہ عالی مرتبت گردوں مکاں آنکو ہے
ہوتے ہیں اب جلوہ فرما کاخ کسریٰ میں حضور — بارگاہ عدل میں نوشیرواں آنکو ہے

آپ نے سہرے اور مبارکبادیاں بہت سنی ہوں گی مگر مولوی خطیب عبد اللطیف صاحب[1] ام اے وائس پرنسپل جاگیردار کالج حیدرآباد کی شادی پر جو ترکیب بند حاجی شبیر نے لکھا ہے اس کا ایک بند بھی پڑھ لیجئے کہ کیا اس کا جواب ہے؟

بچھ رہی ہے مسند اقبال یاں کس کے لئے — ہو رہی ہیں ساری یہ تیاریاں کس کے لئے
رونق افزائے چمن ہے کونسا نخل مراد — بن رہا ہے صحن مجلس گلستاں کس کے لئے
آج اس حلقے میں تبلاؤ حکومت کس کی ہے — جھک رہے ہیں آج سب پیر و جواں کس کے لئے
خطبہ جاری ہے زباں پر آج کس کے نام کا — ہے خطاب نوشہی زیبا یہاں کس کے لئے
کون ہے نوشاہ آخر کون وہ سرتاج ہے — اے لطیف محترم تیری ہی شادی آج ہے

بقول میرزا فرحت اللہ بیگ صاحب حاجی شبیر کے کلام نظم میں دو چیزیں سب سے زیادہ مزیدار ہیں۔ (۱) ایک تو آنحضرتؐ کی نعت و مدینۂ منوّرہ کی گلیوں میں پھرنے کا شوق۔ (۲) دوسرے زمانے کی حالت کا

---

[1] خطیب صاحب۔ حضرت شبیر کے شاگرد ہیں، مدرسۂ آصفیہ میں ان سے پڑھتے تھے۔

خوش مذاقی میں نقشہ۔ میرزا صاحب نے اپنے مضمون میں حاجی شبیر کی صرف مذاقیہ نظموں ہی کے نمونے پیش فرمائے ہیں جن کی نسبت اُن کی یہ رائے ہے "اکبر کے بعد اگر اس رنگ میں کوئی لکھنے والا ہے تو وہ یہی حضرت ہیں۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ ایک بڑھکار اردو لٹریچر کا درخشاں ستارہ بنگیا اور یہ اسطرح گوشۂ گمنامی میں پڑے رہے۔"

طالع شہرتِ رسوائیِ مجنوں پیش است ورنہ طشتِ من و او ہر دو زیک بام اُفتاد

تجربات و مشاہدات

حاجی صاحب کے مذاقیہ رنگ میں سب سے زیادہ مرغوب عنصر دفتری تجربات ہیں جن میں انہوں نے حاکموں، عہدہ داروں، اہلکاروں اور امیدواروں کی مختلف حالتوں کے نقشے عجیب عجیب دلچسپ طریقوں سے دکھائے ہیں۔ اس خاص موضوع پر حاجی شبیر نے (۵۵) نظمیں کہی ہیں۔ ان کے علاوہ اُمرا، عُلما، فقرا، مشایخ، شعرا، واعظ، مرثیے خواں، ناول نویس، مُلّا، سیانے، عامل، قومی لیڈر وغیرہ کی کمزوریاں بہت ہی خوبی کے ساتھ دکھائی ہیں۔ تمدّنی و معاشرتی اصلاح پر بھی متعدد نظمیں ہیں اسی ضمن میں بعض نظمیں یا گیت یا رسوم کی گیتوں اور ناٹک کی طرز میں ہیں۔ بجز غزلیات کے ہر نظم کا کوئی نہ کوئی دلچسپ عنوان بھی ہے۔ بعض نظمیں بڑی بڑی ہیں مگر دلچسپی ان میں بھی قایم رہتی ہے۔ جیسا کہ اس بارہ میں مولوی میرزا فرحت اللہ بیگ صاحب فرماتے ہیں:-

"میں نے اس مضمون میں بڑے بڑے قطعات جا بجا چھوڑ دئے ہیں اس لئے نہیں کہ وہ بدمزا تھے، بلکہ اس لئے کہ مضمون بہت، بڑھ جاتا۔"

حاجی شبیر کے تجربات و مشاہدات سے متعلق بہت سی نظمیں مثلاً: 'خدا کے ہاں سینیارٹی کا لحاظ'... نوکری کے لئے شرکت امتحان کا نتیجہ' حضرت آدم کی ناخلف اولاد' وہم، 'شیطانی خواب' اپیل بدرگاہ حضرت احکم الحاکمین بناراضی حکام بے دین، ملازمت سے دو دو باتیں' انتظار نا روا' سیلاب بلا' فرشتوں کو دھوکا' زمانہ سازی' ایک ملازم کی سرگزشت' ملک الموت سے شکایت' ایک حاکم کی جعیت تھتھری' شام کے وقت گاؤں کا سماں' بدزبان ساس پھوہڑ بہو' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ہمارا یہ مضمون ان کا تحمل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ہم ایک دو غزلیں امہ چند قطعات و رباعیات لکھکر آگے بڑھتے ہیں۔

غزل

حرص کے باعث گرفتار بلا پھرتے ہیں ہم کچھ عجائب مخمصوں میں مُبتلا پھرتے ہیں ہم

قافلہ سب ساتھیوں کا حیف آگے بڑھ گیا — خاک اڑاتے دشت میں مثل صبا پھرتے ہیں ہم
یاں کوئی ہمراز ہے اپنا نہ کوئی ہم سخن — چپکے چپکے اپنی دھن میں جابجا پھرتے ہیں ہم
نیک ہو یا بد کسی سے بھی نہیں اپنا بگاڑ — اور بظاہر یوں تو سب سے ہی خفا پھرتے ہیں ہم
شامت اعمال سے پڑتے ہیں جب ادبار میں — پھر بھلا کب صورت تیر قضا پھرتے ہیں ہم
گردش ایام نے یاں تک ہمیں چکرا دیا — کچھ نہیں معلوم سر پھرتا ہے یا پھرتے ہیں ہم
سب بھلے ہیں پر کسی سے کچھ خدا ڈالے نہ کام — مانگتے شبیر در در یہ دعا پھرتے ہیں ہم

غزل

ہمارا کون ہے سب یار اور اغیار دشمن ہیں — مسلماں ہیں ادھر بد دل ادھر کفار دشمن ہیں
الٰہی خیر ہو، سارا زمانہ پھر گیا ہم سے — زمین و آسماں اعدا، در و دیوار دشمن ہیں
چمن سے اب نکل جائے نہ کیوں بلبل، کہ گلشن میں — خس و خار اس کے درپے ہیں، گل و گلزار دشمن ہیں
بجا ہے، واقعی، تہذیب خونریزی سے پھیلے گی — ہمارے یہ مہذب دوست بھی خونخوار دشمن ہیں
تری تکفیر بھی ہوتی ہے لیکن فرق ہے واعظ — ترے اغیار دشمن ہیں، ہمارے یار دشمن ہیں
بلا سے اپنے ماتحتوں کو گر ناراض رکھتے ہیں — کسی کا کیا کریں گے اپنے ہی سرکار دشمن ہیں
لباس ظاہری بھی ہے محرک بدگمانی کا — جناب شیخ کے یہ جبہ و دستار دشمن ہیں
غرض اعدا کے شر سے امن میں یاں کون ہے شبیر — کسی کے غیر دشمن ہیں، کسی کے یار دشمن ہیں

ایک غزل کے چار شعر یہ بھی پڑھ لینے کے قابل ہیں۔

کر چکے اچھی طرح چین و ختن کا انتظام — اب کریں گے انشاء اللہ ہم وطن کا انتظام
بلبلیں مدت ہوئی سب اڑ گئیں گلزار سے — کر رہے ہیں باغباں زاغ و زغن کا انتظام
خود بخود ہو جائیگا رندوں کے ہاتھوں کا علاج — واعظو پہلے کرو اپنے دہن کا انتظام
باندھیں کس کس کو فقیہ شہر بھر منصور ہیں — ہے اگر بوتا کرو دار و رسن کا انتظام

ایک قومی غزل میں کہتے ہیں۔

قوم گمراہ کا ہے راہ پہ لانا مشکل — راستے پر بھی جو آئے تو چلانا مشکل
ایک دو میں ہو خرابی تو سنواریں اس کو — سارا آوا ہی جو بگڑے تو بنانا مشکل

ہم نے مانا کہ ہے عیبوں کا چھڑانا مشکل ہم نے مانا کہ ہے رسموں کا اُڑانا مشکل
اپنی ناکامی سے مایوس نہ ہونا شبیر کسی مشکل کو نہ رکھے گا زمانا مشکل

ایک دوسری قومی غزل کا قطعہ ہے:

ہو گیا بیمار قوم اچھا، نہوں آثار جب اچھے مرض کچھ اور کہتا ہے، دوا کچھ اور کہتی ہے
الٰہی رحم کر اس پر عجب یہ کشمکش میں ہے مسیحا ایتی گاتے ہیں، قضا کچھ اور کہتی ہے

مولوی میرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے اپنے مضمون میں اِن کے جن قطعات پر تبصرہ فرمایا ہے اُن میں سے ایک قطعہ یہاں لکھدینا میں بھی مناسب سمجھتا ہوں۔ اس نے حیدرآباد میں ضرب المثل کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ اہلکاروں کی مشکلات کی کیا سچی تصویر کھینچی ہے:

جن کے گھر دفتر کے پاس اور آنا جانا ہاتھ میں موٹریں اُن کو عطا کیں در پہ گاڑی باندھ دی
دُور گھر، تنخواہ تھوڑی، حاضری کی قید سخت مفلسوں کی یوں اگاڑی اور پچھاڑی باندھ دی

امیر سے غریبوں کی عید کی ملاقات جس طرح عموماً ہوتی ہے اس کا فوٹو ملاحظہ ہو:

در امیر پہ جا کر غریب بیچارہ سلامِ عید کا بارِ گراں اُتار گیا
امیر بُت بنے بیٹھے رہے تیرتہ ہوئی کہ اُن کے پیٹ میں سرکون آ کے مار گیا

دیکھئے ایک قطعہ میں بچوں کو تعلیم دلانے کی ترغیب کس لطیف پیرایے میں دلائی ہے اس قطعے کا عنوان "ناخلف باپ" ہے:

اِک بے پڑھے سے اُس کے چچا نے کہا میاں تجھ ناخلف سے مٹ گئی سب عزتِ سلف
اُس نے کہا چچا، مجھے تعلیم ہی نہ دی میں ناخلف نہیں، میرے باوا ہیں ناخلف

مدعیانِ آزادی پر کیا مزیدار پھبتی کسی ہے:

مجھ سے کہا کل ایک فرنگی نے فخریہ ہم نے ہر اِک کو بخشی ہے آزادیِ تمام
رسمِ غلامی صفحۂ ہستی سے مٹ گئی بردہ فروشی کا کوئی لیتا نہیں ہے نام
ہم نے کہا، غلامی، بلا سے مٹی، مٹی، ایسا نہو مٹیں کہیں جورو کے بھی غلام

ایک قطعہ جس کا عنوان "حق گوئی سے ایک سررشتہ دار کی معذرت" ہے۔ ملاحظہ ہو۔ کیا تجربہ کی بات کہی ہے۔

آپ تو سب راست فرماتے ہیں لیکن سچ یہ ہے حاکموں کے آگے جا کر کہہ سکیگا راست کون
ہم نے مانا، دو ہی سطریں تم نے لکھی ہیں مگر کون سنتا ہے، سُناتا ہے بھلا درخواست کون

ایک مشہور ضرب المثل ہے "دیگراں را نصیحت خود میاں فضیحت" حاجی شبیر نے اس پر کیا مضمون پیدا کیا ہے:

وعظ میں گو سناتے ہیں صوفی ناچنے والیوں کو سنواتیں
اپنی اصلاح کچھ نہیں کرتے ہیں فقط ان کی باتیں ہی باتیں
وہ اگر ناچ گا کے محفل میں رات دن بکتی ہیں خرافاتیں
قبر مرشد پہ ناچ کر یہ بھی مارتے ہیں بہشت میں لاتیں

اب تک ہم لباس کو صرف ظاہری چیز سمجھتے تھے مگر حضرت شبیر کا تجربہ کچھ اور کہتا ہے:

کپڑوں کو سمجھنا نہ کبھی محض لفافہ ہے منحصر اس پر بھی ترقی و اضافہ
دلدادۂ فیشن کو سمجھتے ہیں یہ حقدار حکام کو آتا ہے مگر علم قیافہ

حاجی شبیر کی تمام عمر نوکری میں گزری ہے۔ ترقی کے خواہاں اہلکاروں کو کیسی تیر بہدف سفارش کی نشاندہی فرما رہے ہیں:

میں کہہ رہا تھا پیر سفارش اگر کرے ممکن نہیں کہ ٹال دے اُس کا سخن مُرید
یہ سُن کے پوچھنے لگے دو ایک اُمیدوار کہیئے، ہیں کس کے ناظم خاطر شکن مُرید
میں نے کہا سُنا نہیں مرشد کا ان کے نام لیکن یہ جانتا ہوں کہ ہیں وہ بھی زن مُرید

حضرت شبیر نے برسوں محاسبی کی خدمت انجام دی ہے۔ صیغۂ حساب کا جہاں سے مصارفِ سفر منظور ہوتے ہیں ایک تجربہ ملاحظہ فرمائیے:

اِک اہلکارِ دورہ رو رو کے کہہ رہا تھا گھڑی مری ہوئی گم کپڑا رہا نہ لتّہ
افسر نے اُس کے سُن کر فرمایا "فکر کیا ہے اِس دورے میں ملیگا کل تو ہی دن کا بھتّہ

ایک قطعہ میں حاجی شبیر نے یہ ثابت کیا ہے کہ بڑوں سے چھوٹے اچھے ہیں۔ دیکھیئے کیا کیا اٹل مثالیں دی ہیں۔ پانچویں شعر کا تو جواب ہی نہیں ہو سکتا کس قدر مضمون سمایا ہے۔ کوزہ در یا نوش اسی کو کہتے ہیں:

اگر دنیا میں بفکروں سے ذی افکار اچھے ہیں تو بیشک اہلکاروں سے یہ عہدہ دار اچھے ہیں
عدد محکوم کا اک ہے تو ہیں حاکم کے سو دشمن ہماری رائے میں آقا سے خدمتگار اچھے ہیں
ہوئی جب مُلک میں بدامنی اور پڑنے لگے ڈاکے امیروں کی کھلیں آنکھیں کہ یہ نادار اچھے ہیں

لگی آگ اک محلّہ میں، پڑی سامان کی سب کو لئے کمّل فقیر اُٹھا، کہ اُن سے یار اچھے ہیں

"ایک بد دماغ منتظم" کے عنوان سے حاجی شبیر نے ایک قطعہ کہا ہے۔ بظاہر تو بد دماغی معلوم ہوتی ہے مگر بڑی پتے پتے کی باتیں کہی ہیں:

تم سے سرماروں تو اتنا دم مرے سر میں نہیں سچ ہی تم جا تو جو یہ کہدوں کہ میں گھر میں نہیں
گفتگو دفتر کی، ہاں دفتر میں کیجے شوق سے گھر یہ اور سرکاری باتیں اس کا تو کریں نہیں
میرے ہاں آنے کی اب تکلیف فرمائیں نہ آپ اُن سے ملئے "ہاں" کہیں جو گھر میں، دفتر میں نہیں
سچ کو سچ سمجھیں تو ہے اہل غرض سے یہ بعید ان کی خاطر جھوٹ بولوں اس کا خوگر میں نہیں
میرے سچ سے ہے زیادہ دلنشیں ناظم کا جھوٹ جو چمک ہے آجکل پیتل میں وہ زر میں نہیں
حق میں اک راشی کے قبلہ، یہ سفارش آپ کی ہے یہ فتویٰ، ڈر کسی کا اُن کو محشر میں نہیں

دفتروں میں بے وسیلہ اُمیدواروں کی حالت چمگادڑوں کی مہمانی کی سی ہے۔ ان غریبوں کو کیا صاف صاف لفظوں میں فرماتے ہیں:

ارے بے وسیلو کہاں جا رہے ہو بنا دا کہ تم سیدھے رستے سے بھٹکو
گزر جائے گی عمر نوکر نہ ہوگے اسی میں بھلا ہے کہ اب یاں سے سٹکو
یہی ہے اس اُمیدواری کا حاصل کہ دامن سے آ آ کے میتروں کو جھٹکو
نہ رکھے گا سر پر تمہارے کوئی ہاتھ غرض پاؤں پیٹو کہ اب سر کو ٹیکو
یہ دفتر ہے مہمانی چمگادڑوں کی دھرا کیا ہے یاں آؤ اور اُلٹے لٹکو

بعض اوقات اہل دفتر حاکموں کے استقبال کے لئے جس طرح دوڑتے ہیں اور اسٹیشن پر پہنچنے کے بعد جو نتیجہ عموماً ہوتا ہے اُس کا نقشہ ملاحظہ ہو۔ بہت بڑا مضمون تھا مگر صرف تین شعروں میں آگیا ہے۔

یہ مژدہ آج سنکر سرکار آرہے ہیں بالائے طاق اپنے ہم سارے کام کرکے
کچھ گھسٹے پا پیادہ، کچھ گاڑی میں بھی لٹکے جا پہنچے نامپلی[۵] سو انتظام کرکے

---

[۵] - یہ حیدرآباد کا سب سے بڑا اور قدیم اسٹیشن ہے۔

اب وہاں اُنھوں نے ہمکو دیکھا بھی یا نہ دیکھا   پر ہم تو لوٹے خوش خوش اُن کو سلام کر کے

حضرت غالب کا ایک مشہور قطعہ ہے جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے " رہیے اب ایسی جگہ چلکر جہاں کوئی نہو " انہیں خیالات کو انگریزی کے مشہور شاعر ٹینی سن نے جو تقریباً غالب کا ہمعصر تھا انگریزی نظم میں ادا کیا ہے اس کے اشعار کا لفظی ترجمہ یہ ہے :-

" دنیا سے الگ بھاگ مجھے ایسی جگہ جا کر رہنے دو جہاں کوئی مجھے جان پہچان نہ سکے ۔ مجھے اسطرح مرنے دو کہ مجھ پر کوئی رونے والا نہو اور نہ کوئی پتھر یہ بتا سکے کہ میں کہاں دفن ہوں "

حاجی شبیر نے بھی اسی مضمون کو ایک قطعے میں نظم کیا ہے جس کا عنوان یہ ہے " ایک غمزدہ کے خیالات " ملاحظہ فرمائیے اور دیکھیے کہ انہوں نے غالب ٹینی سن کے خیالات کی توضیح کس حد تک کردی ہے اور مضامین میں کہاں تک اضافہ کردیا ہے۔

دل بھاگتا ہے صحبتِ سرو و سمن سے دُور   لے جا کے چھوڑ دو مجھے کوئی چمن سے دُور
ہو جائے غم غلط یہ مرا مدعا نہیں   چھوڑو کہ بھاگ جاؤں میں اس انجمن سے دُور
ہوں بعد مرگ تا نہ عزیزوں پہ بارِ دوش   جنگل میں آئے موت الٰہی وطن سے دُور
دشت و جبل میں طعمۂ زاغ و زغن بنے   لاشہ پڑا رہے مرا گور و کفن سے دور

اب ہم چند رباعیاں پیش کرتے ہیں۔ اس مطلب کو ادا کرنے کے لئے کہ مصیبت مشیت سے خالی نہیں ہوتی۔ حاجی شبیر نے کیا اعلیٰ درجے کی مثال دی ہے :

کہیے نہ مصیبت کو کبھی قہرِ خدا   ہے وہ بھی کسی مرض کا کڑوا نسخہ
بچے چھپتے ہیں کونے کونے ناداں   اور ماں انہیں بالجبر پلاتی ہے دوا

نفاق کا اس زمانے میں جو دَور دَورہ ہے محتاج بیان نہیں اس کی تصویر دیکھیے :

انداز و طریق اس زمانے کے ہیں اَور   کرنے کے تو اور ہیں سنانے کے ہیں اَور
شبیر جیسے دیکھیے ہاتھی کے سے دانت   کھانے کے تو اور ہیں دکھانے کے ہیں اَور

ایک رباعی میں حاجی شبیر نے کسی تحصیل کی حالت دکھائی ہے ۔ مولوی میرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے اس رباعی کو انتخاب کیا ہے ۔ میں بھی مناسب سمجھتا ہوں کہ اسے نقل کردوں جیسا کہ اس رباعی کا مضمون پُرلطف ہے ویسا ہی اس کا نام بھی مزیدار ہے ۔ اس کا عنوان ہے " دفتر یا خانقاہ کا دھوکا "

میں نے سرِ راہ کل یہ دیکھا منظر — حق حق کی صدا سے گونجتا ہے اک گھر
میں سمجھا فقیر کا ہے تکیہ شاید — پوچھا تو وہ تحصیل کا نکلا دفتر

آجکل عورتوں میں بال کتروانے کا جو فیشن ہو گیا ہے اس پر حاجی شبیر کی نظم "بریدہ گیسو" ملاحظہ ہو:

اب حسینوں کو خط و خال کا سودا نہ رہا — خط کٹا، گیسو کٹے، زلف گرہ گیر کٹی
ناک چوٹی میں گرفتار رہا کرتا تھا — ہوا اچھا تری چوٹی بت بے پیر کٹی
مژدہ دیوانوں کو، شوریدہ مزاجوں کو نوید — پا بجولاں جو تمہیں رکھتی تھی زنجیر کٹی
عاشقو اب تو یہ ناگن نہ ڈسیگی تم کو — شوق سے چھیڑو دم اس کی تہ شمشیر کٹی
ہمکو تو رنج یہ ہے زلف کے مضمون گئے — جڑ ہی اب شاعری کی حضرت شبیر کٹی

دفتر کے راز جس طرح افشا ہو جاتے ہیں اُس کا سبب بھی یاد رکھنے کے قابل ہے:

معمولی سے کاموں کو بھی حکام مجاز — کہتے ہیں کہ سو رازوں کا ہے ایک یہ راز
لیکن عملہ جو پیٹ کا ہے ہلکا از بس — اس راز کو کر دیتا ہے فی الفور بر راز

یہ سب کو معلوم ہے کہ بغیر بھوک کے کھانا کس قدر بد مزا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس نظر سے شاید دسترخوان کو کسی نے نہ دیکھا ہوگا۔ فرماتے ہیں:

یہ خوان مزے چکھا رہا ہے ہم کو — ہر طرف آنکھیں دکھا رہا ہے ہم کو
آتا ہے الٹ الٹ کے لقمہ منہ میں — اب، الٹا کھانا ہی کھا رہا ہے ہم کو

حاکموں اور عہدہ داروں کے ہاں ڈھٹی دینے میں جو تکلیف ہوتی ہے اس کی یہ تصویر ہے:

جا کر در حکام یہ جب ڈٹتے ہیں — ہوتے ہیں خفیف دمبدم گھٹتے ہیں
جتنا جتنا کہ وقت کٹتا ہے وہاں — بس اُتنے اُتنے ہی دلیں ہم کٹتے ہیں

امیروں کے ہاں دعوت میں غریب جس کس مپرسی میں پھرتے ہیں اس کا یہ نقشہ کھینچا ہے:

دروازے پہ منعموں کے اب جائے کون — دعوت ہی سہی یہ جا کے پچھتائے کون
کھانا تو ملے گا پیچھے کھانے کے لئے — دربانوں کے دھکے پیشتر کھائے کون

غیروں کے لئے سفارش نہ سننے والے ایک عہدہ دار پر پھبتی ملاحظہ ہو:

دشمن چھیڑو مزار سر وہ دھنتے ہی نہیں — اپنوں کے سوا غیر کو چُنتے ہی نہیں

عہدے نے کیا ہے ان کو بہرا پتھر   سنتے ہیں، کسی کی اب وہ سنتے ہی نہیں

اگرچہ حاجی شبیر نے ہجووں کا ذخیرہ غیر مطبوعہ ہی رہنے دیا ہے اور جو ہجویں طغیانی کی نذر ہو گئیں اُن کا افسوس بھی ان کو نہیں ہے تاہم وہ کسی پر خفا ہو کر فرماتے ہیں:

تو عرب ہے کبھی وحشت میں، کبھی شیدی ہے   بے وقوفی میں کبھی خر ہے کبھی گیدی ہے
شکل و رفتار و روش، وضع قطع، ڈیل ڈول   اونٹ رے اونٹ تری کونسی کل سیدھی ہے

سلام سب کرتے ہیں مگر شاید یہ وجہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی۔

جب تک کہ کسی شخص سے مطلب تھا نہ کام   جھکتے نہ تھے ہم کسی سے، ہو خاص کہ عام
اب آ کے غرض تو ہم بھی دولھا کی طرح   کرنے لگے یاں ہر کس و ناکس کو سلام

سلام کسی نے آجتک واپس نہیں مانگے ہوں گے۔ حاجی شبیر کسی پر خفا ہو کر فرماتے ہیں:-

محض اتنی امید پر کہ تم آؤ گے کام   کرتا رہا میں سلام تم کو بھی ــ مدام
اب کام پڑا تو تم بتاتے ہو ہوا   واپس کرو، لاؤ، گن کے کل میرے سلام

ہمدردانِ قوم کی زبان سے دعوے آپ نے سُنے ہوں گے اب اس قسم کے مدعیوں پر یہ چُست فقرہ بھی سُن لیجئے:

قوم کے نام پہ جو لوگ کہ دم دیتے ہیں   اُن سے گر مانگئے کچھ دام تو دم دیتے ہیں
الغرض گھر میں پکاتے ہیں خیالی جو پُلاؤ   دمبدم جلسوں میں پھر اس کو وہ دم دیتے ہیں

جذبات مذہبی مولوی میرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے حاجی شبیر کی متین اور مذہبی نظموں کے متعلق دو جگہ اظہار رائے فرمایا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں: "سب سے زیادہ مزیدار ان کی دو چیزیں ہیں۔ (۱) ایک آنحضرت صلعم کی نعتیں اور مدینہ منوّرہ کی گلیوں میں پھرنے کا شوق۔ (۲) دوسرے زمانے کی حالت کا خوش مذاقی میں نقشہ۔" دوسری جگہ یہ جامع و بلیغ رائے ظاہر فرمائی ہے: "ان کا قلم مذہبی مضامین پر بھی ایسا ہی چلتا ہے جیسا مذاقیہ مضامین پر۔" فی الواقع حاجی شبیر میں یہ کمال ہے کہ جس طرح وہ ظرافت میں ید طولیٰ رکھتے ہیں اسی طرح وہ متانت میں بھی گھٹے ہوئے نہیں ہیں۔ ان کا یہ فرمانا بالکل درست ہے اور گویا ان اشعار میں انہوں نے زمانہ سازوں کی کیا بلکہ خود اپنی ہی تعریف کی ہے۔

جیسا موقع ہو بنا لیتے ہیں ویسا ہی مزاج
ایک حالت پر نہیں رکھتے طبیعت منحصر

گر بلندی کا کریں رخ توڑیں تارے عرش کے
اور جو پستی میں گریں پاتال کی لائیں خبر

بیٹھیں بچوں میں تو وان بچوں کی سی باتیں کریں
اور بڑے بوڑھوں کی مجلس میں بنیں خواجہ خضر

حاجی شبیر کی متین نظموں کی مثال علیحدہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ تجربات و مشاہدات کے ضمن میں جو دو غزلیں اور قومی نظموں کے جو اشعار ہم نے لکھے ہیں وہ متانت کی پوری تصویریں ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے مجموعے کا باب جذبات بھی تمام ایسی ہی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔ ان کی نعتیہ و اشتیاقیہ نظمیں اور بالخصوص نوحے متانت و سنجیدگی میں ڈوبے ہوئے ہیں لیکن قبل اس کے کہ ہم کسی نعتیہ یا اشتیاقیہ نظم کا نمونہ پیش کریں یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ بعض اوقات ان نظموں میں بھی وہ اس قسم کا مزاح کر جاتے ہیں جو سُنّت ہے۔ مثلاً وہ اپنی نظم "خدا سے ایک گنہگار کی توقع" میں فرماتے ہیں:

اپنے عصیاں سے خدایا مجھے انکار نہیں
قابل رحم مگر کیا یہ گنہگار نہیں

اس میں کچھ شک ہی نہیں لائق تعزیر ہوں میں
نا سزا کو تو سزا دے یہ سزاوار نہیں

یہ سمجھتا ہوں کہ تجھسا بھی نہیں کوئی رحیم
جانتا ہوں کوئی مجھسا بھی گنہگار نہیں

میں نے جو کچھ کیا سب تیرے ہی ایما سے کیا
ہوں خطاوار مگر پھر بھی خطاوار نہیں

کونسا دن ہے کہ آتا نہیں اب ذکر ترا
کب ترا نام مری زینت گفتار نہیں

جب تعارف نہ تھا شبیر کو بخشا سب نے
اب تو سو سابقے ہیں بخشش کہ دشوار نہیں

ایک نعتیہ مخمس میں فرماتے ہیں:

یہ مانا بال بال اپنا سیہ کاری کا دفتر ہے
نہ عابد ہیں نہ زاہد ہیں نہ کوئی اور جوہر ہے

مگر کچھ غم نہیں ہم کو نبی کا ہاتھ سر پر ہے
نگہباں اپنی کشتی کے منجدھار میں تو کیا ڈر ہے

ہمیں کو کیا ڈبا دینگے ہمارے ناخدا ہو کر

رہوں میں ہند میں بیتاب کبتک یا رسول اللہ
تڑپے کیا چین ہو آؤں نہ جبتک یا رسول اللہ

یہ شکوہ کیوں نہ آئے میرے لب تک یا رسول اللہ
دراقدس پہ بلوایا نہ اب تک یا رسول اللہ

مری مشکل نہ حل کی آپ نے مشکلکشا ہو کر

خدائے بے نیاز کی درگاہ میں کس طرح ناز کیا ہے ملاحظہ ہو:

گرے ہیں ٹوٹ کے کوثر پہ پیاس کے مارے پڑا ہیں یہیں او بے نیاز رہنے دے

حرمین سے کس قدر محبت ہے اللہ اکبر!

خلاف شرط محبت ہے شست وشوئے شبیر تو اپنے جسم پہ خاک حجاز رہنے دے

مدینے پہنچکر بیٹھنے اٹھنے میں ان کا شش و پنج قابل دید ہے ۔ فرماتے ہیں:

ہے ایک طرف قبیلا اور ایکطرف طیبہ وہ ہے حرم اقدس، یہ ہے وہ حرم والا

نے پیٹ ادھر اچھی نے پاؤں ادھر زیبا پھیلائیں کدھر بستر آرام کریں کس جا

بیٹھیں تو کہاں بیٹھیں اٹھیں تو کہاں اٹھیں

حاجی شبیر کی نعتیہ نظموں سے ان کا شیدائے نبی و عاشق رسول ہونا ثابت ہے ۔ بلکہ عموماً ان کا قال سچے حال کی کیفیت رکھتا ہے ۔ عام شعرا کی نعتیہ اور عشقیہ غزلیات میں کوئی ایک آدھ لفظ شہ مدینہ وغیرہ حد فاصل ہوتا ہے ورنہ نعت کی پوری عمارت عشق مجازی کے مسالے سے تیار کی جاتی ہے ۔ حاجی شبیر نے ان باتوں کا بیحد خیال رکھا ہے اور ایک ادنیٰ غلام کو اپنے آقا کیساتھ جس طرح مخاطبت کرنی چاہیئے اس کا پورا پورا لحاظ کیا ہے ۔ ایک اور نئی بات حاجی صاحب کے نعتیہ کلام میں یہ بھی ہے کہ انہوں نے زیارت بیت اللہ کا اشتیاق بھی اسی جوش وخروش کے ساتھ ظاہر کیا ہے جتنا کہ بیت الرسول کا ۔ اور بمشکل ان کی نعتیہ غزلیں اس سے خالی ہوں گی ان کے قصیدے "اشتیاق حرمین" اور "مشتاق کعبہ" اس کے شاہد ہیں اول الذکر نظم میں فرماتے ہیں:

سبزۂ غلطاں مرے پاؤں میں اب چبھنے لگا آرہے ہیں یاد صحرائے عرب ریگ رواں

نکہت باد بہاری سے مرا دل پھر گیا ہے کدھر باد سموم اور عالم فصل خزاں

دامن دل کھینچتے ہیں دشت بطحا کے ببول پنجۂ خار مغیلاں میں پھنسا ہے دست جاں

"مشتاق کعبہ" میں زمانۂ حج کا سماں دکھانے کے بعد آخر میں حاجی صاحب کہتے ہیں:

اے کعبۂ مکرم اے قبلۂ مقدس! سچ کہیو ہم بھی تجھ کو کچھ یاد آرہے ہیں

ہم طائران بے پر ظاہر میں یاں پڑے ہیں کوہ صفا پہ لیکن کاوا لگا رہے ہیں

ہے سامنے ہمارے اس وقت کوہ رحمت آآکے وہ فرشتے خطبہ سنا رہے ہیں

شبیر، حاجی شبیر، شبیر، حاجی شبیر! وہ دیکھو مکے والے مجھکو بلا رہے ہیں

ایک غزل میں فرماتے ہیں۔

ترے لطف و کرم کا منتظر اذن عام بیٹھے ہیں مگر ابتک الٰہی ہم یونہی ناکام بیٹھے ہیں

امیروں کے کئی حج ہو چکے ہم بینوا ابتک اسی اک فکر میں لینے کی قرض و وام بیٹھے ہیں

خدا وندا اجازت ہو کہ یہ ناخواندہ مہماں بھی پئے طوف حرم باندھے ہوئے احرام بیٹھے ہیں

ایک نعتیہ غزل میں ذرا دیکھنا حج کا جوڑ کس طرح ملایا ہے:

جو زادِ راہ نہیں حج کا، خیر، اللہ ہے پڑے گی جیسی بھگت لیں گے ہم بلا سے چلو

یہ کیا گلہ ہے کہ آئی صبا نہ یثرب سے غضب ہے تم بھی یہاں لٹے ہو ہوا سے چلو

اس کے ساتھ منقبت کی گرہ بھی قابل دید ہے:۔

وضو نماز سے پہلے ضرور ہے شبیر مدینے جاتے ہو تو آؤ کربلا سے چلو

بجز نعتیہ غزلوں کے حاجی شبیر کی نعتیہ و اشتیاقیہ نظموں کے بھی مختلف عنوان ہیں مثلاً "حاجیوں کا داخلہ مدینے میں" "ہوائے یثرب" "نقشہ کعبہ و مدینہ دیکھکر ایک مشتاق کے خیالات" "یثرب سے شکایت" "مکے کا اک مسافر" "حضرت شفیع المذنبین کی خدمت میں سلام۔ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" "تمنائے مدینہ" "سرکار بلائیں یثرب میں" "میلاد محمد" "اشتیاق حج" "مجھکو بلاتے نہیں" "حضرت غزل سے گزارش" "مسلمانوں کو مبارکباد دی" "آہنگ حجازی" "مدینے کی چاندنی" "عاصیوں کی التجا" "مکہ معظمہ" "سرکار سنبھالو مجھکو" وغیرہ۔ ذرا اس غزل کا جوش و خروش ملاحظہ ہو:

یوں ہوا و حرص میں ہم نے دی کبھو کو نسی نہ رقم اٹھا کسی کار خیر میں آجتک، مگر ایک بھی نہ درم اٹھا

جو توامن چاہے تو کعبے چل، نہ صنم کدے میں ستم اٹھا جبیں آستان بتاں سے اب، تجھے میرے سر کی قسم اٹھا

در دیر پر ہی اڑے رہے کبھی بیٹھے گاہ کھڑے رہے غرض ہند میں ہی پڑے رہے کبھی قبلہ رخ نہ قدم اٹھا

رہ حشر میں یہی لاکھ سہم، مگر اس کا ہمکو نہیں الم وہاں ڈگمگائے بھی گر قدم، ہمیں لیں گے شاہ امم اٹھا

شبیر اب مدینے چلے چلو، کرو عزم جیسے بنے چلو نہ رکو کہیں بھی بڑھے چلو، کہ جو دل اٹھا تو قدم اٹھا

ایک اور غزل اسی بحر میں ہے اس کے بھی دو شعر ملاحظہ ہوں:

میں بہا تا فردِ گناہ کی، مگر اشکوں کی یہ لگی جھڑی کہ بھری بہی بھی بہی بہی کوئی ہو سکی نہ رقم رقم
نہ ڈرو صراط سے عاصیو میں غلام شہ ہوں نہ غم کرو میرا ہاتھ پکڑو بڑھے چلو، مرے ساتھ آؤ قدم قدم

حاجی شبیر کی ایک فقیرانہ غزل بھی مرصع ہے تین شعر اس کے بھی لکھ دیتا ہوں :-

جو چال تھی اپنی چوک گئے، جو نقشے تھے وہ بھی نہ جمے اب زد میں کچھ ایسے آن پھنسے، ہر دھب سے ہے ہلکو تا میاں
جب ہاتھ کی اپنے بات تھی سب ہم بیٹھے تھے رکھے ہاتھ پہ ہاتھ ہاتھ آتا ہے کیا افسوس سے اب ہیہات میاں ہیہات میاں
بستی میں رہے اور دن میں پھرے، ہم گھر سے نہ نکلے رات گئے سنسان ہے جنگل، قبر اندھیری، کیسے کٹے گی رات میاں

مدینے کی چاندنی قابل دید نظم ہے۔ منجملہ گیارہ بندوں کے تین بند لکھے جاتے ہیں۔ اب سے تیرہ چودہ برس قبل "رسالہ افادہ" حیدر آباد میں بھی یہ شایع ہوئی تھی اور "تذکرہ شعرائے دکن" میں بھی حاجی شبیر کے کلام کا نمونہ اسی نظم کا انتخاب ہے :-

ندی چڑھاؤ پر ہے شرابِ طہور کی مے نوش لا رہے ہیں خبر دُور دُور کی
کیا دیکھے کوئی روشنی اب شمع طور کی جھڑیاں لگی ہوئی ہیں مدینے میں نور کی
چھٹکی ہلال گنبدِ خضرا کی چاندنی
پھیکی پڑے نہ کیوں ید بیضا کی چاندنی

روضے پہ کیوں نثار نہ ہو بار بار چاند ہے آسماں پہ ایک زمیں پر ہزار چاند
ہر شہر میں دکھاتا ہے یوں تو بہار چاند طیبہ میں لگ گئے ہیں مگر اس کو چار چاند
ہے یہ کہ روشنی یہاں شمس الضحیٰ کی ہے
یہ ساری چاندنی کسی بدر الدجیٰ کی ہے

کس کا ظہورِ جلوہ عیاں و نہاں میں ہے کس کی ضیا زمین میں ہے آسماں میں ہے
پرتو سے کس کے روشنی کون و مکاں میں ہے کس نورِ عرش کا یہ اُجالا جہاں میں ہے
کس کے مقابلے میں چمک تیری ماند ہے
اے چاند وہ ہمارے مدینے کا چاند ہے

حاجی شبیر کا ایک اشتیاقیہ ترکیب بند عجیب حسرت و یاس میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس کے اصل اشعار جو بحر اختیار کی ہے وہ بھی بہت ہی درد انگیز ہے اور جن شعروں میں گرہ لگائی ہے وہ بھی باوجود

شگفتہ بحریں ہونے کے تاثیر سے خالی نہیں ہیں۔ تین بند اس نظم کے بھی لکھے جاتے ہیں:

صبا کہیو یہ عرض کہ شاہ عرب مری تمکو بھی کچھ ہے خبر کہ نہیں
گلی کوچوں میں طیبہ کے اب کے برس کبھو میرا بھی ہوگا گذر کہ نہیں

کب سے مشتاق تصوّر ہیں جمائے بیٹھے
خانۂ دل میں مگر آپ نہ آئے بیٹھے

نظر لطف غریبوں پہ بھی شاہا ہو جائے
ایک مدّت سے ہیں یہ آس لگائے بیٹھے

درِ عرش پہ پہنچی نہ میری دعا، نہ مدینے گئی کبھی آہ رسا
رہا گریہ سو اسمیں بھی کیا ہے دھرا جانے اب بھی کچھ ہوگا اثر کہ نہیں

احمد پاک تلک اشکوں سے جایا نہ گیا
قصۂ شوق مرا اُن کو سنایا نہ گیا

آتش ہجر غریبوں کی بجھائی نہ گئی
ہم کو طیبہ میں خداوند بلایا نہ گیا

یونہی گزرے الٰہی برس پہ برس رہا یاد سے خالی نہ کوئی نفس
کبھی لو رہی بھی ہوگی ہماری ہوس کبھی حج کا بھی ہوگا سفر کہ نہیں

شکل دکھلائی نہ افسوس خوشی نے اب تک
یاد فرمایا نہ شاہِ عربی نے اب تک

شوق دیدار سے آنکھوں میں بھی دم آ پہنچا
حیف پہنچے نہ یہ مشتاق مدینے اب تک

حاجی شبیر کو اہل بیت اطہار سے جو عقیدت ہے اُس کا اندازہ اِن کے نوحوں سے ہی اچھی طرح ہو سکتا ہے۔ حاجی صاحب نے اس صنف میں بھی اپنی خصوصیات شاعری کو ملحوظ رکھا ہے اور واقعہ نگاری سے آگے نہیں بڑھے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنے نوحہ جات و سلام وغیرہ میں آئمۂ اطہار یا اہلبیت نبوّت کی زبان سے کچھ ادا نہیں کیا کہ خلاف ادب و نامناسب تھا جو کچھ کہا سب اپنی ہی زبان سے اور جو کچھ آنسو بہائے ہیں وہ سب اپنی ہی آنکھوں سے اور پھر لطف یہ ہے کہ تاثیر و درد بھی اِس میں کچھ کم نہیں ہے۔ ان نوحہ جات کی ایک بیاض علٰحدہ بھی طبع ہو چکی ہے اور بعض دوسرے شعراکے نوحہ جات کے انتخاب کے ساتھ حاجی شبیر کے بعض نوحے مطبع سَیّدی حیدرآباد نے شایع کئے ہیں۔ "شبیر کا نوحہ شبیر پر" اور "شبیر کا نوحہ اصغر پر" رسالۂ افادہ حیدرآباد میں بھی طبع ہوا تھا۔ حیدرآباد کے مختلف محلّوں کے زنانہ عاشورخانوں میں میں بھی یہ نوحے عام طور پر محرّم میں پڑھے جاتے ہیں۔ ہر نوحے کا کچھ نہ کچھ عنوان بھی قایم کیا گیا ہے مثلاً "شکوۂ فرات"، "واقعات کربلا"، "ماتم رضا"، "اصغر نے کیا کیا تھا"، "ساقیٔ کوثر کا ماتم"، "اے کرب و بلا خونخوار زمین"۔ "تابوت سکینہ"، "صبح محشر"، "محرّم کی چاندنی"، "ماہِ عرب"، "احمدِ ثانی"، "شامِ قیامت"، "بیمارِ کربلا"

یہاں ہم صرف ایک سلام جو اپنی نوعیت میں بے مثل سمجھا گیا ہے لکھکر اپنا مضمون ختم کرتے ہیں:

سلام اُس پر کہ چھلنی ہوگیا تیروں سے تن جس کا
سلام اُس پر کہ خاک گرم صحرا تھی کفن جس کا

سلام اُس پر کٹا یا راہ حق میں جس نے سب کنبہ
سلام اُس پر لٹا اک دوپہر میں سب چمن جس کا

سلام اُس پر نہو سکتی تھی گنتی جس کے زخموں کی
سلام اُس پر ہوا پامال گھوڑوں سے بدن جس کا

سلام اُس پر انگوٹھی کیلئے انگلی کٹی جس کی
سلام اُس پر نہ چھوڑا ظالموں نے پیرہن جس کا

سلام اس پر کہ جس نے غسل اپنے خون سے پایا
سلام اُس پر رہا بے گور و بے مدفن بدن جس کا

سلام اُس پر چڑھا نوک سناں پر جس کا سر بیر
سلام اُس پر کہ پتھر سے ہوا زخمی دہن جس کا

سفینہ بحر آرزو

(از)

جناب ابوالافتخار فخر حیدرآبادی

ہے شہرہ آفاق دلبری میں طلسم نیرنگ آرزو کا
مگر وہ ہمت سے توڑ دیگا خیال ہے جسکو آبرو کا

نہ کھا فریب ریاض ہستی نہ جلوہ ریزی پہ جا تو اسکی
ہے حلقہ دام ہر رگ گل نہ ہو گرفتار رنگ و بو کا

ہے حسن نظارہ سوز اسکا نگاہ مشتاق ہوش میں آ
کہیں وہ جلوونکی برق پاشی جلا نہ دے خرمن آرزو کا

بہار آئی بصد تجمل ہے جلوہ گل سے مست بلبل
عطا میں ساقی ہے کیوں تامل دہن کھلے اب خم و سبو کا

بہشت در تبہ ہے خموشی ہے عیش جاوید بادہ نوشی
نہ گرم بازار خود فروشی دہن کشادہ نہ عیب جو کا

فرائض اپنے بجا نہ لائے تلاش کامل سے جی چرائے
حقیقت انساں نہ اپنی پائے یہ نقص ہے اسکی جستجو کا

نہیں بدلتا کبھی مقدر یہ جانتا ہوں وہ بے خبر ہے
وہ لاکھ چاہے مری برائی بھلا نہ کیوں چاہوں میں عدو کا

یہ عالم آب و گل ہے ناداں نہ پھنس کے اسمیں اٹھا تو نقصاں
نہیں ہے جز رنج اسکا حاصل نہ دل میں بو تخم آرزو کا

ہر ایک شعر اس کا جلوہ ساماں خلاصہ شوق بیکراں ہے
غزل یہ اے فخر درحقیقت سفینہ ہے بحر آرزو کا

معراج مسرت

(از ماپسان)

مترجمہ جناب عزیز احمد صاحب

گئے دی ماپسان موجودہ مختصر قصہ نگاری میں ید طولیٰ رکھتا ہے۔ اس فن کے ترقی دینے میں اس نے بڑی جدوجہد کی ہے۔ ماپسان کے قصوں میں "معراج مسرت" خیال اور زبان ہر لحاظ سے بہترین شہ کار تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے قصے عموماً حیرت خیز اور دلچسپ ہوتے ہیں۔ ——————— (مکتبہ)

—————— (ا) ——————

چائے کا وقت تھا چراغ جلائے جا رہے تھے۔ چوپال سے سمندر کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ ڈوبتے ہوئے سورج نے آسمان کا رنگ گلابی کر دیا تھا۔ گویا اس کے رخساروں پر سنہرا غازہ چھڑک دیا تھا۔ بحیرۂ روم بلا کسی جوش و خروش اور حس و حرکت کے بالکل مسطح تھا۔ اور رخصت ہوتے ہوئے دن کی روشنی میں چمکدار دھات کی ڈھال کی طرح جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔

سیدھی طرف بہت دور پر قوی ہیکل پہاڑ اپنی سیاہ اور ستوان بلندیوں کو لیئے ہوئے مغرب کے دھندلے سنہرے رنگ کے مقابل کھڑے تھے۔

وہ لوگ محبت کی باتیں کر رہے تھے۔ وہ پرانی کہانیاں جو کئی کئی بار دُہرائی جا چکی تھیں اب پھر دہرائے جاتے تھے۔ نرم رنج آمیز، اندھیرا چھاتا جا رہا تھا۔ اور ان کے دلوں کو نرمی اور درد سے لبریز کر رہا تھا۔ لفظ "محبت" کبھی کسی مرد کی کرخت آواز میں سنائی دیتا۔ اور کبھی کسی عورت کی بلند شیریں آواز میں۔ یا یوں کہیئے کہ سارا کمرہ اس لفظ کی تاثیر سے گرم تھا۔ جو ایک پرندے کی طرح اُن کے سروں پر اڑ رہا تھا۔

کیا محبت غیر مختتم ہے؟

بعض نے کہا ہاں۔

بعض نے کہا نہیں۔

پھر وہ مختلف معاملات کے باہمی فرق ظاہر کرتے رہے۔ اُن باتوں کی تشریح کی جو اُن مختلف حالتوں کے باہمی فرق کا باعث تھیں مختلف مثالیں پیش کی گئیں۔ مردوں اور عورتوں سب نے اپنی گذری ہوئی دلچسپیوں، اور محبت کی ناکامیوں اور کامیابیوں کی داستانیں سنائیں۔ ان کے دل اپنے رموز نہاں کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ اُن کے لب متاثر انداز سے محبت کی داستانیں سنا رہے تھے۔ وہ اس عام مگر مقدس جذبے یعنی دو ہستیوں کے پراسرار تعلقات کا عمیق تاثر اور سوز و گداز سے ذکر کر رہے تھے۔

دفعتہً اُن میں سے ایک جس کی نگاہیں دور کے منظر پر جمی ہوئی تھیں بولا "دیکھو تو" وہ دور پر کیا نظر آرہا ہے؟ سمندر پار افق کی روشنی میں ایک بڑا ابھورا بے ڈھنگا سا دھبّہ نظر آرہا تھا۔ عورتیں کھڑی ہو کر اس دلچسپ چیز کو غور سے دیکھنے لگیں، اُن میں سے کسی نے اس کو پہلے نہ دیکھا تھا۔

"یہ جزیرہ کارسیکا ہے" کوئی بولا "سال میں دو تین بار جب مطلع، آبی بخارات اور دھند سے خالی ہوتا ہے تو یہ جزیرہ، فرانس کے اس ساحل سے نظر آجاتا ہے" پہاڑ کی چوٹیاں تک نظر آرہی تھیں، بلکہ اُن پر جمی ہوئی برف بھی دکھائی دیتی تھی۔ دنیا کے اس حصے کے.... اچانک نظر آجانے پر وہ متعجب ہوئے۔ گھبرائے اور غالباً خوف زدہ بھی ہوئے۔ شاید وہ اسی قسم کا خطرہ محسوس کر رہے تھے، جیسا کہ کولمبس کے ساتھیوں نے نامعلوم سمندروں میں جہاز رانی کرتے ہوئے محسوس کیا تھا۔

پھر ایک شریف صورت پیر مرد جس نے اب تک گفتگو میں حصہ نہ لیا تھا، کہنے لگا "یہ جزیرہ جو اس طرح اتفاقاً ہماری نظروں کے سامنے آگیا ہے، عجیب و غریب ہے۔..........اس کو دیکھ کر مجھے ایک دلچسپ افسانۂ الفت یاد آجاتا ہے..........وفادار محبت، افسوں نما، مسرت آمیز محبت کی ایک کامل مثال۔

(۲)

پانچ سال گذرے میں کارسیکا کی سیاحت کرنے گیا تھا۔ یہ وحشی جزیرہ ہم سے کافی دور ہے اور اس کے حالات سے ہم لوگ بہت کم آگاہ ہیں، امریکہ سے بھی کم..... حالانکہ یہ جزیرہ کبھی کبھی فرانس کے ساحل سے بھی نظر آجاتا ہے، جیسے آج ہی۔

اسے ایک دنیا فرض کیجئے جو ترقی و تہذیب سے آشنا نہیں ہوئی۔ پہاڑوں کا ایک جال، تنگ وادیاں، ساحل سے سر ٹکراتی ہوئی موجیں، ناہموار زمین، سراب کی عظیم اور مہیب لہریں، گھنے جنگل

غیر مزروعہ زمین ـــــ البتہ کبھی کبھی کسی پہاڑ کی چوٹی پر کوئی گاؤں .... نظر آجاتا ہے۔ مگر نہ تہذیب ہے، نہ صنعت، نہ فنون۔ چھلی ہوئی لکڑی یا ترشا ہوا پتھر تک نظر نہیں آتا۔ خوبصورت اور نادر چیزوں کا قدرداں اور متلاشی کوئی نہیں۔ اس عظیم الشان سنگین جزیرے میں سب سے زیادہ قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ یہاں اس سحر آفریں جمال کی قدر نہیں جس کو حسن کاری کہتے ہیں۔

اطالیہ، وہ ملک جس کا ہر ہر مکان حسن کارانہ شاہکاروں سے آراستہ ہونے کی وجہ بجائے خود ایک شاہکار بنا ہوا ہے۔ جس میں مرمریں، چوبیں، آہنی حسن کاریاں انسانی عقل و دانش کا ثبوت مہیا کرتی ہیں۔ جہاں چھوٹے سے چھوٹے پرانے موروثی مکان میں بھی حسن کاری کی پیداوار کو بڑی حفاظت سے رکھا جاتا ہے ـــــ اطالیہ ہماری نظروں میں ایک مقدس اور محبوب سرزمین ہے کیونکہ وہ انسان کی تخلیقی قوت کا پرشوکت اور باعث فخر گہوارہ ہے۔

اور اطالیہ ہی کے پڑوس میں کارسیکا بھی ہے۔ جہاں ہنوز روزِ اول ہے۔ یہاں کا انسان بھدے مکانوں میں رہتا ہے۔ اور ان تمام چیزوں سے، جو اس کی ذات یا خاندان سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں قطعاً بے پروا ہے۔ وہ تمام غیر مہذب قوموں سے خرابیوں اور خوبیوں میں بازی لے گیا، خطرناک ہے، قابلِ نفرت ہے، خون کا پیاسا ہے، مگر ساتھ ہی ساتھ، مہمان نواز، خلیق، فیاض، ہمدرد سادگی پسند اور محسن پرست بھی ہے۔

ایک مہینہ تک میں اس جزیرہ میں پھرتا رہا اور یہ محسوس کرتا رہا کہ دنیا کے کنارے تک پہنچ گیا ہوں۔ سرائیں نہیں، مسافر خانے نہیں، سڑکیں تک نہیں، البتہ دیہاتوں کے درمیان خچروں کے چلنے کے راستے موجود ہیں۔ پہاڑوں پر گاؤں بسے ہوئے ہیں جہاں سے نشیب میں پرشور خلیجوں اور ہیبتناک دھاروں کا نظارہ خوب ہوتا ہے۔ مسافر آکر مہمان ٹھہرتا ہے معمولی سی میز پر کھانا کھاتا ہے معمولی سی چھت کے نیچے سوتا ہے۔ اور صبح کو اپنے میزبان سے ہاتھ ملاتا ہے جو اس کو گاؤں کے کنارے تک چھوڑ آتا ہے۔

ایک روز دس میل چلنے کے بعد مجھے ایک چھوٹا سا مکان نظر آیا۔ جو ایک تنگ وادی کی گہرائی میں بنا ہوا تھا۔ اور سمندر سے تقریباً ایک میل دور تھا۔ دونوں طرف پہاڑ، جن کے ڈھلان پر جھاڑیاں پودے، اور بڑے بڑے درخت تھے اور جو تاریک دیواروں کی طرح اس خلیج کو گھیرے ہوئے تھے۔

مکان کے اطراف انگور کی چند بیلیں تھیں۔ ایک چھوٹا سا باغ تھا، کچھ دور بڑے بڑے درخت تھے۔ اور اس ملک میں یہ ماحول ایک تنہا زندگی بسر کرنے والے کے لئے کافی تھا۔

ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا۔ اس کے چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں اور ایک بوڑھا مرد بید کی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ میرے خیر مقدم کے لئے اٹھا، اور پھر ایک لفظ بولے بغیر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

"جناب اسے معاف کر دیجئے" اس کی بیوی نے مجھ سے کہا "اس کے کان جواب دے چکے، اب اس کی عمر (۸۲) برس کی ہوگی"۔

وہ شستہ فرانسیسی بولتی تھی۔ میں نے متعجب ہوکر سوال کیا "آپ لوگ کارسیکا کے باشندے ہیں؟"

"نہیں" اس نے جواب دیا "ہم سرزمین فرانس سے آئے ہیں۔ مگر یہاں رہتے ہمیں پچاس سال سے اوپر ہو گئے"۔

پچاس برس! اس تاریک سوراخ میں شہروں اور انسانی آبادی سے دور پڑے گئے۔ اس خیال نے میرے دل میں تعجب اور خوف کا احساس پیدا کر دیا۔ ایک بڈھا چرواہا ہمارے لئے کھانا لیکر آیا اور ہم سیدھا سادہ کھانا، گاڑھا شوربا، آلو اور ابالی ہوئی ترکاریاں کھانے لگے۔ جب کھانا ختم ہوا تو میں باہر نکل کر دروازے کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس گرد و پیش کے منظر کا میرے دل پر بے حد تاریک اثر پڑا۔ میری حالت بالکل وہی تھی جو اکثر مسافروں کی تاریک راتوں کو اجڑی ہوئی بستیوں میں ہوتی ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد کہن سال عورت بھی میرے پاس آکر بیٹھ گئی اور اس تجسس سے مغلوب ہوکر جو بڑے سے بڑے تارک الدنیا کے دل میں بھی ضرور موجود ہوتا ہے۔ مجھ سے پوچھنے لگی "تو تم فرانس سے آ رہے ہو؟"

"ہاں میں صرف سیاحت کی غرض سے آیا ہوں"۔

"غالباً پیرس سے"۔

"نہیں نانسی سے"۔

اور میں نے محسوس کیا کہ کوئی غیر معمولی خلجان اسے بے چین کر رہا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اس کے دلی اضطراب کا پتہ کیونکر لگایا۔

"نانسی سے آ رہے ہو" اس نے آہستہ سے دہرا کر کہا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کا شوہر

دہلیز پر عام بہروں کی طرح افسردہ داخل ہوا۔ بوڑھی عورت نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "کوئی حرج نہیں۔ وہ بہرا ہے۔ سن نہیں سکتا اور پھر چند لمحوں کے بعد کہنے لگی "تو تم نانسی کے لوگوں کو جانتے ہو؟"

"ہاں تقریباً ہر شخص کو"

"سینٹ ایلز خاندان کو بھی؟"

"ہاں اچھی طرح سے وہ لوگ میرے والد کے دوست ہیں"۔

تمہارا نام کیا ہے؟

میں نے اپنا نام بتا دیا وہ تھوڑی دیر تک میری طرف گھورتی رہی اور پھر پرانی باتوں کی یاد سے متاثر ہو کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی "ہاں مجھے خوب یاد ہے۔ اور بریلیا میں خاندان والوں کا کیا حال ہے"

"سب مر گئے"

"اور سرمونت خاندان؟ تم اس سے واقف ہو؟"

"ہاں۔ ان میں سے ایک نوجوان آج کل جنرل ہے"۔

یہ سن کر اس نے بیتابی سے نہ معلوم کس خلجان انگیز مضبوط اور موثر جذبے یا... پوشیدہ رازوں کو ظاہر کرنے کی کس زبردست ترغیب سے متاثر ہو کر اس راز کو افشا کرتے ہوئے جو اس کے سینے میں برسوں سے پوشیدہ، ان لوگوں کا ذکر سن کر جن کے نام سے اس کی روح کی گہرائیوں میں بھی لرزش پیدا ہو جاتی تھی، کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا "ہاں ہنری دسرمونت میں اس کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ میرا بھائی ہے"۔

میں نے نظر اٹھا کر تعجب سے دم بخود ہو کر اسے دیکھا، اور پھر دفعتہً مجھے وہ پرانا واقعہ یاد آ گیا۔ یہ ایک پرانا قصہ تھا جو لورین کے پرشوکت صوبے میں پیش آیا تھا۔ سپہ سالار کی نوجوان، خوبصورت اور مالدار لڑکی سوزین دسرمونت، اپنے باپ کے ایک ماتحت افسر کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔

یہ افسر جو اپنے افسر بالا کی لڑکی کو بھگا لے گیا تھا ایک قبول صورت نوجوان تھا۔ اس کے والدین کاشتکار تھے۔ مگر وہ خود فوج کی نیلی وردی کو بڑے فخر سے پہنتا تھا۔ جنرل کی لڑکی نے غالباً اسے فوجی مشق کے وقت کہیں دیکھ لیا اور اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ مگر وہ دونوں کیونکر مل سکے؟ کیونکر یکجا ہو سکے؟ ان کی محبت کے تعلقات کیونکر بڑھے؟ یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔

کسی بات کا شبہ یا اندیشہ تک نہ تھا۔ ایک شام کو وہ دونوں غائب ہو گئے پھر ان کا پتہ نہ مل سکا اور نہ ان کی کوئی خبر ملی۔ یہاں تک کہ ان کو مردہ سمجھ لیا گیا۔ اور اسی وقت میں نے اس دور دراز تیرہ و تاریک وادی میں پھر ان کو پا لیا۔

اب میں نے جواب دیا "ہاں مجھے خوب یاد ہے۔ تم مدموزیل سوزین ہو؟"

اُس نے سر کے اشارے سے اثبات میں جواب دیا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے اور پھر بوڑھے کی طرف جو چوکھٹ پر خاموش کھڑا تھا دیکھ کر مجھ سے کہنے لگی "یہ وہی ہے"۔

میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اب تک وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ اب بھی اس کو محبت کی اندھی آنکھوں سے دیکھتی ہے۔

"مگر کم از کم تم نے مسرت سے تو زندگی بسر کی؟" میں نے سوال کیا۔

اور اُس نے نہ دل سے جواب دیا "ہاں انتہائی مسرت سے۔ اُس نے مجھے ہمیشہ خوش رکھا مجھے وطن چھوڑنے کا مطلق افسوس نہیں"۔

میں نے محبت کی بے پناہ طاقت کا اندازہ کرتے ہوئے متعجب اور اندوہناک نظروں سے اُسے دیکھا ــــــ یہ امیر لڑکی، اس آدمی اس کسان کے لڑکے کے ساتھ بھاگ آئی۔ ایک ایسی زندگی بسر کی جس میں ظاہری دلکشی، آرام، اور عشرت بالکل نہ تھی اُس نے اپنے آپ کو ایک سادہ زندگی کا عادی بنایا۔ اور اب بھی وہ اس سے محبت کرتی تھی۔ وہ ایک دیہاتی کاشتکار کی بیوی ہے۔ اس نے معمولی ٹوپی اور بورئیے کا لباس پہن کر آلو اور ترکاریاں کھا، تمام لذائذ سے کنارہ کش ہو اپنے شوہر کے ساتھ گھاس کے بچھونے پر سو کر اپنی زندگی کے دن گذارے۔

اُسے اگر کوئی فکر تھی تو صرف اپنے شوہر کی۔ اُس کو جواہرات، نفیس ملبوسات، صوفے، عطریات اور مخملی بچھونے چھوڑنے کا کبھی رنج نہ ہوا۔ سوائے اس کے اُسے دنیا کی کسی شئے کی ضرورت نہ تھی اور چونکہ وہ اس کے پاس موجود تھا۔ اُسے کسی اور چیز کی تمنا نہ تھی۔

عنفوان شباب میں وہ آرام کی زندگی، دنیا، اپنے عزیز، سب کو چھوڑ کر اُس کاشتکار کے لڑکے کے ساتھ اس وحشی وادی میں چلی آئی۔ اور وہی اس کی تمناؤں کے لئے، اُس کے خوابوں کے لئے، اُن تمام چیزوں کے لئے جن کی ایک عورت کو آرزو ہوتی ہے سب کچھ تھا۔ وہ اس کی امیدوں کا

مرکز تھا۔ اس کی بدولت اس عورت کی زندگی شروع سے آخر تک معراج مسرت بنی رہی۔

اس سے زیادہ مسرت حاصل ہو ہی نہیں سکتی۔

رات بھر میں بوڑھے سپاہی کے خراٹوں کی آواز سنتا رہا۔ وہ گھاس کے بچھونے پر بڑھیا کے پاس پڑا سو رہا تھا۔ رات بھر میں اس عجیب و غریب، سادے سے واقعے پر غور کرتا رہا۔ اس کا افسانۂ محبت جس کی انتہا معراج مسرت تھی اور وہ بھی زوال نا آشنا۔

دوسری صبح میں بوڑھے جوڑے سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔"

(۳)

کہنے والے نے اپنا افسانہ ختم کیا تو ایک عورت بولی "پھر بھی اس کی آرزوئیں کس قدر آسان، اس کی خواہشیں کسی قدر معمولی، اور اس کی زندگی کس قدر سادہ تھی۔ یقیناً کوئی بے وقوف سی لڑکی ہوگی۔"

دوسری عورت آہستہ سے بولی۔

"اس سے کیا؟ اُس کی زندگی تو مسرت سے لبریز تھی"

بہت دور افق پر کار سیکا، رات کی تاریکی میں نہاں ہو رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان دو محبت کرنے والوں کی داستانِ الفت سُنا رہا ہے، جنہیں اس کے ساحل پر پناہ ملی۔

کردار اور افسانہ

از مولوی سید عبدالقادر سروری ایم اے۔ ایل ایل بی

یہ دنیائے افسانہ کا گویا دوسرا حصہ ہے۔ فاضل مؤلف نے افسانہ نگاری میں کردار (کیرکٹر) کی کیا اہمیت ہے اس پر جامع بحث کی ہے اور جگہ جگہ انگریزی اور اردو افسانوں کے کرداروں کی مثالیں دینے کے علاوہ اردو کے افسانوی ادب کے مشہور کردار عمرو عیار (داستان امیر حمزہ)، نجم النسا (مثنوی میرحسن)، نعیمہ اور نصوح (توبۃ النصوح)، عون محمد (مراثی انیس)، پر تنقیدی مقالے بھی لکھے ہیں۔ ضخامت (۲۲۲) صفحات۔ مجلد سادہ قیمت (عہ)۔

مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد

غزل

(از)

علامہ نواب ضیا یار جنگ بہادر

خندہ برق، بدگمانیے کیست | گریۂ ابر، جاں فشانیے کیست

آنکہ صد خرمنِ تمنّا سوخت | شعلۂ آتشِ جوانیے کیست

آنکہ اخلاقِ غنچہ کرد درست | طرزِ تعلیم بے زبانیے کیست

گر خدنگِ تو راستی میکرد | مرغِ جاں صیدِ کج کمانیے کیست

ہمچو اوراقِ گل پریشان است | دفترِ رازِ زندگانیے کیست

دلکشِ مایلانِ خوابِ عدم | قصۂ مرگِ ناگہانیے کیست

دل کہ پہلو کشد ضیا از من

آرزو مندِ مہربانیے کیست

یورپ اور اسلام

(از)

جناب ڈاکٹر محمد عبدالحق صاحب
ڈی ایس سی (پیرس) - اے - انسٹی ٹیوٹ - پی (لندن) ڈی ایف ایچ -

جب مسلمان چمنستان اُندلس کو انواع واقسام کے علمی پھولوں سے آراستہ وپیراستہ کررہے تھے اُس وقت یورپ پستی میں غفلت کی نیند سو رہا تھا - چنانچہ آنسلون پروفیسر رائل ملٹری اکاڈمی (فرانس) اپنی کتاب (Tableaux de revolutions du systeme politique de l'eurape depuis xve si-ecle) کے صفحہ (۱۴۹) پر رقمطراز ہے :-

"عرب پہلی قوم تھی جس نے حسن انتظام اور نمایاں کامیابی کے ساتھ علوم سائنس کی بنیاد رکھی - اُنھوں نے اسپین کے مشہور شہروں میں کالج، اکاڈمی، لائبریری اور اسکول بنائے - علوآن نے قرطبہ کی یونیورسٹی کی بنیاد رکھی اور اس کی لائبریری میں چھ ہزار کتابیں جمع کیں - اسپین کے ملک میں ستر لائبریریاں قایم کی گئیں"-

یہ ممکن نہیں کہ یورپ عربوں کے مبارک اثر کا انکار کرسکے - انہوں نے یوروپ میں انوارِ علوم کے پھیلانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا، یورپ بھر کے طلبا اُن درسگاہوں میں تحصیل علوم کے لئے آتے تھے - اُن کے تجارتی تعلقات بحیرۂ روم کی تمام بندرگاہوں کے ساتھ خوشگوار تھے، اُن ہی کی بدولت علم کے جراثیم یورپ کے ہر ملک میں پہنچے تھے - اُنکی کتابوں کا مغربی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا اور اُن کی جامعات اور درسگاہوں کی دریا دلی دیکھکر خسروان یورپ کے دلوں میں بھی علمی درسگاہوں کے قایم کرنیکا خیال پیدا ہوا"

انہی حقایق کا اعادہ کرتے ہوے ایک انگریز مصنف "سر تامس ارسکائن" جو بیجا اہل مشرق کو کوسنے سے غافل نہیں رہا اپنی کتاب تاریخ جمہوریت یوروپ (Histori de la Demo-ocratic en Europe)

میں عربوں کی تعریف میں لکھتا ہے:

"عربوں کی تہذیب مشرقی تہذیب تھی، جس کی بنیاد ایشیا اور مغربی سائنس پر رکھی گئی تھی، عربوں کی ذہنی ترقی تاریخ انسان کا حیرت ناک ورق ہے، اُن کا ذوق علم قومی امتیاز سے کم نہ تھا، خلفائے بغداد نے علم النجوم، حکمت، علم جرّاحی وغیرہ کے مدارس جاری کئے۔ مصری، یونانی، ایرانی اور یہودی حکما، دانشمند اُن کے درباروں میں جمع رہتے تھے، انہوں نے کئی لائبریریوں کی بنیاد رکھی، اور علوم ماضی کو اپنی تہذیب کے رنگ سے بدل دیا۔ اس لحاظ سے انھیں بطلیموس کا جانشین کہنا بے جا نہ ہوگا، اُن کی معرکتہ الآرا فتوحات نے اُن کی حیرت نواز تہذیب کو یوروپ کی دیواروں تک پہنچا دیا۔ آٹھویں صدی عیسوی میں انہوں نے اسپین کو فتح کیا، اور اس طرح ایک مغربی ملک میں ایشیائی تہذیب کا نشان گاڑا۔ قرطبہ کے مور خلفا، خلفائے بغداد کے حریف تھے، اُس زمانے میں جب کہ اہل مغرب تعلیم کی برکات سے محروم تھے انہوں نے علم وصنعت کا پودا لگایا، یونیورسٹیاں بنائیں، عظیم الشان محلات تعمیر کرائے جن کی یادگاریں آج تک جن کی توں باقی ہیں، ظاہر ہے کہ اُن کی تہذیب مغربی تہذیب سے اولیٰ تر تھی مگر افسوس یہ ہے کہ وہ ایک غیر زبان رکھتے تھے اور اُن کا مذہب عیسائیت کی نظروں میں ایک ڈراونی چیز تھا۔ بایں ہمہ اُن کا حلقۂ اثر بہت وسیع تھا، اُن کی وجہ سے انسانی فہم و ادراک بلند ہوا، انہوں نے عیسائی مذہب پر بہت تحقیقات کیں، اور اُن کا لٹریچر شمالی فرانس، سسلی، اٹلی اور دوسرے ممالک میں پھیل گیا۔"

"مندرجہ بالا سطور پڑھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یوروپ کے لوگ عربوں کی کرم گستری کے منت کش احسان رہ چکے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اگر مور اسپین کو فتح کرکے مشرقی تہذیب کو مغرب نہ پہنچاتے تو یوروپ والوں کو کبھی موجودہ عروج نصیب ہی نہ ہوتا۔ اسلامی فتوحات نے اہل یورپ کے دلوں میں دو قسم کے خیالات پیدا کئے (۱) اُن کی فوقیت کا اعتراف (۲) اُن کی مدافعت کی تدبیر، اول الذکر خیال نے اہل فرنگ کو اس بات پر راغب کیا کہ اُن کی درسگاہوں میں جاکر علوم وافرہ سے بہرہ اندوز ہوں تاکہ تکمیل تعلیم و تدریس کے بعد وہی علوم اپنی یونیورسٹیوں میں رائج کرسکیں، علاوہ ازیں عربوں نے یونان کے فلسفیوں اور قدما، کی اکثر کتابوں کو زبان عربی میں ترجمہ کر ڈالا تھا، یہ کارنامے اہل مغرب کے ہاتھ آئے، اور اسی طرح ایشیائی تہذیب و حکمت کے نایاب خزانے اہل مغرب کی آنکھوں کی بصیرت بنے،

ثانی الذکر خیال نے اہل غرب کو اتحاد عامہ اور تنظیم قوائے عامہ کی رغبت دلائی، یورپ کے اہل دانش اس تدبیر کی تلاش کرنے لگے جس کی بدولت عربوں کو جن کی قوت بازو شہرۂ آفاق تھی اپنا مطیع و منقاد بنا سکیں۔ اس فکر و تلاش نے مغربی فلاسفروں میں قدرتاً مختلف طاقتوں سے استفادہ حاصل کرنے کا خیال پیدا کیا۔ مزید براں "سیاسی ڈپلومیسی" کی بنیاد رکھی گئی۔

اسلامی تہذیب نے یورپ کے مذہبی خیالات پر بھی خاص اثر کیا، اس تعلیم کا پہلا اثر مسلم اسپنس کے ذریعہ کیتھولک فرانس میں البین جنسس اتحاد کی صورت میں رونما ہوا، کئی آزاد خیال فلاسفر شمع ہدایت بنکر یورپ کے آسمان پر چمکے، جان ہیلس، ساوآنرولڈ، لیوتھر، برونو اور کیپلا نے اپنی حیرت نواز اور اخوت طراز تقاریر سے پاپائیت کے قصر کہن میں تہلکہ ڈال دیا، یہانتک نیوٹن جیسا سائنس داں اور نیچر پسند بھی وحدانیت کے خیالات سے بے حد متاثر ہوا ہے وہ ایک جگہ لکھتا ہے:

"آفتاب، ستاروں اور آسمان کا قابل ستائش نظام بغیر ایسے ناظم کے نہیں ہو سکتا جو بہت طاقتور اور دانشمند ہو، یہ لامحدود ہیئت جملہ کائنات پر حاوی ہے، وہ دنیا کا حصہ نہیں، بلکہ چیزوں کا محافظ ہے، حقیقی خدا وہی ہو سکتا ہے جو ہمیشہ زندہ اور صاحب حکم و قوت ہو، وہ اس قدر مکمل ہے کہ اس کا کمال محدود نہیں ہو سکتا، وہ ابدی ہے اور ہمیشہ رہیگا، وہ ہر جگہ موجود ہے گویا کین لامکاں ہے وہ سب کا داتا ہے اور جو آنے والے واقعات ہیں وہ ان سے آگاہ ہے۔"

ظاہر ہے کہ یہ خیالات فرقان حمید کی آیات کا ترجمہ ہیں۔ وحدت پرستی تو الگ رہی خود فلسفہ ارتقا طبعی میں ڈارون تک نے حکیم ابن مسکویہ کے رسائل کی تقلید کی، یہ صحیح نہیں کہ ڈاکٹر ڈارون اس فلسفہ کا موجد ہے، بلکہ الخوارزمی کی بعض تصانیف بتاتی ہیں کہ عربی دماغ اس فلسفہ سے نا آشنا نہ تھا، جلال الدین رومی نے اپنے اشعار میں اس کا اجمالاً ذکر کیا ہے اور بارھویں صدی عیسوی میں اس مسئلہ نے عربی اور اسلامی درسگاہوں میں کافی فروغ حاصل کیا، مسلمان حامیان ارتقا نے اس کو حیوانات تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ انہوں نے حیوانات کے علاوہ جمادات اور عالم بالا کے دوا اور مدارج بھی قائم کئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابن الصائغ آج سے کئی سو سال پیشتر قرطبہ کے کالجوں میں اس کی بنیاد کو استوار کر چکا تھا اور اسی بیج سے شگوفے پھوٹے جو آج تناور درختوں کی صورت میں نظر آرہے ہیں۔ کچھ بھی ہو۔

اس میں شک نہیں کہ اسلامی وحدت پرستی نے تثلیث کے گھر میں پھوٹ کے بیج بو دیے تھے۔ اسی کا اثر تھا کہ مذہب پر قومیت کو فوقیت دی گئی، رومن کیتھولک، پروٹسٹنٹ وغیرہ الفاظ میں اس قدر کشش نہ رہی جس قدر جرمن انگریز فرانسیسی وغیرہ کہلاتے ہیں۔ اکثر حکیمان فرنگ اس خیال کے پابند ہونے لگے کہ وہ مذہب مذہب کہلانے کا مستحق نہیں جس کی بنیاد فہم عام پر نہ رکھی گئی ہو، چنانچہ پاسکل لکھتا ہے:

"حقیقت اور انسانی فطرت دو ایسی چیزیں ہیں جن کو آپس میں جدا نہیں کیا جا سکتا، اگر ہمارے مذہب کی بنیاد فہم عام اور رواداری پر نہ ہو تو ایسا مذہب لغو اور تمسخر انگیز ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خدا نے بذریعہ ہمارے اندر عمل کی طاقت پوشیدہ رکھی ہے۔ مگر یہ بات بھی غیر یقینی نہیں کہ ہم کسی بات کو پورے طور پر پیش کر سکے۔ بایں ہمہ کہ ہم میں تمام قوتیں پنہاں ہیں"

اسی طرح امیل ہو ترو ممبر انسٹی ٹیوٹ فرانس "اخلاق و مذہب" Morale & religion میں لکھتا ہے: "سچا خیال وہ ہے جس سے فایدہ حاصل ہو، جس سے انسان فریب و مکر میں گرفتار نہ ہو، بلکہ جب اس پر عمل کیا جائے تو اس سے امید بندھے۔ جو انسان کو عزت کی زندگی بسر کرنے میں مدد کرے۔ اخلاق وہ چیز ہے جس کے ذریعہ انسان کا باطن و ظاہر یکساں ہوتا ہے۔ مذہب وہ چیز ہے جس سے ہر فعل اطمینان قلب کا موجب ہوتا ہے اخلاق، خوش اطواری اور خصایل ستودہ کا مجموعہ ہے۔ مذہب یہ ہے کہ اسی مجموعہ کو حکم آسمانی سمجھا جائے۔ لہذا مذہب و اخلاق دو جداگانہ چیزیں نہیں"

یہ خیالات اس بات کے شاہد ہیں کہ مغربی دماغ اصول اسلامی سے کس قدر متاثر ہو چکا تھا۔ اسلام کے اصول مساوات و حریت نے اشتراکیت کی آئینی صورت یعنے ڈیموکریسی اختیار کی، اور اس طرح عمومیت کے جملہ اصول بالواسطہ یا بلا واسطہ یوروپین سوسائٹی کے ارتقا میں شمع راہ ہوئے، آج یوروپ کی مہذب اقوام کا دعوے ہے کہ اشتراکیت، مساوات اور حریت اور ان سب کی آئینی صورت ڈیموکریسی موجودہ اور گزشتہ تہذیبوں کا مایہ امتیاز ہے مگر یہ اصول عرب کے کملی والے ہی نے دنیا کے آگے پیش کیے تھے۔ والٹیر کا مسئلہ اخوت، روسو کا اصول مساوات، مان تس کیو کا فلسفہ عمل، لاک کی عرکز پرستی، میونے تیوس اور ہیول باک کی ظاہر پرستی اسی خرمن کے خوشے تھے۔ انقلابات زمانہ نے اسلامی چراغ بجھا دیئے ہیں مگر واقعات قایم ہیں سہ

سلف کی دیکھ رکھو راستی اور راست اخلاقی ۔۔۔ کہ اُن کے دیکھنے والے ابھی کچھ لوگ ہیں باقی

سچائی

(از)

جناب حکیم آزاد انصاری صاحب

بھلائی کی خواہش عجب شے ہے، لیکن بھلائی کی صورت سچائی میں دیکھی
جہاں نے خزانے سچائی سے لوٹے ترقی دولت سچائی میں دیکھی
ترقی کے چشمے سچائی سے پھوٹے تمدن کی طلعت سچائی میں دیکھی
مسرت کے گلشن سچائی سے پھولے بہار فراغت سچائی میں دیکھی
دلوں سے کدورت سچائی نے دھوئی جلائے طبیعت سچائی میں دیکھی
بنائے مذاہب سچائی نے ڈالی ادائے رسالت سچائی میں دیکھی
نقاب حقیقت سچائی نے کھولی تجلی وحدت سچائی میں دیکھی
طمانیت دل سچائی نے بخشی خدا کی معیت سچائی میں دیکھی
یقینی ہدایت سچائی سے پہنچی حقیقی سعادت سچائی میں دیکھی
بساط رذالت سچائی نے الٹی بقائے شرافت سچائی میں دیکھی
زمانہ کی عظمت سچائی میں پائی خدائی کی طاقت سچائی میں دیکھی

بہرحال آزاد اپنا ہے تو یہ ہے
کہ سچی مسرت سچائی میں دیکھی

جیوفری چاسر

حیات اور شاعری

(از جناب سید شاہ محمد صاحب بی اے (عثمانیہ))

تمہید چاسر کو شعرائے انگلستان میں اولیت کا فخر حاصل ہے۔ وہ سپنسر، شکسپیر، ملٹن اور دیگر انگریزی تاجداران سخن کے شاہی سلسلہ کا مورث اعلیٰ تھا۔ اس کے بعض پیرووں کا یہ خیال کہ وہ انگریزی شاعری کا باوا آدم ہے صحیح نہیں۔ تاہم وہ "اس دلکش زبان کا پیش آہنگ" ضرور ہے۔ چاسر نے قدیم رسم ورواج سے روگردانی کرکے ایک ایسی شاعری کی بناڈالی جو صورت اور مواد میں بڑی حد تک نہ تو اینگلو سیکسن تھی اور نہ سلٹک بلکہ اجنبی تھی۔ مگر یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ قدیم روایات کو اس نے باختیار خود ٹھکرا دیا بلکہ یہ اس کی تعلیم و تربیت اور طرز زندگی کا فطری نتیجہ تھا جن سے اس کی ذکاوت کو ڈھالے جانے کا موقع ملا۔ یہ سچ ہے کہ شاعر پیدا ہوتا ہے بنایا نہیں جاتا لیکن بڑے سے بڑے شعرا کا کلام اپنے ماحول سے تھوڑا بہت متاثر ہوتا ہے۔ چاسر کی ذکاوت اور اس کے اختیار کردہ راستہ کو سمجھنے کے لئے ہم کو اس کی حیات اور واقعات سے واقف ہونا چاہیئے:

تاریخ حیات چاسر کی لندن میں (۱۳۴۰ء) ایک تاجر کے گھر ولادت ہوئی۔ وہ غالباً نارمن نسل سے تھا۔ چاسر کا خاندان متمول اور با اثر تھا۔ اس کے باپ کے تعلقات شاہ وقت ایڈورڈ سوم کے ساتھ اچھے تھے۔ چنانچہ چاسر کو سترہ برس بادشاہ کی بہو کونٹس الزبتھ کے ہاں ملازمت مل گئی۔ چاسر کی زندگی کا یہ نہایت اہم واقعہ ہے ایسی عمر میں جبکہ بچپن اور حساس طبیعت کے لئے دنیا بالکل اچھوتی اور حیرت بھری نظر آتی ہے ہمارے شاعر کو اس اجنبی فضا میں ڈالا گیا جو نازنینوں، اُمرائے کبار اور فرانسیسی شعرا و فرانسیسی مذاق پر مشتمل تھی۔ اس چھوٹی دنیا کے باہر انگلستان کی کلفت نصیب طاعون زدہ رعایا تھی۔ چاسر اس سے بیخبر تھا۔ اس کی تربیت اس عہد کے شرفا کی سی ہوئی تھی۔ اس کی دنیا شجاعت رومانس اور دربار پر مشتمل تھی۔

اس درباری تربیت کے علاوہ چاسر کے سامنے کتابی دنیا بھی تھی۔ اس نے لاطینی سیکھی اور غالباً

بچپن سے فرانسیسی سے واقف تھا۔ شکسپیر کی طرح وہ نہ صرف محب وطن انسان تھا بلکہ کتابوں کا بھی دلدادہ تھا۔ اور طالبعلمانہ شوق و محنت کے باوجود وہ اپنا آپ بہترین معلم تھا۔ اس کی اکثر نظمیں پرانی کتابوں پر مبنی یا ان سے ماخوذ ہیں۔

اس کے اجنبی اثرات کی پیداوار ادبی وراثت خالص انگلو سیکسن نہیں تھی بلکہ لاطینی اور فرانسیسی مشہور شعراء میں ورجل اور عووڈ Ovid کا اس نے مطالعہ کیا تھا۔ اس کا مادری ادب فرانسیسی تھا۔ اس نے رومن ڈی لا روس (فرانسیسی قدیم افسانے) پڑھے تھے وہ معاصر فرانسیسی شعراء سے بھی واقف تھا۔ یہی اس کے اساتذہ تھے اور جب اس نے کوئی نظم شروع کی تو اس کے مخاطب درباری لوگ تھے جن کا مذاق بھی فرانسیسی تھا۔ اس لئے قدرتاً اس کو فرانسیسی طریقہ کی اتباع کرنا پڑا

لیکن طالبعلمی اور شعرگوئی چاسر کی کثیر الشعب زندگی کے چند رخ تھے۔ بیس سال کی عمر سے پہلے اس کو صد سالہ جنگ فرانسیسی میں بھی بادشاہ کے ساتھ حصہ لینا پڑا۔ ان دنوں جنگ شان و شکوہ سے مملو ہوتی اور شاعرانہ تخیل کے لئے ایک بہترین محرک تھی۔ جنگ کا تاریک پہلو بھی اس کی نظروں سے چھپ نہیں سکا۔ چنانچہ وہ فرانسیسیوں کے ہاتھ قید ہوگیا اور بادشاہ نے معاوضہ دیکر اس کو چھڑا لیا۔ اس کے بعد چاسر کو تنخواہ مقرر کردی گئی، وہ خاص شاہی ملازمین میں داخل ہوگیا اور اس نے اپنی شادی بھی کرلی۔

چاسر کو غالباً بادشاہ کا اعتماد حاصل ہوگیا تھا چنانچہ اس کو ۱۳۷۲ء میں ایک سیاسی مشن پر اٹلی بھیجا گیا۔ اس سلسلہ میں اسے فلورینس جینوا جیسے دلکش شہر دیکھے جو اس عہد کی حسن کاری اور شاعری کے گہوارے تھے۔ اس نے اطالوی نشاۃ جدیدہ کے علمبردار شاعر پٹرارک سے بھی ملاقات کی۔ اس کا اثر اس کی ذکاوت اور نشو و نما پر بہت ہوا۔ واپسی کے بعد چاسر کے اعزاز میں اور اضافہ ہوا یہاں تک کہ وہ پارلیمنٹ کا رکن بھی بن گیا۔

لیکن چاسر کی خوشحالی میں تغیر ہونے والا تھا۔ اس وقت تک وہ مرفہ الحالی سے بہت کچھ فائدہ اٹھا چکا تھا اور اس سے اپنے ذوق شاعری کو خوب ترقی بھی دی تھی۔ لیکن اب اس کو دوسرے معلم کی ضرورت تھی۔ ۱۳۸۶ء میں اس کے قدرداں بادشاہ ایڈورڈ سوم کا انتقال ہوگیا اور رچرڈ دوم کی نابالغی کے زمانے میں خردسال بادشاہ کے چچا یکے بعد دیگرے برسر اقتدار ہونے لگے۔ چاسر کے مستقل اور قدیم محسن جان آف گانٹ کی عدم موجودگی میں ڈیوک آف گلاسٹر مختار سلطنت ہوگیا اور اس تغیر کا خمیازہ جان کے ساتھیوں کو بھگتنا پڑا چنانچہ چاسر کے عہدے بھی چھین لئے گئے لیکن چاسر نے مردانہ وار مصائب کا

مقابلہ کیا۔ اپنی عمر کے آخری حصہ کی نظموں میں اس نے کبھی بیزارگی اور بدمزاجی کا اظہار نہیں کیا بلکہ قسمت کے مصائب اور انعامات" کو "مساوی شکریہ" کے ساتھ قبول کرتا رہا۔ اس نے اپنی ایک نظم میں لکھا ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک مصیبت زدہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے متعلق ایسا خیال نہ کرے۔ اور یہ تعجب خیز ہے کہ اس نے اپنی ایام مصیبت اور درماندگی میں اپنی شہرۂ آفاق نظم "کنٹربری ٹیلیس" لکھی۔ اس کے قدیم محسن جان کے بیٹے ہنری چہارم کی تخت نشینی پر چاسر کے برے دن ٹل گئے۔ لیکن اب اس کی قسمت میں درباری تحائف و وظائف سے فائدہ اٹھانا نہیں تھا چنانچہ ایک سال بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ اسے کو ضروری اعزاز کے ساتھ وایسٹ منسٹر کی خانقاہ کے اس گوشہ میں دفن کیا گیا جو بعد میں "گوشۂ شعراء" سے موسوم کیا گیا۔

چاسر کا کلام چاسر کی زندگی کے تین دور قرار دئے جا سکتے ہیں، ایک ابتدائی دوسرا وسطی اور تیسرا آخری۔

جبکہ چاسر مصاحب، سپاہی اور سیاسی کی حیثیت سے زندگی کے منازل طے کر رہا تھا۔ وہ شاعری کے میدان میں بھی قدم رکھ چکا تھا۔ اس نے فرانسیسی طریقہ پر عشقیہ نظمیں لکھیں جن میں سے اکثر گم ہو گئیں۔ ابتدائی نظموں میں صرف ایک قابل یادگار ہے جس کو اس نے اپنے محسن جان آف گانٹ کی بیوی ڈچس بلانک کی وفات پر لکھی تھی۔ اس میں شاعر کے بعض خصوصیات ـــ مناظر قدرت سے دلچسپی اور حسن لطیف کی مدحت ـــ ظاہر ہوتے ہیں۔

اس کی شاعری کا دوسرا دور اطالوی اثرات کی پیداوار تھا۔ ہم بتا چکے ہیں کہ اس نے اٹلی کی سیاحت کی اور پیٹرارک سے بھی ملاقات کی۔ اس وقت اٹلی قرون وسطیٰ سے گزر چکا تھا اور وہاں ایک نئی روح کارفرما تھی۔ اس کو متمدن دنیا کی ملکہ کی حیثیت حاصل ہوتی جا رہی تھی جس کار اور فضلا اس سرزمین پر پرورش پا رہے تھے اور ایک نیا ادب جنم لے رہا تھا۔ چاسر کا ان حالات سے متاثر ہونا لازمی تھا۔ موسیو ژوسے رند (Jusserand) نے "تاریخ ادبیات انگلستان" خوب لکھی "اٹلی میں جو کچھ اس نے دیکھا وہ اس کے ذہن میں عود کرنے لگا۔ عالیشان عمارت، فریسکوز، پیٹرارک کی سائنس۔ ڈانٹے کی نظمیں۔ بوکاسیو کے قصے جن کو اس نے اپنے دماغ میں محفوظ رکھا تھا تاکہ بے خبر اور خوش باش انگلستان کو متحرک کرے اور اس میں روح پھونکے۔" اس دور کے کلام میں ایک اہم نظم (TROILUS AND CRESSIDA) "ٹرائیلس اینڈ کریسیڈا" بوکاسیو کے ایک افسانہ

پر مبنی ہے اور ''ہاوز آف فیم'' HOUSE OF FAME ڈانٹے کے اثر کو ظاہر کرتی ہے۔

آخری دور میں چاسر کی سرمایۂ ناز نظم ''کنٹربری ٹیلیس'' لکھی گئی جو مختلف حکایتوں پر مشتمل ہے۔ ساوتھ وارک کی سرائے میں تیئس زائرین کی ایک جماعت اکٹھا ہوتی ہے اور مالک سرا ''ہیری بیلی'' نے تحریک کی کہ ہر زائر دو قصے کنٹربری کو جاتے ہوئے اور دو قصے واپسی میں بیان کرے۔ اور بہترین قصہ گو کو اس کے ساتھیوں کی طرف سے ایک دعوت ملے گی۔ مختلف قصوں سے پہلے شاعر کی جانب سے ''پیش لفظ'' PROLOGUES ہیں جو تمام قصوں کو ایک دوسرے سے مربوط کرنے کا کام دیتے ہیں۔ چاسر نے خوبی کے ساتھ ایسے زائرین کا انتخاب کیا جو مختلف فرقوں اور پیشوں سے متعلق تھے۔ اس طرح اس کے لئے ممکن ہو گیا کہ اس کے گرد و پیش کی زندگی کی خاکہ کشی کرے۔

سب سے پہلے نائٹ (سردار) ہمارے سامنے آتا ہے جو اپنے عہد کی شجاعت و مردانگی کا مجسمہ ہے اور پندرہ خوفناک جنگوں میں بہادرانہ طور پر حصہ لے چکا ہے۔ اس کا بیٹا سکوائر آتا ہے جو ایک خوشباش نوجوان اور شاندار لباس پہنے ہوئے مختلف کرتبوں کا ماہر تھا۔ اس کے بعد میڈم اگلنٹائن آتی ہے جو لڑکیوں کی معلمہ اور فرنچ مذاق کی دلدادہ تھی۔ اس طرح کلیسا کی زبون حالی کی ترجمانی خوش مزاج فرائر کرتا ہے۔ اسی طرح سوداگر'' قانون داں وغیرہ ہمارے سامنے آتے ہیں۔

لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ کنٹربری ٹیلیس میں صرف اپنے عہد کی تصویر قصص و حکایات کے ذریعہ کھینچی گئی ہے بلکہ یہ نظم ایک ڈرامائی حیثیت بھی رکھتی ہے کیونکہ ہر قصہ گو غیر ارادی طور پر قصہ میں اپنے کردار پر تھوڑی بہت روشنی ڈالتا ہے مثال کے طور پر کلرکس ٹیل (محرر کا قصہ) اور لایرس ٹیل (وکیل کا قصہ) لئے جا سکتے ہیں اول الذکر میں گریسلڈا کی بے لوثی اور زنانہ اطاعت اپنے شوہر کی حرص و آز کے متقابل ہے۔ گریسلڈا کے کردار کے ذریعہ نسائیت کا جو تصور پیش کیا گیا ہے وہ بیشتر قرون وسطیٰ کا ہے لیکن عام انسانوں کے لئے ہر وقت دلچسپی کا باعث ہے اور چاسر کہتا ہے'' ہر نوجوان کو ممکنہ طور پر گریسلڈا کی طرح اپنی مصیبت میں مستقل مزاج رہنا چاہیئے۔''

قرون وسطیٰ میں پلاٹ (خاکہ) کی اختراع کا رواج نہ تھا! اور چاسر نے دیگر شعرا کی طرح مختلف ذرائع سے حاصل شدہ قصوں کو اپنا لیا۔ اس سے یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ کنٹربری ٹیلس کا مصنف محض مترجم یا مقلد تھا بلکہ وہ ایک تخلیقی قوت کا مالک تھا۔ ہم اس کے شاہکار کے مطالعہ کے بعد محسوس کرتے ہیں کہ اس نے زندگی کی خاکہ کشی کی تھی اور فرانس و اٹلی میں جو کچھ حاصل کیا تھا ان کو اپنے خاص رنگ میں ڈھالکر اپنا ایک ممتاز انداز

بیان پیدا کرلیا۔

بحیثیت شاعر: قطع نظر اس کے کہ چاسر نے موجودہ انگریزی ادبی زبان کی ترویج کی اس کا خاص امتیاز یہ ہے کہ اس نے معاصرانہ حیات کی خاکہ کشی کی ہے اس کی ذکاوت خارجی (OBJECTIVE) ہے وہ سادہ واقعہ کو خوبی سے ادا کرتا ہے۔ وہ نہایت فیاض منش اور خنداں رو ہے۔ ڈرائیڈن نے اس کو "عقل سلیم کا دوامی سرچشمہ" قرار دیا۔ اپنی فیاضانہ موجودیت (REALISM) اور قدردانیٔ انسان میں وہ شکسپیر و سکاٹ کا ہم پایہ ہے اس کی خوش مزاجی (HUMAN) جو ہر قسم کے بغض و عداوت سے پاک ہے فیلڈنگ کی ظرافت اور مسرت انگیز قہقہہ کی یاد تازہ کرتی ہے۔

شکسپیر کی طرح وہ تصوری (IDEAL) اور عملی (PRACTICAL) باتوں کو یکساں طور پر سنبھالتا ہے وہ حقیقت نگار ہے جو کچھ دیکھتا ہے اس کو دیانت کے ساتھ بیان کرتا ہے وہ طفلانہ بے لوث خوشی سے زندگی کا لطف اٹھا سکتا ہے۔ اس کا دل ہمیشہ رحم و ہمدردی سے معمور تھا۔ وہ نیک عورت کا احترام کرتا ہے اور چھوٹے بچوں کے ساتھ شفقت کا اظہار کرتا ہے۔ اس میں ترش روئی، غداری اور شکایت کا مادہ نہیں بلکہ طرب افزا ہمت اور مردانہ قناعت کے ساتھ زندگی کی معطیات کو قبول کرتا ہے۔ وہ پرندوں سبزہ و گیاہ، پھولوں اور ستاروں سے بڑی مسرت حاصل کرتا ہے وہ ایک بڑا مزاحیہ نگار (HUMANS) مصنف بھی ہے شکسپیر کی طرح انسانی غلطیوں اور حماقتوں کا مزاحیہ رنگ میں نقشہ کھینچتا ہے۔ چاسر انگریزی کے خوش گو شعرا میں بھی داخل ہے اور اس کے کلام میں بڑی موسیقیت پائی جاتی ہے۔

لیکن آخر میں یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ زندگی کی بعض ہستیوں کی طرف چاسر نے توجہ نہ کی وہ مختلف اجتماعی حیثیتوں کے اشخاص کی کردار کشی کرتا ہے لیکن غرباء کی دنیا سے وہ نامانوس تھا۔ وہ درباری شاعر تھا۔ فیوڈل سوسائٹی (معاشرہ جاگیری) کا شاعر تھا۔ اس کی خندہ زن طبیعت میں مصلح اور فداکار بننے کی صلاحیت نہ تھی۔

قدرِ وفا

(از)

جناب محمد جمیل احمد خان صاحب کوکبؔ شاہجہانپوری

یہی معراج ہے اہلِ وفا کی — تمنّائیں کریں جور و جفا کی

نہیں کچھ حد نہیں لطفِ خدا کی — مگر اس پر بھی ہم رہتے ہیں شا کی

سرِ تسلیم خم کر دے رضا پر — کہاں تک کشمکش بیم و رجا کی

سہوں گا شوق سے تیری جفائیں — اگر عمرِ رواں نے کچھ وفا کی

سراب دہر کی زیبائشوں سے — نظر خیرہ نہ ہو گی آشنا کی

عیاں کردی نگاہِ دوربیں نے — حقیقت پردۂ ارض و سما کی

جفا سے بھی ہوا ہے دلکش وہ — اگر کی بھی تو کیا قدرِ وفا کی

جبینِ شوق ہے اور ذرہ ذرہ — زہے حسرت سجودِ نقشِ پا کی

کسی کی فتنہ پردازی نے کوکبؔ — بگاڑی خو دلِ درد آشنا کی

حسن کاری کا ایک نمونہ

(از چیخوف)

اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا اکبر ڈاکٹر حفیظ کے دواخانہ میں آیا، وہ اپنی بغل میں 'اسٹیٹسمن' میں لپٹی ہوئی کوئی چیز دبائے تھا۔ اسے دیکھکر ڈاکٹر نے کہا۔ "کہو میاں! اب کیسے ہو؟ کوئی نئی بات تو نہیں ہے؟"

"اماں نے آپ کو سلام کہا اور مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنے کو کہا ہے۔" اکبر نے سینہ پر ہاتھ رکھکر گرج دار آواز میں کہا۔ "میں اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا ہوں اور آپ نے میری جان بچائی ہے، مجھے خطرناک مرض سے مخلصی دلائی ہے۔ ہم دونوں نہیں جانتے کہ کس طرح آپ کا شکریہ ادا کریں۔"

ڈاکٹر نے خوشی سے کھلتے ہوئے کہا۔ "صاحبزادے، یہی کافی ہے۔ میں نے تو صرف وہی کیا ہے، جو کوئی بھی، اگر میری بجائے ہوتا، کرتا"

"میں اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا ہوں" اکبر نے کہا۔

"ہم لوگ غریب آدمی ہیں، یہ دیکھکر ہمیں رنج ہوتا ہے، ہمارا دل مسوس اٹھتا ہے کہ ہم آپ کی محنت کا معاوضہ نہیں دے سکتے، اسی لئے ہم، یعنے میں اور میری ماں، جس کا میں اکلوتا بیٹا ہوں، آپ سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ آپ ہمارے احسان مندی کے صلے میں اس چیز کو قبول کریں۔ یہ ایک پرانے کانسے کی چیز ہے، یہ حسن کاری کا ایک نمونہ ہے اور بڑی قیمتی چیز ہے"

"اس کی تو در اصل کوئی ضرورت نہیں" ڈاکٹر نے منہہ بناکر کہا۔

"تم ہی بتاؤ اس کی کیا ضرورت تھی؟"

"نہیں نہیں، براہ نوازش آپ اس سے انکار نہ کریں" اکبر نے بنڈل کا کاغذ کھولتے ہوئے کہا۔ "آپ انکار کریں گے تو مجھے اور میری ماں کو بڑا صدمہ پہنچے گا۔ یہ پرانے کانسے کی مورت بڑی عمدہ چیز ہے۔ ہم کو اسے میرے والد مرحوم چھوڑ گئے تھے، ہم نے اسے ان کی نشانی کے طور پر رکھا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ میرے والد کانسے کی پرانی چیزوں کا پیشہ کرتے تھے، یعنے موقعے سے ملنے پر ایسی چیزیں خرید لیتے تھے،

اور پھر انہیں حسن کاری کے شائقین کے ہاتھ منافع پر بیچ ڈالے تھے۔ مَیں اور میری ماں اب بھی یہی کام کرتی ہیں" اکبر نے اس میز پر لپٹا ہوا کاغذ الگ کر کے اُسے عقیدت کے ساتھ میز پر رکھ دیا۔ یہ ایک پرانے کانسے کا چھوٹا لیکن بہت ہی باکمال کاریگری کا بنا ہوا شمعدان تھا۔ اس میں ایک تخت پر حضرت حوّا کے لباس میں دو عورتوں کی مورتیں تھیں۔ عورتیں بے حجابی سے مُسکرا رہی تھیں، اور انہیں دیکھکر یہ معلوم ہوتا تھا کہ اگر موم بتی اُٹھانے کا بار ان کے سپُرد نہ ہوتا، تو وہ تخت پر سے کود کر کمرے میں ایسا ہڑبونگ مچاتیں، جس کے محض خیال سے ناظرین کا چہرہ مارے شرم کے سُرخ ہو جاتا!

اس تحفہ چیز کو اچھی طرح دیکھ بھال کر ڈاکٹر نے اپنا کان کھجلایا، منہہ بناتے ہوئے ناک صاف کی اور کہا "بے شک یہ بہت خوبصورت ہے! مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اپنا منشا تم سے کیسے ظاہر کروں، بات یہ ہے۔ تم میرا مطلب سمجھتے ہو۔ یعنے یہ ذرا ٹھیک نہیں ہے، یہ کچھ بد وضع سا ہے۔"

"میں نہیں سمجھا کہ آپ کیوں ایسا خیال کرتے ہیں"۔

"ارے بھئی، دنیا کو ورغلانے والا شیطان بھی اس سے زیادہ خراب چیز نہیں ایجاد کر سکتا! ایسی چیز کو میز پر تمام مکان کو ناپاک کرنا ہے"۔

"ڈاکٹر صاحب، آپ بھی حسن کاری کو کس عجیب نظر سے دیکھتے ہیں!"

اکبر نے ذرا بگڑ کر کہا۔ "اجی صاحب، یہ ایک شہکار ہے شہکار، ذرا اسے غور سے دیکھئے۔ اس میں اعلیٰ درجے کی خوب صورتی ہے، جسے دیکھکر دل میں ایک پاکیزگی محسوس ہونے لگتی ہے۔ آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ جب آپ ایسی خوب صورت چیز کو دیکھتے ہیں تب تھوڑی دیر کے لئے تمام دنیوی خیالات کو بھول جاتے ہیں۔ ذرا دیکھئے، کیسا نکھار ہے، چہرے پر کیسا نور ہے!"

"صاحبزادے، میں اسے اچھی طرح سمجھتا ہوں!" ڈاکٹر نے بات کاٹتے ہوئے کہا:

"مگر میں بال بچے والا آدمی ہوں، لڑکے بالے برابر اِدھر سے اُدھر دوڑا کرتے ہیں میرے ہاں اکثر عورتیں آیا کرتی ہیں"۔

"ہاں اگر آپ معمولی۔ عام جاہل لوگوں کی نگاہ سے دیکھیں" اکبر نے کہا۔ "تب تو کاریگری کی یہ نایاب چیز بے شک ہی دوسری روشنی میں دکھلائی دیگی۔ مگر ڈاکٹر صاحب آپ کو تو معمولی لوگوں کی نسبت اونچا ہونا چاہیئے اور اس لئے اور بھی آپ کے انکار کرنے سے مجھے اور میری ماں کو جس کا میں اکلوتا بیٹا ہوں

اور جس کی آپ نے جان بچائی ہے، بڑا ہی ہوگا۔ ہمارے پاس جو سب سے قیمتی چیز ہے، اُسے ہم آپ کے نذر کر رہے ہیں۔ مجھے اس بات کا سخت افسوس ہے کہ ہمارے پاس یہ ایک ہی ہے، اِس شمعدان کا جوڑا نہیں ہے۔"

"خیر تم اپنی ماں سے میرا سلام کہنا، اور بولنا کہ میں اِس کے لئے اِن کا بہت ممنون ہوں! مگر پھر بھی خدا کی پناہ! ذرا تم ہی خیال کرو کہ میرے اِس کمرے میں چھوٹے چھوٹے بچے برابر دوڑا بھاگا کرتے ہیں، بیمار عورتیں آیا جایا کرتی ہیں۔ مگر خیر، اِسے رہنے دو! تم سمجھانے سے نہیں سمجھو گے!"

"اور اِس میں سمجھنے کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔"

اکبر نے خوشی سے کہا۔ "اِس کو اِدھر دائیں طرف اِس گلدان کے پاس رکھ دیجئے! یہ بڑی ہی خراب بات ہے کہ اس کا جوڑا نہیں ہے۔ اگر کہیں اِس کا جوڑا ہوتا، تب تو سونے میں سہاگہ ہو جاتا! اچھا ڈاکٹر صاحب، آداب عرض ہے۔"

اکبر کے چلے جانے کے بعد ڈاکٹر دیر تک شمعدان کو دیکھتا رہا اور اپنا کان کھجلا کھجلا کر سوچتا رہا۔

"و شمعدان بے شک بڑی صنعت گری کی چیز ہے، اِس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، اِسے پھینک دینا تو بڑی بُری بات ہوگی، مگر اِسے یہاں رکھا رہنے دینا ناممکن ہے! اونہہ! اب تو یہ عجیب ہی معمّا ہو گیا! اِسے میں کسے نذر کر دوں؟"

اِس بات پر بہت دیر سوچ بچار کرنے کے بعد ڈاکٹر کو دفعتاً اپنے وکیل دوست مسٹر شیشر ناتھ کی یاد آگئی، مسٹر شیشر ناتھ نے ڈاکٹر کا ایک مقدمہ کر دیا تھا جس کے لئے ڈاکٹر اِن کا احسان مند تھا۔

"واہ یہ بات خوب سوجھی" ڈاکٹر نے مصمم ارادہ کر لیا "دوستی کی وجہ سے وہ مجھ سے محنتانہ نہیں لیتے، لہٰذا ہی مناسب ہے کہ میں انہیں یہ تحفہ نذر کر دوں، میں اِس شیطان کی مورت کو لے کر خود جاؤں گا۔ ہاں ایک اور بات بھی تو ہے، مسٹر شیشر ناتھ نے ابھی تک بیاہ بھی نہیں کیا ہے، اور وہ بڑی چلبلی طبیعت کے ہیں۔"

ڈاکٹر نے بغیر لمحہ بھر توقف کئے، کپڑے پہنے اور شمعدان لے کر مسٹر شیشر ناتھ کے ہاں چل دئے۔

"دوستِ من! مزاج شریف؟" ڈاکٹر نے وکیل صاحب کو دیکھ کر کہا، انہیں اِس بات کی خوشی تھی کہ وکیل صاحب گھر ہی پر موجود ملے۔ "بھائی جان، آپ نے میرے اوپر جو احسان کیا ہے میں اُس کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔ چونکہ آپ مجھ سے محنتانہ میں لینا منظور نہیں کرتے، تو کم سے کم

میرے اِس تحفے کو قبول کیجئے۔ بھائی جان یہ ایک حسن کاری کی چیز ہے، کاریگری کا کمال ہے کمال!"
شمعدان کو دیکھتے ہی وکیل صاحب کھِل اُٹھے۔ "آہا، کیسا خوب صورت ہے" وکیل نے
ہنستے ہوئے کہا۔ "اِن پر شیطان کی مار، یہ لوگ کیا نہیں بنا سکتے! بے شک یہ تعجب انگیز ہے! کیسا
خوشنما ہے! آپ کو ایسی خوب صورت اور نایاب چیز کہاں سے ہاتھ لگی؟" وکیل شمعدان کو جی بھر کر
دیکھ چکنے اور اُس پر اپنی خوشی کا اظہار کر چکنے کے بعد سہمی ہوئی نگاہ سے دروازے کی طرف دیکھا، اور
بولے۔ "بھائی جان، آپ اِسے واپس لے جائیے، میں اِسے منظور نہیں کر سکتا"

"کیوں نہیں؟" ڈاکٹر نے ڈر کر پوچھا۔

"کیونکہ یہاں اکثر میری ماں آیا کرتی ہیں، اس کے علاوہ موکّل آتے رہتے ہیں، اور میں نہیں چاہتا کہ
نوکر چاکر ــــــ"

"نہیں، نہیں، آپ کو میرے تحفے سے انکار نہیں کرنا چاہئے" ڈاکٹر نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔
"یہ تو ایک حسن کاری کی چیز ہے! ذرا دیکھئے، اِس میں کیسا نکھار ہے۔ چہروں پر خیالات کا کیسا
عکس کھنچا ہے! میں آپ کا انکار بالکل نہیں سن سکتا! میں خفا ہو جاؤنگا!"

یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب جھپٹتے ہوئے وکیل کے دروازے سے نکلے اور اپنے گھر چلے آئے۔ وہ اِس بات سے
خوش تھے کہ انہیں اِس تکلیف دہ تحفے سے چھٹکارا مل گیا۔ ڈاکٹر کے چلے جانے پر وکیل نے شمعدان کو چوطرفہ
دیکھا۔ اُسے انگلی سے چھوا بھی۔ اب وہ لگے اپنا دماغ دوڑانے کہ اِس تحفہ کا کیا کیا جائے؟

"چیز تو بے شک بڑی حسین ہے" انہوں نے سوچا، "اِسے پھینک دینا تو بڑی خراب بات ہوگی،
مگر اِسے اپنے گھر میں رہنے دینا بھی نامناسب ہے۔ ایسی حالت میں سب سے اچھی بات یہی ہے
کہ اِسے کسی کو نذر کر دیا جائے۔ میں اِسے آج شام کو ناٹک کے اداکار مسٹر عزیز کے پاس لے جاؤنگا، وہ
شخص اِس قسم کی چیزیں خوب پسند کرتا ہے، اور آج خوش قسمتی سے اس کی منفعت بخش رات بھی ہے۔"

مسٹر شیشر ناتھ اپنی بات کے پکّے تھے، وہ شمعدان کو اچھی طرح کاغذ میں لپیٹ کر اُسی دن شام کو
تھیٹر پہنچے اور عزیز کو جہاں پھولوں کے گلدستے اور دیگر تحفے تحائف دیئے گئے، وہاں وہ شمعدان بھی دیا گیا۔
شام ہی سے مسٹر عزیز کے کمرۂ پوشاک کو لوگوں نے گھیر رکھا تھا، وہ اس کے تحفوں کو دیکھنے آئے تھے،
کھیل ختم ہونے پر عزیز کندھے بدکاتا ہوا بڑبڑانے لگا۔ "میں اِس کمبخت چیز کا کیا کروں؟ میں ایک شریف

خاندان میں رہتا ہوں! اداکارنیاں اکثر مجھ سے ملنے کے لئے آیا کرتی ہیں۔ یہ کوئی فوٹو یا تصویر تو نہیں جسے الماری کی دراز میں چھپا کر رکھ دیا جائے!" تھیٹر کا بیرا عزیز کو پوشاک اُتارنے میں مدد دے رہا تھا۔ اُس نے کہا۔ "حضور میں بتلاؤں یہاں ایک بوڑھی عورت رہتی ہے، اکبر کی ماں۔ اُسے بھی جانتے ہیں وہ ان چیزوں کا پیشہ کرتی ہے۔ مجھے دیجئے، میں اسے اُس کے ہاتھ فروخت کرآؤں"

کوئی دو دن بعد ڈاکٹر حفیظ اپنے دواخانہ میں بیٹھے ہوئے سر پر ہاتھ رکھے نزلے اور طاعون کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ یکایک دروازہ کھلا اور اکبر دوڑتا ہوا گھس پڑا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اُس کے تن بدن سے خوشی پھوٹی پڑتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں اخبار کے کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی چیز تھی۔

"ڈاکٹر صاحب!" اُس نے بغیر سانس لئے ہوئے کہا۔ "آج میری خوشی کا ٹھکانا نہیں ہے! آپ بڑے ہی خوش قسمت ہیں۔ ہمیں آپ کے شمعدان کا جوڑا مل گیا! اماں بھی بہت خوش ہیں! میں اپنی ماں کا اکلوتا لڑکا ہوں، اور آپ نے میری جان بچائی ہے!"

اکبر نے احسان مندی کے مارے کانپتے ہوئے ڈاکٹر کے سامنے کاغذ سے نکال کر شمعدان رکھ دیا۔ ڈاکٹر نے کچھ کہنے کے لئے منہ بنایا، لیکن وہ ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا۔ اُس نے محسوس کیا۔ گویا اس کے منہ کو لقوہ مار گیا ہے! ——— (ماخوذ)

غلام رسول (سٹی کالج)

علوم دین کے شیدائی

تفسیر خوانی اور افہام مطالب قرآنی کے لئے تفسیر مظہری بھی پڑھ کر دیکھیں جس کو حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رح نے لکھا تھا اور جن کی نسبت حضرت شاہ عبد العزیز صاحب فرماتے تھے کہ وہ بیہقی وقت تھے۔ اب یہ کتاب پہلی بار طبع ہو کر منظر عام پر آئی ہے۔ فی الوقت صرف پہلے تین پاروں کی تفسیر تیار اور (۶ روپیہ) میں مل سکتی ہے۔

مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد

نوائے راز

(از)
جناب ابوالفاضل راز چاندپوری

حسنِ پنہاں جب سرِ محفل نمایاں ہو گیا
کم نظر تھا جو تماشائی وہ حیراں ہو گیا

دیدۂ دل وا ہوا دیدارِ جاناں ہو گیا
عینِ ایماں آج عشقِ کفر ساماں ہو گیا

مرحبا اے شاہدِ عشق آفریں صد مرحبا
برق زارِ طورِ قلبِ تیرہ ساماں ہو گیا

کورِ باطن! دیکھ اعجازِ بہارِ گلفروش
آنکھ والا دم زدن میں گل بداماں ہو گیا

عشق کی آمد نویدِ روح افزا ہو گئی
بے حسی کا خوابِ شیریں اب پریشاں ہو گیا

اٹھ گئی ہاں اٹھ گئی روئے حقیقت سے نقاب
ہو گیا میں بے نیازِ کفر و ایماں ہو گیا

چشمِ ساقی! تیرے صدقے تیری گردش کے نثار
ایک ہی ساغر دلیلِ راہ عرفاں ہو گیا

تشنہ کامی کی اذیت سے رہائی مل گئی
اے ترے قرباں کہ اب جینے کا ساماں ہو گیا

کیا ہوا سچ سچ بتا اے راویٔ رنگیں بیاں!
راز کیونکر کامیابِ دیدِ جاناں ہو گیا

اورنگ نامۂ حقیری

(از)

جناب محمد عبداللہ صاحب چغتائی لکچرار (اسلامیہ کالج لاہور)

یہ مضمون چغتائی صاحب نے پچھلے دسمبر میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس منعقدۂ پٹنہ کے شعبۂ تاریخ میں پڑھا تھا۔ موصوف عالمگیر کی لائف پر روشنی ڈالنے والے کل مواد کی تلاش و تفحص میں ایک عرصے سے سرگرداں ہیں۔ اسی سلسلے میں وہ کئی دفعہ کتب خانہ آصفیہ سے استفادے کے لئے حیدرآباد آئے اور بہت سے مخطوطات کا مطالعہ کیا۔ ان ہی مخطوطات میں سے ایک حقیری کا اورنگ نامہ بھی ہے۔

(مکتبہ)

اورنگ زیب عالمگیر کی تخت نشینی کے متعلق یہ منظوم تاریخی دستاویز حیدرآباد دکن سے ملحق مرتفع اجنٹہ والیورہ ''اورنگ زیب کی آخری قیام گاہ اور مدفن'' کے سرکاری کتب خانہ کی ملک ہے۔ مجھے اس کتاب کا کسی جگہ بھی کوئی اور نسخہ باوجود تلاش کے نہیں ملا۔ مجھے اس کا کامل یقین ہے کہ تاریخ کے کسی متعلم نے اس نسخے کو آج تک استعمال نہیں کیا۔ اس میں اورنگ زیب کے متعلق نہایت کارآمد معلومات جو بالکل غیر جانب دارانہ رائے اور شخصی مشاہدات پر مبنی ہیں، درج ہیں۔ مصنف نے آخری باب میں اس کو '' اورنگ نامہ '' کے نام سے موسوم کیا ہے۔

جیسا کہ فارسی کی عام کتابوں کا قاعدہ ہے یہ بھی خدائے تعالیٰ کی حمد وثنا سے شروع ہوتی ہے۔

بنام خدائے کہ از صنع پاک ۔۔۔ بکرد آفریدہ خلایق زخاک
ہمہ را زبان داد وہم چشم وگوش ۔۔۔ خردمندی و دانش ورائے وہوش

حمد وثنا کے بعد ہندوستان میں تیموری خاندان کی آمد وترقی کا مختصر سا ذکر ہے۔ مصنف نے اپنا پورا نام کسی جگہ بھی بیان نہیں کیا بلکہ متعدد مقامات پر صرف اپنا تخلص لکھ دیا ہے ؎

بیا اے حقیری زلطف خدائے ۔۔۔ بگو نعت پیغمبر رہنمائے

بہ عجز حقیری ایا پادشاہ | کہ جز ذات پاکت ندارد پناہ
کہ بخشائے برمن زباں آں چناں | کہ گویم حکایات شاہ جہاں

اسی بنا پر میں نے اپنی کتاب "ماخذ سیرت عالمگیر اعظم" میں اس کو "اورنگ نامۂ حقیری" کے نام سے موسوم کیا ہے تاکہ اس قسم کی دوسری کتابوں سے ممیز رہے۔ جیسا کہ خود اس نے اس کتاب میں بیان کیا ہے۔ حقیری مذہباً شیعہ مسلمان اور نسلاً آذربیجانی تھا۔ یہ قوم وسط ایشیا میں متوطن تھی۔ اس کتاب کی بحر وہی ہے جو شاہنامہ فردوسی کی ہے۔ کتاب کی تقطیع اوسط اور عام ہے یعنی (۱۰ × ۷) انچ۔ کل اوراق (۲۷۸) ہیں۔ ہر صفحے پر (۱۵) ابیات اور کلہم تقریباً پانچہزار ابیات ہیں۔ ان ابیات کو سرخ روشنائی سے (۲۴۰) ذیلی عنوانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ خط نہایت پاکیزہ نستعلیق ہے۔

ذیل کی تاریخی کتابوں میں زیادہ تر جنگ تخت نشینی کے واقعات مندرج ہیں:-

(۱) واقعات عالمگیری از محمد عاقل رازی۔ (۲) تاریخی شاہ شجاعی از میر محمد معصوم۔ (۳) تاریخ شاہجہانی از محمد صادق وغیرہ۔

مگر اس اورنگ نامے کے مندرجات ایک حد تک تاریخ شجاعی سے ملتے جلتے ہیں اور اس کی وجہ سراسر یہی ہے کہ مصنف بھی میر جملہ کی سرکردگی میں شجاع کے خلاف جنگوں میں شریک رہا ہے اور ان ہی واقعات کو اس نے ذاتی مشاہدات کی روشنی میں شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ اسی قسم کی ایک منظوم کتاب آشوب ہند نامی مؤلفۂ بہشتی بھی ہے جو لکھنؤ سے شایع ہوئی ہے۔ چونکہ بہشتی، داراشکوہ کا ملازم و نمکخوار تھا اس لئے اس نے اکثر موقعوں پر اپنے آقا کی حمایت و مدافعت کی ہے مگر ہمارا مصنف حقیری کبھی کسی سے متاثر نہیں ہوا اور اس کی طرز نگارش بے جا طرفداری کے الزام سے بالکل پاک ہے۔ کتاب کے اصل مندرجات حسب ذیل ہیں:-

۱۔ شجاع کے خلاف سلیمان شکوہ پسر داراشکوہ کا عزم بنگالہ بمعیت جے سنگھ۔
۲۔ شجاع کا فرار اور سلیمان شکوہ کا جشن فتحمندی۔
۳۔ داراشکوہ کی حرکت سے شاہ جہاں کی ناراضی۔
۴۔ تخت سلطنت کے لئے دارا کی سازشوں سے واقف ہوکر مراد اور اورنگ زیب کی باہمی گفت و شنید۔

۵۔ شاہ جہاں مکاتیب کے ذریعہ انہیں اس سے روکتا ہے، شاہ جہاں کو ان کے جواب وصول ہوتے ہی ان کو بجنسہ دارا کے حوالے کر دیتا ہے، مگر دارا رُکنے والا نہیں تھا۔

۶۔ اِدھر دارا شکوہ، اورنگ زیب کے خلاف جسونت سنگھ کو حملہ کرنے کے لئے بھیجتا ہے۔

۷۔ اُوجین میں مراد اور اورنگ زیب متحد ہو جاتے ہیں اور جسونت سنگھ شکست کھا جاتا ہے۔

۸۔ دارا اس سے مطلع ہو کر اپنے بیٹے سلیمان کو واپس بلا لیتا ہے اور اورنگ زیب گوالیار فتح کر لیتا ہے۔

۹۔ دارا، صورت حالات سے شاہ جہاں کو مطلع کرتا ہے اور وہ دارا کی اس رائے کو سخت ناپسند کرتا ہے، مگر دارا شاہ جہاں کے کہنے کی ذرا بھی پروا نہیں کرتا بلکہ اورنگ زیب سے لڑنے کے لئے خود سیدھے گوالیار کا عزم کرتا ہے۔

۱۰۔ دارا شکست کھا کر لاہور چلا جاتا ہے۔

۱۱۔ یہ حالت دیکھ کر شاہ جہاں، اورنگ زیب کو تخت و تاج بخشتا ہے۔

چنانست در دل گواہی من — کہ زیبد باورنگ شاہی من
ہمہ ملک خود را فراز و نشیب — سراسر سپارم باورنگ زیب
نشینم بہ یک گوشۂ بے نیاز — بیارم دراں پنج نوبت نماز

۱۲۔ مراد اور اورنگ زیب کے معاملات۔

۱۳۔ اورنگ زیب ملتان تک دارا کا تعاقب کرتا ہے اور یہاں اُسے اطلاع ملتی ہے کہ شجاع دہلی آ کر تخت نشین ہو گیا ہے۔

۱۴۔ سلطان محمد پسر اورنگ زیب اور میر جملہ دونوں شجاع سے جنگ کرنے کے لئے کوچ کر کے دریائے گنگا کے کنارے خیمہ زن ہوتے ہیں۔

مصنف نے اس موقع پر ہر ایک جزوی امر کو وضاحت سے بیان کیا ہے اور بالخصوص میر جملہ کی وہ تمام لڑائیاں اور معرکہ آرائیاں جن میں وہ خود بھی اس کے ماتحت اورنگ زیب کے ایک سپاہی کی حیثیت سے شریک تھا۔

ان معرکوں میں شجاع کو شکست فاش اُٹھانی پڑی اور آخر کار وہ اپنے ساز و سامان کو نذر آتش

کرکے دکن کی طرف چل دیتا ہے۔ اس نوبت پر حقیری اپنے متعلق بھی چند ابیات لکھ جاتا ہے۔

حقیری ز لطف خدائے کبیر　　بدانگہ رسید آں سپہدار میر

چنیں یاد دارم از آں پاک دیں　　کہ بودم در آں دم بتا ندہ زمیں

بدم پاکزاں فریدون کلاہ　　کہ خلقش بخوانند اورنگ شاہ

بتعینات میر جملہ پاک دیں　　بہ بودم دراں جنگ و پیکار کیں

نژادم بدانی تو آذربیہاں...　　ہمہ سر فرازند نزد شہاں

وطن گاہ شاں گو ہمہ سر نژاد بوم　　بود در میان صفاہان و روم

ہمہ سرگذشت سپہدار میر　　بآخر رسانید ظہیر حقیر

۱۵۔ یہاں سے شجاع جنگل کا رخ کرتا ہے اور تیرہ، دہات اور کارکوٹ کے راجہ سے معرکہ آرا ہوتا ہے

۱۶۔ اجمیر میں دارا کی آخری جنگ جہاں سے وہ قندھار جانے کے ارادے سے سندھ کا رخ کرتا ہے اور بھکر پہنچ کر ملک جیون کا مہمان ہوتا ہے جو دراصل اس کو گرفتار کرا دیتا ہے۔

۱۷۔ اورنگ زیب دہلی کی طرف کوچ کرتا ہے اور وہاں پہنچ کر ہندوستان کا شہنشاہ بن جاتا ہے اور اپنے نام سے نئے سکے تیار کرتا ہے۔

۱۸۔ دارا دہلی لایا جاتا ہے اور اورنگ زیب کے حکم سے اس کا خاتمہ کر دیا جاتا ہے۔ اور پھر وہ ہمایوں کے مقبرے میں سپرد خاک کیا جاتا ہے۔

۱۹۔ یہ خاتمۃ الکتاب ہے اور سلیمان شکوہ پسر دارا شکوہ کے ذکر کے لئے وقف ہے۔

۲۰۔ آخری ابیات میں مصنف حقیری نے تاریخ تصنیف سنہ ۱۰۷۲ھ بتائی ہے اور لکھا ہے کہ اس کی تکمیل میں ڈیڑھ سال لگ گیا۔

ز لطف خداوند عرش مجید　　ہمہ داستاں تا بآخر رسید

کشیدم بسے رنجہا سال و ماہ　　نہادم بدیں نام اورنگ شاہ

ہمہ بیت ہائے چو دُرِ ثمیں　　مبارک بہ بادا بہ صاحب نگیں

بیک سال شش ماہ ز لطف وہاب　　فراہم بکردم جمیع کتاب

بشد نسخہ ایں آخر مرز باں　　ز بخشش گردوں بادا زباں

زدنیا گذشت رسول کبار دو بودی و هفتاد و هم یک هزار
زپس شاهِ اورنگ فرہنگ دار بہ فرّخ گذشتہ بودی چہار
چو نسخہ بہ بینی ایا تیز در بخوانی دعا را ز بہرِ حقیر

مختصر یہ کہ یہ کتاب اورنگ زیب کی تخت نشینی کے صرف چار سال بعد شاہ جہاں کی زندگی ہی میں لکھی گئی۔ ترقیمے سے ظاہر ہے کہ اورنگ نامے کا یہ نسخہ ۱۱۱۶ھ میں یعنے اورنگ زیب کی وفات کے دس برس بعد ظفر آباد (جونپور یو۔پی) میں لکھا گیا۔ اس کے کاتب کا نام غلام علی ہے۔

تمت تمام شد

نسخۂ اورنگ نامہ بتاریخ ششم ماہ صفر المظفر ۱۱۱۶ھ ہجری نبوی۔

مکاتبہ غلام علی
سکنہ شہر ظفر آباد

شاعر کی حیثیت سے حقیری کو میں نے تذکروں میں بہت تلاش کیا مگر کہیں اس کا پتہ نہیں چلا۔ البتہ جنگ تخت نشینی میں ایک جماعت "آذربیجان قوم" کا بہت حصہ ہے اور حقیری بھی اسی قوم کا ایک فرد تھا۔

تنقید

ہندستانی مدیر مولوی اصغر حسین صاحب - قیمت سالانہ (۴ ملیے)، پتا دفتر ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد -

یہ صوبہ جات متحدہ کی مجلسِ علمیہ ''ہندستانی اکیڈیمی'' کا اُردو سہ ماہی رسالہ ہے جو مولوی اصغر حسین صاحب اصغر گونڈوی کی ادارت میں جاری کیا گیا ہے - مُدیر کے علاوہ ڈاکٹر تاراچند صاحب معتمد عمومی ہندستانی اکیڈیمی، ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی پروفیسر عربی و فارسی جامعہ الہ آباد، مولوی سید مسعود حسن صاحب رضوی پروفیسر فارسی و اُردو جامعہ لکھنؤ اور منشی دیا نارائن صاحب نگم بی - اے کی ایک مجلس ادارت بھی اس رسالے کی نگراں ہے -

ہندستانی اکیڈیمی کے قیام کے ساتھ ہی اس کے اغراض و مقاصد میں ایک بلند پایہ رسالے کا اجرا بھی شامل تھا جو کئی روز کے غور و فکر کے بعد ''ہندستانی'' کی صورت میں زبان اُردو کی خدمت کے لئے میدانِ صحافت میں رُونما ہوا ہے - اس کا پہلا نمبر جو اس وقت ہمارے سامنے ہے (۱۲۰) صفحات پر مشتمل ہے اور خوب صورت ٹائپ میں چھپا ہے - صحت اور صفائی کا خاص اہتمام ہے - اس پر بھی چند غلطیاں رہ گئی ہیں جو ابتدائی کوشش میں ناگزیر ہیں، اس نمبر میں اُردو املا پر ڈاکٹر صدیقی اور اُردو لغات پر مولوی مسعود حسن صاحب کے قلم سے دو محققانہ مقالے ہیں - ایک اور دلچسپ مضمون ''قومی سیرت'' پر مولوی غلام السیدین کا ہے - ان مقالوں کے علاوہ اداریہ کے عنوان سے ڈاکٹر تاراچند صاحب اور مدیر صاحب نے ''ہندستانی اکیڈیمی'' اور ''ہندستانی'' کا تعارف کرایا ہے - تنقیدوں کا خاص اہتمام رکھا گیا ہے اور اس نمبر میں بھی ایک بسیط اور عالمانہ تنقید پروفیسر زبید احمد صاحب نے لکھی ہے - رسالہ نہایت ''معقول'' اور ''اُردو'' اور ''مجلہ عثمانیہ'' کی طرح اُردو کا نہایت بلند پایہ سہ ماہی ہے - ہندستانی اکیڈیمی کے کارکن اس کوشش پر اُردو دانوں کے خاص شکریے کے مستحق ہیں -

---

رہنمائے تعلیم لاہور (جوبلی نمبر) گذشتہ ختم سال پر لاہور نے جس قدر خاص نمبر اطراف ملک میں بھیجے ان میں ایک قابل ذکر "رہنمائے تعلیم" بھی ہے لیکن "رہنمائے تعلیم" کو دوسرے خاص رسالوں میں ایک اختصاصی اہمیت حاصل ہے پہلے تو یہ کہ اردو میں فنی اور اک جہتی رسالوں کی کمی ہے۔ "رہنمائے تعلیم" خالص تعلیمی رسالہ ہے۔ دوسرے "رہنمائے تعلیم" کی ... عمر ... کے بہت کم رسالوں ہی کو نصیب ہوئی ہے پچیس سال سے یہ رسالہ نہایت کامیابی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور خاموشی کے ساتھ ہندوستان کے تعلیمی ادب میں اضافہ کر رہا ہے۔ تیسرے طویل عمر کی طرح جوبلی کے خاص نمبر کا حجم بھی اب تک شاید ہی کسی اردو خاص نمبر کو نصیب ہوا ہو۔ "رہنمائے تعلیم" کا خاص نمبر تقریباً (۸۰۰) صفحوں پر مشتمل ہے۔ تصویروں کی تعداد بھی ضخامت کے تناسب سے ہے۔ ستر کے قریب بلاک کی تصویریں ہیں۔ ان میں بہت سی رنگین بھی ہیں۔

ہمارے خیال میں کسی خاص نمبر کا آٹھ سو صفحوں پر شائع ہونا، خود ایک قابل قدر بات ہے لیکن اگر ان صفحات میں بہت سا قابل مطالعہ اور مفید مواد دستیاب ہو سکے تو "نورٌ علیٰ نور" بلا مبالغہ یہی حال "رہنمائے تعلیم" کے اس خاص نمبر کا ہے۔ یقین کے ساتھ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن خیال غالب ہے کہ جوبلی نمبر کے مضمون نگاروں میں، ہندوستان سے شاید ہی کوئی مضمون نگار چھوٹ گیا ہو۔

ظاہری امتیاز کے ساتھ، رسالہ کی معنوی خوبیوں میں بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ مضامین کا بڑا حصہ درس وتدریسی مسائل پر مشتمل ہے جن میں سے بعض مضامین کے متعلق ہمیں یقین ہے کہ پائدار اہمیت کے ثابت ہونگے اس قدر ضخیم رسالہ میں تنوع کی ضرورت کے مدنظر چند علمی اور ادبی مضامین بھی شامل ہیں۔ بعض تعلیمی نظمیں متعلمین کا بڑا اچھا مشغلہ بن سکتی ہیں۔ اگر ہمارے کم عمر متعلمین کے ہاں درس وتدریس اور کھیل کود کے بعد کوئی وقت بچ رہے (اس کا ہمیں یقین ہے کہ کافی ہوتا ہے) تو ہم سمجھتے ہیں کہ ان کا دلچسپ مطالعہ جوبلی نمبر سے بہتر نہیں ہو سکتا۔

اس حجم، ان تصویروں اور اس سلیقہ کو دیکھکر ہمیشہ شبہ ہوتا ہے کہ "ماسٹر جگت سنگھ اینڈ کمپنی" نے پچیس سالہ تجربہ سب کچھ اس نمبر کی تہذیب پر لگا دیا ہوگا۔ اگر ایسا ہے تو ہمیں آئندہ اردو رسالوں میں سے ایک اک جہتی اور اختصاصی رسالے کے دیوالیہ ہوجانے کا بڑا افسوس ہوگا۔ لیکن ایک توقع بجا دکھائی نظر آتی ہے، وہ صرف ہندوستان کے تمام تعلیمی اداروں میں اس کو خریدنا اور تعلیمی محکموں کا اس کی دستگیری کرنا ہے۔

(س، س، م)

ہندوستانی صوتیات

(از ڈاکٹر سید محی الدین زور ایم اے پی ایچ ڈی (لندن)

"نگار" لکھنؤ کی رائے

یہ رسالہ انگریزی میں اس موضوع پر لکھا گیا ہے کہ دکن کے اہل علم کی ہندوستانی زبان کا لہجہ کیا تھا۔

جناب زور حیدرآباد کے ان مخصوص طلبہ میں سے ہیں جنھوں نے ولایت جاکر صحیح معنی میں علم حاصل کیا۔ اور دوسروں کو اس سے مستفید کیا۔ آپ نے وہاں لسانیات کی اعلیٰ ڈگری لینے کے بعد بھی سلسلہ تحقیق و تفتیش جاری رکھا۔ جسکا بالکل تازہ نتیجہ یہ کتاب ہے۔

اس موضوع پر غالباً یہ بالکل پہلی کتاب ہے ڈاکٹر زور نے پہلے تاریخی روشنی اس مسئلہ پر ڈالی ہے۔ اور شمالی و جنوبی لب و لہجہ کے اختلاف سے بحث کی ہے اس کے بعد کے تین ابواب میں محض صوتیات سے متعلق ایک جامع گفتگو کی گئی ہے۔

یہ کتاب پیرس میں طبع کرائی گئی ہے قیمت عصہ

مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

اردو شہ پارے

(جلد اوّل)

اس میں ابتدائے اردو سے لے کر ولی اورنگ آبادی کے عہد تک اردو کی پیداوار کا نچوڑ اور اس قدیم دور ادب کی محققانہ اور مکمل تاریخ ہے جس کو ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم۔اے پی ایچ ڈی (لندن) نے ترتیب دی ہے اس میں قدیم الفاظ کی فرہنگ اور آئندہ تحقیقات کرنے والوں کے لئے مفید ضمیمے اور شعراوغیرہ کی چھ نایاب تصاویر بھی ہیں۔ انتخابات زیادہ تر ان کتابوں سے لئے گئے ہیں جو ہندوستان میں نایاب ہیں اور صرف یورپ کے عجائب خانوں اور کتب خانوں کی زینت ہیں ضخامت (۴۰۰) صفحات قیمت ۲ روپے

"زمانہ" کانپور کی رائے | اس حصہ میں اردو ادب کے آغاز سے لیکر ولی کے زمانہ تک شاعروں اور نثر نگاروں کا تذکرہ ہے اور انکی تصانیف سے دلچسپ اقتباسات پیش کئے گئے ہیں۔ شروع میں ایک بسیط مقدمہ ہے جو چار ابواب پر مشتمل ہے۔

۱۔ اردو ادب کی ابتدائی کوشش۔ اس میں شاہان بیجاپور کے عہد کے اہل سخن وقلم کا ذکر ہے
۲۔ اردو ادب بیجاپور۔ اس میں شاہان بیجاپور کے عہد کے اہل سخن وقلم کا ذکر ہے۔
۳۔ اردو ادب گولکنڈہ میں تاجداران گولکنڈہ کے زمانہ کے مصنفین کے حالات ہیں
۴۔ اردو ادب مغلوں کی حکومت میں۔ اس میں سلطنت مغلیہ کے ابتدائی زمانہ میں شمالی ہند دکن اور گجرات میں جو مشہور شاعر۔ مرثیہ گو نیز نثر نگار گذرے ہیں ان کے حالات ہیں۔ اس کے بعد تمام مذکورہ اصحاب کے ادبی کارناموں (نظم و نثر) سے دلچسپ اقتباسات پیش کئے گئے ہیں علاوہ ازیں متعدد ضمیمے ہیں اور آخر میں قدیم نامانوس الفاظ کی فرہنگ بھی ہے قابل مؤلف نے اپنے قیام یورپ کے زمانے میں اردو کی قدیم ادبیات کے متعلق لندن، آکسفورڈ، وغیرہ کے کتب خانوں سے مسالہ فراہم کرکے اس کو مرتب کیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

دنیا کے شاہکار افسانے

اردو میں گذشتہ چند سال سے افسانہ خوانی اور افسانہ نویسی کا ذوق روز افزوں ترقی کر رہا ہے دنیا کی تقریباً تمام ترقی یافتہ زبانوں میں مختلف ممالک اور اقوام کے چیدہ اور بلند پایہ افسانے متعدد مجموعوں کی صورت میں ترجمہ اور منتقل ہو چکے ہیں اردو میں اب تک بڑے پیمانے پر ایسی کوئی کوشش نہیں کی گئی اس کمی کو پورا کرنے اور ساتھ ہی اعلیٰ ادبی ذوق کو آگے بڑھانے کے لئے ہم نے زیر ادارت مولوی عبدالقادر سروری ایم اے ال ال بی صاحب لکچرر عثمانیہ یونیورسٹی بڑے اہتمام سے "دنیا کے شاہکار افسانے" کا سلسلہ شروع کیا ہے جو چودہ ۱۴ جلدوں پر مشتمل ہے "قدیم افسانے" یہ اسی سلسلے کی پہلی جلد ہے اور مصر، یونان، روما، ہندوستان، ایران اور عرب کے (۲۵) قدیم ترین افسانوں کا مجموعہ ہے ہر افسانے کے ساتھ اس کے مصنف کا حال بھی درج ہے ضخامت (۱۷۴) صفحات قیمت ۱۲ عہ

"جامعہ" دہلی کی رائے: مکتبہ ابراہیمیہ دنیا کے ہر ملک اور ہر زبان کے بہترین افسانوں کا سلسلہ شائع کرنا چاہتا ہے یہ اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے اس مجموعے میں قدیم مصری، یونانی، رومی، ہندوستانی، ایرانی اور عربی افسانوں میں سے چند چوٹی کے افسانے جمع کر دئے گئے ہیں۔ مؤلف نے ہر زبان کے افسانوں کے متعلق الگ الگ تمہیدیں لکھی ہیں اور ہر ایک کے مصنف کے مختصر حالات بھی دیدئے ہیں۔ حسن انتخاب اور ترتیب کے لحاظ سے یہ مجموعہ بہت قابل قدر ہے۔ ہمارے نزدیک ادب کے قدر دانوں کے لئے یہ کتاب بے حد دلچسپ ثابت ہوگی اور اس سے اردو زبان میں افسانہ نویسی کا معیار بلند ہونے میں بھی بے حد مدد ملیگی۔

کی

خریداری میں مزید سہولت

جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپیہ کے مطبوعات مکتبہ یا ساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائیں گے، ان کے نام رسالہ سال بھر کے لئے بلا قیمت جاری ہو سکے گا۔ اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی درسی و دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خرید کریں گے۔ ان کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کے لئے مجلۂ مکتبہ بلا قیمت حاضر ہوگا۔ یکمشت خریدنے والے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کر دیا جائے گا۔ جو حضرات بدفعات کتابیں خریدیں گے، ان کو ایک رسید دیجائیگی۔ جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہو گی۔

خریدار صاحبین کو چاہیئے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب صراحت بالا رقم معینہ کی تکمیل ہو جائے وہ رسیدیں منتظم مجلہ مکتبہ کے پاس بھیجدیں رسالہ ان کے نام جاری کر دیا جائے گا۔ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہو سکتی ہیں۔ اس طرح کئی اشخاص مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

مطبوعہ

مطبع مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ

حیدرآباد دکن

دارالاشاعت مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود حیدرآباد دکن

کا

ماہوار علمی و ادبی مجلہ

مکتبہ

مدیر

عبدالقادر سروری ایم اے ال ال بی

شرکا

سید محمد ایم اے

عمر یافعی

یہ دارالاشاعت مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود کا ماہوار رسالہ ہے۔
یہ علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں علم و ادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین
درج ہوں گے۔ حجم کم از کم چار جز کا ہوگا۔
بنظر احتیاط پرچہ بذریعہ سرٹیفکٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا۔ اگر اتفاقاً وصول
نہ ہو تو ہر فصلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالۂ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔
قیمت سالانہ (للعہ/) مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے (عاہں) فی پرچہ ۶/
اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (صہ/) نصف کیلئے (سے)
اور چوتھائی کے لئے (عہ/) ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ
میں ۱۲½ فیصدی سے ۲۵ فیصدی تک کمی ہوسکے گی۔
ترسیل زر و مضامین اور جملہ خط و کتابت **منتظم مجلہ مکتبہ**۔ مکتبۂ ابراہیمیہ
امداد باہمی اسٹیشن روڈ۔ حیدرآباد دکن سے کیجئے۔

رجسٹرڈ نشان پٹہ سرکار آصفیہ
(۶۵)

رجسٹرڈ نشان پٹہ انگلشیہ
(۰۰۰۰)

مجلّہ مکتبہ

جلد (۶) بابتہ ماہ اردی بہشت ۱۳۴۲ف مطابق مارچ ۱۹۳۳ء شمارہ (۶)

شذرات

صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کی ہندوستانی اکیڈیمی نے حسب اعلان اپریل کے پہلے ہفتے میں اپنی دوسری سالانہ ادبی کانفرنس منعقد کی۔ اگرچہ کانفرنس کی تیاریاں بڑے پیمانے پر کی گئی تھیں اور متعدد اہل قلم حضرات کو شرکت کے دعوت نامے بھیجے گئے تھے لیکن کئی اصحاب جن کو اس میں حصہ لینا اور اپنی موجودگی سے کانفرنس کے اغراض و مفاد کو فائدہ پہنچانا ضروری تھا، کسی نہ کسی وجہ سے اس میں شریک نہ ہو سکے۔ خود سر تیج بہادر سپرو مستقل صدر اکیڈیمی جو افتتاحی تقریر فرمانے والے تھے، کسی ضروری قومی کام کی وجہ سے الہ آباد سے باہر چلے گئے اور شرکت سے معذوری کے اظہار کے ساتھ اپنا پیام بھیج دیا۔ جسٹس شاہ محمد سر سلیمان میر مجلس عدالت العالیہ الہ آباد نے افتتاحی خطبہ دیا اور اکیڈیمی کے معتمد صاحب نے سال بھر کی کارگزاری کی رپورٹ پڑھی اگلے دن شعبہ واری اجلاس شروع ہوئے۔ شعبہ اردو کی صدارت مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی (صدر یار جنگ بہادر) نے کی اور خطبہ صدارت کے علاوہ ایک علمی مضمون بھی پڑھا زیادہ تر مقامی حضرات نے مختلف عنوانات پر دلچسپ اور کارآمد مقالے سنائے۔

جامعہ عثمانیہ میں فارغ التحصیل طلبہ کے ذریعہ مختلف علوم و فنون میں اعلیٰ تحقیقات (ریسرچ) کرانے کا سوال ایک عرصے سے درپیش تھا مگر عملی صورت اختیار کرنے میں کوئی نہ کوئی رکاوٹ رہی

مگر صدر صاحب کلیۂ جامعہ عثمانیہ کی مسلسل کوشش سے ابتداً مرہٹی، تلنگی وغیرہ میں ریسرچ کا کام باضابطہ طور پر شروع ہوگیا۔ ریسرچ کرنے والے اصحاب کے لئے خاص وظایف منظور ہوئے اور اب اس سلسلے کو مزید وسعت دی گئی۔ شعبہ فنون و شعبہ دینیات دونوں میں مختلف علوم کی تحقیقات کے ابتدائی مراحل بھی طے کر دیئے گئے۔ صرف مجلس اعلیٰ کی توثیق اور تحقیقاتی وظایف کے اجرار کا کام باقی ہے۔ عربی فارسی، اُردو اور فقہ اسلامیہ میں تحقیقات کا کام بھی کم و بیش شروع ہو چکا ہے۔

حیدرآباد کے مدارس تحتانیہ و وسطانیہ کا انگریزی نصاب کوئی پندرہ سولہ برس سے غیر متبدل رہا۔ اور بنگال ریڈرون کے پرانے سلسلے کی کل مدارس میں پڑھائی ہوتی رہی۔ اس عرصے میں اگرچہ اکثر مضامین کی کتابیں بدلدی گئیں مگر اس طرف کوئی توجہ مبذول نہیں ہوئی تھی اس سال سررشتہ تعلیمات کے ذمہ دار افسروں اور ماہرین تعلیم عہدہ داروں کی متفقہ رائے سے ایک نیا سلسلہ جس کو سٹروسٹ نے ترتیب دیا ہے، شریک نصاب کیا گیا اور اگلے سال تعلیمی سے اس سلسلے کی کتابیں پڑھائی جائینگی۔ یہ ریڈریں ہندوستانی بچوں کے لئے جن کی مادری زبان انگریزی نہیں، اُن کی مشکلات اور ضروریات خاص طور پر ملحوظ رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ ہر ریڈر کے ساتھ ایک ایک دو دو امدادی کتابیں جداگانہ ہیں جن میں صرف اس ریڈر کے مستعملہ الفاظ میں سلیس قصے وغیرہ ہیں۔ اساتذہ کو کامیاب طور پر پڑھانے کے لئے جداگانہ کتاب ہدایات بھی ہے۔ ان ریڈروں کا طریقہ تعلیم بالکل راست اُصول اور بڑے غور و خوض پر مبنی ہے اُمید کی جاسکتی ہے کہ یہ نیا سلسلہ طلبہ کے حق میں بے حد مفید ثابت ہوگا۔

دارالاشاعت مکتبہ ابراہیمیہ کی متعدد زیر طبع کتابوں میں سے اس مہینے دو کتابیں چھپ کر شائع ہوئی ہیں۔ ایک مبادی نفسیات ہے جس کو مولوی شیخ عبدالحمید صاحب شوق بی، اے (آنرز) نے کئی ایک انگریزی کتب نفسیات کے مطالعہ کے بعد سلیس انداز میں تحریر کیا ہے۔ اُردو میں اس کارآمد و دلچسپ موضوع پر بہت کم کتابیں ہیں۔ دوسری کتاب جو زیادہ تر طلبہ مدارس کے غیر درسی مطالعہ کی غرض کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے، سلاطین بہمنیہ کے مشہور عالم وزیر خواجہ محمود گاوان کی سوانح عمری ہے۔

مشاہیر کی سوانح عمریاں طلبہ [illegible]

سیرت اور اعلیٰ کارناموں کا ولولہ پیدا ہوتا ہے جو انھیں کارزار زندگی میں صحیح راستے پر لگاتا اور سرگرم عمل بناتا ہے۔

حیدرآباد سے ایک نیا رسالہ ہمجولی کی اشاعت کا اعلان کیا گیا ہے جس کی عنان ادارت ایک خاتون سیدہ بیگم صاحبہ خویشگی کے ہاتھ ہوگی اس کے اجرا کا مقصد مدیرہ کے الفاظ میں "نئی پود کی ذہنی ترقی اور ہر جہتی فلاح" ہے۔ رسالہ باتصویر ہوگا اور سنجیدہ مضامین سے زیادہ شگفتہ لطائف ظریفانہ نظمیں پُرلطف معمے، دلکش کارٹون، انوکھے خاکے وغیرہ اس کی خصوصیات ہونگے۔ اُمید ہے کہ یہ رسالہ جلد منظرعام پر آکر اپنی دلفریبیوں سے بہت جلد ہردلعزیزی حاصل کریگا۔

ہندی ادب

پر

ایک سرسری نظر

از اِف' اے' کئے - ایم' اے

یہ مضمون کئے کی کتاب "ہندی ادب" (ہری ٹیج آف انڈیا سیریز) کے دوسرے باب کا ترجمہ ہے - پہلا باب جلد (۵) شمارہ (۳) میں شایع ہوچکا ہے - (عبدالقادر سروری)

جب تک راجہ ہرش زندہ رہا' شمالی ہند میں اس کی وسیع سلطنت قایم رہی - لیکن سنہ ۶۴۶ء یا ۶۴۷ء میں اس کے قضا کرتے ہی' بد نظمی اور انتشار کا طویل دور شروع ہوگیا - تاریخی ارتقا کا سررشتہ اُس وقت تک منقطع رہا جب تک مسلمانوں نے یہاں آکر ایک مستحکم اعلیٰ اقتدار نہ قایم کرلیا - اسی زمانے میں راجپوت قبایل کو نشوونما حاصل ہوا - کئی راجپوت امارتیں قایم ہوئیں' جنھوں نے ہندوستان کی آیندہ تاریخ میں بڑا حصہ لیا - یہ حکومتیں عموماً آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ برسرپیکار رہتیں - اور صرف مغرب کی طرف سے مسلمانوں کے حملے کے وقت' یہ پھر متحد ہوکر' غنیم کا مقابلہ کرتیں - یوں تو کابل' پنجاب' اور سندھ پر بہت پہلے مسلمانوں کا قبضہ ہوچکا تھا - لیکن ہندوستان کی فتح سنہ ۱۱۷۵ء سے تصور ہونی چاہیے کیونکہ سلطان شہاب الدین محمد غوری کی فتوحات اسی وقت سے شروع ہوتی ہیں - سنہ ۱۱۹۱ء میں مسلمانوں کی پیش قدمی کو دیکھکر ہندو راجاؤں میں ہراسانی پیدا ہوگئی - آپس کے جھگڑوں کو دباکر تمام راجاؤں نے دہلی اور اجمیر کے چوہانی حکمراں پرتھی راج (جو پرتھوی راج اور رائے پتھورا کے ناموں سے بھی مشہور رہے) کی قیادت میں ایک عظیم الشان اتحاد قایم کیا - پہلی دفعہ تو ہندوؤں کو تارین پر فتح نصیب ہوئی' لیکن دوسرے ہی سال اسی مقام پر ان کی قسمت کا پانسا پلٹ گیا - پرتھی راج جنگ میں گرفتار ہوکر مارا گیا - دہلی پر تو مسلمانوں کا فوراً قبضہ ہوگیا' لیکن ان کی کشورکشائی عرصہ تک جاری رہی - سنہ ۱۳۲۵ء تک یعنے محمد بن تغلق کے عہد میں یہ معراج کمال کو پہنچ گئی - اس میں شک نہیں کہ مغلوں نے اکثر ہندو سلطنتوں کو فتح کرلیا تھا اور راجپوتانے میں بھی تقریباً تمام قلعے ان کے تصرف میں آچکے تھے' تاہم راجپوت قبایل

ان کے کبھی پوری طرح مطیع نہیں ہوئے۔ جب موقع ملتا اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ مسلمانوں کے عہد حکومت میں بھی راجپوتوں کی کئی نئی سلطنتیں برپا ہوتی رہیں۔ اکثر مسلم شہنشاہوں نے ان راجپوت سرداروں کو مغلوب کرنے کی بجائے حلیف بنانا مفید تصور کیا۔

یہی وہ دور تھا جس میں ہندوستان کی موجودہ بھاشائیں یا ورناکیولر زبانیں بن رہی تھیں۔ ان میں سے سب سے پہلے بھاشا کا ادب، راجپوتانے کے مطرب شاعروں کے وقایع کی شکل میں نمودار ہوا۔ اپنے زمانے کے سنسنی خیز حالات نے ان شاہی بھاٹوں کے لئے بہت سے موضوع بہم پہنچا دیے تھے۔ اس پر سرداروں اور بادشاہوں کی فیاضانہ سرپرستیوں نے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ بھاٹوں کی شاعری، اس میں شک نہیں کہ مداحی سے پُر اور داستانیت سے مملو ہے، اور اسی لئے سنجیدہ تاریخ نہیں سمجھی جا سکتی، تاہم ہندو سلطنتوں اور مسلم فاتحین کی بے جگرانہ کشمکش کی وہ یادگار ہے اور ایسے عہد میں جیسی جانبازی ظاہر ہونی چاہئیے اس کی پوری مظہر ہے۔ اس دور کی ادبیات میں سب سے زیادہ نمایاں ہستی چند بردائی کی ہے۔ یہ پرتھی راج کے دربار کا بھاٹ تھا۔ چند ہی کے زمانے کا ایک اور شاعر جگنایک ہے۔ چودھویں صدی کے وسط میں سارنگ دھر کی نغمہ خوانی خاص شہرت رکھتی ہے۔ یہ رنتھنبور کے راجا ہمیر کے دربار کا شاعر تھا اور اس کی شجاعت کے کارناموں کی مدح سرائی کیا کرتا تھا۔

پندرھویں صدی کے آغاز میں رام چندر جی کی پرستش نے اردو ادب میں دوبارہ تازہ روح پھونک دی۔ وشنواسیوں کا ایک گروہ، وشنو کی پرستش کرشن کی شکل میں کرتا تھا۔ یہ مسلک عرصے سے مقبول خاص و عام ہو گیا تھا۔ اب زیادہ تر راما نند کے زبردست اثر نے، اکثروں کو رامچندر جی کی پرستش میں محو کر دیا۔ بعد میں مسلمانوں کے اثر سے ایک نیا مسلک نمودار ہوا، جس میں بت پرستی کے بجائے وحدانیت کو جگہ ملی۔ اس مسلک کا سب سے پہلا گرو، کبیر ہے۔ یہ اور اسی قسم کی دوسری تحریکات اس عظیم الشان مذہبی احیا کا جز ہیں جو عوام میں پھیل رہا تھا۔ اسی ضرورتوں سے عوام ملکی زبانوں کو اپنے ادب کے لئے کام میں لانے لگے۔ اس کے بعد سے عموماً ملکی ادب کی رفعت مذہبی مطامع پر منحصر ہو گئی، اور اس کی طرز رفتار وہی قایم ہو گئی، جو وشنو مصلحین نے پیدا کی تھی۔ یہ دور تقریباً سنہ ۱۴۰۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور کے شعرا میں نام دیو، کبیر، ودیاپتی، میرا بائی اور ملک محمد جائسی خاص

طور پر قابل ذکر ہیں۔ راجپوتانے کے اگلے بھاٹ، عبوری دور کے شاعر تھے، اِن کی زبان میں ابھی پراکرت کا اثر باقی تھا۔ یہ گویا ہندی ادب کا بچپن تھا۔ لیکن اِس دوسرے دور کے شعرا نے جب قلم اُٹھایا ہندی زبان خصوصًا بول چال میں عملاً وہی تھی جو آج استعمال ہوتی ہے۔ اِس زبان کے اگلے دور کے شعرا کی طرح، انہیں بھی اپنا راستہ ہموار کرنا پڑا۔ اپنی شاعری کے لئے ملکی زبان کو استعمال کرنا ان کے لئے ایک بڑا اہم کام تھا۔ یہ زمانہ ہندی کی نوعمری کا ہے۔

ہندوستان کے ادبیات کا زرین دور ۱۵۵۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ مغل شہنشاہوں نے نہ صرف زبردست سلطنت قایم کی بلکہ اُنہوں نے ادبیات اور فنون لطیفہ کی بھی فراخدلی کے ساتھ سرپرستی فرمائی۔ اکبر (۱۵۵۶-۱۶۰۵) جہانگیر (۱۶۰۵-۱۶۲۷) شاہ جہاں (۱۶۲۷-۱۶۵۸) کا دور ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا معراج کمال ہے۔ جس میں سلطنت کا دبدبہ اور شکوہ منتہا کو پہنچ چکا تھا۔ یہی زمانہ ہندی ادبیات کا بھی نصف النہار ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ انگریزی ادب بھی اسی زمانے میں اپنی عظمت کے آخری نقطہ پر پہنچ گیا، جس کو انگریزی نقاد "انگریزی ادب کا الزبیتھی دور" کہتے ہیں۔ نیز اسی زمانے میں انگلستان اور ہندوستان کا پہلے پہل تعلق پیدا ہوتا ہے۔

اِس دور کی خصوصیت یہ ہے کہ ادب میں ایک حسن کارانہ اثر نمایاں ہونے لگا، جس سے ہر صنف کی نظم میں شستگی پیدا ہونے لگی اسی وقت کیشوداس اور دوسرے مصنفین نے فن شاعری کے قواعد وضوابط بھی مدون کرنے کی اولیں کوشش کی۔ جیسے غیر فانی شاعر ہندی کو اِس دور میں نصیب ہوئے۔ پھر کبھی نہ ملینگے تلسی داس، سورداس اور بہاری لال کے علاوہ دوسرے باکمال انشاپرداز جیسے ترپاٹھی برادران دیو کوی، اور سناپتی کا ثانی ہندی ادب آج تک نہ پیدا کر سکا۔ یہی وہ زمانہ بھی ہے، جس میں سکھوں کی مقدس "گرنتھ" مدون ہوئی۔ دارو بھی گئی اور نئے مذہبی فرقے بھی وجود پذیر ہوئے۔ اِن فرقوں نے بے شمار اعلیٰ درجہ کی نظمیں پیدا کیں۔ اٹھارویں صدی میں اس درخشاں دور کا اختتام ہوتا ہے۔ یہیں سے ہندی ادبیات عالیہ کا زوال شروع ہوتا ہے۔ یہی وہ نقطہ بھی ہے جہاں پہنچ کر مغل شہنشاہوں کا نیّر اقبال گہنانے لگتا ہے۔ اِس کے بعد ہندی میں اوّل درجے کے مصنفین پیدا ہونے بھی موقوف ہوگئے۔

اُنیسویں صدی کی ابتدا ہندی ادب کو ایک نئے اثر سے دوچار کرتی ہے۔ یہ یورپی تمدن کا اثر ہے۔ جو مغربی اقوام کے ساتھ ہندوستان پہنچا۔ اٹھارویں صدی سے انگریز فرانسیسیوں پر سبقت

حال کرنے کی مسلسل کوششیں کرتے رہے تھے۔ اب یہ کش مکش ختم ہو چکی تھی اور مغلیہ سلطنت کے تار و پود کے بکھر جانے اور مرہٹوں کی قوت ٹوٹ جانے سے انگریزوں کے لئے راستہ صاف اور ان کا اقتدار قایم ہو گیا تھا۔ ہندی معاشرت کے ہر شعبہ میں اب انگریزی اثر زیادہ سے زیادہ نمایاں ہونے لگا۔ ہندوستان پر مغربی تمدن کے اثر نے نئے خیالات کی افزایش شروع کی۔ اندرونی جھگڑوں سے نجات ملتے ہی ملکی قابلیت پھر روپ میں اجاگر ہونے لگی۔ انہیں حالات کا نتیجہ ہے کہ ہندی ادبیات میں ایک بھاری انقلاب اور ادبی احیا شروع ہوا جو اب بھی ترقی پذیر ہے۔ اس دور کے آغاز میں للو جی لال نے موجودہ ہندی نثر کی بنیاد رکھی۔ اس نے ایک نئی بولی بھی بنائی جو بعد میں چلکر ہندی کا اصلی ذریعۂ اظہار بن گئی۔ اسی زمانے میں چھاپے خانوں کے رواج نے ادب کو دور دراز حصوں میں شایع کرنے کا ذمہ لے لیا۔ ہندی شاعری کی احیائی کوششیں ہریش چندر نے شروع کیں۔ اسی دور میں ہندی ڈراما کا بھی نشو نما ہوا۔

غزل

(از)

جناب حکیم آزاد انصاری صاحب

میں اور تری شکایت؟ تہمت ہے افترا ہے
جو دل میں وہ زباں پر، اللہ جانتا ہے

تو اور چشم پوشی، قسمت کی خوبیاں ہیں
ہم اور کس مپرسی، تقدیر کی خطا ہے

ان بے نیازیوں کا انجام کچھ نہ ہوگا
ان ناشکیبیوں پر کیا جرأت آزما ہے

حسرت نصیب آنکھیں تیری ہی منتظر ہیں
کلفت نصیب دل کا اک تو ہی مدعا ہے

اب ہم تمھیں بتائیں، دامِ کرم بچھادو
بیدادِ ناروا کا موقع گزر چکا ہے

اب کوششِ تغافل کچھ فایدہ نہ دیگی
مایوس ہو چکا ہوں، اور صبر آچلا ہے

ظالم! وہ دھن کہ تیری حسرت سنے نامرد ہے
اک خار ہے کہ میرے دل میں کھٹک رہا ہے

کافر! وہ غم کہ تیری الفت کا ماحصل ہے
اک زخم ہے کہ جس کی ہر ٹیس جانگزا ہے

وہ دوستوں کے جلسے، وہ دلگی کے ساماں
گزرا ہوا زمانہ آنکھوں میں پھر رہا ہے

دریا ہے اور تلاطم، کشتی ہے اور تباہی
اے ناخدائے عالم! اب تو ہی ناخدا ہے

آزاد! تا بہ امکان منزل کی جستجو کر
اللہ راہبر ہے، اللہ رہنما ہے

یونانی علم الاصنام کا ایک زرین ورق

از
جناب ابوالمکارم فیض محمد صاحب صدیقی بی۔اے۔ (عثمانیہ)

سائکی

ایرس کا محل

ایک بادشاہ کی تین لڑکیاں تھیں اور ہر ایک اپنے غیر معمولی حسن وجمال کے باعث چار دانگ عالم میں مشہور تھی، سائکی ان سب سے چھوٹی اور سب سے زیادہ حسین لڑکی تھی چنانچہ جب وہ مندروں میں پھول چڑھانے کی غرض سے جاتی تو لوگ اسے حسن وعشق کی دیوی سمجھکر وہ پھول پہنا دیتے تھے جو اصل میں وینس (حسن وعشق کی دیوی) کے لئے لائے گئے تھے۔

اس میں معلا غریب سائکی کا کیا تصور تھا! لیکن اب اس کو کیا کیا جائے کہ وینس کے دل میں رقابت کی آگ بھڑکی اور اس نے بری طرح انتقام لینے کا تہیہ کرلیا اور ایک روز خدائے محبت ایرس کو بلا کر حکم دیا کہ جا اپنے سنہری نوک والے تیر سے سائکی کے دل کو زخمی کر کے اسے سب سے زیادہ ذلیل اور کریہ منظر فقیر کی محبت میں گرفتار کر دے۔

ایرس تیر وکمان لئے اپنی ماں کے حکم کی تعمیل کے لئے زمین پر آیا اور جیسے ہی اس نے سائکی کی صورت دیکھی اس کے غیر معمولی حسن کے نظارہ میں اس قدر محو ہوگیا کہ اپنے تیر سے خود اپنے کو زخمی کرلیا اور بجائے اس کے کہ سائکی کو کسی کی محبت میں گرفتار کرتا خود اس کا دیوانہ بن گیا۔

سائکی کی بڑی بہنوں کی شادیاں شہزادوں سے ہوچکی تھیں لیکن یہ بڑی عجیب بات تھی کہ باوجود اسقدر حسین ہونے کے سائکی کے لئے کوئی پیغام نہیں آتا تھا، بادشاہ تاڑ گیا کہ ہو نہ ہو یہ وینس کا غضب ہے نجوم سے بھی یہی معلوم ہوا کہ یہ سارا کیا دھرا حسن وعشق کی دیوی وینس کا ہے کیونکہ نجومیوں نے یہ کہا تھا کہ "اپنی لڑکی کو دلھن کا لباس پہناؤ اور اس پہاڑ کے بازو لیجا کر چھوڑ دو"۔

"ایک نامعلوم پردہ دار دشمن، جس سے زمین والے تو زمین والے آسمان"
"کے دیوتا بھی ڈرتے ہیں، آئے گا اور اس کو اس طرح لے جائے گا جس طرح باز"
"قمری کو لے جاتا ہے"

یہ سُنکر بادشاہ غم و اندوہ کے دریا میں غرق ہوگیا، اتنی ہمت کہاں تھی کہ اس حکم کی خلاف ورزی کرتا، پس ایک رات سائکی کو سہیلیوں نے اسے دُلھن کے کپڑے پہنائے اور بادشاہ ایک زبردست براے کے ہمراہ اس کو ایک سر بلند پہاڑ کی چوٹی پر لے گیا، وہاں پہنچکر سہیلیوں نے مشعلوں کو گل کر دیا اور اس خوفناک تاریکی میں اکیلا چھوڑ کر سب لوگ لوٹ آئے۔

تنہا مرا قاتل رہا، کوئی نہیں قاتل کے پاس

غریب سائکی، تنہا پہاڑ کی چوٹی پر رنج والم کی زندہ تصویر بنی بیٹھی تھی، خوف کے مارے اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا، ساتھیوں کے قدموں کی آواز مدھم پڑنے لگی اور وہ منتظر بیٹھی تھی کہ کوئی دم میں ایک عجیب الشکل و صورت کا جانور پنجے کھولے اور دانت تیز کئے اس پر حملہ آور ہوگا، وہ اسی طرح عالم خوف و دہشت میں بیٹھی ہوئی تھی کہ سرد ہوا کا ایک جھونکا آیا اور اس نے ایسا محسوس کیا کہ زیفرس (خدائے باد) کے نرم بازوؤں نے اس کو اپنی آغوش میں لے لیا ہے، یہی ہوا، زیفرس نے اس کو چٹان سے اٹھا کر ایک خوبصورت سرسبز و شاداب وادی میں پہنچا دیا اور وہاں نہایت آہستگی سے اُسے ایک سبزہ زار پر لٹا دیا۔

چاندنی چھٹکی ہوئی تھی، وادی کی پرامن اور فرحت افزا فضا نے سائکی کے دل سے خوف کا احساس زائل کر دیا اور اس کی آنکھ لگ گئی، صبح کو جب آنکھ کھلی تو اس نے اپنے کو ایک خوبصورت باغ میں پڑا پایا، اس کے اطراف اونچے اور قد آور درخت کھڑے ہوئے تھے، سامنے ایک عالیشان عمارت تھی، حوض میں فوارہ اُڑ رہا تھا۔ محل میں سونے کے ستون تھے، دیواروں پر گنگا جمنی کام کیا ہوا تھا اور فرش پر ہمہ قسم کے قیمتی پتھر بچھے ہوئے تھے۔

سائکی نے ڈرتے ڈرتے مکان کے اندر قدم رکھا اور ہر ایک کمرہ کا معائنہ کرنے لگی، مکان کے اندر بالکل سکوت اور خاموشی تھی لیکن دو تین مرتبہ اسے کچھ موہوم سی آواز سنائی دی اور ایسا محسوس ہوا گویا پریاں باتیں کر رہی ہیں، اس خیال سے وہ ذرا جھجکی لیکن پھر یہ سمجھکر کہ شاید یہ سامنے والے فوارہ کی آواز ہوگی مطمئن ہوگئی۔

اِدھر اُدھر پھرتے پھراتے وہ ایک کمرہ کے اندر داخل ہوئی، دیکھتی کیا ہے کہ ایک میز پر کھانے پینے کا سامان نہایت خوش سلیقگی کے ساتھ رکھا ہوا ہے، سامنے صرف ایک کرسی پڑی ہوئی تھی جس سے قیاس کیا جا سکتا ہے

کہ صرف ایک ہی شخص کی دعوت کا یہ اہتمام ہے، سائکی ڈرتے ڈرتے کرسی پر بیٹھ گئی اور محل کی تمام پریاں، اس کی نظروں سے غائب، لیکن اس کے اطراف حلقہ باندھ کر کھڑی ہوگئیں، اپنے کو اس اطمینان اور سکون کی حالت میں پاکر سائکی جی کھول کر کھانے لگی اور جیسے ہی اس نے اپنا کھانا ختم کیا موسیقی کے پُر ترنم نغموں کی صدا اس کے کانوں میں گونجنے لگی، ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ہزاروں پریاں ہم آہنگ ہوکر گا رہی ہیں، تھوڑی دیر بعد یہ مشترکہ گانا ختم ہوا اور بانسری کی تنہا اور سُریلی آواز نے اس کی جگہ لے لی۔

دیکھتے دیکھتے دن گذر گیا اور رات کی تاریکی رفتہ رفتہ فضاء عالم پر اپنا تسلط جمانے لگی، سائکی کا دل مارے خوف کے کانپنے لگا کیونکہ یہ بتلایا گیا تھا کہ اس کا عاشق ایک پُر اسرار دیو ہے، اس کے تخیل نے اسے بے حد متوحش اور ہراساں کردیا تھا۔ تمام دروازے کھلے ہوئے تھے، نہ تو بولٹ ہی تھے اور نہ قفل، گویا اس خطہ کے رہنے والوں کو نہ تو چوروں ہی کا ڈر ہے اور نہ کسی بدطینت ہستی کا خوف! بالآخر جب تاریکی بڑھ گئی اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے لگا تو سائکی کے کانوں میں پروں کے پھڑپھڑانے کی آواز آئی اور کوئی شخص اندر آتا ہوا محسوس ہوا اور ایک شخص آہستہ آہستہ قدم رکھتے ہوئے نہایت تیزی کے ساتھ کمرہ کے اندر داخل ہوکر اس کی کرسی کے قریب بیٹھ گیا اور نہایت دھیمی اور میٹھی آواز میں اس سے مخاطب ہوا "اے خوب صورت سائکی! یہ مکان اور اس کے اندر کی تمام چیزیں تیری ہیں بشرطیکہ تو یہاں رہنے پر راضی ہوجائے اور مجھ سے شادی کرلے، جو آوازیں تو نے سُنی ہیں وہ تیری خادمات کی ہیں، جو تیرے ہر حکم کے لئے ہر وقت حاضر ہیں، روزانہ رات کو میں تیرے یہاں رہونگا اور دن نکلنے سے قبل اُڑ کر چلا جاؤنگا، میری صورت دیکھنے کی کوشش نہیں کرنا اور یہ بھی نہ پوچھنا کہ میں کون ہوں، مجھ پر اعتماد کر، میں اس کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا" سائکی کے خوف میں کمی ہوئی کیونکہ وہ سمجھی ہوئی تھی کہ پہلی ہی ملاقات میں وہ اس کو کھا جائے گا لیکن اس کے طرزِ عمل، برتاؤ اور خلوص و محبت کی باتوں نے اس کے دل کو اطمینان بخشا اور وہ مطمئن ہوگئی کہ اس کا عاشق دیو یا شیطان نہیں ہے۔

حسب وعدہ اس کا عاشق جو بجائے خود ایک راز بنا ہوا تھا، روزانہ رات کے وقت آتا تھا، بعض دفعہ اس کی آمد پر سائکی کا دل باغ باغ ہوجاتا تھا اور بعض وقت پروں کی آواز سُنکر اس کے ہوش پرّاں ہوجاتے تھے۔

ایک دن باغ میں وہ گلاب کے پھول چُن رہی تھی، سامنے والے پہاڑ پر جہاں اس کے باپ

اور اس کے ساتھیوں نے اِسے ہمیشہ کے لئے جدا ہونے کے واسطے چھوڑ دیا تھا اس نے دیکھا کہ اس کی دونوں بہنیں ایک چٹان پر بیٹھی ہوئی اس طرح آہ وزاری اور سینہ کوبی کر رہی ہیں گویا وہ کسی کی موت پر ماتم کر رہی ہیں، بار بار وہ اس کا نام لیتی تھیں اور روتی جاتی تھیں، سائکی نے اس سے قبل کبھی اپنی بہنوں کو اس پر اتنا مہربان نہیں دیکھا تھا لیکن اب کی دفعہ اسے ان کی محبت کا یقین ہوگیا۔

اسی رات جب اس کا عاشق ملاقات کے لئے آیا تو سائکی نے اپنی بہنوں سے ملنے کی خواہش ظاہر کی، خواہش منظور کی گئی لیکن کسی قدر بد دلی کے ساتھ۔ دوسرے دن جب اس کی بہنیں اسی پہاڑ کی چوٹی پر آکر رونے پیٹنے لگیں تو زیفرس نے ان دونوں کو اس پر فضا وادی میں پہنچا دیا۔ یہاں پہنچکر ان کی آنکھیں کھل گئیں اور اپنی چھوٹی بہن کی خوش نصیبی کو وہ حیرت و استعجاب کی آنکھوں سے دیکھنے لگیں اور بجائے خوشی کے ان کے دل میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی۔ سائکی سے دونوں نے کئی سوال کئے اور خاص طور پر مالک مکان کے حالات معلوم کرنے کی کوشش کی، سائکی نے صرف اتنا کہدیا کہ وہ شکار کی غرض سے باہر گئے ہوے ہیں، زیفرس نے جب یہ دیکھا کہ وہ خواہ مخواہ بہت ہی کھوج کر رہی ہیں تو ان کو فوراً اسی چٹان پر لیجا کر چھوڑ دیا اس طرح سے ملاقات کا خاتمہ ہوگیا۔

کچھ دنوں بعد سائکی تنہائی سے گھبرا گئی اور پھر اپنی بہنوں سے ملنے کی خواہش ظاہر کی، اس کے عاشق نے اس کو دوبارہ منظور کرلیا اور اسے ہدایت کردی کہ وہ نہ تو اس کے متعلق کسی سوال کا جواب دے اور نہ کچھ سُنے اور دوسرے یہ کہ اگر اس نے اس کو دیکھنے کی کوشش کی تو وہ اسے چھوڑ کر مجبوراً اُڑ جائے گا اور محل وغیرہ سب غائب ہو جائے گا۔

پہلے کی طرح زیفرس نے دوسرے دن اس کی بہنوں کو اس وادی میں پہنچا دیا، سائکی کی پُر عظمت اور پُر تکلف زندگی نے اس کی بہنوں کے دل میں حسد کی آگ بھردی اور اب کی دفعہ انہوں نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ کسی نہ کسی ترکیب سے اس کے عیش و آرام کا خاتمہ کردیں، انہوں نے اس کو مختلف طریقوں سے سمجھایا کہ اس محل کا مالک اصل میں ایک پر دار اژدہا ہے، پہاڑی لوگوں نے اسے اکثر دفعہ دیکھا ہے اور کہنے لگیں اُس میں شک نہیں کہ وہ تجھ پر حد درجہ مہربان ہے تاہم یاد رکھ کہ موقع پاکر تجھ کو نگل جانے میں وہ کبھی دریغ نہ کرے گا وہ جانتا ہے کہ تو اس کی کریہ منظر شکل وصورت دیکھکر ڈر جائے گی اسی لئے تو اپنی صورت اسطرح چھپاتا ہے، دیکھ اپنی بڑی بہنوں کی نصیحت کو سُن ہم تجھ سے عمر اور عقل دونوں میں بڑے ہیں، اگر تجھ کو ہم پر

اعتبار ہے تو یہ چاقو لے اور جب تیرا مصنوعی عاشق سو جائے تو چراغ اٹھا کر اس کی صورت دیکھ اگر ہم نے جو کچھ کہا ہے درست ثابت ہو تو اس چاقو سے اس کا گلا کاٹ کر اپنے آپ کو موت کے چنگل سے آزادی دلا " یہ کہکر چاقو کو سائکی کے حوالے کر دیا اور رخصت ہو گئیں، سائکی کے دل میں خوف و دہشت کا تلاطم برپا ہو گیا، اس کا اعتبار اعتماد سب کچھ رخصت ہو چکا، اگر یہ سب کچھ صحیح نہیں ہے تو پھر کس لئے وہ مجھ سے میرا عاشق ہو کر اپنی صورت چھپاتا ہے؟ اسے میری بہنوں سے کس لئے خوف ہے؟ اس کو یہ پر کیوں لگے ہیں؟ سب سے زیادہ خراب بات یہ ہوئی کہ اس کا وہم یقین کی حد تک پہنچ گیا اور سوچنے لگی " واقعی دو تین مرتبہ میں نے فرش پر اژدہا کے چلنے کی آواز سنی تھی " اس سے اور بھی وحشت بڑھ گئی۔

جیسے ہی اندھیرا ہوا اس کا عاشق مکان کے اندر داخل ہوا، اس رات سائکی نے اس سے بات تک نہیں کی، اس نے وہ نزدیک کے کمرہ میں جا کر ایک صوفہ پر دراز ہو گیا اور وہاں اس کی آنکھ لگ گئی۔

سائکی خوف کے مارے تھر تھر کانپتے ہوئی، ایک ہاتھ میں مشعل اور دوسرے میں چاقو لئے ہوئے آہستہ آہستہ کمرے میں داخل ہوئی " اس صوفہ کے قریب گئی جس پر اس کا عاشق گہری نیند سو رہا تھا مشعل کی پوری روشنی اس کے چہرے پر پڑی اور سائکی نے بجائے بدصورت، گندے اژدہا کے ایرس یا مجسم محبت کو دیکھا جو تمام دیوتاؤں سے زیادہ حسین اور خوب صورت ہے، اس کے منہ پر سنہری گھونگر والے بال پڑے ہوئے تھے، اس کے برف کے مانند سفید اڑتیلیوں کیطرح خوشنما پر بند تھے اور سانس کے چلنے کے باعث کبھی کبھی حرکت کرتے تھے، اس کے قدموں کے پاس تیر اور کمان دونوں رکھے ہوئے تھے۔

ندامت سے سائکی کے ہاتھ سے چاقو چھوٹ گیا، اس نے فوراً ایک تیر اٹھایا اور اس کے سنہری نوک سے اپنی انگلی کو زخمی کر لیا، چراغ کو اوپر اٹھایا اور اپنی مشتاق آنکھوں سے ایک مرتبہ پھر سے ایرس کو دیکھنے لگی اور اب کی دفعہ محبت کو " محبت " میں جلوہ گر دیکھا، لیکن اس کا ہاتھ کانپا اور گرم تیل کا ایک قطرہ خدائے حسن کے کندھے پر گرا، اس نے آنکھیں کھول دیں اور حقارت سے اس کی طرف دیکھنے لگا اور بغیر ایک لفظ زبان سے نکالے اڑ گیا، خوب صورت محل غائب ہو گیا اور سائکی جنگل میں بالکل تنہا رہ گئی۔

سائکی کا فیصلہ

سائکی محبت کے تیر سے زخمی ہو کر اپنے عاشق کی تلاش میں خود عاشق بنکر صحرا نوردی کرنے لگی

پان' پرس' اور جوتو سے ملاقات کی اور ان سے امداد کی درخواست کی لیکن سبھوں نے نفی میں جواب دیا۔ آخر مجبور ہو کر وہ خود وینس کے پاس گئی اس خیال سے کہ شاید محبّت کی ماں محبّت کی خاطر اس پر اپنی شفقت اور مہربانی کے پھول نچھاور کریگی۔

اُس وقت ایرس' وینس کے محل میں پڑا ہوا زخم کی جلن کے باعث کراہتا تھا' وینس کو سارا واقعہ معلوم ہو چکا تھا اور وہ غصّہ میں بھری بیٹھی تھی' سائکی کو دیکھکر اور بھی آگ ہوگئی اور سزا کے طور پر اُسنے سائکی کے ذمہ بہت سے ناممکن العمل کام لگا دیئے۔

سب سے پہلے اس نے اناج کا ایک انبار اس کے حوالے کیا جس میں مختلف قسم کے اجناس مثلاً: گیہوں' چاول' جوار وغیرہ سب ملے ہوئے تھے' وینس نے حکم دیا کہ "یہ لے اور ہر جنس کو علیحدہ کر' شام سے پہلے یہ کام ختم ہو جانا چاہیے"

غریب سائکی کو جرأت نہ ہوئی کہ وہ اس کام کو شروع کرے اس لئے وہ سرنچا کئے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی تھی کہ ناگہاں پتھر کے نیچے سے ایک چیونٹی نکلی اور چیونٹیوں کی عظیم الشّان فوج جمع کر کے صرف محبّت کی خاطر اُس نے اس کام کو بات کرتے میں کروا دیا۔

دن ڈھلنے کے بعد وینس نے آکر جب یہ دیکھا کہ سائکی نے اپنا کام ختم کر دیا ہے تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی اور غریب لڑکی کے سامنے نہایت حقارت سے روٹی کا ایک ٹکڑا پھینک کر کہنے لگی "کل اس سے زیادہ مشکل کام دیا جائے گا" دوسرے دن وینس اُس کو ایک ندی کے کنارے لے گئی' دوسرے کنارے پر سنہری بالوں والے بکروں کے منڈ چر رہے تھے حکم دیا کہ "وہاں جا کر ان کے بال لا"

سائکی کی ناامیدی کی کوئی انتہا نہ رہی' اور اب اپنے آپ کو بالکل مجبور پا کر دریا میں ڈوب جانے والی تھی کہ دریا کے تنکوں نے کہا "دیکھو وہ بہت ہی خوفناک جانور ہیں اور دھوپ کے وقت ان کے مزاج میں بڑی تیزی ہوتی ہے تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ اور جب ندی کا دلچسپ راگ ان کو سلا دے تو وہاں جا کر جس قدر چاہے بال نکال لو۔" آفتاب ڈھلنے تک سائکی وہاں ٹھہری رہی اور اس کے بعد ندی کو عبور کر کے بالوں کے دو گٹھے بغل میں دبا کر واپس ہوئی' سائکی کو صحیح و سلامت دیکھکر وینس اور بھی زیادہ غضبناک ہوگئی اور بول اٹھی "یہ کام تو نے خود سے تو نہیں کیا ہے' اب میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ کس قدر عقلمند اور کفایت شعار ہے تاکہ ایرس کی بیوی بن سکے۔ لے یہ برتن لے اور "خود فراموشی کے چشمہ" سے اس میں پانی بھر لا۔

یہ چشمہ پہاڑ کے بالکل بالائی حصہ پر واقع تھا، برف کے مانند سرد پانی ایک مسطح چٹان سے نکل رہا تھا جو اس قدر اونچی تھی کہ اس پر چڑھنا بہت ہی دشوار تھا، پانی گرتے وقت آواز نکلتی تھی "مجھ سے دور رہو جاؤ، ہوشیار ورنہ برباد ہو جاؤگے" اس نہر کی دونوں جانب بڑے بڑے غار تھے جن میں خونخوار اژدہے رہا کرتے تھے، جہاں پہنچ کر سائکی کے ہوش گم ہو گئے وہ بت کی طرح کھڑی ہوئی تھی، زہرہ کے عقاب نے جس پر محبت کی خاص عنایت تھی اس وقت سائکی کی مدد کی اور وہ کامیاب رہی۔

سائکی خوش و خرم وینس کے پاس واپس آئی اور اب کی دفعہ اسے کامل یقین تھا کہ وینس خوش ہو جائیگی لیکن محبت کی ماں اور غصہ میں آگئی، اور کہنے لگی "تو جادوگرنی ہے ورنہ ناممکن ہے کہ تو ان کاموں کو انجام دیسکے اچھا ایک اور کام تیرے ذمے کرتی ہوں، یہ ڈبہ لے اور زمین کے اندر جاکر پرازرپائین سے کہہ کہ وہ اپنا تھوڑا سا حسن دے"

سائکی نے جب یہ سنا تو اسے یقین ہو گیا کہ وینس اسے اسی طرح تباہ و برباد کر دینا چاہتی ہے، اس نے خیال کیا کہ مزید جد و جہد لاحاصل ہے اس لئے وہ نا امید ہو کر ایک اونچے مینار کی چوٹی پر گئی اور اب کود کر جان دینے والی تھی کہ پتھروں سے آواز آنے لگی "سائکی، بہن، مینار کے اس بازو کے شگاف میں سے جس پر کانٹی پڑی ہوئی ہے، زمین کے اندر ایک راستہ جاتا ہے، جَو کی روٹی کا ایک ایک ٹکڑا ہاتھ میں اور منہ میں دو سکے لیکر اس ناہموار راستہ سے گزر دریائے موت کے پاس پہنچنے کے بعد چیران ملے گا اور سکوں کی طرف لپکے گا، سکے اس کے حوالے کر دو، وہ تمکو جانے دیگا اس کے بعد فلاطون کے دروازے پر سربیرس بیٹھا ہوا ہوگا اس خونخوار کتے کو روٹی کا ایک ٹکڑا ڈالدو وہ تمہیں اندر جانے دیگا۔ اندر تخت پر ملکہ پرازرپائین جلوہ گر ہوگی، اس کے بعد تمہاری خواہش پر وہ اپنے حسن کا کچھ حصہ تمہیں دیگی اس کو ڈبہ میں بند کر کے اسی راستہ پر سربیرس کو روٹی کا دوسرا ٹکڑا اور چیران کو دوسرا سکہ دیکر واپس ہو جاؤ۔ ہاں ایک بات اور یاد رکھنے کے قابل ہے، چاہے کچھ بھی ہو جائے ڈبہ کھول کر نہ دیکھنا"

سائکی نے شکریہ ادا کیا اور حسب عمل بھی کیا، لیکن آخری بات بھول گئی چنانچہ واپس ہوتے وقت اس ہدایت کے خلاف ڈبہ کھول کر دیکھ لیا "محبت" سے جدا ہونے کے بعد اس کی فکریں بڑھ گئی تھیں اور اس کا بہت کچھ حسن ضائع ہو چکا تھا اس لئے پرازرپائین کے حسن سے استفادہ کرنے کی غرض سے اس نے ڈبہ کھول کر دیکھا، اف، ایک عجیب و غریب غیر مرئی شئے اس کے اندر سے نکلی اور اس پر محیط ہوگئی اور وہ

گہری نیند سوگئی، اگر محبت کا غم اچھا نہ ہوتا اور اس کا اس طرف سے گذر نہ ہوتا تو وہ کبھی جاگنے نہ پاتی۔ ایروس نے اس کو خوب ہلایا یہاں تک کہ وہ بیدار ہوگئی، اس کے بعد اس نے وہ ڈبہ دے کر اپنی ماں کے پاس روانہ کیا، وہ خود کوہ اولمپس کا رخ کیا اور زہرہ کے سامنے اس مقدمہ کو پیش کیا۔

خداؤں کے بادشاہ نے تمام حالات سنکر فیصلہ صادر کیا کہ سائکی غیر فانی رہے اور ایروس سے اس کی شادی کردی جائے۔

مریخ کو حکم ہوا کہ وہ جاکر فوراً سائکی کو لے آئے، ادھر مریخ سائکی کو لانے کے لئے روانہ ہوا اور ادھر تمام خداؤں کو دعوت دی گئی اس میں زہرہ نے اپنے ہاتھ سے اس فانی نازنین کو بقائے دوام کا پیالہ پلایا۔ سائکی نے اس سنہری پیالے سے کچھ چکھا اور فوراً اس کے دونوں بازو پر دو خوب صورت پر پھوٹ نکلے اور وہ بھی دوسرے دیوتاؤں کی طرح ایک دیوی بن گئی۔

اس کے بعد ایروس سے اس کی شادی ہوگئی، پھر کبھی خدائے محبت اس سے جدا نہ ہوا۔ اپالو نے اس تقریب میں خوب گایا، وینس کا غصہ اتر گیا اور اس مبارک و مسعود موقع پر وہ خود بھی رقص کرنے لگی۔

علامہ اقبال سے

از

جناب شیخ عبدالحمید صاحب شوق بی اے آنرز ہیڈ ماسٹر احمد پور دکن

اے کہ تیرے نام کا عالم میں اک آوازہ ہے
اے کہ تیری اک نوا سے عہدِ ماضی تازہ ہے
اے کہ تیرا ہر سخن اسلام کا شیرازہ ہے
تیرا ہر نکتہ رخِ ہندوستاں کا غازہ ہے
تو بھلا اردو سے اب کیوں ہو گیا بیزار ہے؟
سرد تو نے کر دیا اردو کا کیوں بازار ہے؟

تو زمینِ ہند میں سعدی کا ہم آواز ہے
تو غنی کا ہم سخن ہے بلبلِ شیراز ہے
صائب و عرفی کو تجھ پر آج فخر و ناز ہے
مثنوی تیری بھی رومی کا سا اک اعجاز ہے
گیسوئے اردو مگر منت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائی دلسوزیٔ پروانہ ہے

غرب کو تو نے پیامِ مشرق سرتاسر دیا
اور عجم کو بھی زبورِ زمزمہ پرور دیا
بیخودی کا اور خودی کا راز بھی حل کر دیا
اور مے عرفاں سے جامِ ایشیا بھی بھر دیا
مسلمِ ہندی مگر پھر آج تشنہ کام ہے
وقف اوروں کے لیے تیرا بھلا کیوں جام ہے

محفلِ ہندوستاں سے فارسی داں اٹھ گئے
اٹھ گئے سارے گرامی سے غزل خواں اٹھ گئے
اٹھ گیا آزاد اور اس کے سخنداں اٹھ گئے
غالب و بیدل سے خوش گفتار انساں اٹھ گئے
فارسی سے سرزمینِ ہند اب بیگانہ ہے
شمعِ اردو کا بنا ہر ایک اب پروانہ ہے

بد مذاقی سے غزل ہے اپنی دنیا میں ذلیل
اور کہلاتا ہے ہم میں ہر قصیدہ گو رذیل
نیچرل گو آپ ہے اپنی خرابی کی دلیل
کچھ نکلنے کی نہیں قعرِ مذلت سے سبیل
ہاں مگر تیرے قلم میں جو ہر اکسیر ہے
اک تری بانگِ درا صد نعرۂ تکبیر ہے

۱۔ حافظ رح ۲۔ مثنوی اسرار و رموز۔ ۳۔ خود حضرت اقبال کا شعر غالب کے متعلق بہ تصرف خفیف ۴۔ پیام مشرق ۵۔ زبور عجم ۶۔ رموز بیخودی ۷۔ اسرار خودی ۸۔ فلسفۂ ایران کے متعلق انگریزی تصنیف کی طرف اشارہ ہے ۹۔ مولوی غلام قادر گرامی ہوشیارپوری ۱۰۔ محمد حسین آزاد مرحوم کی تصنیف سخندان پارس۔ ۱۱۔ یعنی اردو کلیات اقبال

اے کہ تو اپنی غزل میں میر کا ہمراز ہے
اے کہ غالب کا تخیل تیرا ہم پرواز ہے

اے تری آواز گویا درد کی آواز ہے
اے انیس و آتش و سودا کو تجھ پہ ناز ہے

ہم سخن[۱۲] بندوں کو پھر کر دے خدا سے ایک بار
شکر شکوے[۱۳] کو کر حسن ادا سے ایک بار

لے کے پھر فریاد امت[۱۴] جا شہ لولاک تک
نعرۂ مستانہ[۱۵] مسلم سر افلاک تک

خضر[۱۶] کا پیغام پہنچا دے ہر اک ادراک تک
زندہ[۱۷] جاوید ہو جائیں خس و خاشاک تک

پھر طلوع دین[۱۸] احمد کی نوید تازہ دے
مسلم ہندی کو ذہن[۱۹] ہند کا آوازہ دے

ترجمانی پھر حقیقت[۲۰] کی کر اے شمع سخن
سوز[۲۱] سے پھر پھونک دے اے شمع محفل انجمن

پھر دلوں[۲۲] میں تازہ کر دے حق سے پیمان کہن
مسلم ہندی کی قومیت نہ ہو رہن وطن

قوم[۲۳] آوارہ کی پھر کر دے عناں سوئے حجاز
چھیڑ دے پھر زخمۂ اردو سے تو مسلم کا ساز

مسلم ہندی کو پھر تیرا ترانہ[۲۴] چاہیے
تیغ کے سایہ میں پلنے کا فسانہ چاہیے

کارواں بانگ درا سے پھر جگانا چاہیے
آنکھیں ملتے ہیں یہ اٹھنے کو بہانہ چاہیے

آگ[۲۵] پھر آتش نوائی سے وہی سینوں میں پھونک
دین کا پھر صور اٹھ کر سارے سینوں میں پھونک

نغمہ[۲۶] ہندی حجازی لے میں گا پھر ایک بار
جام ہندی میں حجازی مے پلا پھر ایک بار

شمع اور[۲۷] شاعر کی وہ باتیں سنا پھر ایک بار
اور بلال[۲۸] حبش کی صورت دکھا پھر ایک بار

نوجوانان[۲۹] علیگڑھ کو وہ پھر پیغام دے
مسلم بیچارہ کو امید صبح و شام دے

---

۱۲ جواب شکوہ میں ہے "شکر شکوہ کو کیا حسن ادا سے تو نے / ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تو نے" ۱۳ شکوہ اقبال کی ۱۴ فریاد امت مشہور نظم ہے جو انجمن حمایت الاسلام کے جلسے میں ابر گہربار کے عنوان سے پڑھی گئی تھی ۱۵ جواب شکوہ "اڑ کے آواز تری تا بہ فلک جا نہ سکی" ۱۶ خضر راہ ۱۷ خضر راہ میں زندگی پر بند ملاحظہ ہو ۱۸ طلوع اسلام کی طرف اشارہ ہے ۱۹ عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے ۲۰ حضرت اقبال کو عموماً ترجمان حقیقت کہا جاتا ہے ۲۱ شمع محفل ہو کہ تو جب سوز سے خالی رہا ۲۲ الست بربکم قالوا بلیٰ (آیۂ کریمہ) ۲۳ شکوے کے دو مصرعے ہیں "قوم آوارہ عناں تاب ہے پھر سوئے حجاز" اور "تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز" ۲۴ اقبال کا ترانہ بانگ درا ہے گویا ۲۵ شعلہ بن کر پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو (شمع و شاعر) ۲۶ نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری / یہ بادہ ہندی سہی تو کیا مے تو حجازی ہے مری ۲۷ شمع اور شاعر مشہور نظم اقبال ۲۸ بلال مشہور نظم ۲۹ طلباء علی گڑھ کے نام (بانگ درا ص ۱۱۹)

سرزمیں[۳۰] اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے — ذرہ ذرہ اس کا گویا فتراق انگیز ہے
رنگ قومیت یہاں پر انشقاق انگیز ہے — یعنے گلشن کی ہوا بالکل فراق انگیز ہے
کھینچ دے نشہ سے اپنے پھر کوئی تصویر درد[۳۱] — پھر ذرا سینوں میں بھر دے تو وہی تاثیر درد
پھر عجم سے ہند کو اقبال آجائے اگر — پھر مے الفت سے اپنے دل کو گرمائے اگر
پھر اسی محفل کو اپنی خون رلوائے اگر — پھر بت قومیت و ملک و وطن ڈھائے اگر
ہے توقع مسلم ہندی کو ہوش آجائے گا — کس میری میں نہیں تو سر بسر مٹ جائے گا
اندلس[۳۲] کی داستاں بھی کیسی درد انگیز ہے — قصر الحمرا[۳۳] کا منظر کیسا خون آمیز ہے
قرطبہ[۳۴] کا سانحہ بھی کیسا عبرت خیز ہے — یاد کر اقبال ان کی یاد حسرت خیز ہے
ہند میں اقبال آکر اندلس والوں کو رو — جس طرح سسلی[۳۵] کو رویا ہے ہاں والوں کو رو
مسلم ہندی کو بھی اب سخت مشکل پیش ہے[۳۶] — اندلس کا واقعہ اب ہند میں درپیش ہے
بلکہ میں تو یہ کہوں گا یاں یہ مشکل بیش ہے — یعنے دشمن یاں پہ اک بیگانہ اور اک خویش ہے
تو نے اے اقبال اپنی دستگیری گر نہ کی — چند دن میں قوم تیری یاد رکھ مٹ جائیگی
گر مسلماں مٹ گئے اردو نہ کیا مٹ جائیگی — یادگار ملت بیضہ نہ کیا مٹ جائے گی
گر ہوا ایسا تو دنیا سے حیا مٹ جائیگی — نعرہ اللہ اکبر کی صدا مٹ جائے گی
یاد رکھ یہ خون ہوگا تیری گردن پر سوار — ورنہ گر پیمان فاران کو یہاں پھر استوار
شوق کی یہ عرض گو اک صورت تہدید ہے — پر ستی جائیگی یہ مجھکو قوی امید ہے
گرچہ گستاخی یہ مبنی بات کی تمہید ہے — پر ضرورت کی بھی شدت قابل تجدید ہے
"راز اس آتش نوائی کا مرے سینہ میں دیکھ[۳۷] — شوق کی تصویر اپنے دل کے آئینہ میں دیکھ"

---

[۳۰] حضرت اقبال ہی کی ایک نظم کے اشعار جن میں تصرف خفیف آ گیا ہے۔ نظم کا نام تصویر درد (بانگ درا ص ۲۹) [۳۱] تصویر درد مشہور نظم اقبال [۳۲] اندلس جزیرہ نمائے آئیبریا یورپ کے جنوب مغرب میں جس میں اسپین و پرتگال کے ملک شامل ہیں اس جزیرہ نما پر ۸۰۰ سو برس سلطنت رہنے کے بعد پھر اس کا بالکل مسلمانوں کے لئے اجنبی ہو جانا عبرت انگیز ہے [۳۳] قصر الحمرا عہد اسلامی کی اسپین میں مشہور عمارت جو سنگ مرمر کی ہے [۳۴] قرطبہ موجودہ کارڈوا مسلمانوں کا دار السلطنت تھا [۳۵] جزیرہ صقلیہ پر نظم (بانگ درا ص ۱۴۱) [۳۶] اندلس میں فاتحان کسٹیلیا نصرانی اور عیسائی جو مسلمانوں کے مخالف تھے [۳۷] راز اس آتش نوائی کا مرے سینہ میں دیکھ، جلوہ تقدیر اپنے دل کے آئینہ میں دیکھ

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

از

جناب عزیز احمد صاحب

صبح کو وہ سو کر اٹھا تو آفتاب کی زرین کرنیں بچھونے پر پڑ رہی تھیں وہ اٹھا تو اس نے محسوس کیا کہ بے فکری اور فارغ البالی کی ایک مسرت انگیز لہر اس کے سارے جسم میں دوڑ گئی وہ اپنی قسمت پر خود رشک کرنے لگا۔

اور پھر دو گھنٹے کے بعد وہ موٹر میں گنگناتا ہوا اپنے ایک دوست سے ملنے جا رہا تھا، اس کی زبان سے کچھ نغمے نکل رہے تھے، جو اس کے چہرے کی مسرت کے ترجمان تھے۔

پھر وہ اپنے دوستوں کے ساتھ قہقہے لگا رہا تھا، باغ سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی، وہ ہنس رہا تھا، مذاق کر رہا تھا، اس کی زبان اس کی دلی مسرت کی ترجمان تھی، اس کے قہقہے اس کی بے فکر اور مسرت ناک زندگی کا ثبوت تھے، اس کے قہقہے سچے قہقہے تھے، اس کا تبسم "درد پنہاں کے چھپانے کے لئے اک پردہ" نہ تھا، بلکہ وہ حقیقی تبسم جو مسرت سے، بہجت سے، یا یوں کہئے کہ مسرت اور بہجت کی شراب سے مخمور ہونے کے بعد بے اختیار نمایاں ہو جاتا ہے۔

پھر اس کے بعد وہ مترنم الفاظ میں گنگنانے لگا۔

آمد سحرے ندا ز میخانۂ ما　　　　کاے رند خراباتی دیوانۂ ما

برخیز کہ پر کنیم پیمانہ ز مے　　　　زاں پیش کہ پر کنند پیمانۂ ما

اور اس کے دوست جھوم رہے تھے، غالباً بے فکری و فارغ البالی نے ان کو بھی دنیا کی خلش سے، اس کے آلام سے، اس کے مصائب سے بے پروا بنا رکھا تھا، زندگی ان کے لئے ایک خواب بے حقیقت نہ تھی، سراب نہ تھی، نہیں زندگی ان کے لئے سب کچھ تھی، ولولے امیدیں امنگیں اور آرزوئیں ان کو گھیرے ہوئے تھیں، ان کے لئے زندگی ایک قہقہہ تھی ـــــ ایک لافانی غیر مختتم قہقہہ

مگر وہ اِس حقیقت سے نا آشنا تھے کہ قہقہہ لگاتے لگاتے آنسو بھی نکل آتے ہیں۔

اور اِن سب میں ریاض ——— ہمارے ہیرو کا نام یہی ہے ——— خصوصیت سے زندگی کے آلام اور مصائب سے بے پروا تھا، اس کا مقولہ یہ شعر تھا:۔

اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات — ہنس کر گزار یا اِسے رو کر گزار دے

مگر وہ اِس حقیقت سے ناواقف تھا کہ شمع کی زندگی ایک غیر مختتم قہقہہ نہیں بلکہ گریۂ پیہم ہے۔ وہ ناواقف تھا کہ دنیا کی ہر شے بجائے خود ایک حزنیہ ہے، وہ ناواقف تھا کہ اُس کے دل میں بھی درد ہے، درد کی کسک ہے، وہ ناواقف تھا کہ اُس کی آنکھوں میں بھی آنسو ہیں۔

وہ ناواقف تھا، کیوں کہ حقیقت پر ایک ہلکا سا پردہ پڑا ہوا تھا، اور وہ ناواقف تھا کہ رنج و الم حقیقت ہے اور یہ ہلکا سا عارضی پردہ مسرت ہے، مگر وہ بیخود اور سرشار ہو کر قہقہے لگاتا رہا۔

پھر وہ ہنستا رہا، قہقہے لگاتا رہا اور یہاں تک ہنسا کہ ایک آنسو اس کی آنکھ سے ڈھلک کر گر پڑا۔

یہ مسرت کا آنسو تھا مگر اُس کو پہلی بار اِس المناک حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا کہ ع

آنسو بھی نکل آتے ہیں ہنستے ہنستے

مگر مسرت کی دوسری لہر اِس خیال کو بہا لے گئی۔

آفتاب، تمام انسانی شور و غل کو گھسیٹتا ہوا لے گیا اور فضا پر تاریکی چھا گئی، شہر کی روشنی کے سوا، صرف ایک چراغ جل رہا تھا، یہ چاند تھا، جس کی کرنیں آفتاب سے اکتساب نور کر کے زمین کو روشن کر رہی تھیں، صرف زمین ہی اِن سے منور نہیں ہو رہی تھی بلکہ یہ بہت سے دلوں میں بھی اُتر رہی تھیں۔ شاعروں کے دل میں، مصوّروں کے دل میں، نغمہ گروں کے دل میں یہ کرنیں نور کا دریا بہا رہی تھیں۔

اور ریاض بھی جو قہقہوں سے، دوستوں سے اور زندگی کی شورشوں سے محفوظ ہو کر واپس آچکا تھا چاند کی ان نورانی کرنوں سے لذت اندوز ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

چاند بادلوں میں چھپ گیا تھا، ریاض بچھونے پر جا لیٹا، مگر نیند نہیں آئی، کروٹیں بدلتا رہا۔

کیوں، کیا یہ وہی ریاض تھا جو اب سے دو گھنٹے پیشتر قہقہے لگا رہا تھا جو حلقہ احباب میں ہنس رہا تھا، مذاق کر رہا تھا؟ اس وقت کیوں اس کا دل دھڑک رہا تھا؟ اس وقت کیوں اسے وہ سرور حاصل نہ تھا؟ کیا وجہ تھی کہ وہ خاموش تھا؟ کوئی خاص واقعہ پیش نہ آیا تھا، کوئی ایسی بات نہ ہوئی تھی کہ اس کے قلب پر ناگوار اثر ڈالتی۔

مگر اِس کا کیا علاج کہ خوشی کی انتہا، غم کی ابتدا ہوتی ہے۔

اب وہ پہلی بار اختلاج قلب سے، غم کے خفیف سے احساس سے، خوشی کی انتہا سے، روشناس ہوا، اس نے ایک شیریں لرزش محسوس کی، یہ غم کا شیریں احساس تھا، جو مسرت اور بہجت کے بعد اُسے محسوس ہو رہا تھا، یہ آنسو تھے، جن میں وہ قہقہوں کے بعد ایک خاص لذت محسوس کر رہا تھا۔

پھر اس نے دن بھر کی مسرت بھری زندگی پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور حسرت آمیز لہجے میں کہا:-

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

اور پھر وہ سو گیا، اب تک اس کا دل دھڑک رہا تھا، اُس کے آنسو خشک نہ ہوئے تھے، اور وہ سوتے میں یہ سُن رہا تھا کہ

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

مُشاہَدات

از

جناب سید علی اختر صاحب اختؔر

تجھ کو ہے، اِس میں تلاشِ جلوۂ تسکینِ روح
بیخبر، دنیا ہے اک ہنگامۂ زار اضطراب

اِس خلا میں گم ہوئے ہیں، آہ کتنے کارواں
جن کی گردِ راہ ہے، اب تک رہینِ پیچ و تاب

یہ لطائف، یہ مناظر، یہ بہشتِ آب و رنگ
جلوۂ آزادِ طفلی، خندۂ حسنِ شباب

جن کے سائے میں نمو پاتی ہے تیری آرزو
صبح کے آغوش میں جیسے شعاعِ آفتاب

زندگانی موت کا احساس کھو سکتی نہیں
اِن سے تیری روح کی تسکین ہو سکتی نہیں

جرمن جامعات

از

جناب ابوالمحامد محمد بشارت علی صاحب قریشی (کلیہ عثمانیہ)

تمہید جامعاتِ جرمنی اپنی تعلیمی فضا اور قدامت کے اعتبار سے چار دانگ عالم میں مشہور ہیں۔ تقریباً پانسو سال کے عرصہ سے اہل جرمنی نشر و اشاعت علوم، تحقیقات علمی کا کام انجام دیرہے ہیں باوجود تعلیمی انہماک کے وہ اقتصادی، سیاسی، سماجی، مالی اور دوسرے لوازم میں جو ایک متمدن قوم کے لئے ضروری ہیں، ممالک یورپ میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ سائنس کی ترقی میں جوان کی حیثیت ہے اِس کے متعلق یہاں کچھ لکھنا بے سود ہے۔ بہرحال اہل جرمنی کو قدیم سے اور موجودہ دَورِ مادیت میں بھی یہ فخر حاصل ہے کہ وہ بالواسطہ یابلاواسطہ اپنے ملک و قوم اور انسانی دنیا کی بہتری کے لئے اہم ترین خدمات انجام دے رہے ہیں جس کا اعتراف نہ کرنا اخلاقی جرم ہے۔ مسلمان اور اسلامی دنیا خاص طور پر جرمن قوم کی رہین منت ہے کہ اس نے اسلام سے متعلق ممتاز خدمات انجام دیں عربی زبان اور ادب، تاریخ اسلام اور اسلام سے متعلق وہ چیزیں جو بدبخت ہندوستان اور عام اسلامی دنیا کی نظر سے مستتر ہیں ان کے احیا اور تجدید کے لئے ممالک یورپ سے زیادہ اِس کا قدم آگے بڑھا ہوا ہے۔ یہاں کی جامعات کے درس و تدریس کے اُصول طالب علم کو کامل القویٰ بنا کر علمی دنیا کے سامنے پیش کرنا ہی نہیں چاہتے بلکہ وہ "کتابی کیڑا" بنانے سے زیادہ ایک عامل انسان بنا کر پیش کرتے ہیں تاکہ علمی دنیا کے لئے وہ اہل اور سچے کارپرداز ثابت ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں طلبہ بکثرت اقطاعِ عالم سے آتے اور متاعِ علم سے متمتع ہوتے ہیں۔ جرمنی کی تعلیم اور تعلیمی فضا ایسی عمدہ اور خوشگوار ہے کہ وہاں کا طالب علم آزاد خیال، روشن دماغ اور ایک نایاب فرد بنکر نکلتا ہے۔ ہندوستان کی فضا اور خود اس کے تعلیمی اُصول طالب علم کے لئے وہی نوعیت رکھتے ہیں جو بقول حالی ع

ہے سقر موری کے کیڑے کے لئے باغِ ارم

تعصّب اور قومی منافرت جبلّتِ انسانی میں داخل ہیں اِس لئے متمدن ممالک ان سے آزاد نہیں

رہ سکتے مگر یں جرمن قوم کے متعلق یہ وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہونکہ اُنھوں نے مذہبی منافرت کے باوجود جس فراخدلی کے ساتھ ہندوستانیوں اور غیر اقوام کو اپنے محروسہ علاقہ میں جگہ دی ہے وہ تاریخ عالم کے لئے ایک بے نظیر مثال ہے۔ یہ ایک علحدہ بات ہے کہ برطانیہ عظمیٰ کے قطعات یا ہندوستان یں جرمنی کے تعلیم یافتہ کی قدر نہ ہو مگر اقطاع عالم نے جرمن پیداوار کا جس فراخدلی کے ساتھ خیر مقدم کیا ہے اسکا بین ثبوت یہ ہے کہ آج تقریباً ایک لاکھ آدمی دنیا کے ہر حصے یں پھیلے ہوے اپنی بہترین خدمات کے تحت شہرت تامہ حاصل کر رہے ہیں۔ جنگ عظیم کے بُرے اثرات کے باعث جرمن جامعات کی ترقی حالتِ جمود یں آگئی تھی مگر ان علمی درسگاہوں کے سپوتوں نے دامے، درمے، سخنے، امداد سے دریغ نہ کر کے ان کی ساکھ اور قدیمی عظمت کو سنبھال لیا۔ اِس طریقہ سے جرمن جامعات کو ایک نیا حیاتی پہلو حاصل ہوا اور اب پہلے سے زیادہ سرسبز اور کامیاب صورت یں اقطاع عالم کی دوسری جامعات کے دوش بدوش بلکہ ایک حد تک آگے بڑھی ہوئی ہیں۔

جرمنی یں طلبہ کی خاص طور پر معاونت کی جاتی ہے چنانچہ وہاں بیسیوں انجمنیں قائم ہیں جو طلبہ کی سہولت کے لئے ہر قسم کی خدمات کے انجام دینے میں تساہل نہیں کرتیں۔ ایک طرف یہ انجمن اُستاد اور شاگرد کو قریب سے قریب تر کرتی ہیں تو دوسری طرف جرمنوں سے خوشگوار تعلقات قایم کرتی ہیں۔ اِس سلسلہ یں اگر یہ کہا جائے کہ جرمن جامعات اپنے ملک و قوم کی صوری و معنوی خصوصیات سے غیر ممالک کے باشندوں اور طلبہ کو روشناس کرتی ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ اِن انجمنوں کے معاونین طلبہ، اساتذہ (پروفیسر) اور حامیان تعلیم ہوا کرتے ہیں۔ یہ انجمنیں بروقت ہر قسم کی امداد کے لئے تیار رہتی ہیں۔ ضرورت صرف اِس بات کی ہے کہ اِن سے اِعانت طلب کی جائے۔

جرمن جامعات کی تعلیمی خصوصیات

تعلیم کا مقصد جرمن جامعات کا نظام اور اُصول تعلیم دنیا کی دوسری جامعات سے بالکل مغایر ہے یہاں کی آزاد فضا میں وہی طلبہ بارآور اور قوتِ لایموت حاصل کر سکتے ہیں جو تعلیم کو مندرجہ طریقۂ ثلاثہ کے تحت حاصل کرنا چاہیں:

۱- سائنٹفک طریقہ کار۔

۲- آزاد اور بے قید درس و تدریس۔

۳- زندگی کے مسائل کے متعلق ذمہ داری۔

سائنٹفک تعلیم و تربیت جرمنی میں ہر علم و فن کی تعلیم و تربیت کے لئے عام طور پر سائنٹفک طریقہ کو زیادہ برتا جاتا ہے۔ طلبہ مجبور نہیں کہ کسی قاعدے کے تحت مخصوص مضامین یا مخصوص فن کو اپنی طبیعت یا ذوق سلیم کے خلاف منتخب کریں۔ ان کو کلیتہً یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ انتخاب مضامین یا علمی شعبوں میں سے وہی مضمون یا شعبہ اختیار کریں جن سے ان کو فطری مناسبت ہے۔ جسقدر قاعدے منضبط ہیں ان میں ہر قسم کا استحقاق مردوں کے دوش بدوش "صنف نازک" کو بھی حاصل ہے۔ جامعہ میں داخلہ اسی وقت مل سکتا ہے جب کہ طالب علم جرمن جامعات سے میٹرک کامیاب کرے۔ عموماً یہاں میٹرک کا نصاب نو سالہ ہوتا ہے۔ بیرونی طلبہ کو جامعہ میں شریک ہونے کے لئے اسی معیار کا صداقت نامہ پیش کرنا پڑتا ہے۔

میقات حاضری کا التزام جرمن جامعات میں سال یا دن پر مبنی نہیں جن کو وہاں کی خاص صورت میں سمسٹر کہا جاتا ہے۔ گرما کی میقات تین ماہ کی ہوتی ہے (مئی — جولائی) اور سرما کی ۴ ماہ کی (نومبر — فبروری) تعلیم کا آغاز طالب علم کے اختیار تمیزی پر مبنی ہے کہ وہ گرما کی میقات سے شروع کرے یا سرما کی میقات سے۔ ہر دو صورتوں میں داخلہ آسانی سے ممکن ہے۔ مگر مناسب یہ ہوگا کہ طلبہ اپنی تعلیم کا آغاز سرما کی میقات سے شروع کریں کیونکہ درسی خطبات اسی میقات سے شروع ہوتے ہیں۔ ان درسی خطبات کو سال بھر کی مقدار پر تقسیم کرکے گرما کی طویل تعطیلات کے بعد کالج کھلنے پر بھی جاری رکھا جاتا ہے۔ داخلہ کے متعلق ضروری امور طے کر لینے یا کسی مخصوص جامعہ میں جگہ محفوظ کرا لینے کے بعد ابتدا یا وسط ماہ جولائی میں طالب علم جرمنی پہنچکر بھی اپنے خیال میں ردوبدل کر سکتے ہیں۔ موقع اور محل کے لحاظ سے موزوں تو یہی ہے کہ وہ جرمنی پہنچکر جامعہ کا انتخاب اور مقام درس معین کر لیں۔ عہدہ داران جامعہ سے تعرف حاصل کرکے شرکت کی درخواست پیش کریں۔ اگست سے

SEMESTER ۱

گرما کی تعطیلیں شروع ہوتی ہیں اور اکتوبر تک ان کا سلسلہ جاری رہتا ہے اس لئے ان فرصت کے لمحات کو جرمن زبان کے سیکھنے میں صرف کیا جائے تو داخلہ میں مزید سہولت اور تعلیم کے جلد ختم کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

جرمن زبان کی خواندگی اگرچہ ہندوستان اور بیرونی ممالک میں جرمن زبان کے حاصل کرنے کے لئے سہولتیں مہیا نہیں ہیں تاہم جرمن زبان کے ابتدائی رسالے مثلاً "اوٹو[1] جرمن گفتگو کے قواعد" مطبوعہ جولیس گروس ہیڈلبرگ[2] کو خانگی طور پر زیر مطالعہ رکھا جائے تو زبان کے سمجھنے اور بولنے میں ایک گونہ سہولت حاصل ہو سکتی ہے جس کی وضاحت انگریزی زبان میں کی گئی ہے۔ اگر معمولی طور پر پڑھنا سیکھنا منظور ہے تو "جرمن ریڈنگ سمپلی فائڈ"[3] ہیگو[4] کی جرمن انگلش، بلنگال[5] کا سلسلہ اور Lese buch fur studierende auslander وغیرہ کی معاونت سے کافی مہارت حاصل کی جا سکتی ہے۔ جامعہ عثمانیہ میں ڈاکٹر جعفر حسن پی۔ ایچ۔ ڈی کے زیر نگرانی خاص طور پر اس زبان میں درس دیئے جاتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ وہ طلبہ جو کالج سے تعلق نہیں وہ بھی صدر کلیہ کی اجازت سے خاص طور پر ان دروس سے متمتع ہو سکیں۔

یہ تمام کتابیں جن کا اوپر ذکر ہوا ہے مشرح اور بامعنی ہیں مزید سہولت کے لئے کاسل[6] کی جرمن اور انگریزی، انگریزی اور جرمن لغت بے حد مدد دے سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں اگر کالن[7] کی جیبی لغت خرید لی جائے تو آسانی سے کام نکلنے کے علاوہ ہر وقت کی مصاحب اور معاون رہیگی۔

جرمنی میں اگر تعطیلات کے دوران میں پہنچ جائیں تو مندرجہ ذیل جامعات برلن[8]، بان[9]، ہیمبرگ[10]، ہیڈلبرگ، لیپزک۔ میونخ وغیرہ میں جرمن کلچر، تاریخ ادبیات وغیرہ کے علاوہ خود جرمن زبان کے متعلق درسی

---

[1] Otto's German Conversation - Grammer [2] Yulius Groos in Heide-lberg [3] Higo [4] German reading Simplified [5] German-English Blingual series — ... — [6] Cassells' German-English - English Grammer dictionary [7] Collins German English dictionary [8] Berlin [9] Bonn [10] Hamburg

جماعتیں مقرر کی جاتی ہیں۔ خاص شعبہ جات مثلاً طب، معاشیات، سیاست مدن، موسیقی وغیرہ میں بھی تعطیلات کے مواقع پر میونخ، ہم برگ وغیرہ میں درسی جماعتیں مقرر کی جاتی ہیں۔ ان کے متعلق مفصل معلومات ـ "جرمنی کا نصاب دوران تعطیل"¹ سے جو ہر سال شایع ہوتا ہے حاصل ہو سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ پیشہ ور لوگ اور وہ طلبہ جو انگریزی زبان جانتے ہیں بغیر کسی معاوضہ کے زبان کے سکھانے میں مدد دیتے ہیں۔ زبان سکھانے کے علاوہ ایک خاص انجمن "Austan sch" ہے جو اپنی خدمات کو بلا معاوضہ انجام دیتی ہے مزید برآں بعض طلبہ ایسے بھی ملسکتے ہیں جن سے جرمن زبان اس طریقہ سے سیکھی جا سکتی ہے کہ ان کو انگریزی زبان سکھائی جائے۔ انجمن اور خود جامعات کی جانب سے اطلاع نامے اور بعض مواقع پر مقامی اخبارات میں ان کو شایع کیا جاتا ہے۔ تعطیلات کے علاوہ درس کے زمانے میں بھی اجنبیوں کے لئے یہ سہولت ہے کہ وہ زبان سیکھ سکیں۔ طلبہ جامعات میں بغیر زبان سیکھے اس شرط کے ساتھ شریک کئے جاتے ہیں کہ وہ ایک مدت مقررہ میں اس قابل ہو جائیں کہ جماعت کا ساتھ دے سکیں۔

تعلیمی سہولت کے علاوہ تعطیلات کے مواقع پر جرمن ممالک کی سیاحت، پیدل سفر اور سماجی معلومات کے متعلق اساتذہ اور مؤدب خاص طور پر معاونت کرتے ہیں۔ جرمنی کے قدیم شہروں میں ایک قسم کی جاذبیت ہے، وہاں کے مناظر اور نشیب و فراز تسخیر کا حکم رکھتے ہیں۔ بلاد الجامعہ خاص طور پر طلبہ کے لئے بے حد دلکش ہیں۔ اخراجات سفر اس وجہ سے زیادہ عائد نہیں ہوتے کہ وہاں کے عہدہ داران جامعہ طلبہ کے لئے ہر طرح کی سہولت مہیا کرتے ہیں، وہاں کے خاص ہوٹل اور دار الفرح نہایت فراخ دلی سے طلبہ کی رہایش اور خورونوش کا انتظام برعایت کرتے ہیں۔ اگر اجنبی طلبہ کی ایک جماعت سیاحت کے لئے تیار ہو جائے اور قبل از قبل اس کی اطلاع انجمن Akademische auslandl Stelle کو مل جائے تو جرمن طلبہ کی ایک جماعت ان کی رہبری کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔

نصاب تعلیم

کسی خاص شئے کے علاوہ شعبہ جات کے انتخاب میں آزادی ہے مگر لبرل ایجوکیشن کے تحت کسی مخصوص شعبہ کے علاوہ فلسفہ، تاریخ اور ادب میں بھی ایک یا دو لکچر ہو جاتے ہیں

---

1. Vacation course in Germany

عام طور پر شعبہ جات علم کو یہاں کی جامعات میں چار بڑے شعبوں کے تحت منقسم کیا گیا ہے:۔
فلسفہ، مذہبیات، قانون اور طب اور یہی طریقہ تمام جگہ رائج ہے۔ بعض جامعات میں عمرانیات اور معاشیات کو قایم رکھ کر ایک پانچواں شعبہ قرار دیا گیا ہے۔ سائنس کی تعلیم جامعہ سے متعلق خاص اداروں میں ہوتی ہے جس کے تحت تمام شعبہ جات سائنس اور فنون شامل ہیں۔ اسی وجہ سے فنون سے متعلق جنگلات، زراعت، صنعت وحرفت، تجارت، علاج حیوانات وغیرہ کے ادارے فرداً فرداً قایم ہو گئے ہیں۔ ان اداروں میں بھی کسی خاص شعبہ کو بہ نسبت فنی یا اکتسابی تعلیم کے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے تاکہ طالب علم کسی ایک مخصوص شاخ میں ید طولیٰ اور کمال حاصل کرے۔ شعبہ جات علوم وفنون کے لئے ایک مدت معین ہے اور اقل مدت بعض اہم شعبہ جات کی ذیل میں سپرد قرطاس کی جاتی ہے:

نمبر شمار	نصاب تعلیم	مدت بحیثیت میقات	اندازہ اخراجات میقاتی
۱	۲	۳	۴
۱	فن تعمیرات	۷ – ۸	۱۸۰ — ۲۰۰ مارک
۲	میکانیکل انجینیرنگ	۸	۱۶۰ — ۱۸۰ مارک
۳	سیول انجینیرنگ	۸	۱۸۰ — ۲۰۰ مارک
۴	الکٹرک انجینیرنگ	۸	۱۶۰ — ۱۷۰ مارک
۵	فلاسفی (فنون)	۸	۱۱۰ — ۱۲۰ مارک
۶	فلاسفی (سائنس)	۸	۱۷۰ — ۲۰۰ مارک
۷	طب	۵	۱۹۰ — ۲۲۰ مارک
۸	پولٹیکل اکانمی	۶ — ۸	۱۱۰ ۱۲۰ مارک
۹	جنگلات	۸	۱۴۰ — ۱۵۰ مارک
۱۰	معدنیات	۸	۱۷۰ — ۱۹۰ مارک
۱۱	زراعت	۶	۱۴۰ — ۱۵۰ مارک

تعلیمی آزادی

تعلیم کے اختتام یا کسی ایک شاخ میں کمال حاصل کرنے کے لئے مداخلت نہ ہونی چاہئیے - اسی خیال کے تحت جرمن جامعات میں یہ خاص خصوصیت ہے کہ وہ طلبہ پر بیجا قیود عاید کرنا نہیں چاہتیں - خارجی طور پر جس قسم سے وہ آزاد ہیں اسی طریقہ سے داخلی طور پر بھی انہیں آزادی حاصل ہے -

مختلف جامعات کی شرکت

ہر ایک طالب علم کلیتہً آزاد ہے کہ وہ جس جامعہ میں چاہے شریک ہو یا اس سے قطع تعلق کرلے - مختلف جامعات میں تعلیم حاصل کرنے سے علمی تجارب زیادہ حاصل ہوتے ہیں کیوں کہ کمال کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہر قسم کے اساتذہ اور ماہرین فن سے تبادلۂ خیالات اور افادہ علمی حاصل ہو - یہ قطعاً ناممکن ہے کہ ماہرین کمال علما اور ادبا ایک ہی جگہ جمع ہو جائیں - یہ مختلف جگہ منتشر ہو کر رہتے ہیں - جہاں کسی چیز میں کمال حاصل کرنے کے لئے محنت جانکاہ اور درسی تعلیم کی ضرورت ہے وہاں اہل کمال کی صحبت سے براہ راست فائدہ اُٹھانا اعلیٰ کامیابی کی بہترین دلیل ہے - کثیر تعطیلات جو جامعات یورپ میں ہوتی ہیں اُن کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ ایک طرف طالب علم لذائذ دنیا سے محروم نہ رہے - دوسری طرف بلاد جامعات کی سیر کر کے وہاں کے باکمال اساتذہ سے ملے اور اپنے مخصوص شعبہ کے متعلق ان سے تبادلۂ خیالات اور گفت و شنید کے ذریعہ ان کے دیرینہ تجارب سے فایدہ اُٹھائے - یہ سہولت کسی خاص اُصول کے تحت ملحوظ نہیں رکھی گئی ہے بلکہ اس کا مقصد طالب علم کو ایک مکمل طالب علم اور رستیزہ گاہ دنیا کے لئے ایک زبردست قہرمان بنانا ہے - دوران تعلیم میں طالب علم آسانی کے ساتھ ایک جامعہ سے دوسری جامعہ میں منتقل ہو سکتا ہے اور یہ ردّوبدل کا طریقہ جرمن جامعات کی حد تک محدود ہی نہیں بلکہ طالب علم دوسری غیر ملکی جامعات مثلاً وائنا گراز[1] جو اسٹریا کی جامعات میں منتقل ہو سکتا ہے - چنانچہ ایک صاحب جو حال ہی میں جنگلات کی تعلیم کے لئے جرمنی گئے ہوئے تھے - ان کی خواہش کی بنا پر دو میقات تک انہیں اسٹریا میں تعلیم پانے کی اجازت دی گئی ہے -

طریقہ تعلیم

ہندوستان میں اعلیٰ ڈگریوں کے امتحان کی شرکت میں تعلیم سے زیادہ حاضری کو ملحوظ رکھا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہاں کا نصاب تعلیم اتنا غیر مکمل اور پھر عمر کے بیشتر حصہ پر حاوی ہے کہ طالب علم جامعات

---

[1] Vienna Graz

کی تعلیم ختم کرتے کرتے ایک پیر کہن سال ہوجاتا ہے۔ صحت خراب، دماغ خراب، بصارت خراب
بہر حال میدان عمل میں جب وہ قدم رکھتا ہے تو اس کی نوعیت ایک اپاہج کی سی ہوتی ہے جس میں نہ تو سکت
ہوتی ہے اور نہ جس فضا سے نکل کر آیا ہے وہ عالم تمثیلی کی ہم آہنگ ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی ہستی
مجسم یاس کی سی ہوتی ہے۔ ناشران تعلیم ہمدرد نہیں ہوتے بے چارے طلبہ کے لئے بلائے بے درماں
ہوتے ہیں۔ کیا یہ ظلم نہیں کہ ایک طالب علم باوجود جماعت میں تعلیمی حالت اچھی ہونے کے محض حاضری کی
بنا پر امتحان کی شرکت سے روک دیا جائے۔ یہاں ہم یہ عرض کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ موجودہ نصاب تعلیم یا ناشران تعلیم پر
خوردہ گیری کرنا ہمارا مطمع نظر نہیں ہے یہ چند جملے معترضہ تھے جو "مبنی بر صداقت" ہونے کے لحاظ سے بے دھڑک نکل گئے۔

جرمن جامعات میں حاضری کی سختی نہیں حتیٰ کہ حاضری کی کوئی کتاب یا داخلہ تک نہیں ہوتا۔ یہ طالب علم
کے اختیار تمیزی پر منحصر ہے کہ وہ کلیہ کے درس میں شریک ہو یا نہ ہو۔

جرمن جامعات میں درس تدریس کا طریقہ جو رائج ہے وہ لکچر، مشق اور خانگی مطالعہ پر مشتمل ہے۔
لکچر کے ذریعے اپنے اپنے شعبہ کے متعلقہ اساتذہ موضوع درس سے بحث مباحثہ کرتے ہیں۔ بعض وقت
وہ مضمون کے کسی عمومی پہلو یا کسی خاص پہلو کو لے کر عالمانہ نقطۂ نظر سے شرح و بسط کے ساتھ روشنی
ڈالتے ہیں اور یہ لکچر ان کے تجارب یا ان کے نتائج پر مبنی ہوتے ہیں جو ان کی تحقیقات کا جز لاینفک ہوتے ہیں
مشق کے طور پر معلّم و متعلّم دونوں آپس میں بحث کرتے ہیں اور ہر طالب علم اپنے خاص نظریہ یا مطمع نظر کے
تحت بحث و مباحثہ میں آزاد ہے، ان کی جدت خیال کی تعریف یا غلطی ہوں تو ان کی اصلاح کی جاتی ہے۔
مختصر یہ کہ ان کو آزاد خیالی کا اہل بنایا جاتا ہے۔ اس بحث و مباحثہ میں کچھ دیر کے لئے استاد استاد نہیں رہتا
بلکہ ایک رفیق ہوتا ہے جو طلبہ کے دلائل کو سنتا، غور کرتا اور ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ کاش ہندوستان
میں بھی یہی طریقہ رائج ہوتا تو طلبہ اور اساتذہ میں جو منافرت ہے وہ مٹ کر طلبہ اور شاگرد کے درمیان خلوص
بڑھ جاتا۔ یہ طریقہ خاص طور پر کتابی اور فنی طلبہ کے لئے زیادہ مفید اور متاع معلومات کا بہترین ذریعہ ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور طریقہ جس کو سیمنرس Seminars کہتے ہیں۔ طالب علم کے
لئے نہایت عمدہ اور فایدہ سے خالی نہیں۔ اس قاعدے کے تحت کسی تحقیقی کام میں تلامذہ متحدہ طور پر کام
کرتے ہیں۔ حکیم العلوم کی ڈگری کے لئے اس قسم کے طریقے سے زیادہ مدد ملسکتی ہے۔ اساتذہ کے علاوہ اس قسم کے

ڈاکٹریٹ Doctorate

خاص ادارے اور انجمنیں قایم ہیں جس میں کئی تشنگانِ علم علمی اور سائنس کی تحقیقات کو کسی ماہرِ فن کے زیرِ نگرانی جاری رکھتے ہیں۔ بعض اوقات یہ طالب علموں کی جماعت اپنی شخصی تحقیقات میں مشغول ہوتی ہے یا کسی ادارے کی جانب سے کسی خاص مسئلہ کے تحت تحقیقاتی کام کو انجام دیتی ہے۔ دنیا میں جرمن قوم ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ اُستاد و شاگرد کے درمیان نہایت گہرے تعلقات ہوتے ہیں اور جب دونوں کے درمیان حجابِ تکلف باقی نہیں رہتا تو علمی زنجیروں کی کڑیاں ایک دوسرے سے متواصل ہو جاتی ہیں۔

کالج کی تعلیم سے بڑھ کر شخصی اجتہاد اور خانگی مطالعہ زیادہ مفید چیز ہے۔ اس لئے کلیہ کی تعلیم ایک جزئی یا محض طالبانِ علم کے لئے رہبری کا کام دیتی ہیں ورنہ کامیابی کا سارا انحصار شخصی اور خانگی تعلیم پر مبنی ہے۔ اس لئے جرمن جامعات اس کو زیادہ اہمیت دیتی ہیں۔ اس سلسلہ میں جامعات میں کوئی خاص نصاب یا کوئی خاص درسی کتاب مقرر نہیں جس کو پڑھ لینے یا ازبر کر لینے سے کامیابی حاصل ہو جائے اپنے خاص شعبہ میں جو کتابیں ممد و معاون ہو سکتی ہیں ان کا مطالعہ کافی ہے۔ کتابوں کے انتخاب، ان کے پڑھنے کے لئے عام آزادی حاصل ہے۔ تحقیقات کے لئے نصابی کتابیں ایسی ہی بیکار ہیں جیسی اشتہا کے مٹ جانے کے بعد کھانا۔ اگر طالبِ علم کسی خاص نصاب کو پڑھ لے تو پھر اُس کو یہ تحریص نہیں ہوتی کہ دوسری کتابیں پڑھے۔ جامعات کے ام۔ اے کے طلبہ بھی عام معلومات اور درسی کتابوں کے علاوہ فنی اور اپنے خاص شعبے کے شہ کاروں سے ناواقف ہوتے ہیں ان کو اجتہاد اور اپنے بل بوتے پر کھڑا ہونا نہیں آتا۔ اس لئے امتحان کی تیاری میں یہ بھی چھوٹی جماعتوں کی طرح اساتذہ کی مدد اور نوٹس کے محتاج رہتے ہیں۔ جتنے عرصے میں درسی کتابیں پڑھی جا سکتی ہیں اگر نصاب کی پابندی نہ ہو تو اس سے بڑھ کر کتابیں ہماری نظر سے گذر جائیں گی۔ یہ ہماری بدبختی ہے کہ ہم ایک محدود دایرہ میں قید کر دئے جاتے ہیں طبیعت اگر چاہے بھی تو درسی کتابوں کو عبور کر نیکے بعد ہمیں کہاں موقع ہے کہ دوسری کتابیں پڑھیں۔

امتحان | طالب علم کے لئے امتحان ہی تو تخریب جا سے کم نہیں۔ ہندوستان میں امتحان تحصیل علم کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے حالانکہ امتحان حقیقت میں صحیح معیارِ قابلیت نہیں ہو سکتا۔ طلبہ کی جان اس امتحان کے تحت مخمصے میں ہے ایک دو امتحان ہوں تو خیر برداشت بھی کر لیا جا سکتا ہے۔ سہ ماہی امتحان، شش ماہی امتحان، ترقی کا امتحان، میعاقی امتحان، غرض دنیوی مصائب کے لاتناہی سلسلے کی مانند

جامعاتی دنیا کے باشندوں کے پیچھے یہ بلا لگی ہوئی ہے۔ اگر ہم غلطی پر نہ ہوں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ امتحان طالب علم کو پست، اُس کی ترقی کو مسدود، اُس کے ولولے، ذہنیت اور آزادی کے لئے سم قاتل ہے۔ جرمنی میں یہ چیزیں سرے سے مفقود ہیں۔ تمام شعبہ جات کے برخلاف صرف طب، کیمیا، اور صنعت و حرفت کے طلبہ کو اپنی کل عمر تعلیمی میں پہلے زینے پر ایک ابتدائی امتحان دینا پڑتا ہے۔ کاش ہندوستانی جامعات اس کی اتباع کرتے تو زیادہ موزوں تھا۔ اس سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ مقررہ میعاد کے بعد بی۔ اے کی ڈگری یا اور کوئی ڈگری بغیر سرکاری امتحان کے دے دی جائے۔ اس سے ہمارا یہ مقصد ہے کہ کلیہ کے طلبہ میقاتی اور ششماہی امتحانات سے بری کر دئے جائیں اور صرف ایک ڈگری کا امتحان ہو جس کی کامیابی پر طیلسان عطا کیا جائے۔ ہماری بدبختی کی اس سے بڑھکر کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ جامعات کے ارباب حل وعقد ہماری قابلیت۔ اسی میں سمجھتے ہیں کہ ہم درسی کتابوں پر کہاں تک قدرت رکھتے ہیں۔ دوسروں کے چبائے ہوئے نوالے۔ نگل بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ ہماری جدت اور اختراع فایقہ اور ذاتی قابلیت کو کون دیکھتا ہے اگر کوئی طالب علم ذاتی اعتبار سے کتنا ہی قابل کیوں نہ ہو مگر جب وہ طوطے کی طرح درسی کتابوں کا اعادہ نہیں کر سکتا تو وہ امتحان میں ناکامیاب کر دیا جاتا ہے۔ بہر حال یہ ہماری بدبختی ہے کہ ہم کو آزاد خیال بنا کر ہماری اپج کو ترقی سے روکا جاتا ہے۔ - - - - - - - - - - -

- -

- -

جب کوئی قوم حالت جمود اور حضیض نکبت میں پڑ جاتی ہے تو اس کا غلامانہ روش کو اختیار کرنا ایک ضروری نتیجہ ہے اور جو قوم اس پر مسلط ہوتی ہے وہ ایسی روش اختیار کرتی ہے جو ظاہر میں تو رفاہ اور فایدہ متصور ہوتی ہے مگر اس کا داخلی پہلو یہ ہوتا ہے کہ قیود اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا جائے۔ اسی مذموم فضا کا نتیجہ ہے کہ ہم کو ہماری تعلیم میں بھی غلامانہ اثرات مرتسم کرنے کو زیادہ ترجیح دی گئی ہے۔ غلامی اور بدبختی کے بادل گھرے ہوئے ہونے کی وجہ معائب اور معنوی نقصانات بھی نظر نہیں آتے۔ جرمن جامعات میں طالب علم چبائے ہوئے لقمے کے حصول کے ذریعہ کامیاب نہیں ہو سکتا بلکہ اس کی کامیابی کا سارا انحصار خود اس کے ذاتی معلومات، شخصی تجاربات اور انفرادی علمیت پر مبنی ہے۔ مدت تعلیم جہاں تک ہو سکے کم مقرر کی جاتی ہے اور پھر اختتامی امتحان ختم تعلیم ہی کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ امتحان کے لئے کسی خصوصی

زمانے یا وقت تک ٹھہرنا نہیں پڑتا۔ ہندوستان کے نصاب تعلیم میں جہاں بیسیوں معائب ہیں وہاں وقتی اور زمانی تحدید بھی طالب علم کے لئے ایک بدترین نقصان کا مترادف ہے جس کی تلافی مافات ممکن نہیں یہاں لحاظ عمر اور اوقات کی کیا قدر ہے۔ کسی کی عمر ضایع ہوتی ہے تو بلا سے مگر یہ اپنے اصول اور قاعدے سے نہیں ٹلیں گے۔ افسوس کہ کسی طالب علم کا اس سے بڑھ کر کیا نقصان ہو سکتا ہے کہ وہ محض ایک مضمون کی خاطر جس میں وہ بدبختی سے ناکام رہ جاتا ہے اپنی عمر کے کامل ایک سال جیسی بیش بہا نعمت کو نثار کر دے!

ڈگریاں یورپ بالخصوص انگلستان اور اس کی مقررہ ہندوستانی جامعات میں ڈگریاں پانے والوں کی تعداد وہی حیثیت رکھتی ہے جو برسات میں حشرات الارض کی ہوتی ہے۔ انسان بالطبع حریص واقع ہوا ہے اور یہ مادہ خصوصیت کے ساتھ نوجوانوں پر اپنی پوری قوت کے ساتھ مسلط ہے۔ طالب علم جب جامعاتی سلسلہ میں داخل ہوتا ہے تو اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ بی۔ اے کامیاب کرے مگر جب بی۔ اے کامیاب کر لیتا ہے تو ام۔ اے کی خواہش ہوتی ہے اور اسی قسم سے یہ سلسلہ بڑھتا ہوا محض آرزو بن کر دل ہی دل میں رہ جاتا ہے کہ وہ مجسمۂ علمیت کیوں نہ ہو گیا۔ انسان میں جب حد سے زیادہ حرص ہو جاتی ہے تو وہ پست اور مضمحل ہو جاتا ہے اور یہ اضمحلال اس کی ترقی میں مانع آتا ہے۔ اسی حرص کے سدباب کے لئے جرمن جامعات نے بی۔ اے اور ام۔ اے کے مخصوص کو نکال کر صرف ایک ڈگری ڈاکٹریٹ کی جس کو بی۔ اے کے مترادف سمجھئے یا علم کی اختتامی ڈگری سمجھئے قایم کر دی ہے۔ خاصکر جرمنوں کے لئے اس ڈگری کے علاوہ ایک اور امتحان ہوتا ہے جس کو سرکاری امتحان[1] کے ہم معنی سمجھنا چاہئیے۔ اس امتحان کے ممتحن اہم شعبہ جات ہی نہیں ہوتے بلکہ سرکاری عہدہ داروں کی ایک جماعت بھی اس میں شرکت کرتی ہے اور اس کی کامیابی کے بعد سرکاری عہدے، وکالت، طبابت کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ امتحان پاس کرنے سے پیشتر دو یا تین سال کا عملی تجربہ بھی حاصل کرنا پڑتا ہے اور اس کے بعد دوسرا امتحان ہوتا ہے جس کے بعد کامیاب طلبہ کو سند عطا کی جاتی ہے۔ اب رہا ڈاکٹریٹ کے امتحان کے سلسلے میں بعض اہم شعبہ جات مثلاً قانون طب وغیرہ کے طلبہ کو تیسری اور چوتھی میقات پر

---

[1] State examination

ایک امتحان ضرور دینا پڑتا ہے مگر یہ کوئی لازمی نہیں کہ اُسی وقت دیا جائے اگر طالب علم چاہے تو اس کا امتحان آخر میں بھی ہو سکتا ہے۔ امتحان کی دو میقات پیشتر طالب علم کو باضابطہ کسی جامعہ میں شریک ہونا پڑتا ہے جس کے تحت وہ امتحان دینا چاہتا ہے۔

تدریس اور انتظام کی آزادی

جرمن جامعات حقیقت میں تحقیقاتی جامعات ہیں ان کا صرف مقصد یہ ہوتا ہے کہ تحقیقات کی وساطت سے علم کی نشر و اشاعت ہو۔ یہ طریقہ میرے خیال میں آزاد خیالی، روشن ضمیری، اپج کی ترقی، ذہنیت کی رفعت، حقیقی اجتہاد اور صحیح معنوں میں علم سے روشناس ہونے کا زیادہ نافع اور شاندار ذریعہ ہے۔ باوجود پارلیمانی اور قانونی نگرانی کے جامعات اپنے اندرونی انتظامات میں ایسی ہی آزاد ہیں جیسے ہوا۔ انتظام کی حد تک تو آزاد ہے اس کی بنیاد کسی خانگی ذرائع یا پادریوں کے اجتہاد کی رہین منت نہیں ہے۔

تدریسی طبقہ

تدریسی حلقے میں پروفیسر اور مددگار پروفیسر شامل ہیں۔ ان کے علاوہ معلم بھی پائے جاتے ہیں جن کو وہاں کی خاص اصطلاح میں Privatdozenten کہا جاتا ہے۔ پروفیسر کا تقرر وزرا کے اختیار میں ہے اور یہ اُس وقت تک عمل میں نہیں آتا جب تک کہ امیر شعبہ جات خاص طور پر سفارش نہ کریں اس کے علاوہ پروفیسر دوامی وہی ہیں جو سلطنت کے عمایدین یا اعلیٰ عہدہ دار رہ چکے ہیں۔ یہ جگہ ان کی اعلیٰ ترین خدمت ہوتی ہے اور مرتے دم تک وہ اس خدمت سے علحدہ نہیں کئے جا سکتے۔ علم پرستی کی کیا بہترین مثال ہے! وہاں کے عہدہ داروں کو دیکھئے اور ہمارے یہاں کے اُمرا کو بھی ملاحظہ فرمائیے جن کو نشر و اشاعت علم سے کچھ بھی تعلق نہیں، روپیہ پیسہ تو درکنار۔ وہ قابل افراد جن کا فقدان امرا کے طبقہ میں ہے اعزازی کام تو کجا وہ کالج میں آنا بھی شان امارت کے خلاف سمجھتے ہیں۔ ان کی امارت اسی میں ہے کہ وہ بادۂ گلگوں کے جام کو لنڈھائیں۔ خرافات اور کاہلی میں اپنی گرانبہا عمر کو صرف کریں۔ یوروپ کا ہر فرد خواہ وہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی ہی کیوں نہ ہو اس وجہ سے قابل وقعت ہے کہ وہ ملک اور قوم کی خاطر ہر قسم کے ایثار کو تیار ہو جائے گا۔ حال ہی میں ایک محبِ علم نے ڈرائڈن کے خستہ مکان کو کئی ہزار پونڈ میں خرید لیا ہے۔ ہمارے پاس کے لوگ کئی ہزار تو کجا ایک پیسہ دینا بھی فعل قبیح میں شرکت کا مترادف سمجھتے ہیں۔

یہ ایثار اور تعلیمی سرپرستی کوئی نئی بات نہیں جب اسلام اسلام تھا اور وہ نیر اعظم کی طرح

عالم پر چمک رہا تھا اُس وقت ہمارے علما اور امرا کی یہی حالت تھی۔ تاریخ اسلام کی ورق گردانی سے اس کا بین ثبوت مل جائے گا۔ تاریخ ہند میں خود سعداللہؒ اور عبدالرحیم خانخاناں اس کی بہترین مثالیں ہیں میری یہ تمنا ہے کہ اخلاف کی یہ حالت جو اقوام یوروپ کے موجودہ دور میں ہویدا ہے ہمارے ملک کے ممتاز اُمرا اور علم پرست عمائد کے لئے تازیانۂ عبرت ہو اور وہ ملک اور قوم کی خاطر سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔

متذکرہ علمی حلقوں کے علاوہ جامعات میں اعزازی پروفیسروں کا بھی تقرر ہوتا ہے جو اپنے مخصوص شعبہ میں درس و تدریس کے ذریعے معاونت کرتے ہیں۔

نظم و نسق جامعہ کے انتظام ایک بورڈ کے تحت عمل میں آتے ہیں جس میں ایک رکٹر بہ حیثیت صدر اور دوسرے رفقائے جامعہ (Senate) بہ حیثیت اراکین کے ہوتے ہیں۔ رفقا تدریسی حلقے سے منتخب کئے جاتے ہیں۔ رکٹر کی میعاد صرف ایک یا دو سال کی ہوتی ہے۔ رفیق شعبہ سے کل تدریسی حلقے مراد نہیں بلکہ وہ ایک ہی شعبے کے چند اساتذہ ہوتے ہیں۔ امیر شعبہ ڈین جس کو وہاں کی اصطلاح میں (Dekan) کہا جاتا ہے جو ہر سال منتخب کیا جاتا ہے۔ یہ شعبہ جات علم اور امتحانی معاملات کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ جرمن جامعات ان قانون اور نظام کے تحت جاری ہیں۔

طالب علم کی زندگی جرمن جامعات میں شریک ہونے والے طلبہ دوسرے اور ممالک کے طلبہ کے مقابل بڑی عمر کے ہوتے ہیں اس لحاظ سے ان کو ہر قسم کی آزادی میسر ہے۔ جرمن طلبہ کا یہ تمغائے امتیاز ہے کہ وہ ایک طرف تو آزاد منش ہوتے ہیں تو دوسری طرف اپنے کردار کے ذمہ دار ہیں۔ آزادی کو تخریب سے ملوث کرنا وہ اپنی شانِ طالب علمی کے خلاف سمجھتے ہیں اور اس کی نگہداشت کے لئے وہ نہایت حزم و احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ جرمن جامعات کے تحت دارالاقامے تالار اور بڑے کمرے نہیں ہیں اس لئے طلبہ عام طور پر کسی خاندان کے مکان میں کرایہ پر سکونت اختیار کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے یوروپ کی دوسری جامعات میں سماجی کیفیات جس نوعیت پر ہوتی ہیں ان کا قطعی طور پر یہاں فقدان ہے۔ یہ بات یاد رہے کہ ادب کی جامعات میں عام طور پر رقص و سرود ورزش جسمانی، تفریحی مشاغل اور دوسرے سماجی انہماک تعلیم کا ایک جزو لازم ہیں۔

انجمنیں اور اجتماعات ذہنی ارتقا اور طلبہ کے مخصوص حلقوں میں ربط و ضبط بڑھانے کے لئے چند کلب

اور اجتماعی انجمنیں قایم کی گئی ہیں اور ان میں اجنبی طلبہ بلا کسی دقت کے رکنیت حاصل کر سکتے ہیں۔

طلبہ کے لئے امکنہ جنگ عظیم کے بعد سے جرمن جامعات میں ایک نیا تحتی پہلو پیدا ہوا ہے اور اسی کی بناپر جرمن جامعات کی تحریکات پر امکنہ کھیل، ورزش جسمانی کے علاوہ کئی سماجی اور اتحادی انجمنیں قایم ہوئیں۔ تمام جامعات میں خاص طور پر طلبہ کے خورد ونوش کا انتظام کیا گیا ہے۔ اور بعض جامعات نے تو توقع سے زیادہ ترقی کی ہے۔ ایک معقول تعداد تالاروں اور امکنہ کی طلبہ کے لئے مخصوص کردی گئی ہے۔ فی الوقت پانچ جامعات نے اس انتظام کے تحت قدم بڑھایا ہے اور باقی ان کے نقش قدم پر چلنے کے لئے گامزن ہیں۔ یہ امکنہ خاص طلبہ کے اتحاد کا نتیجہ ہیں۔ ان امکنہ میں اجتماعی اور سماجی تحریکات کے لئے وسیع تالار بنائے گئے ہیں جہاں طلبہ ایک جگہ جمع ہوتے ہیں۔ خاص خاص مواقع مثلاً خوشی کے جلسے اور عید برات کے موقع پر اساتذہ بھی نہایت گرمجوشی کے ساتھ ان میں شریک ہوتے ہیں۔

تحقیقاتی کام اوپر ہم لکھ چکے ہیں کہ جرمن ترقی کا انحصار اور ان کے درس وتدریس کی اساسی عظمت تحقیقاتی کاموں پر مبنی ہے اور اس خاص خصوصیت کے باعث ان کو اقوام عالم میں ممتاز درجہ دیا جاتا ہے۔ تحقیقاتی وسعت کا لحاظ کرتے اکثر و بیشتر طلبہ اور محققین کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ اور کچھ عرصہ کے لئے رہ کر مزید تحقیقاتی معلومات اور اس کے طریقے حاصل کئے جائیں۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ جرمنی میں نوجوانوں کی کثیر جماعت ایک ماہر کے زیر ادارت تحقیقات میں مشغول رہتی ہے۔ اس کے اداروں میں قیصر ولیہم سوسائٹی برلن (Kaiser Wilhelm Society Berlin) زیادہ مشہور ہے۔

قیام و طعام کے اخراجات اوپر ہم لکھ چکے ہیں کہ جرمنی میں طلبہ کی رہائش کا خاص طور پر انتظام نہیں اگرچہ چند امکنہ مخصوص جامعات میں ضرور ہیں مگر وہ ایک بڑی تعداد کے لئے کفاف نہیں کر سکتے۔ اس لئے طلبہ کو خاص طور پر رہائش کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ میقات کے شروع ہونے پر خالی شدہ کمروں کے متعلق جامعہ کی جانب سے خاص طور پر اطلاعنامے شایع ہوتے ہیں۔ عام طور پر رہائش کے لئے تین طریقے اختیار کئے جا سکتے ہیں:

(۱) کمرہ لے لیا جائے جس کا کرایہ بشمول ناشتا کرایہ دار پر عاید ہوگا۔

(۲) یا کسی مکان میں قیام کیا جائے جو عام طور پر ان کی مالک لینڈ لیڈی (LAND LADY)

کے نام سے مخاطب ہوتی ہے۔ یہاں کھانے کا بھی انتظام ہو سکتا ہے۔

(۳) یا کسی خاندان میں سکونت اختیار کی جائے۔ کیونکہ ایسے خاندان کی کمی نہیں جو کرایہ پر اپنے مکانوں میں اجنبیوں کو رکھتے ہیں۔

میرے خیال میں زبان اور جرمن زندگی کے داخلی پہلو کے دیکھنے میں زیادہ مدد مل سکیگی۔ اسکے علاوہ چند ایسے مقامات اور طعام گاہ موجود ہیں جن میں سبزی اور ترکاری سے تیار شدہ غذا کے سوا اور کوئی چیز نہیں ملسکتی۔

اخراجات کا صحیح اندازہ ناممکن ہے البتہ قیاساً یہ تبلایا جا سکتا ہے کہ ایک کمرہ جو ضروری لوازم اور فرنیچر سے مُزیّن ہو اس کے لئے (۵۰ - ۴۰) مارک تک کا صرفہ عاید ہوگا۔ اس میں ناشتا اور روشنی کے اخراجات بھی شامل ہیں۔ معمولی غذا جو کسی رسٹورنٹ میں دوپہر اور شام میں کھائی جا سکتی ہے اس کے لئے ماہانہ (۷۰ - ۷۵) مارک تک کا خرچہ عاید ہوگا۔ دوسرے متفرق اخراجات مثلاً اصلاح، صابون، سینما، تھیٹر وغیرہ کے لئے کم از کم (۳۰ - ۵۰) مارک ماہانہ درکار ہیں۔

تعلیمی اخراجات

اوپر ہم اس کے متعلق لکھ چکے ہیں کہ اس میں کتابوں، دوات، قلم اور دوسرے تعلیمی اخراجات شامل نہیں تاہم ان سب کو شامل کرلیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک سال کے اخراجات جس میں سرما کے ملبوسات اور دوسرے مصارف بھی شامل ہیں جو ناتجربہ کاری کی وجہ عاید ہوتے ہیں ان کا تخمینہ (۲۰۰۰ - ۲۵۰۰) مارک گویا ماہانہ (۲۰۰ - ۱۷۵) روپیہ کا کیا جا سکتا ہے۔

اخراجات میں کمی

اکثر جرمن جامعات میں انجمنوں کے ذریعہ اخراجات میں کمی عائد ہوسکتی ہے۔ جرمنی میں اس قسم کی (۴۴) انجمنیں قایم ہیں جن کے حُسن انتظام کے تحت تخمیناً (۲۷۰۰۰) طلبہ کم اخراجات میں خوراک حاصل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اخراجات کی کمی کے لحاظ سے کئی مدات مثلاً دُھلائی، اصلاح، کفش دوزی، خیاطی، کتابوں کا لین دین، دوسرے ضروری مدات کی دکانیں، انہیں انجمنوں کی سرگردگی میں قایم کی گئی ہیں اور یہ سب محض طلبہ کی آسایش اور بے فکری سے تعلیم حاصل کرنے کے لئے ہیں۔ اس کے علاوہ جرمنی میں طلبہ کو معمولی کام آزوقہ کے پیدا کرنے کے لئے ملجایا کرتا تھے مگر حزبُ العُمّال کی زیادتی نے اس بات کو قطعاً مسدود کردیا ہے۔ اب یہ ناممکن ہے کہ طلبہ وہاں آزوقہ کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی حاصل کریں۔

وظایف تعلیمی: جرمن جامعات کی اس سے بڑھ کر اور کیا فیاضی ہو سکتی ہے کہ وہ غیر ممالک کے طلبہ کو بھی وظائف دینے میں دریغ نہیں کرتیں۔ یورپ کی دیگر جامعات اس معاملہ میں ان کی نسبت کرتے بہت پیچھے ہیں۔ حال ہی کا ذکر ہے کہ بیرونی ممالک کے طلبہ کے لئے حکومت جرمنی نے (۴۰) وظائف دینے کا اعلان کیا ہے۔ علاوہ اس کے برلن کی Akademische austansche-dienst جو ڈاکٹر مارس Dr. Mars bach کے زیر نگرانی قایم ہے اور یہ طلبہ کو قدرے مالی معاونت کرتے کے علاوہ بین الاقوامی اساتذہ کے طریقہ کے ردّو بدل کو خاص طور پر انجام دیتی ہے۔ بعض بعض عالی حوصلہ اور کرم گستر جرمن حضرات ایسے بھی ہیں جو طلبہ کے خورونوش اور رہایش کا انتظام فی سبیل اللہ کر دیتے ہیں۔

اجنبی طلبہ کے لئے چند انجمنیں: جرمن جامعات اور دوسرے معاملات میں مندرجہ انجمنوں سے اعانت حاصل کی جا سکتی ہے۔

۱۔ The akademische austandsstellen-
۲۔ The Alexander Von Hunboldt House, Fasanen Strasse 23 Berlen
۳۔ The weltstudenten werk Munchen studenten hans Luisen Strasse 67.

معلومات بہم پہنچانے والی انجمنیں۔

۱۔ Akadenisches Auskunftsamt University
۲۔ Berlan. Kaiser Franz Josefplatz;
۳۔ Akademische Stidien-und Berufsberatz, Universty colague Woun 201

اس کے علاوہ اور دوسری انجمنیں اور معلومات بہم پہنچانے والی کمیٹیاں قایم ہیں جن کی فہرست طوالت کے لحاظ سے نظر انداز کر دی جاتی ہے۔

جامعہ کا داخلہ: جرمن جامعات میں ہر طالب علم ان کی شرایط کا تکملا اور جگہ کے خالی ہونے پر شریک ہو سکتا ہے ان میں ہندوستان کا میٹرک کامیاب طالب علم شریک ہو سکتا ہے مگر

ایف - اے کی صورت میں داخلہ بہ سہولت ممکن ہے۔ داخلہ کے وقت - صداقت نامہ مندرجہ پیش کرنا پڑتا ہے۔

۱ - ایسی سند جس کی وساطت سے خود طالب علم اپنے گھر کی جامعہ میں شریک ہو سکے مگر کسی صورت میں بھی طالب علم جرمن فوقانی طبقہ کی نویں جماعت سے کم نہ ہو۔

۲ - جرمن زبان کے جاننے کا ایک تحریری وثیقہ بھی پیش کیا جائے - جرمن نہ جاننے پر بھی داخلہ ممکن ہے مگر ایک مختصر مدت میں اس قابل ہو جانا چاہیئے کہ جامعہ کے لکچر کو سمجھ سکیں۔

۳ - اپنے خاندانی اور ذاتی حالات کا ایک مصدقہ خاکہ۔

۴ - مربی یا والدین کی جانب سے ایک تحریری سند کہ طالب علم کی مالی حالت درست ہے اور وہ اس قابل ہے کہ جرمن جامعات میں تعلیم جاری رکھ سکے۔

جامعہ کا صداقت نامہ اگر اصل پیش کیا جائے تو مناسب ہے۔ مندرجہ بالا صداقت نامہ جرمن زبان میں ہو۔

ان سب صداقت ناموں کے تکملے کے بعد طالب علم کو شریک جامعہ کر لیا جاتا ہے۔ داخلہ کے پہلے دن طالب علم کو اپنی تصویر داخل کرنی پڑتی ہے اور دوسرے مقررہ دن درخواست کی منظوری کے بعد فیس جامعہ (۲۰) مارک دینے پڑتے ہیں۔ اس کے علاوہ ورزش جسمانی، کھیل کود، اور دوسرے مصارف کے لئے (۲۵) مارک داخل کرنے پڑتے ہیں۔ اس مرحلے کے بعد طالب علم کو رسید دی جاتی ہے جس پر رکٹر کی دستخط ہوتی ہے۔ اس میں طالب علم کی تصویر چسپاں رہتی ہے اور ابتدائے میقات کا داخلہ بھی ہوتا ہے۔ اجنبی طلبہ جو زبان سے ناواقف ہوتے ہیں ان کی ترجمانی اور درخواست کی خانہ پری میں انجمن کے غمرکا، مدد دیتے ہیں۔

جرمن تعلیمی فضا سے باہر

جرمن تعلیم میں نہ صرف جامعہ کی تعلیم ہی ہے بلکہ دوسرے علمی کاروبار میں بھی حصہ لینے کو جزو تعلیم سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کتابی یا جامعہ کی دنیا کو اگر خیالی دنیا کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ خیالی دنیا کے مقابل، اصلی دنیا کا وجود بھی ہے اور ان دونوں میں بے حد مغائرت ہے۔ جب طلبہ خیالی دنیا سے نکل کر اصلی دنیا میں قدم رکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ اصلی دنیا کیا چیز ہے اور اس سے بے بہرہ کس قدر گھاٹے میں رہتا ہے۔ اس لئے طالب علم کا فرض ہے کہ اگر دنیا میں زندہ رہنا چاہتا ہے یا یہ کہ کامیاب انسان بننا چاہتا ہے تو بھی

اِس کو خیالی دنیا کے ساتھ ساتھ عملی دنیا کے متعلق کچھ نہ کچھ معلومات بہم پہنچانے کی ضرورت ہے۔ ہر طالب علم کو خیالی دنیا سے نکل کر اصلی دنیا میں آنا ایسا ہی ہے جیسا کہ تولد کے بعد مرنا۔ اِس لئے اگر وہ ابتدا ہی سے اِس کے لئے تیار نہ ہو تو آخر میں اِس کے لئے شکست اور ناکامیابی ضرور ہے۔ اس دنیا میں کامیابی کے اُصول کالج میں نہیں بتلائے جاتے بلکہ وہ براہ راست اصلی اور ذی روح دنیا میں داخل ہونے سے مل سکتے ہیں۔ اجنبی طلبہ کا جرمنی کی تعلیمی فضا کو دیکھکر حیران ہونا کوئی نئی بات نہیں کیونکہ وہاں کی جامعات میں اِن امور کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ طلبہ بہ طیب خاطر سیر و سیاحت کرتے ہیں، ایک ملک سے دوسرے ملک کو جاتے ہیں، عوام اور کاروباری دنیا سے تبادلۂ خیالات کرتے ہیں، بلدالجامعہ کی سیاحت کے تحت وہاں کے کارپرداز اور اعلیٰ اساتذہ سے بحث و مباحثہ کر کے اِن کے دیرینہ تجارب اور کامیاب خیالات سے استفادہ کرتے ہیں۔ اِس سلسلہ میں ہر کالج کے تحت بڑے بڑے لکچر ہال، سینما گھر، ڈرامہ اسٹیج، موسیقی کے کمرے ہوتے ہیں۔ اگر یہ چیزیں کسی کالج میں نہ ہوں تو جامعہ کے ارباب حل و عقد طلبہ کے لئے خاص طور پر رعایت سے تفریح گاہوں، نمایش گاہوں۔ عکاس خانوں میں جانے کا انتظام کرتے ہیں اور پبلک تفریح گاہیں رعایت سے طلبہ کی ضیافت کرتے ہیں کبھی تامل نہیں کرتے۔

پیادہ پا سیاحت طلبہ جرمنی کا ایک مقبول ترین شغلہ ہے۔ ہر سال چند یا کثیر طلبہ کی جماعت کو بلدالجامعہ اور دوسرے تاریخی یا مشہور قابل دید مقامات کی سیر کرائی جاتی ہے۔ جرمنی میں (۲۵۰۰) مکانات ایسے بنے ہوئے ہیں جو اِس قسم کے سیاحوں کے خور و نوش کا انتظام سستے داموں کرتے ہیں۔ اور اِن کے آرام کے لئے ہر ممکنہ کوشش عمل میں لاتے ہیں۔ اجنبی طلبہ کی رہبری کے لئے انجمنیں خاص طور پر امداد کرتی ہیں۔ کثیر تعداد میں نقشے، رسالے، اور رہبری نامے شایع کئے جاتے ہیں، ان رسالوں میں ملک کے ہر قطعے کی خاص خاص رسم و رواج سے مفصل بحث کی جاتی ہے۔ ان کے کئی نسخے ہر زبان میں اشاعت پاتے ہیں۔ تاکہ ہر زبان والا جرمنی کے متعلق مشرح اور مفصل معلومات حاصل کر سکے۔

کھیل کود اور ورزش جسمانی کے ارتقا کے لئے ہر جامعہ ممکنہ کوشش کرتی ہے۔ ان کے احیا کے لئے بڑی بڑی بازی گاہیں اور دفاتر بنے ہوئے ہیں جن کی نگرانی میں ہر قسم کے کھیلوں کے کام باحسن الوجوہ انجام پاتے ہیں۔

آمد و رفت میں سہولتیں طلبہ کے لئے ریلوے کمپنیاں خاص طور پر رعایت ملحوظ رکھتی ہیں۔

طلبہ جب اپنے منزل مقصود کو پہنچ جاتے ہیں تو ان کا فرض ہے کہ وہ اسٹیشن ماسٹر سے اجازت لیکر اس ٹکٹ کو اپنے پاس رکھ لیں جو از روئے قاعدہ ریلوے کے حوالے کر دینا پڑتا ہے۔ جب داخلہ جامعہ میں ہو جائے تو جامعہ کے مُراسلے کے ذریعہ وہ ٹکٹ ریلوے عہدہ داروں کے پاس روانہ کر دیا جائے۔ اِس طریقہ سے نصف کرایہ طلبہ کو واپس مل سکتا ہے۔ اس طریقہ سے سیاحت یا واپسی وطن میں بھی نصف کرایہ کے ذریعہ سفر کیا جا سکتا ہے۔ سامان کا خرچہ عام سیاحوں کے مقابل طلبہ سے کم لیا جاتا ہے۔

اِختتام اب ہم اپنے اِس مضمون کو جامعات کی ایک فہرست پر ختم کرتے ہیں۔ یہ ایک مختصر مضمون ہے۔ مفصّل معلومات سالنامہ جو ہر جامعہ سے شایع ہوتا ہے یا گائیڈ بک سے معلوم ہو سکتے ہیں طلبہ کی نوعیت اپنے ملک سے باہر ایک سفیر کی سی ہوتی ہے اِس لئے اِن کا فرض ہے کہ وہ اپنے ملک پر کسی قسم کا حرف نہ آنے دیں۔

جرمن زبان جاننے سے پہلے اِس کے متعلق کچھ سرسری معلومات حاصل کر لینا چاہیئے کیونکہ طلبہ کے پیش نظر محض تعلیم ہی نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک مصلح واخاذ ہوتا ہے جو غیر ملک کو "خذ ما صفا دع ما کدر" کے نقطۂ نظر کے تحت جاتا ہے۔ غیر ملک کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے علاوہ خود اپنے ملک کے متعلق بھی کافی معلومات حاصل کرے۔ کیونکہ توثیقی معلومات جرمنوں کو محض طلبہ کی وساطت سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ اگر کوئی طالب علم اِس کا شافی اور بالغ جواب نہ دے سکیگا تو اجنبیوں کے دل پر طالب علم کے ملک کے متعلق بُرے اثرات مُرتسم ہوں گے۔

جامعات:

	نام جامعہ		سنِ وجود	باشندوں کی تعداد	تعلیم یافتوں کی تعداد
۱	برلن	Berlin	۱۸۰۹	۴۰۳۴۱۶۵	۹۱۷۳ جن میں ۱۳۱۸ عورتیں ہیں۔
۲	بان	Bonn	۱۸۱۸	۹۰۲۴۹	۳۴۸۵ " ۳۱۸ عورتیں ہیں۔
۳	برسلا	Breslau	۱۸۱۱	۵۵۷۱۳۹	۳۰۴۴ منجملہ ۴۰۳ عورتیں۔

۴	ارلانگن	Erlangen	۱۷۴۳	۲۹۵۹۷	۱۳۴۰	منجملہ	۷۳	عورتیں
۵	فرانک فرٹ	Frankfurt	۱۹۱۴	۴۶۷۵۲۰	۲۲۱۱	منجملہ	۳۷۵	"
۶	فیربرگ	Frei burg	۱۴۵۷	۹۰۴۷۵	۳۲۶۴	"	۵۰۲	"
۷	گیسن	Gie sen	۱۶۰۷	۳۳۶۰۰	۱۴۵۳	"	۷۷	"
۸	گاٹن جن	Gottengen	۱۷۳۴	۴۱۵۱۴	۳۰۲۲	"	۳۲۶	"
۹	گرفس والڈ	Greifswald	۱۴۵۶	۲۶۶۹۵	۱۲۳۵	"	۱۴۷	"
۱۰	ہال	Halle	۱۶۹۴	۱۹۴۵۷۵	۱۸۱۶	"	۱۳۱	"
۱۱	ہیم برگ	Hamburg	۱۹۱۹	۱۵۷۹۱۲۶	۲۲۵۵	"	۴۳۷	"
۱۲	ہیڈلبرگ	Heidel berg	۱۳۸۶	۷۳۰۳۴	۲۸۶۰	"	۵۲۷	"
۱۳	جینا	Gena	۱۵۵۸	۵۲۶۴۹	۲۲۷۰	"	۳۳۵	"
۱۴	کیل	Kiel	۱۶۶۵	۲۱۳۸۸۰	۲۰۸۱	"	۲۶۰	"
۱۵	کان	Koln	۱۳۸۸					
۱۶	کانس برگ	Konigsberg	۱۵۴۴	۲۷۹۹۲۶	۱۹۱۳	"	۲۶۱	"
۱۷	لیپزک	leipzig	۱۴۰۹	۶۷۹۱۵۹	۴۹۳۷	"	۴۲۷	"
۱۸	ماربرگ	Mar burg	۱۵۲۷	۲۳۲۹۹	۲۷۶۷	"	۴۷۹	"
۱۹	میونخ		۱۴۷۳	۶۸۰۷۰۴	۶۹۲۷	"	۱۱۶۷	"
۲۰	منسٹر	Munster	۱۷۷۳	۱۰۶۴۱۸	۲۸۹۹	"	۵۳۶	"
۲۱	راس ٹاک	Rostock	۱۴۱۹	۷۷۶۶۹	۱۱۷۲	"	۱۲۲	"
۲۲	ٹیبن گن	Tubingen	۱۴۷۷	۲۰۲۷۶	۲۸۹۰	"	۲۶۳	"
۲۳	ورزبرگ	Warzburg	۱۵۸۲	۸۹۹۱۰	۲۲۴۳	"	۱۳۱	"

اِن کے علاوہ صنعتی اور پیشہ داری درسگاہیں یہ ہیں :—

	آچن	Aachen	۱۸۷۰	۱۵۵۸۱۶	۹۸۴	"	۱۰	"

برلن چارلوٹن برگ	Berlen Charlottenburg	۱۸۷۹	—	۴۲۵۸	مجملہ ۳۵	عورتیں
	Braunschweig	۱۸۷۷	۱۴۶۷۲۵	۹۴۵	″ ۳۶	″
برسلا	Breslau	۱۹۱۰	—	۷۸۶	″ ۱۲	″
ڈانزگ	Danzig	۱۹۰۴	۳۸۵۰۰۰	۱۵۱۵	″ ۴۳	″

سیاسیات کی تعلیم کے لئے تمام جرمنی میں صرف ایک درسگاہ ہے جس کا نام (DENTECHE HACHZCHULE FUR POLITEK) ہے۔ اُس کے تحت (۹۰۰۰) کتابوں کا ایک کتب خانہ ہے۔

متذکرہ صنعت گاہوں کے علاوہ ڈارمسٹاڈ (DARMETADAT- ڈریسڈن (Dresden.) ہنیور (Hannover.) میونخ (Munch) اسٹٹ گار (Shitt gart.) ہیں۔

پیشہ ور مثلاً علاج حیوانات میں برلن، ہنیور شامل ہیں۔ معدنیات میں کاسلٹیال Clausthal فری برگ ہیں۔ جنگلات میں ایبرس ویلڈ (Hursmalda.) ہاں (Haun.) اور ٹرھانڈ (Tharandt.) شامل ہیں۔ زراعت میں برلن، بان، ہونیام (Hohenheim) اور (weihenstephan.) شامل ہیں۔ کاروبار میں برلن، کالن برگ، ...... (Mannheim.) اور نرن برگ (Nurnberg.) شامل ہیں۔

فنون لطیفہ اور موسیقی میں برلن، میونخ اور لیزک وغیرہ شامل کئے جا سکتے ہیں۔ جسمانی تعلیم کے لئے اسپانڈ (Spandau.) جرمنی کی مقبول ترین درسگاہ ہے۔

———— (÷) ————

غزل

از

جناب ابو الضیا گلؔ حیدرآبادی

ستمگر دلفریبی کے بھی کچھ ساماں پیدا کر
ادا، غمزہ، کرشمہ، ناز، شوخی، آن پیدا کر

یہ ضد بھی کوئی ضد ہے کہہ رہے ہیں وہ مصور سے
مری تصویر کھینچی ہے تو اسمیں جان پیدا کر

وہ بزم غیر سے اٹھ کر مری محفل میں آبیٹھیں
الٰہی غیب سے ایسا کوئی سامان پیدا کر

ملیگا فائدہ کیا گھر ہی گھر میں خود فروشی سے
کھلے بندوں جہاں سودا ہو وہ دوکان پیدا کر

تمنا ہے اسی قاتل کے قدموں پہ کروں قرباں
الٰہی جان دوں میں اور پھر تو جان پیدا کر

زمیں و آسماں کا فرق ہے اغیار میں ہم میں
ذرا اپنے پرائے کی بھی کچھ پہچان پیدا کر

دو روزہ حسن کے برتے پہ یہ دعوائے یکتائی
خدا کو مان او کافر! ذرا ایمان پیدا کر

کٹے گی زندگی کانٹوں پہ تیری باغ عالم میں
سمجھ کر گلرخوں کا دل میں اے گلؔ دھیان پیدا کر

زرّیں رات

از

جناب قتیل حیدرآبادی

نکلتے جاڑے ہیں، بہار کی آمد ہے، اس وقت رات کے بارہ بجا چاہتے ہیں، آدھی رات ادھر اور آدھی رات ادھر ہے۔ لیلائے شب کی زلفیں کمر تک لٹک رہی ہیں، مطلع صاف ہے اور آسمان نکھرا ہوا ہے، ماہ کامل، جس میں ایک فلسفی کو اپنی خشکی دماغ کے باعث آبادی اور حیات انسانی کے جلوے نظر آتے ہیں اور عاشق مزاجوں کو کسی ماہ پارہ کے فروغ حسن کی تجلی نظر آتی ہے۔ بڑی آن بان اور اپنی انتہائی شوکت و شان سے کسی محبوبہ چاردہ سالہ کی طرح تخت آسمان پر جلوہ گر ہے، نور کے ظہور نے تمام عالم کو سفید خلعت پہنا دیا ہے، زمین سفید ہے آسمان سفید ہے، گویا مشاطۂ قدرت نے عروس گیتی کے رخسار پر سفید غازہ مل دیا ہے جوں جوں رات بھیگتی جاتی ہے ہوا کے تیز تیز جھونکوں میں ایک لطیف اور خوشگوار طراوت پیدا ہوتی جاتی ہے۔

میں اپنے گھر میں ایک آرام کرسی پر لیٹا ہوا چاند کے مصحف جمال کی تلاوت کر رہا تھا اور عالم وجد میں جھوم رہا تھا۔ یکایک میرے دل میں یہ خیال آیا کہ اس وقت تالاب کے بند پر اپنے ایک دوست متین سے ملنے کا میں نے وعدہ کیا ہے، یہ خیال آتے ہی چونک گیا، سیکل ہاتھ میں لی اور گھر سے نکل پڑا۔

تھوڑی دیر میں اس سریع السیر سواری نے مجھے حسین ساگر کے تالاب تک پہنچا دیا جہاں مناظر قدرت کے بہت سارے دلدادہ سیر و تفریح میں مصروف تھے، کوئی بنچ پر بیٹھا تھا، کوئی کھڑا ہوا تھا، کوئی اپنی ٹوپی بغل میں دبائے ٹہل رہا تھا۔ بعض لوگ تالاب کے پانی کی ہلکی ہلکی لہروں اور چمکتی ہوئی بجلی کے نظارے میں محو تھے۔ حقیقت میں اس وقت تالاب ماہ کا آئینہ بردار بنا ہوا تھا۔ پانی کی سطح چاند کی روشنی سے جگمگ جگمگ کر رہی تھی، سرسری طور سے میں اس سیمیں منظر کو دیکھتا ہوا آگے بڑھا۔

بند کے اس سرے سے اس سرے تک وعدہ فراموش متین کا کہیں پتہ نہ تھا آخر مایوس ہوکر

میں نے گھر جانے کی ٹھان لی اور باغ عام کی سڑک پر نکل آیا اس وقت رات کے دو بجے ہوں گے۔ سڑک پر ایک سنّاٹا سا چھایا ہوا ہے، میں سیکل سے اُتر پڑا اور اس پر سکون فضا میں آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا گھر کی طرف جانے لگا۔

ہوا کی رفتار جو تھوڑی دیر پہلے کسی قدر دھیمی پڑ گئی تھی پھر سے تیز ہوگئی گویا ہوا کے جھونکے پہلے چاندنی کے فرش پر چل رہے تھے، اب دوڑنے لگے، یکایک سامنے سے ایک نیلگوں کاغذ خس و خاشاک کے ساتھ اُڑتا ہوا آیا اور میرے قدموں پر نثار ہونے لگا۔ جب میری نظر اس کاغذ پر پڑی تو مجھے یکایک نوٹ کا گمان ہوا فوراً جھک کر میں نے وہ کاغذ کا ٹکڑا اٹھالیا۔ "ہیں یہ تو سو روپے کا نوٹ ہے" بے اختیار میری زبان سے یہ الفاظ نکلے، نہیں معلوم یہ کس کا ہے، کہاں سے اُڑتا ہوا آیا ہے، اگر اس کا کوئی مالک مل جائے اور میں یہ نوٹ اس کے حوالے کردوں تو وہ کس قدر خوش ہوگا اور میرے متعلق کتنا بہتر خیال کرے گا! اونھ دیکھا جائے گا فی الحال اس گنج باد آورد کو جیب میں تو اُتار لو۔

یہ خیالات ابھی میرے دل میں چکر لگا رہے تھے کہ پھر ہوا کا ایک تیز و تند جھونکا آیا اور میرے ہاتھ سے نہایت صفائی کے ساتھ نوٹ اُڑا لے گیا، گویا بجلی تھی کہ کوندگئی اور چشم زدن میں آندھی کے کوّے کی طرح وہ نوٹ میری نظروں سے غائب ہوگیا "آہ سونے کی چڑیا اڑ گئی" میں نے نہایت تأسف سے کہا اور جھٹ سے سیکل کو ایک طرف رستے میں کھڑا کر کے نہایت تیزی کے ساتھ اس کا تعاقب کیا سانس پھول گئی، چوٹی سے ایڑی تک پسینہ بہنے لگا۔ ہر چند خاک چھانی، تلاش اور جستجو میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا مگر ہوا سے کون مقابلہ کرے؟

اس بادپیمائی کے بعد ناکام و بے نیل مرام واپس ہوا اور اپنی سیکل لیکر گھر کا رستہ لیا۔ واقعی دنیا کی دولت بادِ صرصر کے ایک جھونکے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔

بُرے خیالات

از

جناب رشید احمد صاحب حیدرآبادی

ذیل کا مضمون نفسیات کے مشہور عالم پروفیسر انڈرسن کی کتاب "نفسیات مذہب" کے پہلے باب کا ترجمہ ہے۔ مُصنّف نے اِس کتاب میں حقایق نفسیات کی جن مثالوں کے ذریعے توضیح کی ہے وہ تمام تر مذہب عیسائیت سے مُتعلق ہیں۔ ہمارے خیال میں اگر مُصنّف ذرا وسیع النظری سے کام لیکر دیگر مذاہب کی مثالوں کو بھی اس میں جگہ دیتا تو اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ کتاب ہر حیثیت سے جامع کہلانے کی مستحق ہوتی ——— (مکتبہ)

بُرے خیالات انہیں عام قوانین کے تحت کام کرتے ہیں جو ہماری اپنی دماغی زندگی کے دیگر اُمور میں دایرو سایر ہیں۔ یہاں ہم اُن اُصول کو بیان کریں گے جن سے ان حالات و مواقع میں جو مذہبی نقطۂ نظر سے درست نہوں مدافعت کی جا سکتی ہے۔ ہم یہ دیکھیں گے کہ انہیں اُصول سے ایک کاروباری آدمی بھی کام لیتا اور اِس عمل کا ازالہ کرتا ہے جو اِس کے خیال میں اِس کے اپنے نام و نمود کو ملیا میٹ کر رہا ہے۔ دماغی وسائل دونوں صورتوں میں ایک ہیں مگر صورت میں اختلاف ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ جن خیالات کی مدافعت کا طریقہ حضرت عیسیٰؑ نے اختیار فرمایا تھا ان کی علم النفس سے تطبیق ہوتی ہے۔ آج ہم نفسیاتی حقایق کو خود اِن کے بشری خیالات اور ان کے ان مسایل کے جوابات میں پاتے ہیں جن سے انہیں سابقہ پڑا تھا۔

ہم اُن پانچ اُصول کو بیان کریں گے جو آج بھی ایسے ہی صحیح ہیں جیسے پہلی صدی عیسوی میں تھے۔ جن کی وجہ یہ ہے کہ اِن کی بنیاد اصلی شعوری حالت پر رکھی گئی ہے۔ نفسیات کے اِن اُصول پر عمل پیرائی میں بہت کچھ کامیابی کی توقع ہے۔

۱ - پہلا اُصول یہ ہے کہ بُرے خیال کے آتے ہی اِس کو وہیں روک دیا جائے۔ اگر غلطی سے

کسی نے زہر کھا لیا ہے تو ایسے شخص کے لئے فوری تدبیر کرنی ضروری ہے اور اُس کے بچنے کا امکان اُسی صورت میں ہے کہ اِس کو جلد تریاق دیا جائے۔ اگر دیر کی گئی تو زہر اُس کے جسم میں سرایت کر جائے گا۔ اور موت لازمی نتیجہ ہوگی۔ اِسی طرح زہریلے خیال کا اثر ہے۔ گو ہم زہریلے خیال کے اثر کو نہیں دیکھتے لیکن یہ دماغ پر ایسا ہی اثر کرتا ہے جیسا زہر عضلات جسم پر۔ محض اِس لئے کہ خیال کے اثرات نمایاں طور پر نظر نہیں آتے اِس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خیال اپنا اثر دماغ پر ایسا ہی چھوڑ جاتا ہے جیسی پنسل کی تحریر کاغذ پر۔

ہم اپنے بُرے خیالات کے متعلق جانتے ہیں کہ بُرے ہیں لیکن ہم اِنہیں نہیں روکتے اور ان کو اپنی حالت پر چھوڑنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ طرز عمل نہایت خطرناک اور اِس کے نتائج تباہ کن و مُضر ہوتے ہیں۔ اکثر حالات میں ہم وہی کرتے ہیں جو کرنا چاہتے ہیں اور اِس کے لئے اسباب و علل قایم کرتے ہیں۔ اور یہ فرض کر لیتے ہیں کہ یہ کام ہم بعد میں ترک کر دینگے لیکن یہ سمجھ رکھیں کہ ایسی عادتیں استقلال کے خلاف اور عمدہ شخصیت کو ملیا میٹ کرنے والی ہیں۔

۲ - دوسرا اُصول میرے خیالات کی روک کے لئے یہ ہے کہ انہیں بالواسطہ روکا جائے۔ اور بلاواسطہ نہیں۔ اگر ہمیں کوئی خیال برائی کی طرف لے جا رہا ہے تو بلاواسطہ یہ کہکر اُس کی مدافعت نہ کریں کہ ہم فلاں کام نہ کریں گے بلکہ اِس خیال کو دوسرے خیال سے بدل دیں۔ ایک لڑکے کو کسی ایک پھول کا رنگ بہت اچھا معلوم ہوا اور اُس نے اُس کو توڑنے کی کوشش کی۔ ماں نے یہ کہہ کر اُس کو منع کیا کہ "اِس پھول کو نہ توڑو" اور بار بار یہی کہہ کر اِس کو منع کرتی رہی لیکن لڑکے کے اصرار میں کمی نہ ہوئی۔ ایک دوسری عورت نے جو قریب بیٹھی ہوئی تھی اثر آفرینی سے کام لے کر اِس مشکل کو ٹالا۔ اُس نے ایک خوشنما رنگ کی گیند لڑکے کو بتائی جس پر اُس کی نظر نہ پڑی تھی اور جب لڑکے نے اُس کو دیکھا تو پھول توڑنے کا ارادہ جاتا رہا "نہیں" سے اِرادے کی تبدیلی ایسی نہیں ہو سکتی جیسی ہونی چاہیئے۔ "میں نہیں چراؤنگا" سے ہرگز خیال ایسا نہیں ہٹ سکتا جیسا "میں اپنا قرض ادا کر دوں گا" سے ہٹ سکتا ہے۔ یہ واضح رہے کہ اثبات کا اثر نفی کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔ بُرے خیال کے آتے ہی ہم کو بُرے خیال کو روکنا ہی نہیں چاہیئے بلکہ اِس کو اعلیٰ وارفع خیال سے بدل دینا چاہیئے۔ اِس طرح سے بُرے خیال کی مدافعت ہوگی۔ جس قدر دیر تک ایک خیال دماغ میں رہیگا اُسی قدر زیادہ اُس کے

آیندہ یاد آنے کا احتمال اور عملی صورت میں تبدیلی کا امکان ہے۔ ڈاکٹر وان ڈایک لکھتے ہیں "بہترین گلاب کا تختہ وہ نہیں جس میں بالکل تھوڑے کانٹے ہوں بلکہ بہترین تختہ وہ ہے جس میں کانٹے بہت ہوں"۔ بعض لوگ کانٹوں کے ہی دور کرنے میں لگے رہتے ہیں جس کی وجہ سے اِن کے پھول بڑھنے نہیں پاتے۔ اور بعض لوگ اِن اُمور پر جن سے وہ احتراز کرنا چاہتے ہیں اِس قدر متوجہ ہوتے ہیں کہ جو کرنے کی باتیں ہیں اِن کا اُنہیں خیال نہیں آتا۔

۳۔ تیسرے اُصول کو اِن الفاظ میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ "صُلح کے زمانے میں جنگ کی تیاری کرو"۔ اِس کی ایک عمدہ مثال حضرت عیسیٰؑ کی زندگی سے مِل سکتی ہے۔ نذرت (NAZARETH) میں آپ کی جد و جہد کا کوئی سُراغ نہیں مِلتا اِس لئے قیاس چاہتا ہے کہ آپ کی زندگی یہاں سکون و اطمینان سے گزری ہوگی اور ضرور آپ نے یہاں بیٹھ کر توریت و انجیل کا نہایت انہماک کے ساتھ مطالعہ کیا ہوگا۔ کیونکہ آپ کی بشری خواہشات سے آپ کے وسیع معلومات کا ثبوت ملتا ہے۔ کتبِ مُقدس صرف گناہ کے لئے تریاق نہیں بلکہ کوئی تریاق گناہ کے لئے اِن سے بہتر نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ اعلیٰ وارفع خیالات اپنے اندر رکھتی ہیں جن سے گناہ کا اِرادہ ہم سے دور ہو جاتا ہے۔ کوئی ایسا مشغلہ بھی جس میں ہم کو دلچسپی ہے بُرے خیالات سے باز رہنے میں مدد دیتا ہے مثلاً نجاری لوہاری اسپورٹس، موسیقی، حساب وغیرہ۔ بشرطیکہ اِس مشغلہ کا تعلق اِس خیال سے مطلق نہ ہو جس سے ہم گریز کرنا چاہتے ہیں۔ اوایل جنگ میں اتحادیوں پر جرمنی کے وحشیانہ حملے نوعیت کے اعتبار سے بالکل نئے تھے۔ جن کا سبب یہ تھا کہ جرمنی کئی سال سے تیاری کر رہا تھا اور اتحادی نہیں۔ امن کے زمانے میں اگر ہمارے خیالات عمدہ اور ہمارے ارادے نیک ہوں تو جنگ کے زمانے میں ہم مستعدی کا ثبوت دے سکتے ہیں۔ اِس اُصول کا تعلق نفسیات حافظہ سے ہے۔ کسی بات کو یاد رکھنے کے لئے اس کے تلازمات کو پیش رکھنا ضروری ہے۔ تلازم سے حافظہ کو زبردست مدد ملتی ہے۔ کسی خیال کو ذہن نشین رکھنے کیلئے اِس کے اطراف تلازمات کا جال باندھ دو تو وہ تمھیں یاد رہے گا۔ اور یہ جال اپنے اپنے ماحول اور تجربات کے مطابق بنایا جا سکتا ہے۔

بسا اوقات ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ ہماری کامیابی اور ناکامی بُرے خیال کے آتے ہی اِسکے روکنے پر موقوف ہے۔ صلیب پر مسیح کی کامیابی کی وجہ یہ ہے کہ آپ جتسمین میں کامیاب رہے تھے۔

جسمانی صلیب پر دماغی صلیب مقدم ہے اور یہ دماغی صلیب ہی دقّت کی چیز ہے۔ ایک شخص راستے سے جاتا ہوا ایک دوسرے شخص کو دیکھ کر اس کو بندوق کا نشانہ بناتا اور مار ڈالتا ہے، یہ قتل کا فعل ہوا۔ مگر ارتکاب قتل ان تخیلات کی بنا پر ہوا جو ایک خاص خیال کے تحت ظاہر ہوئے۔ اور یہی خاص خیال ارتکاب جرم کی علت غائی ٹھہرتا ہے۔ ہمارے خیالات کے تار و پود اس قدر نازک ہوتے ہیں کہ ہم اپنے کردار و اعمال کے مقابلے میں ان کو بالکل گھٹا دیتے ہیں لیکن یہی اصل چیز ہیں اور انہیں پر نفسیات کی بنیاد ہے۔

۴۔ چوتھا اصول جسمانی حالت سے متعلق ہے۔ جسم اور دماغ میں جو قریبی رشتہ ہے اس کو نفسیات نے اکثر و بیشتر حالات میں ثابت کیا ہے۔ بعض حالات میں دماغ کا اثر جسم پر اور بعض حالات میں جسم کا اثر دماغ پر ہوتا ہے جیسے اگر کوئی شخص کسی پر غصہ میں آئے اور اسی حالت میں کھانا کھائے تو معدہ کا فعل درست نہ ہوگا اور سوء ہضمی اور بے چینی نتیجہ ہوگی۔ برعکس اس کے غذا ثقیل اور معدہ کے لئے فتور پیدا کرنے والی ہے تو اس کا اثر دماغ پر ہوگا۔ توہمات اور بزدلی وغیرہ کا باعث عموماً کمزوری جسم ہے۔ جس قدر ہمارا جسم کمزور ہوگا اسی قدر ہم اپنے بُرے خیالات کے مقابلہ میں آپ کو ضعیف پائیں گے۔ شنبہ کی راتیں ان المناک واقعات کا مظاہرہ کرتی ہیں جو بُرے خیالات پر قابو نہ پانے کی وجہ سے سرزد ہوتے ہیں۔ ان واقعات کے وقوع میں آنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ جسم کاروبار سے تھکا ہوا رہتا ہے اور ہفتہ بھر کا کام ختم ہونے کی وجہ سے طبیعت ان خیالات کی روک تھام کو اجیرن سمجھتی ہے۔ ایک مشین سے غیر معمولی کام لینے کے لئے اُس کو عمدہ حالت میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح بُرے خیالات کو خاطر خواہ عمدہ طریقہ سے روکنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ جسم بھی تندرست اور مضبوط رہے۔

۵۔ پانچواں اُصول ان دماغی مدارج کو قرار دیا جا سکتا ہے جن کی بدولت ہم بنتے یا بگڑتے ہیں۔ بننے اور بگڑنے کے مدارج ایک ہیں مگر نتیجہ کا دارومدار ہماری دماغی قابلیت پر ہے۔ مدارج کی تفصیل یہ ہے:-

(۱) پہلا درجہ نظر۔ (۲) دوسرا درجہ تصور (۳) تیسرا درجہ کشش۔ (۴) چوتھا درجہ اصلاح

بگاڑ کے بھی یہی درجے ہیں۔ اور چوتھا درجہ بگاڑ ہے۔ نظر میں وہ خیال شامل ہے جو نظر کے بعد ہمارے دماغ میں آ جائے۔ نظر کے مختلف ذرائع ہیں۔ تصویریں دیکھنے والے کی نظر اور اُس کے

ذاتی تجربات اور احساسات شامل ہیں۔ تصویر کے بننے کے لئے لازمی ہے کہ مشاہدہ پیش نظر ہے بعض اوقات اِس تصویر کے بننے میں زیادہ عرصہ لگتا ہے۔ تصویر بن چکی ہے تو ہمارا دماغ اِس تصویر خیالی سے کھیلنے لگتا ہے۔ جب ہماری یہ حالت ہوتی ہے تو تیسرا درجہ کشش کا شروع ہوجاتا ہے۔ اِس درجے میں جذبات کا عمل ہوتا ہے۔ جب یہ عمل تکمیل کو پہنچتا ہے تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ تصویر اپنا رنگ جما رہی ہے اور ہم اس کے رام ہوگئے ہیں۔ اِس درجے سے چوتھا درجہ بگاڑ یا بناؤ بالکل نزدیک ہے اِس درجے پر پہنچنے کے بعد تصویر جو تصویر خیالی تھی عملی صورت میں بہ حیثیت فعل وقوع میں آتی ہے۔

دو اُمور اِن چار متذکرہ مدارج میں ہمیں یاد رکھنے چاہئیں۔ پہلا امر یہ کہ یہ سب مدارج ہمارے دماغ کے ذریعے طے پاتے ہیں۔ نظر کی ابتدا ایک حد تک احساس پر منحصر ہے لیکن اِس نظر کا ہمارے دماغ پر جو اثر مترتب ہوتا ہے وہ خود ہمارے انفرادی میلان پر ہوتا ہے۔ تصویر اور اسی طرح کشش میں ہمارے تجربات اور میلانات شامل ہیں۔ بناؤ اور بگاڑ کچھ تو خیال اور کچھ عمل کا نتیجہ ہیں۔ خیال کا اِن میں زیادہ حصہ ہے کہ فعل بغیر شعور کی ابتدا کے نہیں۔

اِن چار مدارج کو دوسرے طریقہ سے یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔ پہلا درجہ احساسی۔ دوسرا تلازمی۔ تیسرا جذباتی۔ چوتھا حرکی۔ ہم اپنے احساسات کے ایک حد تک ذمہ دار ہیں۔ وہ اِس لئے کہ ہم تمام بُرے خیالات و تاثرات کو اپنے دماغ سے یک لخت نہیں نکال سکتے لیکن اِن کو اپنے دماغ میں مستقل طور پر جگہ دینے کی ذمہ داری ہمارے سر ہے۔ شعور کی تلازمی۔ جذباتی۔ اور حرکی حالت کے متعلق ہم پر پوری ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ بُرے خیال کو روکنے کا بہترین مقام نظر اور تصویر ہے جو احساس اور تلازمہ کے درمیان ہے۔ اگر ہم ان مدارج سے اِس کو گزر جانے دیں تو پھر حالت خطرناک ہوجاتی ہے اور ہم بگاڑ کی طرف نکل جاتے ہیں۔

ہمارے بُرے خیالات ہی ہماری گمراہی کا باعث ہیں لیکن ہم اِنہیں اتنی اہمیت نہیں دیتے۔ جتنی ہمیں دینی چاہئے۔ نفسیاتی تحقیقات اور نتائج جس قدر ہم پر واضح ہوتے جارہے ہیں اسی قدر ہم اپنے افعال کے دماغی اسباب و علل پر زیادہ زور دیتے جارہے ہیں۔ مذہب بھی ایک جداگانہ راستہ اختیار کرتے ہوئے اِنہیں نتائج پر پہنچتا ہے۔ سابقہ مواعظ میں جسمانی و حرکی اُمور کے متعلق زیادہ زور دیا جاتا تھا لیکن حالیہ مواعظ میں دماغ پر زیادہ زور دیا جاتا ہے کہ افعال نتیجہ ہیں

خیالات کا بہت سے اُمور جو پہلے بالکل جسم سے متعلق سمجھے جاتے تھے آج اُن کا تعلق دماغ سے مسلم ہے یہ ضروری ہے کہ ہم جسم پر پہلے غور کریں لیکن یہ کوئی وجہ نہیں کہ یہیں ہم ٹھیر جائیں جبکہ دماغ اس کے درے ہے۔
اگر ہم دماغی قوت کو تسلیم کر کے اس کی ترقی میں سعی کریں تو جسم ہمارے اختیار میں رہیگا کیونکہ یہ دماغ کے تحت ہے
اس کو تسلیم کر لینے کے بعد کہ گمراہی کی ابتداء دماغ سے شروع ہوتی ہے اس امر کو بھی یاد رکھنا چاہئیے کہ دماغی عمل دھیمی رفتار سے ہوتا ہے۔ بعض اوقات ہم کو دماغی تبدیلیوں کی خبر اس وقت تک نہیں ہوتی جب کوئی غیر معمولی واقعہ یا تجربہ ہماری گزشتہ دماغی حالت کو موجودہ دماغی حالت سے مقابلہ کیلئے مجبور نہ کرے یہ عمل اعلیٰ اور ادنیٰ دونوں خیالات کے لئے درست ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک لڑکا پڑھ کر مدرسہ سے آتا ہے تو ہم اس سے پوچھتے ہیں کہ تم نے آج کیا پڑھا وہ عموماً کہے گا کچھ بھی نہیں روزانہ وہ یہی جواب دے گا لیکن کوئی بات ایسی پیش آجاتی ہے جس سے اس کو ایک سال ماقبل کی حالت کو آج کی حالت سے مقابلہ کرنا پڑے اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان سے واقف تک نہیں ہوتے اگر ہم دماغی قوت کو اصلاح و تخریب کا موجب سمجھ لیں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ

ملک ہمیں ہیں بشر ہمیں ہیں صنم ہمیں ہیں خدا ہمیں ہیں

قطعات امجد

از

مولانا احمد حسین صاحب امجد حیدر آبادی

اتر جائیگا سارا نشہ اک دن
یہ سب دو روز کی سرمستیاں ہیں
ہوئی ہے زندگی سے موت پیدا
اجڑنے کے لئے یہ بستیاں ہیں
فنا ہو جائینگی ایک ایک کر کے
یہ جتنی چلتی پھرتی ہستیاں ہیں

انساں کے دل میں خوف کسی کا ضرور ہے
بے خوف زندگی تو بڑی خوفناک ہے
ممکن نہیں کہ فطرت اصلی بدل سکے
امجد ہزار پاک ہو پھر بھی خاک ہے

آخری لمحات

از

جناب لیاقت علی خان صاحب فراق

کہا جاتا ہے کہ ایک ڈوبتا ہوا قریبِ مرگ انسان، اپنی زندگی کے آخری لمحہ میں، جب کہ کسی ندی یا دریا کی موجیں اس کو اپنی موت کا پیام دینے والی آغوش میں لے رہی ہوں اپنی زندگی کے تمام واقعات کو یکے بعد دیگرے اپنی آنکھوں کے سامنے گزرتا ہوا دیکھتا ہے یعنی دماغ انسانی مخزن ہے ان تجربات کا جو ہر شخص کو زندگی میں درپیش ہوتے اور جس وقت کسی کی کشتیِ حیات متلاطم موجوں کی پے در پے ضربوں سے ہچکولے کھا رہی ہو تو اس تاریک مخزنِ خیالات میں بغیر ارادہ کے اضطراری طور پر ان سب کی تصویریں نمایاں ہونی شروع ہوتی ہیں۔

حقیقتاً یہ فطرت کی کس قدر ستم ظریفی ہے کہ کسی ناٹک کے تماشائیوں کی طرح ہم اپنی زندگی میں گزرے ہوئے واقعات کو نظروں کے سامنے خیالی اسٹیج پر دیکھیں جبکہ خود موت ہماری زندگی کی تماشگاہ پر اپنا آخری پردہ کھینچکر اس مختصر ڈرامے کو ختم کر رہی ہو! کاش اس معمورہ رنج و غم میں پھیلے ہوئے بے شمار دریا جو اکثر موقعوں پر ایسی ہستیوں کے لئے جنہیں گردشِ روزگار نے تباہ کر دیا ہے آخری جائے پناہ ثابت ہوئے ہیں حسرت انگیز لاشوں کے ساتھ ان کی زندگیوں کے غمناک رازوں کو بھی ظاہر کر دیتے تو پھر کیسے کیسے افسانہائے عبرت اور کس قدر دردناک واقعات جو ان حسرت نصیبوں کے دماغوں میں اپنے آپ کو سپردِ توج کرتے وقت وقوع پذیر ہوئے ہوں ظاہر ہوتے!

دنیا کے بعض عجیب و غریب افسانوں کے سننے سے ہم پر یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ بعض زندگیوں کو عجیب خیز اتفاقات کا شکار ہونا پڑا ہے جیسا کہ ایک کم نصیب انہماک شب میں اس عظیم الشان، تہذیب یافتہ، دولت مند شہر کی نواح میں ایک ساکن اور آہستہ آہستہ بہتے ہوئے دریا کی گہرائیوں کے حوالے اپنے آپ کو کر دیا ہے۔ ایک بے بس رنجیدہ اجنبی جس کے چہرے پر یاس و حسرت برس رہی تھی اور جس کا پھٹا پرانا بوسیدہ لباس اس کی عسرت اور افلاس کا پتہ دے رہا تھا دریا کے کنارے کھڑا ہوا اشک آلود، حسرت بھری نگاہوں سے کچھ دیر تک پانی کی ساکن سطح کو غور سے دیکھتا رہا۔ اس نے اپنے رخسار پر ڈھلکتے ہوئے قطراتِ اشک کو اپنی سر انگشت سے پونچھکر اٹھایا اور آہستہ آہستہ

چل کر پانی میں داخل ہوا۔ جوں جوں یہ آگے بڑھتا گیا پانی ٹخنوں سے کمر تک پہنچا پھر سینہ بعد ازاں گردن اور اس کے بعد اوپر سے بہنے لگا — سطح کچھ دیر کے لئے متحرک نظر آئی ——— اور ساتھ ساتھ کچھ منتشر پانی کے بلبلے ، ایک لمحہ کے بعد ایک ہاتھ خالی فضا میں ادھر اُدھر کسی چیز سے سہارا لینے کی سعی بے حاصل کرتا ہوا دکھائی دیا وہ کیا تصویریں تھیں جو اس دریا کی متحرک سطح کو حسب سابق سکون پذیر ہوتے اور اس خالی فضا میں سہارا ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کرنے والے ہاتھ کے ذیرا اپنی منتشر موجوں میں غائب ہونے سے قبل آئی ہونگی ——— خود اس کی زندگی کے کیا کیا خیالات اور کون کون سے تصورات کا اس کے سامنے اجتماع ہوا ہوگا ———؟ پہلے پہل مدھم سی صورتوں کا سلسلہ جو رفتہ رفتہ واضح ہوتا گیا اور جن سے اس کی زندگی اور زندگی کے مقاصد وابستہ تھے عورتوں کے متعدد چہرے ایک عمر رسیدہ عورت جس کے سفید بال گالے کی طرح تھے ——— ایک شوخ و طرار سیاہ زلفوں والی مہ جبین رقص کے لباس میں ایک اجنبی جس کے چہرے سے غصہ اور حقارت کے آثار نمایاں تھے اور جس کی تیز و چمکدار آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے !! دوسری اور بہت سی عورتوں کے نظر افروز چہرے ، لیکن ان تمام کے علاوہ ایک ایسی صورت جس کو صناع قدرت کا شاہکار کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا سرخ و سپید رخسار کی دونوں طرف سیاہ بل کھائی زلفیں ——— شرمیلی مگر مخمور نظریں معصومانہ انداز میں بیساختہ قہقہہ کے ساتھ ظاہر ہوتے ہی وہ تمام حسین صورتیں ایسی ہی ماند پڑ گئیں جس طرح کہ ماہ کامل کے برآمد ہونے پر جھلملاتے ہوئے تارے ——— ! ذہن میں اس تصویر حسن کے نمایاں ہوتے ہی اس کو خود اپنی گذشتہ شکل و شباہت کا ایک دھندلا سا نقشہ نظر آنے لگا ......
شہر بمبئی کا وہ عظیم الشان تھیٹر اور اس کا ناٹک کے لباس میں اسٹیج پر آتے ہی حسین حسین عورتوں اور متمول و قلاش تماشبینوں کی تالیوں کا ایک ساتھ گونجتا ہوا شور برقی قمقموں کی وہ خیرہ کن روشنی پھر وہی درشت مزاج اجنبی وہی چکا چوند کرنیوالی روشنی وہی تالیوں کی ایک ساتھ آواز خندہ زن سینکڑوں چہرے۔ اور وہ حسرتناک جنازہ اور خود اس کے رنگ چڑھے ہوئے چہرے پر قطرات اشک ——— آہ کس قدر اندوہناک واقعات کا سلسلہ ہے ! محبت ۔ فتحیابی و بربادی ——— ! اس کی آنکھوں میں آخری دفعہ اپنے بچپن کا زمانہ پھر گیا جب کہ اس کی زندگی صرف جذبات کے تحت بسر ہوا کرتی تھی ایک تو اپنی ماں کی معصوم محبت دوسرا باپ کا خوف جو فطرتی طور پر اس قدر سخت گیر واقع ہوا تھا کہ معمولی سی معمولی خطا اور چھوٹے چھوٹے قصور پر بھی بید استعمال کرنے میں دریغ نہ کرتا تھا تا وقتیکہ ممتا کی ماں نسائیت کے فرض اولیں یعنی شوہر کی فرمانبرداری کو ایک حد تک نظر انداز کر کے بیچ میں نہ آ پڑتی ۔ اس کی زندگی کے جہاں اور بے شمار واقعات

تھے خصوصاً ایک واقعہ تو اس کے لئے ناقابل فراموش تھا جب کہ وہ مقامی درسگاہ سے جہاں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کیلئے شریک کیا گیا تھا نکالدیا گیا یہی نہیں بلکہ ساتھ ہی ساتھ استاد نے اس کے چال چلن کے متعلق بھی اس کے باپ کے پاس شکایت لکھ بھیجی تھی کیا یہ وہ وقت بھول سکتا تھا جبکہ اس کے باپ کی حالت اس خط کے پڑھنے کے بعد ہوئی تھی۔ غصہ کے مارے چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا اور یہ خوف کیوجہ رعشہ براندام خاموش کھڑا ہوا کبھی اپنے بازو کو جو اس کے باپ کی مضبوط گرفت میں تھا اور کبھی اس کے خشمگیں چہرہ کو خوف زدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا لیکن قبل اس کے اس کی پشت پر ہنٹر کی پہلی مار پڑتی اس کی ماں نے دوڑتی ہوئی آکر "میرے لال میرے لخت جگر تو کیوں اس قدر سہما ہوا ہے" کہتے ہوئے اس کو اپنے دونوں بازوؤں میں لے لیا۔ کیا آغوش مادر سے زیادہ راحت اور حفاظت فردوس میں بھی نصیب ہوسکتی ہے جیسے جیسے بچپن کے دن گزرتے گئے اس کے دل میں ماں کی محبت اور باپ کے خوف نے جو بعد میں نفرت کی شکل اختیار کر لیا تھا نشو و نما پاکر مستحکم ہوتے گئے۔ القصہ اس سترہویں سالگرہ کیساتھ اس کی دور زندگی میں اہم انقلاب بھی رونما ہوا۔

اب ایک دوسرا ہی منظر اس کی نظروں کے سامنے ہوتا ہے یعنی یہ دکھائی دیتا ہے کہ آج اس کی سترہویں سالگرہ ہے نیا جوڑا زیب بدن ہے گلے میں پھولوں کے ہار پڑے ہیں مکان میں فرش کیا ہوا ہے اکثر عزیز و اقارب مدعو ہیں اور اس کی ماں ادھر ادھر انتظامات میں مصروف اور آہ اپنی ماں کا وہ رسم گلپوشی کے اختتام پر بیساختہ اپنے سینہ سے لگا کر ایک جیبی گھڑی یہ کہتے ہوئے اس کی زریں واسکٹ میں لگا دینا "میرے بچے یہ لے، تجھ کو گھڑی کی کس قدر خواہش تھی۔"

اس قابل یادگار شب کا ایک تہائی حصہ گزرنے کے بعد جبکہ تمام مہمان اور خود اس کے تھکے ماندے اپنی اپنی خوابگاہ میں سو رہے اور مکان میں خاموشی چھا گئی گر یہ باوجود نیند کے غلبہ کے بہت رات گئے تک اپنے بچھونے پر اس جیبی گھڑی کو بار بار دیکھتا ہوا بیٹھا رہا ـــ یہ تحفہ شاید مالی نقطہ نظر سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا ہو مگر جو مسرت اس کی ملکیت سے اس کو اس وقت ہوئی غالباً قارون کا خزانہ بھی مل جاتا تو ممکن نہ تھی ـــ! ابتدائے طفولیت سے لیکر آغاز شباب تک اس کی صرف ایک خواہش تھی جو شب و روز اس کو بے چین کئے رہتی یہ خطرناک سے خطرناک کام کرنے اور ہر اس چیز کی جو اس کے قبضہ میں تھی قربانی کے لئے آمادہ تھا اگر اس کی یہ تمنا پوری کر دیجاتی کہ وہ ایک مشہور اداکار (ایکٹر) اور ایک بے مثل مغنی بنجائے ـــ اخبار میں اس کی تعریف کے کالم کے کالم لکھے جائیں سڑکوں اور شاہراہوں پر اس کے نام کے پوسٹر چسپاں کئے جائیں ہر جگہ اس کی اداکاری

اور کمال موسیقی کے چرچے ہوتے ہوں اور جس وقت یہ نہایت شان او رمتانت سے اسٹیج پر آئے لوگ مسرت وتعریف کے نعرے بلند کریں اور ایک منکسرانہ انداز میں ادھر ادھر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے گردن کی خفیف سی حرکت کے ساتھ سینہ پر ہاتھ رکھکر شکریہ ادا کرے لیکن بدقسمتی سے وہ مقام جہاں یہ اور اس کا خاندان قیام پذیر تھا ایک قصبہ سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا اس لئے یہاں پر وہ شہر کی دلچسپیاں وہ تماشاگاہیں اور وہ سینما بھلا کہاں میسر آسکتے اگر وہ اپنی اس دیرینہ خواہش کا اظہار کرتا تو کس پر اور مدد چاہتا بھی تو کس سے؟ الغرض یوں ہی دن گزرتے گئے اور اندر ہی اندر اس کا نخل تمنا نہایت تیزی کیساتھ پھولتا پھلتا رہا۔

دن گزرتے دیر نہیں لگتی ــــ اس کی بیسویں سالگرہ کی رسم کو ادا ہوئے چند ہی دن ہوئے تھے کہ اسی مقام پر ایک مشہور سرکس معہ اپنے قابل دید جانوروں اعلیٰ سازو سامان اور حسین و باکمال رقاصوں کے وارد ہوا ــ بس یہیں سے اس کی زندگی کا وہ انقلاب عظیم شروع ہوتا ہے جس نے اس کے لئے دنیا کا نقشہ ہی بدل دیا!

پہلی مرتبہ جب یہ تماشہ دیکھنے کے لئے گیا تو دوران کھیل میں جہاں یہ جانوروں کے تحیر خیز کمالات، گٹھیلے جسم کے کمسن لڑکوں کے ورزشی کھیل، مسخروں کی ان رنگ برنگ کے بھڑکیلے کپڑوں میں ظریفانہ حرکتیں اور ساتھ ہی ساتھ نوجوان حسین رقاصوں کا چست ریشمی لباس زیب جسم کئے کبھی ایک قطار باندھکر اور کبھی ایک دائرہ کی شکل میں مصروف رقص ہونا ــ غرض جملہ دلچسپیوں کو پرشوق نظروں سے دیکھ رہا تھا مگر وہاں سب سے زیادہ اس کی آنکھیں سرکس کی مشہور رقاصہ فیروزہ کے متناسب الاعضاء گداز جسم سرخ وسپید کتابی چہرے اور پشت پر ایک سرخ فیتے کے ذریعے بندھی ہوئی سیاہ زلفوں پر جمی رہیں۔ جبکہ یہ سراپا قیامت اپنی ہر ادا اور ہر حرکت سے برق پاشی کرتی ہوئی ورزشی کمالات دکھا رہی تھی ـ

تماشہ ختم ہونے کے بعد جب یہ اپنے مکان کو واپس ہوا، اپنے کمرہ میں بستر پر پڑے ہوئے سونے کی ناکام کوشش کرتا رہا مگر اس لے تمام تر خیالات اس کا دل اور اس کا دماغ فیروزہ ہی کے حسن دل نواز کے خوش آئند تصورات کا آماجگاہ بنے رہے ــ کچھ دیر ادھر ادھر کروٹیں بدلنے کے بعد یہ اٹھ بیٹھا، چراغ کی بتی بڑھا دی ــ اور ایک پنسل و کاغذ لیکر بیٹھ گیا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ زیادہ لکھا پڑھا تو اوائل عمری میں تھا اس نے اردو فارسی کی چند کتابیں اور متعدد ناول وغیرہ پڑھ لئے تھے۔ تھوڑی بہت انگریزی بھی سیکھ لی تھی لیکن مادری زبان ہونے کے لحاظ سے اپنی اردو کی پوری قابلیت اس نے ایک خط لکھنے پر صرف کی کئی خطوط مختلف مضامین کے لکھے اور پھاڑ ڈالے آخر کار بعد از کوشش بسیار ایک خط کا مضمون اس کو پسند آیا جس میں پہلے اس کے کمالات کی بے حد

تعریف و توصیف کی گئی تھی پھر اس کے بعد یہ بتایا گیا تھا کہ اس کو خود اپنے آپ پر رشک کرنا چاہیے کہ قدرت نے اس کو ایسا بے مثل اور قیامت خیز حسن عطا کیا ہے اور اختتام خط یہ کہ:—

"فیروزہ — میں نہیں بتا سکتا کہ تمہیں دیکھنے کے بعد میں اپنی زندگی میں کس قدر عظیم انقلاب دیکھ رہا ہوں گو خود میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ ہستی ناتواں بھلا اس قابل کہاں کہ تم جیسی حسن کی دیوی کی محبت کا بار گراں اٹھا سکے مگر تمہاری نظرِ انصاف سے کہو کہ دل پر کس کا اختیار ہے یہی وجہ ہے کہ میں اس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنا رازِ دل تم پر منکشف کر رہا ہوں

آہ فیروزہ کیا تم اس بھکاری کو اپنے درِ حسن سے دھتکار دوگی — خدا کیلئے اپنے حسن کا صدقہ اس شیشۂ دل کو سنگ جفا سے چور چور نہ کرو۔

فیروزہ آج شام میں کیا تم کسی وقت اس بدنصیب کی چشم منتظر کو اپنے شربتِ دیدار سے سیراب کر سکتی ہو —"

مانا کہ اب یہ شخص جو دریا کی بے پناہ موجوں میں اپنی ہستی کو گم کر رہا تھا، عالم شباب کے اس جذبہ کو یاد کرکے ضرور پشیمان ہوتا ہوگا — مگر سچ پوچھو تو کیا جوانی میں برے بھلے کا امتیاز حسن کے سامنے باقی رہتا ہے —؟ اس بدنصیب کے دماغ میں اپنی پہلی محبت کی ابتدا اور اس کا مختصر دور تصاویر متحرکہ کی طرح گذرنے لگا۔

قریب ہی کا وہ فرحت افزا باغ ٹھنڈی ہوا کے عطر بیز جھونکے، فضا میں پھیلی ہوئی پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو صاف و شفاف نیلگوں آسمان پر جھلملاتے تارے اور ضوفشاں ماہتاب جس کی ٹھنڈی ٹھنڈی کرنوں نے چاروں طرف فضا میں ایک نور کا لہریں مارتا دریا پیدا کر دیا تھا — ایسے وقت جب کہ فیاض فطرت اپنی پوری دریا دلی سے کام لے رہی ہو اس کا فیروزہ کے ہاتھ میں ہاتھ دے ایک ناقابل اظہار سرور اور نشہ کی سی کیفیت کے زیر اثر چہل قدمی کرنا وصل کے ان کیف زا جلد گزرنے والے چند لمحوں کے بعد جس وقت فیروزہ نے اپنے سینے سے نکلتی ہوئی آہ کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے رخصت کی اجازت مانگی تھی اور یہ غریب جب بہ چشم پرنم مایوسی مگر ایک جوش و بےساختگی کی حالت میں اس کے نرم و نازک مرمریں ہاتھ کو اپنے ہونٹوں سے لگایا اور سر اٹھا کر سامنے جوں ہی نظر ڈالی — بس ایک بجلی تھی جو گر پڑی — سارے بدن میں صرف ایک سنسناہٹ سی پیدا ہوئی اور بس کاٹو تو ایک بوند لہو کی نہ ملے گی — چہرے پر سارے خوف کے زردی چھا گئی اور بدن میں رعشہ — وہی سرخ آتش ریز آنکھیں، وہی سخت اور درشت چہرہ یعنی اس کا باپ سامنے کھڑا ہوا غصہ سے دانت پیس کر ان دونوں کو گھور رہا تھا۔

متذکرہ بالا شب اس کے لئے عجب کرب و اضطراب کی تھی اپنی معشوقہ نازآفریں کے سامنے اس کے باپ کا دھکے دیتے ہوئے برا بھلا کہکر اس کو گھر لے جانا — ساری رات یہی تکلیف دہ خیال اس کے دل میں نشتر زنی کرتا رہا۔ باپ کی سختیاں، اپنی غیر آزادانہ زندگی کا احساس، گاؤں کی سیدھی سادھی زندگی، جوانی کی ناقابل ضبط امنگیں، الغرض ان تمام چیزوں نے اس کو کچھ اور راہ دکھایا یعنی اس کو اب سوائے اس کے اور کچھ نہ سوجھا کہ مختصر سا سامان لے کر اس گھر کو خیرباد کہدے جہاں اس نے اپنی زندگی کے اس قدر طویل سال بسر کئے تھے، محبت والی ماں نے اپنے نورِ نظر کی خاطر رو رو کر، گلے لگا کر التجائیں کیں

منتیں کیں۔ باپ کے پیروں پر سر رکھ کر عفو کی درخواست کی۔ مگر سامان لیکر تیار ہو جانے کے بعد ایک طرف خودداری کا خیال تھا اور دوسری طرف ناخلف اولاد کا وجود دونوں عدم و وجود مسلوی تھے۔ آخر کار اس خوفناک شب میں جب کہ آسمان کا سینہ جو سیاہ بادلوں میں روپوش ہو چکا تھا ہوا بند تھی اور کبھی کبھی بجلی کی چکاچوند کرنے والی دہشتناک چمک آسمان پر نمودار ہو کر چاروں طرف ایک خوفناک منظر پیدا کر رہی تھی، اس نے خاموشی سے اپنی گٹھری اٹھائی۔ بصد حسرت و پشیمانی پہلے اپنے باپ پر ایک الوداعی نظر ڈالی جس کا جواب یوں ملا "ناخلف بد معاش دور ہو میرے سامنے سے، تجھ سے میری یہی امید تھی" اماں بے اختیار بے بسی کے عالم میں بوانہ وار چیخیں مارتی اپنے لخت جگر سے جس کو اپنا خون پلا پلا کر اتنا بڑا کیا تھا لپٹ گئی ۔۔۔ اب بھی جب کہ اس کی آنکھیں جو اس وقت دنیا کی گہرائی میں ہمیشہ کے لیے بند ہو چکی تھیں وہی بوڑھی ماں کا غمزدہ چہرہ اور اشک مسلسل کا سیلاب عظیم دیکھ رہی تھیں گٹھری لیکر باہر قدم رکھا ہی تھا کہ کسی نے زور سے دروازہ بند کر لیا! آہ وہ جگہ جس کو وہ اپنا گھر اور جہاں کی ہر چیز کو وہ اپنی ملکیت ایک عرصہ طویل سے سمجھ رہا تھا۔ اب اس سے چھوٹ رہی تھی غالباً ہمیشہ کے لئے!

آن واحد میں منظر بجلی کی سی سرعت کیساتھ بدلتا ہے اور یہ نظر آتا ہے کہ وہ ریل کے ایک درجہ سوم کے ڈبہ میں ایک طرف حیران سراسیمہ اپنے مستقبل سے قطعی بے خبر بیٹھا ہوا اپنے وطن سے شہر کی طرف سفر کر رہا ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔ ہندوستان کا ایک بڑا شہر، ایک مشہور تجارتی مرکز، جہاں لاکھوں روپیوں کا کاروبار روزانہ ہوتا ہے، جہاں کے دولتمند تجار اور امراء ہزاروں روپیہ صرف سگریٹ، سینما، تھیٹر پر صرف کرتے ہیں، جہاں کی حشرات الارض کی طرح پھیلی ہوئی دلچسپیوں پر ہندوستان کے رئیس اور متمول امراء روپیہ پانی کی طرح بہانے سے دریغ نہیں کرتے یعنی عروس البلاد بمبئی میں اس آوارہ گرد کے لئے کوئی جائے پناہ نظر نہ آئی کسی خدا کے بندے نے اس کو تلاش معاش کا ذریعہ نہ بتایا۔ اور اس وسیع معمورۂ عیش و کامرانی میں کوئی ہاتھ دستگیری کے لئے بڑھتا دکھائی نہ دیا۔ مسلسل کئی دن رات یونہی ٹھوکریں کھاتے در بدر پھرنے کے بعد اس نے دیکھا کہ وہ غیر معروف محلے کے کسی چھوٹے سے شراب خانہ کے دروازہ پر کھڑا ہے۔ اندر داخل ہوتے ہی متوسط الحال اور ادنیٰ درجے کے ہندوستانی ادھر ادھر بیٹھے گپیں ہانک رہے ہیں۔ شراب اور سگریٹ کی مشترکہ بدبو چاروں طرف فضا میں پھیلی ہوئی ہے اس نے پہلے شراب خانہ اور وہاں کے حاضرین پر ایک سرسری نظر ڈالی اور بعد ازاں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے آگے بڑھے جہاں پر ایک میز رکھی ہوئی تھی جس پر ہمہ اقسام کی شراب کی بوتلیں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں اور وہیں پر ایک بھاری بھرکم جسم کا تومند پارسی جو غالباً یہاں کا مالک تھا بیٹھا ہوا اپنے احمق گاہکوں کی مجنوں حرکت کو تبسم زیر لب کے ساتھ فاتحانہ انداز میں دیکھ رہا تھا۔

اس نے قریب پہنچکر التجا کی کہ اگر وہ نامناسب خیال کرے تو حاضرین کو کچھ سنا کر لطف اندوز کرے۔ چونکہ بچپن ہی سے اس کو موسیقی سے شوق بلکہ ایک گونہ لگاؤ تھا۔ اکثر غزلیں اور ٹھمریاں اس کو از بر تھیں اور اپنی فرصت کا زیادہ تر وقت

یا اپنے آپ گنگنانے میں گزارتا علاوہ ازیں آواز بھی بچپن ہی سے سریلی تھی مگر اب دائرہ شباب میں قدم رکھنے کے بعد وہ لوچ باقی نہ تھا تاہم آواز میں کچھ ایسا درد پیدا ہو گیا تھا کہ دل خود بخود کھنچا جاتا، سچ ہے انسان مصیبت اور ضرورت کے وقت کیا کچھ کرنے سے دریغ نہیں کرتا ۔ یہ وہی خوددار بیٹا تھا جس نے باپ کی ناراضگی سے متاثر ہو کر گھر کو خیرباد کہہ دیا تھا اور آج یہی ایک ادنی درجہ کے شراب خانے کے لچوں اور شہدوں کے روبرو گانے کی اجازت طلب کر رہا تھا، تاکہ ایک وقت کا کھانا میسر آسکے ۔!

اس نے اجازت پاتے ہی اپنی گٹھڑی ایک طرف رکھ دی اور آگے بڑھا ۔ پارسی نے تالی بجا کر اپنے گاہکوں کو اس طرف متوجہ کیا ۔

درد میں ڈوبی ہوئی پہلی ہی تان نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ۔ آواز کا اتار چڑھاؤ اور ایک خاص اثر کے تحت ایک ایک لفظ کا ادا ہونا اور خود غزل کے دردناک اشعار ۔ غرض سامعین پر ایک کیف زا حالت طاری ہو گئی ۔ اور اس کا سینہ پر ہاتھ رکھ کر یہ گانا ۔

عاشقِ نامراد کو لازم ہے یہ دعا کرے — جس نے دیا ہے دردِ دل اس کا خدا بھلا کرے

پوری غزل کے ختم ہونے تک چاروں طرف ایک خاموشی طاری رہی ۔ گویا شراب خانہ کا ہر ذرہ جہاں کچھ دیر پہلے ایک طوفانِ بے تمیزی برپا تھا ایک خاص اثر کے تحت ساکن اور ساکت ہے ۔ آخری شعر کے ادا کرنے کے بعد جب اس نے اپنی نمناک آنکھوں اور پیشانی کے پسینے کے قطروں کو پونچھنے کے بعد ہونٹوں پر تبسم پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے سامعین کی طرف ترحم خیز نظروں سے دیکھا تو چند لوگوں نے تالیاں بجا کر داد دی اور پھر اپنے شغل میں مصروف ہو گئے ۔ مالکِ میخانہ نے اس کو ایک گوشہ میں ایک خالی میز کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا ۔

اس کے ساتھ ہی منظر پھرتی کے ساتھ تبدیل ہوتا ہے ۔ بمبئی کا ہوٹل باتھ ریج گا، چوپاٹی، پارسی لباس میں ملبوس وہی شریر حسینہ جو بعد میں ایک طوائف ثابت ہوئی ۔ وہ آراستہ و پیراستہ کمرہ مخملی گدوں کی کرسیاں قرینے سے رکھی ہوئیں مزین مسہری، سنہری چوکھٹوں میں جڑی ہوئی تصویریں، وہی اس کی سراپا قیامت کی پُرجوش آنکھیں وہی پُرفن شرارت آمیز نظریں، وہی غازہ ملا ہوا برقی روشنی میں نظر فریب چہرہ، وہی لب ہائے رنگیں، وہی اس کا اپنے ہاتھ اس کے حمائل کر کے ناز سے بادہ نوشی کی ایک فریب انداز میں التجا ۔ اور آہ وہ خوفناک منظر ۔ جبکہ ایک لمبے تڑنگے ملازم نے اس کی جیب سے وہ نقدی لے کر جس کو اس نے شراب خانہ میں گا کر جمع کیا تھا ۔ دھکے دیتے ہوئے مستی کی حالت میں اس کو اس تنگ و تاریک گلی میں پھینک دیا اور یہ مکارہ کھڑی ہوئی فاتحانہ انداز میں ہنستی رہی! ۔ لیکن پھر کسی چیز کا خیال آتے ہی اس مکار حسینہ کا اس کے قریب آکر اس کی بوسیدہ واسکٹ سے اس گھڑی کا نکالنا، اس کی مزاحمت اور گھڑی کا زمین پر گر کر چور چور ہو جانا ۔ یہ اپنی والدہ کی واحد یادگار کا انجام دیکھ کر سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ آنکھوں میں تاریکی چھا گئی، در و دیوار

گھومتے نظر آنے لگے۔ اور پھر اس کو یاد نہ رہا کہ کیا ہوا — !

اس کے بعد جب اس کی آنکھ کھلی تو یہ خود متعجب ہونے لگا ، پاک و صاف سفید سفید دیواریں ، قطاروں میں دونوں طرف مریضوں کے ایک ہی قسم کے پلنگ ، فضا میں پھیلی ہوئی ایک قسم کی دواؤں کی تیز بو ، اس نے جو آنکھیں مل کر دیکھا تو جب کہیں یقین ہوا کہ یہ عالم خواب نہیں بلکہ اصلیت ہے اس کے سر پر پٹیاں بندھی ہیں اور یہ کسی دواخانہ میں زیر علاج ہے۔ ایک سانولی سی نرس ، چلبلی عورت نے مسکراتے ہوئے اس کی نبض دیکھی۔ تھرما میٹر سے بخار دیکھا اور قریب ہی لوح پر لٹکی ہوئی خاص قسم کی جدول کی خانہ پری کرنے کے بعد اس کو خاموش لیٹے رہنے کی تاکید کرتے ہوئے کسی نوجوان ڈاکٹر سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہوئے چلا گئی — اور یہ اسی طرح خاموشی کے ساتھ آنکھیں بند کئے ہوئے کچھ سوچنے لگا —

مگر جب یہ نرس دن میں نوکری کرنے کے بعد شام میں واپس چلی جاتی اور اس کی جگہ ایک دوسری ادھیڑ عمر کی نرس متعین نظر آتی تو کیوں یہ سانولی نرس کا بوٹا سا قد اس کی آنکھوں میں پھرتا رہتا۔ ؟ کیوں اس کا متبسم چہرہ ، سیاہ گھونگھریلے بال بڑی بڑی سرمگیں آنکھیں اس کو بے چین کئے ہیں ؟

لیکن افسوس کہ اس کی زندگی کا یہ مختصر مگر حد درجہ دلچسپ خواب زیادہ دیرپا ثابت نہ ہوا۔ ایک ہی ہفتہ میں ڈاکٹروں نے اس کو صحت یاب دیکھکر دواخانہ سے خارج کر دیا۔

دواخانہ کا لباس اتار کر اس نے وہی اپنے پھٹے پرانے کپڑے پہن لئے اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا باہر نکلا ، اس کی حالت پہلے سے بدتر تھی۔ ٹیلیفون کے ایک کھمبے کے پاس کھڑے ہو کر اس نے چاروں طرف ایک نظر ڈالی اور سوچنے لگا کہ اب اگر جائے تو کہاں جائے ، کوئی جاننے والا مونس و غمخوار نہیں۔ اور یہاں یہ حالت کہ جیب میں ڈھونڈو تو ایک پھوٹی کوڑی نہ نکلیگی آخر سوچتے سوچتے اس کو وہی شراب خانہ یاد آیا جہاں پر اس نے کچھ دنوں گا گا کر لوگوں سے کچھ پیسے پیدا کئے تھے —

دوسرے لحظہ میں یہ شراب خانہ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہا تھا۔ اکثر لوگوں نے اس کو خوش آمدید کہا۔ مالک میخانہ نے بیٹھنے کے لئے کرسی دی اور کچھ دیر بعد۔ التجا کی کہ کیا وہ کچھ سنا کر محظوظ نہ کریگا ؟ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ اس نے فوراً کھانس کر آواز صاف کی اور گانا شروع کیا اس عرصہ میں اور لوگ بھی جمع ہو چکے تھے اب کی دفعہ اس کی آواز میں وہ پہلی سی جھجک اور گھبراہٹ باقی نہ تھی معمولی دو ٹھمریاں گانے کے بعد جب وہ جلیل کی مشہور غزل کے اس شعر پر پہنچا۔

جی میں آتا ہے کہ ساقی سے اجازت لیکر ۔۔۔ دل کو شیشے سے ملوں آنکھ کو پیمانے سے

ہر طرف سے واہ واہ کی صدا بلند ہوئی۔ غزل کے ختم ہو جانے کے بعد ایک شخص جو وضع قطع کے لحاظ سے یہاں کی موجودہ محفل سے کسی قدر بلند مرتبہ دکھائی دیتا تھا اٹھا اور اس کے قریب پہنچکر مصافحہ کرنے کے بعد اس کی آواز وغیرہ

کی کچھ تعریف بھی کی اور کہا کہ وہ اگر کسی استاد کی مدد سے کچھ ہی دنوں مشق کرے تو بہت ممکن ہے کہ ایک اچھا مغنی ثابت ہو۔ دوران گفتگو میں اس نے اپنی خواہش ظاہر کی کہ اگر نامناسب نہ ہو تو شب کا کھانا وہ اس کے ساتھ ہی تناول کرے

اس اجنبی سے اسکی اتفاقیہ ملاقات نے اسکے دور زندگی میں ایک نمایاں انقلاب پیدا کر دیا۔ یعنی ایک مشہور ناٹک کمپنی کے ایک سربراوردہ ڈائرکٹر کا اس کو مدعو کرنا کسی خاص وجہ پر مبنی نہ تھا بلکہ ایک خوش گلو کا انتخاب تھا جس سے کمپنی کی آئندہ امیدیں وابستہ ہو سکتیں اور فی الوقت جس کا صرف اسٹیج پر آکر تماشبینوں کے روبرو کچھ گا دینا ہی لوگوں کی دلچسپی کا باعث ہو سکتا تھا۔

آخر کار اس کی وہ آرزو جس کا ایک زمانہ دراز سے خواب دیکھا کرتا تھا اب پوری ہوتی نظر آ رہی تھی پہلے پہل تو قلیل تنخواہ پر جس سے بہ مشکل گذر اوقات کر سکتا تھا۔ اس کو مقرر کر لیا گیا۔ اس کا صرف یہ کام ہوتا کہ دوران کھیل میں جب کوئی نیا منظر اسٹیج پر جمایا جا رہا ہو یہ ایک دو غزلیں گا کر حاضرین کو مشغول رکھے۔ کچھ دنوں بعد اکثر ڈراموں میں اس کو متعدد دفعہ چھوٹے چھوٹے کردار بھی ادا کرنے کے لئے دے گئے۔

القصہ وہ دن بھی آ پہنچا جب کہ بمبئی کی اسٹیج پر پہلی مرتبہ آغا حشر کا معرکۃ الآرا ڈراما "آنکھ کا نشہ" دکھایا جانے والا تھا۔ اور بڑی جد و جہد کے بعد کمپنی کے منتظموں نے ایک اہم کردار کے لئے خود اس کا انتخاب کیا۔ دیواروں پر بڑے بڑے پوسٹر چسپاں کئے گئے۔ اردو انگریزی اور گجراتی زبانوں کے اکثر اخباروں میں اشتہارات دئے گئے۔ آخر کار وہ رات بھی آ پہنچی جب کہ آنکھ کا نشہ دکھلایا گیا۔ تماشہ نہایت کامیاب رہا۔ اور خاص کر اس نے اپنا پارٹ اس خوبی سے انجام دیا کہ دوسرے ہی دن اس کی شہرت شہر کے ہر حصہ میں ہو گئی ————!

اس وقت اس قیرسے گل بدنصیب کے ذہن میں وہی دن نظر آ رہا تھا جب کہ ہر طرف اسی کی آواز اور اداکاری کی تعریف ہو رہی تھی دوسرے روز مقامی اخبارات نے اس نئے اداکار کے کمال اداکاری اور اظہار جذبات کی قابلیت پر نہایت پر زور الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ہوٹلوں کلبوں مکانوں، دکانوں غرض ہر مقام پر اسی کا تذکرہ گفتگو کا موضوع بنا ہوا تھا۔ حاصل کلام یہ کہ یہیں سے اسکی زندگی کا وہ شاندار دور شروع ہوتا ہے جبکہ اس کو شہرت اور دولت حسب ضرورت حاصل تھی۔

رہنے کے لئے ایک عالیشان مکان، قسم قسم کے سامان آرائش سے مزین کمرہ، سواری میں کمپنی کی موٹر کار۔ لازم عمدہ کھانا۔ اچھے کپڑے الغرض وہ ہر عیش و آرام کی تقریباً ہر چیز اس کو میسر تھی یا اگر نہیں بھی تھی تو اب یہ اس قابل ہو چکا تھا کہ اس کو مہیا کر سکے۔ اور یہی خاموشی ور سیری کی زندگی اس نے خواب و خیال ہو گیا۔ زندگی کے اس مختصر گردش و عشرت کے دور میں۔ کیا تھا ہی اس کے دماغ میں پچھلی زندگی کا بھی ایک موہوم سا نقشہ پھر گیا، وہ چھوٹا سا قصبہ جہاں یہ پیدا ہوا اپنی عمر کا سب سے زیادہ قیمتی حصہ وہاں کے سرسبز و شاداب کھیتوں میں کھیل کود کر اپنی جانثار ماں کی آغوش محبت میں بسر کیا ——!

مگر ان تمام عیش و عشرت کی فراوانیوں کے باوجود اس کو اطمینان قلب نصیب نہ تھا۔ سکون اس کے لئے بے معنی تھا۔ راتیں اکثر تکیوں
میں جب کبھی آسمان پر اودی اودی گھٹائیں امنڈ امنڈ کر آتیں اور چاروں طرف چھا جاتیں ہوا کے سرد جھونکے چلتے بجلی چمکتی اور بادل گرجتے یا جب کبھی
آسمان پر ماہتاب اپنی ساری ضو فشانیوں کے ساتھ محو خرام ہوتا ستارے جگمگ کرتے اور چاروں طرف ایک دریا سا سیم کی لہریں اٹھاتا نظر آتا عطر بیز ہوا کے
فرحت افزا جھونکے طفلان بے پروا کی طرح اٹھکھیلیاں کرتے رہتے اور یہ سہری پر پڑے ہوئے اپنے گردوپیش کے سامان عیش پر نظر ڈالتا تو اس کو ایک چیز کی کمی دکھائی
دیتی۔ اور دل میں ایک بے چینی سی محسوس کرتا اپنی آغوش تمنا خالی دیکھتا۔ آنکھیں تشنہ کام دکھائی دیتیں اور نظریں رات بھر ایک نامعلوم نگار کے لئے
متلاشی رہتیں اور یہ آنکھوں ہی آنکھوں میں پہاڑ سی رات کروٹیں بدل بدل کر کاٹ دیتا۔

اس مختصر سے تجربے نے اس پر اچھی طرح واضح کر دیا کہ سچی مسرت اور دائمی خوشی نہ اس کو اپالو کے ہوش ربا تفریح گاہ پر مل سکتی ہے نہ چوپاٹی کے
نظر فریب ساحل پر۔ پہلو میں وفادار حسین ناز آفرین بیوی۔ ایک اس کا اپنا علیحدہ مکان اور شادی کے بعد کی وہ لطف انگیزیاں۔ غرض شب و روز
ایک ایسی محبت کرنے والی ہستی کے خواب دیکھتا جو ہر حال میں اپنے آپ کو اس کے لئے اور صرف اسی سے محبت کئے جانے کے لئے وقف کر دے۔!

الغرض اپنی زندگی کے اوراق پریشاں میں ایک نظم و ترتیب قائم کرنے کے لئے عملی طور پر کوشاں ہو گیا۔ لیکن افسوس کہ اس نے معیار قائم
کرنے میں غلطی کی۔ اس کو فوراً آمنہ نرس کا خیال آیا۔ جس نے اس کے ہسپتال والے زمانے میں اس کی خوابیدہ حسرتوں میں ایک ہیجان پیدا کر دیا تھا!
اسی کے زیر اثر دیا بان پہنچا۔ لیکن اس حالت میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ایک عمدہ کشمیرے کا سوٹ زیب جسم۔ کمپنی کی ایک نفیس موٹر کار سواری میں
ہاتھ میں ایک قیمتی چھڑی اور کلائی پر سنہری گھڑی۔ بائیں ہاتھ کی انگلی میں ایک خیرہ کن الماس کی انگوٹھی۔ اور جیب میں قیمتی موتیوں کا ہار
جس کو وہ آمنہ کی خدمت میں تحفۃً پیش کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس نرس کے فرائض کے اعتراف کی جو کچھ صورت سمجھتا تھا سوائے اس کے دوسری
صورت نظر نہ آئی۔ ملاقات ہوئی اور دن بدن رشتۂ دوستی استوار ہوتا گیا۔ آمنہ کو بطور تحفہ گرانبہا سنہری گھڑیاں گلے کے تعویذ، ہار، ریشمی
مختلف وضع کی ریشمی ساڑیاں سینٹ و پوڈر کی لاتعداد شیشیاں اس بات کے ثبوت میں۔ تاج محل ہوٹل کے مجالس رقص چوپاٹی اور
اپالو کے ہوش ربا تفریح گاہ اور یہاں کا ہر ذرہ اس کا شاہد ہے۔ ان کی بے تکلف ملاقاتیں یہاں تک ترقی کر گئیں کہ فرصت کے لمحات اکثر ایک
آغوش تمنا میں گذرتے۔ اور ایک دن وہ آگیا جبکہ ان دونوں کا نکاح ہو گیا۔ مگر آہ نتیجہ کیا نکلا؟ عارضی جوش کب تک قائم رہتا۔ دیکھیاں
ایک ہی چیز کی طرف لگی رہتیں۔ اور جس ماحول کے تحت عمر کا ایک حصہ بسر ہوا اس کے اثرات کب تک ظاہر نہ ہوتے۔ ان دونوں کو عاشق
و معشوق "زن و شوہر" ہوئے کچھ ایسے زیادہ دن بھی نہ ہوئے تھے کہ بدشگونیوں کا اظہار ہونے لگا۔ آخر ایک دفعہ یہ بدنصیب اپنی ناز آفرین بیوی کو
ایک سینما میں بیٹھے کسی اجنبی سے بڑے اختلاط سے باتیں کرتے اور قہقہہ لگاتے دیکھ لیا۔ آخر غیرت نے گوارا نہ کیا گھر پر آنے کے بعد باتوں ہی باتوں
میں کہا کہ دیکھو غیر لوگوں سے تمہارا اس قدر کھلم کھلا اختلاط میرے لئے نہیں بلکہ تمہارے لئے بھی برا ہے دنیا کی زبان بند نہیں کی جا سکتی ہے اور
میرا یہ مطلب نہیں کہ میں تمہاری آزادی سلب کرنا چاہتا ہوں یا خدانخواستہ مجھے تم پر کسی قسم کا شبہ ہے۔ مگر ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔!

گویا عورت کی فطرت ہی نہیں آہستہ آہستہ بات کا بتنگڑ بنا لیا۔ ڈانٹا ڈپٹا اور نسائیت کا آخری حربہ استعمال کیا یعنی رو رو کر عزم
کیا۔ اپنا ... کہیں سنبھالا اور چلی گئی۔ اس نے ایک ہفتہ تک انتظار بھی کیا کہ شاید عورت ہے میری بدگمانی سے اس کے احساسات کو ٹھیس
لگی ہو۔ وہ کچھ ایسی نمائشی تھی ... نہ ملی۔ لیکن کوئی پندرہ یوم کے بعد ایک چٹھی ملی جس میں لکھا تھا کہ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ طلاق دیدو
... اور یہ ایسی طرح اکیلا و تنہا رہ گیا جیسے کہ کچھ دنوں پہلے تھا۔ وہی بے اطمینانی میں گزرنے لگی اور اس کا زخم دل از سر نو
تازہ ہو گیا ---!

پھر ... از سر نو حسین عورتوں کے چہرے بھرنے لگے اور ... حسینہ کا غازہ ملا چہرہ ... اس کی جیب سے نقدی لیکر اس کو
ایک ... کی وجہ سے اس کو ہسپتال میں ایک عرصہ دراز تک زیر علاج رہنا پڑا۔ اسے زیادہ نمایاں طور سے ... قہقہہ زن
دکھائی دیا۔ ... میں کچھ دن گزر گئے ایک رات جب کہ تھیٹر تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا تماشہ شروع ہونے کے لئے تقریباً پندرہ
منٹ باقی تھے اس کی نظر اتفاقاً ... وارد حسینہ پر پڑی جو نہایت بھڑکیلا لباس زیب جسم کئے ایک ترکی ٹوپی اوڑھے ہوئے کسی نوجوان کے ساتھ ہنس ہنس کر
... اگلی قطاروں کی نشستوں کی طرف بڑھی۔ کیا اس کی آنکھیں اس پرفتن ہستی کو بھول سکتی تھیں جس نے اس کو اس ذلت کے ساتھ
اپنے مکان سے باہر دھکیل دیا تھا۔ اس نو وارد خوبصورت بلا نے اس کی طرف مسکرا کر ایک شرارت بھری نظروں سے دیکھا اور انجان بن گئی۔
یہ بھی اس کی موجودگی کو اپنے لئے شگون بد سمجھ کر خاموش ہو رہا۔

اس میں شک نہیں کہ جیسے جیسے دن گزرتے گئے اس کی شہرت اور اس کی آمدنی میں معتد بہ اضافہ ہوتا گیا۔ مگر اس کے دلی
رنج و آلام اور روحانی اذیتوں کا درماں کہیں بھی میسر نہ آسکا ---!

غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس کی ترقی اور شہرت کی خبریں آنے جانے والے مسافروں یا اخبارات کے ذریعہ اس کے والدین تک پہنچتی
رہیں -- ایک دن یہ اپنے کمرہ میں کہیں باہر جانے کے لئے لباس تبدیل کر رہا تھا کہ ملازم نے اس کو ایک تار لاکر دیا۔ تمہاری والدہ سخت بیمار حالت نازک
ہے آخری دیدار دیکھنا چاہتے ہو تو فوراً چلے آؤ!! ایک بجلی تھی جو کوند گئی اور ایک تیر تھا جو وقت واحد میں اس کے دل کے پار ہو گیا اپنی ماں
کی حسرت بھری تصویر آغوش کھولے اس کی طرف یاس انگیز نظروں سے دیکھتی نظر آئی آنکھوں کے سامنے سے ایک پردہ سا اٹھتا محسوس ہوا
اور اپنے بچپن کی کچھ دھندلی تصویریں اس کو دھندلی سی دکھائی دینے لگیں -- اس نے اپنی پیشانی سے پسینے کے چند ٹھنڈے قطرے صاف کئے
-- کچھ نوٹ جیب میں ٹھونس لینے کے بعد گھر سے -- اسٹیشن پہونچا۔ اتفاق کی بات تھی گاڑی کے چھوٹنے کے لئے کچھ ہی لمحے باقی تھے
-- اور اس کے بعد اکسپریس کا طاقتور انجن دھوئیں کے بادل اڑاتا جنوب کی طرف مسافروں کو لیجا رہا تھا ---

وقت سفر جس کرب و بے چینی میں کٹا اس کا اندازہ تجربہ ہی بتا سکتا ہے مختصر یہ کہ ایک عرصہ دراز کے بعد یہ اسی خطہ زمین پر موجود تھا
جہاں سے اس کی المناک زندگی کی نشو و نما ہوئی تھی ---!

وہی چھوٹا سا بوسیدہ مکان جس کی چاردیواری میں ایک ایسا اطمینان قلب اور سکون میسر آسکتا تھا جس کا ملنا عظیم الشان محلوں میں بھی شاید ممکن ہو اور اس کو ایک حد تک اس کا تجربہ بھی ہو چکا تھا مکان کا کھلا ہوا دروازہ در و دیوار پر چھائی ہوئی ایک عبرتناک خاموشی ادھر ادھر بیٹھے ہوئے حضرات کے سنجیدہ چہرے اور ایک اٹھا ہوا جنازہ ایک ہی نظر میں دو رہی سے اس نے محسوس کیا کہ افسوس اس کی آمد بعد از وقت ثابت ہوئی — مکان میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے جس چیز پر اس کی نظر پڑی وہ ایک ان بولتے پر غیر متحرک سفید پوش ہستی تھی جس کو قضا کے فرشتے نے موت کی دائمی نیند سلا دیا تھا — کمرہ کی فضا میں پھیلی ہوئی اگربتیوں کی ایک خاص بو — ایک کونے میں چھوٹی سی چارپائی — ایک میلی چادر — اور کچھ دوائیوں کی شیشیاں بزبان حال سے عبرت کا مرثیہ پڑھ رہی تھیں — لاش کی سیدھی جانب اس کا باپ جس میں گردش روزگار نے بہت کچھ تغیر پیدا کر دیا تھا دیوار سے پیٹھ لگائے خاموش بیٹھا ہوا تھا — کمرہ میں داخل ہوتے ہی بوڑھے باپ نے اشک آلود نگاہوں سے اپنے بیٹے کو دیکھا اور آہستہ سے کہا: —

"کیا بیٹا اپنی ماں سے ملنے کے لئے آئے ہو"

اس جملہ نے اس کے ساتھ وہی کام کیا جو آگ کے ساتھ تیل کا ہوتا ہے اس کی نظروں میں دنیا تاریک ہو گئی — اس نے آج محسوس کیا کہ وہ اپنی سچی محبت کرنے والی اصلی معنوں میں ہی خواہش سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا گیا ہے منہ سے ایک چیخ نکلی اور بے ہوش ہو کر فرش پر گر پڑا —

باپ ایک لحظہ تک اسی طرح خاموش بیٹھا ہوا دیکھتا رہا بعد ازاں بیٹے کو اٹھایا — منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دئے کچھ دیر بعد لوگوں نے تجہیز و تکفین کا سامان تیار کیا اور لاش کو نہلا دھلا کر سپرد خاک کیا۔

منظر پھر اس کے دماغ میں بدل جاتا ہے — سال گزرتے دیر نہیں لگتی اس واقعہ کو ہوئے دو سال گذر گئے اس کی ابتدائی اور موجودہ حیثیت میں ایک عظیم فرق ہو چکا تھا اس کی شہرت و کمال نے اب معراج حاصل کر لیا تھا ایک دفعہ حیدرآباد کی اسٹیج پر جامعہ عثمانیہ کی بزم ادب کی جانب سے شکسپیر کا معرکتہ آرا ڈراما جولیس سیزر دکھلایا جانے والا تھا۔ تمام انتظامات مکمل ہو چکے مگر بروٹس کا کردار انجام دینے کے لئے کوئی موزوں شخص نہ مل سکا تو یہاں کی مجلس انتظامی کے اراکین نے اس کی کمپنی کے مالک کو لکھا کہ اگر وہ از راہ عنایت اپنے اس مشہور اداکار کو معاوضہ لیکر روانہ کرے تو ہمارے لئے ممنونیت کا باعث نہیں بلکہ ایک علمی مدد متصور ہوگی — کمپنی نے منظور کیا ڈرامہ کیا گیا اور نہایت کامیابی کے ساتھ — اس میں شک نہیں کہ اس کو فرا مشق کرنی پڑی لیکن اس نے اپنا پارٹ اس خوبی سے ادا کیا کہ اب اس کا شمار ہوتی اسٹیج کے گرامی پایہ ایکٹروں میں ہونے لگا۔

اس دور زندگی میں اس کو اچھی طرح الم ہو چکا تھا کہ اس کے جیسا ایک ایسی محبت کا تشنہ ہی جو ہر وقت ایک دائمی مسرت ہو تا قابل اظہار مسرت دے سکے اس کو تجربہ نے اچھی طرح دکھلا دیا تھا کہ محبت ہوس پرستی کا نام نہیں بلکہ ایک روحانی تعلق کا نام ہے — بمبئی کی حسن

فردوس فضا میں پیکر او تصویر کی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد حسن کی ریشہ دوانیوں سے سابقہ نہ پڑنا ایک ناممکن سی چیز ہے مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ اس میں ما بہ الامتیاز کی صلاحیت بھی پیدا ہو چکی تھی۔ طبیعت کا وہ لا ابالی پن جو ابتدائے شباب کا جزو لاینفک ہے، اب باقی نہ تھا کسی چیز میں جذب اور کشش ایک خاص حد تک باقی رہتے ہیں مگر ان کو دستیاب ہونے کے بعد اس سے دل اکتا ہی نہیں جاتا بلکہ اس کی طرف سے ایک نفرت سی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی حال اس کا تھا۔ ذاتی تجربے نے اس پر واضح کر دیا تھا کہ دولت، عیش و عشرت اور آرام و آسائش اس وقت تک کیف آگیں نہیں ہو سکتے تا وقتیکہ ایک انیس زندگی اس میں برابر کا حصہ نہ لے۔

گذشتہ تجربے کی تلخکامی کا نتیجہ تھا کہ اس مرتبہ اس نے بڑی احتیاط سے کام لیا اور اس کی شادی تھوڑے ہی دنوں بعد ایک غریب مگر شریف خاندان کی لڑکی محمودہ سے ہو گئی۔ اس کی پختہ ذہن گو کسی کالج کی تعلیم یافتہ حقیقتاً افسانہ نگار اور شاعرہ نہ تھی مگر اس کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ محمودہ ایک فرمانبردار بیوی اور ایک جاں نثار انیس زندگی ہی نہیں ہے بلکہ شکل و صورت کے اعتبار سے اس کی دو آنکھیں ایک خطۂ حسن پر ایک سے بڑھ کر ایک بہتر نمونہ دیکھ چکی تھیں قائل ہو گئیں کہ حقیقتاً حسن، شرمندۂ زیب و زینت نہیں ہے، غازہ ملنے سے سرخ رنگ ہونٹوں پر لگانے سے اور دل آویز عطر کو معطر کرنے سے عورت حسین نہیں بن سکتی بلکہ حسن تو وہی ہے جو ہر حالت میں جاذب نظر ہے۔ محمودہ کا سرخ و سفید چہرہ، اس کی سیاہ نشیلی آنکھیں، اس کے قدرتی لب لعلیں اور سیاہ کستی تک گھونگھر والے بال۔ الغرض اس حسن و سیرت اور عفت و عصمت کی دیوی نے اس پر ثابت کر دیا کہ وہ بھی اس کا شمار بھی ان چند خوش نصیبوں میں ہو سکتا ہے جنہیں ایسی نیک خصال بیویاں نصیب ہیں۔

اس کی زندگی کا یہ زمانہ سب سے زیادہ عیش و راحت اور سکون و اطمینان کا تھا۔ محبت کا یہ عالم تھا کہ اگر تھوڑی دیر بھی ایک دوسرے کو نہ دیکھتے تو بے چین ہو جاتے۔ بمبئی کے فردوس نظر مناظر میں اس کے لئے اب کوئی کشش باقی نہ تھی بلکہ اس کی ساری دلچسپیاں سمٹ کے صرف ایک مرکز پر آ چکی تھیں۔ ان دونوں کو رشتہ حیات کو منسلک ہوئے صرف چھ ماہ ہوئے تھے کہ محمودہ نے ایک دن تنہائی میں مبہم سے الفاظ میں شرما کر ایک مژدہ سنایا۔ اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی یہ مسرت سے ایک دم مچل کر کھڑا ہو گیا اور ایک لحظہ حیرت و مسرت کی مشترکہ نظروں سے محمودہ کے انفعال پذیر چہرہ کو غور سے دیکھتا رہا اور پھر بے ساختہ اس کے زریں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر فرط محبت سے چوما۔ اس واقعہ نے دونوں کے دلوں میں محبت کا دریا موجزن کر دیا اور دن بدن ان کی محبت اور ان کا سچا پیار ترقی کرتا گیا۔

باقیماندہ دن بھی بہت جلد گزر گئے۔ آخر وہ شب بھی آ چکی جبکہ دردزہ کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ لیڈی ڈاکٹر اور نرس کو خاص طور پر متعین کیا گیا۔ اتفاق کی بات تھی اسی رات بمبئی میں آنکھ کا تماشا ایک عرصے کے بعد کھلایا جانے والا تھا۔ یہ غریب عجیب کشمکش و پیچ میں پڑ گیا۔۔۔ اپنی رفیقۂ حیات کو اس موت و زندگی کی حالت میں بھی چھوڑ کر نہ رہ سکتا تھا اور کمپنی سے معاہدہ کی بنا پر بغیر شریک ہوئے بھی چارہ نہ تھا۔ آخر کار دل پر جبر کر کے جانا ہی پڑا۔ تھیٹر کا ہال تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ ہندوستان کے اکثر شوقین مزاج والیان ریاست اور معززین شہر موجود تھے۔ اٹھلا سٹیج سے پردہ اٹھا اور ایک منظر کے بعد جب یہ اسٹیج پر آیا سینکڑوں کو گونج تالیاں بجائیں۔ پھولوں کے ہار اور گلدستے پھینکے اور اس نے مسکراتے

سب کا شکریہ سر کے اشارے سے ادا کیا۔ شور و غل ختم ہونے کے بعد جب اس نے اپنا پارٹ انجام دینا شروع کیا مگر باوجود کوشش کے بھی الفاظ اس کی زبان سے نکل نہ سکتے تھے دل غم و رنج سے سینے میں بیٹھا جا رہا تھا۔ یہ کہنا کچھ اور چاہتا مگر زبان سے کچھ اور ہی نکلتا کان ٹیلیفون کی گھنٹی پر تھے تمام تر خیالات اپنی نازنین بیوی کی طرف لگے ہوئے تھے۔ کمپنی کے تمام آدمی اور خود تماشائی حیرت میں غرق تھے کہ آخر اس کو ہو کیا گیا ہے۔ آج ہی نہیں بلکہ متعدد دفعہ اس کا کام دیکھ کر اس کی قابلیت کے قائل ہو چکے تھے مگر آج کا معمہ سمجھ ہی میں نہ آتا تھا۔ بعد سعی بسیار کے آج اس کو اپنے پارٹ کے ادا کرنے میں سخت ناکامی ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ درجہ چہارم کے تماشائیوں کی طرف سے نفرت کا اظہار شروع ہوا اور یہ یہاں تک ترقی کر گیا کہ متعین شدہ کانسٹبلوں کو دخل دینا پڑا۔ کمپنی کا منیجر اور مالک الگ پریشان تھے کہ انھیں کس قدر بدنامی اور نقصان کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اکثر معززین آہستہ آہستہ اٹھ کر جانے لگے اور یہ ہر ممکنہ کوشش کے باوجود بھی نہ کچھ کہہ سکا اور نہ اسکو اپنا پارٹ ہی یاد رہا۔ منیجر نے پردا چھوڑ دیا اور اسٹیج پر آ کر کہنے لگا کہ ہمارے مشہور ایکٹر کی یکایک طبیعت ناساز ہو جانے کی وجہ تماشہ ایک گھنٹہ کے لئے ملتوی کر دیا جاتا ہے۔ امید کہ ناظرین معاف فرمائیں گے۔

یہ بیچارہ ایک مدہوشی کی سی حالت میں اپنے لباس بدلنے کے کمرہ میں داخل ہوا ہی تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی اس کی ملازمہ گھبرائی ہوئی کہہ رہی تھی "خدا کے لئے جلد آئیے — بچہ مرا ہوا پیدا ہوا اور حالت نازک ہے —!"

اس کو دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہی اور یہ سراسیمہ گرتا پڑتا اسٹیج سے نیچے اترا بارش شدت کی ہو رہی تھی۔ آسمان پر گھٹا ٹوپ بادل چھائے ہوئے تھے سڑک پر نہ کوئی ٹیکسی ہی نظر پڑی اور نہ کوئی دوسری سواری ہی مل سکی کمپنی کے موٹر کو دریافت کیا معلوم ہوا ڈرائیور کا پتہ نہیں ہے مکان دور آخر پہنچے کس طرح۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اس کا اضطراب بڑھتا گیا۔ بارش ہے کہ تھمنے کا نام نہیں لیتی۔ موٹر کون کہے چاروں طرف آمد و رفت بند تھی آخرکار اس نے بغیر سوچے پیدل ہی گھر کی راہ اختیار کی۔ ایک ایک قدم سو سو من کا ہو گیا۔ پیر رکھتا ایک جگہ اور پڑتا دوسری جگہ۔ آخرکار گرتا پڑتا پریشان و مضطرب گھر پہنچا اور ایک دیوانگی کی سی کیفیت کے زیر اثر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ کسی سے کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہ تھی۔

دھاڑیں مارتی ہوئی ملازمہ۔ نومولود کی ننھی سی لاش نرس اور لیڈی ڈاکٹر کے سنجیدہ چہرے اور ایک ساکن و غیر متحرک سفید چادر سے ڈھکا ہوا جسم الغرض ایک ہی نظر نے اس پر واضح کر دیا کہ اس کا قصر عشرت منہدم ہو چکا ہے۔ یہ لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا اور کانپتے ہوئے ہاتھ سے چادر کا ایک کونہ اٹھایا نیم وا پر حسرت آنکھیں، زرد مگر کسی قدر متبسم چہرہ، کچھ تھوڑا سا کھلا ہوا زیریں لب۔ برف سا ٹھنڈا نرم و نازک ہاتھ شاہد تھے کہ اجل کی باد سموم کا اس گل شگفتہ پر وار چل گیا۔

اس کی آنکھوں میں تاریکی چھا گئی۔ نظروں کے سامنے کمرہ گھومتا ہوا نظر آیا اور یہ فرش پر گرنے والا ہی تھا کہ نرس نے سہارا دے کر پلنگ پر لٹا دیا۔

مرحومہ کے گل اندام جسم کو مع اس کے مردہ بچے کے دوسرے ہی دن علی الصباح سپرد خاک کر دیا گیا۔ اس پر مسلسل چار پانچ روز تک ایک سرسام کی سی کیفیت طاری رہی۔ [illegible]

اس کی زندگی معرض خطر میں نظر آنے لگی۔ خدا خدا کر کے پانچویں دن کہیں جا کر اس نے آنکھ کھولی۔ مگر نہ تو ہوش و حواس ہی باقی تھے اور نہ اس کو اپنے تن بدن کا ہی ہوش تھا۔ کبھی کبھی دیوانے کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھتا اور چیخ مار کر بے ہوش ہو جاتا۔ تقریباً ایک ہفتہ اسی حالت میں گزر گیا اور نویں دن اس کے ہوش و حواس کچھ درست دکھائی دینے لگے مگر ایک آفت سے چھوٹتے ہی دوسری مصیبت نازل ہو گئی یعنی اس شدت کا بخار چڑھا کہ پھر وہی سرسام کی کیفیت طاری ہونے کا اندیشہ ہونے لگا۔ اس کے دوسرے ہی دن تمام جسم پر آبلے نمودار ہو گئے اور یہ چیچک کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں گننے لگا۔ جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ چھوٹا جہاں پر آبلے نہ دکھائی دیتے ہوں اور اسی عرصہ میں اس کی دائیں آنکھ بھی بیکار ہو گئی۔

ایک مہینے تک یہ فرش رہا جب تمام زخم بھر گئے اور اس کی حالت نسبتاً پہلے کے روبہ اصلاح ہو گئی تو اس نے نرس لیڈی ڈاکٹر اور خود اپنی بیماری وغیرہ کے اخراجات ادا کرنے کیلئے کمپنی کے مالک کو ایک خط لکھا کہ اگر اس کی تنخواہ اور کچھ مزید روپیہ بطور قرض روانہ کیا جا تو عین عنایت ہو۔

بڑے انتظار کے بعد شام میں کمپنی کا مالک خود اس کی جائے قیام پر پہنچا اور مزاج پرسی کے چند رسمی الفاظ ادا کرنے کے بعد کہنے لگا "یہ تمہاری تنخواہ کا چیک ہے قرض کے متعلق کمپنی کو جس قدر نقصان کا سامنا کرنا پڑا ہے اس کے مد نظر مالی حالت اب اس قابل نہیں ہے کہ تمہاری مدد کی جا سکے۔ پھر کسی وقت اگر موقع ہو تو ہم دریغ نہ کریں گے اور ساتھ ہی ساتھ مجھے یہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ کمپنی کے نظماء نے کہدیا ہے کہ اب تمہاری ضرورت بھی باقی نہیں رہی تمہارا معاہدہ دو دن پہلے ہی ختم ہو چکا ہے"!!

اس نے خاموشی کیساتھ چیک لے لیا۔ اور سوائے اس کے کر بھی کیا سکتا تھا مگر اس عرصہ میں قرض کی رقم جس درجہ پر پہنچ چکی تھی اس کے مد نظر یہ موجودہ رقم قطعی ناکافی تھی۔ اس کو مجبوراً اپنا سامان اور کچھ سونے چاندی کی چیزیں فروخت کرنا پڑا۔ فرنیچر وغیرہ اس نے ایک سراج میں ڈال دیا۔ اور محمودہ کے اور اپنے بعض کپڑے بھی جو ذرا قیمتی تھے جو بھی قیمت آئی نکال دیا اور اس طرح قرض کا ایک ایک حبہ ادا کر کے یہ اسی طرح بے خانماں و مفلس اس شہر میں رہ گیا۔

دو مہینے تک ادھر ادھر ایک شش و پنج کی حالت میں خاک اڑاتا پھرتا رہا۔ دن آوارہ گردی میں بسر ہوتا اور رات محمودہ کی قبر کے پاس آنسو بہانے میں۔ لوگ اب اس کو پہچان بھی نہ سکتے تھے گو جب کبھی چار دوست احباب مل کر بیٹھتے اور کسی ناٹک یا ڈرامہ کا تذکرہ ہوتا تو اس کا نام بھی ضرور دوران گفتگو میں آجاتا۔ ایک دن سر شام جب آفتاب کی الوداعی کرنیں عالیشان عمارتوں سے گزر رہی تھیں اور افق پر شفق کی بوقلمونی نے ایک آگ سی لگا رکھی تھی۔ یہ محمودہ کی قبر سے پیٹھ لگائے بے معنی نظروں سے ایک طرف دیکھتا بیٹھا ہوا تھا۔ قریب ہی ایک مہندی کی ڈالی پر کوئی چڑیا سریلی آواز میں نغمہ زن تھی جس کی صدا قبرستان کی سنسان فضا میں ایک عبرتناک اور سبق آموز منظر پیدا کر رہی تھی اس نے اپنی گذشتہ زندگی پر ایک نظر ڈالی معلوم ہوا صرف ایک خواب تھا جس کے صحیح ہونے میں بھی کچھ شبہ ہونے لگتا ہے اس کے بعد وہ اپنی باقیماندہ زندگی کے متعلق سوچنے لگا کہ آخر اسے اب کیا کرنا چاہیے کوئی اس کا پرسان حال نہ تھا کوئی خبر گیری کرنے والا نہ تھا

نہ دیتا تھا۔ کوئی جائے قیام تھی اور کوئی مونس و غمخوار نظر نہ آتا تھا اس نے سوچا کہ کیا وہ اپنے وطن کو واپس چلا جائے مگر اب وہاں کیا رکھا تھا چونکہ اس کو اطلاع مل چکی تھی کہ اس کا باپ اس کی والدہ کے انتقال کے بعد سے مکان وغیرہ فروخت کر کے کہیں لاپتہ ہو گیا ہے آخر کیا کرے؟ کیا کسی دوسری کمپنی میں ملازمت کی کوشش کرے۔ مگر ایک جگہ اس قدر ذلت اٹھانے اور کمپنی کو بدنام کرنے کا باعث ہونے کے بعد بھلا اس کو کیا امید ہو سکتی تھی! سچ تو یہ ہے کہ اب اس کے لئے اس دنیا میں دلچسپی ہی کیا باقی تھی ——!

جس وقت یہ گردش روزگار کا ستایا ہوا مصیبت کا مارا آوارہ گرد بے مونس و غمخوار اس وسیع دنیا میں کوئی جائے پناہ نہ پا کر دریا کی ٹھنڈی ٹھنڈی موجوں سے ہم آغوش ہو رہا تھا۔ آخر دفعہ اس کے ذہن میں اپنی حسرت نصیب بیوی کا وہی خوبصورت اور متبسم چہرہ پھر نے لگا جیسا کہ اس نے مرنے سے پہلے دیکھا تھا ——!

پانی کی سطح کے اوپر خالی فضا میں سہارا ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کرتا ہوا ہاتھ آہستہ آہستہ موجوں کے نیچے غائب ہو گیا۔ پانی کے منتشر بلبلے ایک ایک کر کے غائب ہونے لگے لحظہ بہ لحظہ دریا کی سطح ساکن ہوتی گئی اور حسب معمول ماہتاب کی ابتدائی کرنیں پانی کی لہروں سے اٹکھیلیاں کرنے لگیں! !

غزل

از

جناب سید قادر حسین صاحب قادر

مرے دل کا کوئی علاج بھی ہے ۔۔۔ درد کے ساتھ اختلاج بھی ہے

آپ کیا مجھ کو آزماتے ہیں ۔۔۔ تھی طبیعت جو کل وہ آج بھی ہے

آپ الجھتے ہیں باتوں باتوں میں ۔۔۔ آپ سا کوئی بدمزاج بھی ہے

وہ مرا دل نہ کیوں کریں برباد ۔۔۔ ان کی عادت بھی ہے رواج بھی ہے

سرنگوں سرکشوں کو کرتی ہے ۔۔۔ کیا بری چیز احتیاج بھی ہے

میں نے مانا کہ تم مسیحا ہو ۔۔۔ دردِ دل کا کوئی علاج بھی ہے

اس بتِ بیوفا ستمگر میں ۔۔۔ سادگی بھی ہے، کچھ مزاج بھی ہے

دیکھئے کس طرح بنے اس سے ۔۔۔ حیلہ جو ہے تنک مزاج بھی ہے

چار ہی دن میں پھر گئے ہم سے ۔۔۔ تم کو اپنے کئے کی لاج بھی ہے

بت حکومت جتاتے ہیں یارب ۔۔۔ کیا خدائی میں ان کا راج بھی ہے

لوگ کیوں بدگمان ہیں مجھ سے ۔۔۔ بدظنی کا کوئی علاج بھی ہے

میکشی کے سوا تمہیں قادر ۔۔۔ اور دنیا میں کام کاج بھی ہے

چندن مدیر جناب سدرشن صاحب سالانہ چندہ (عہ) پتہ دفتر چندن ریلوے روڈ لاہور۔

سدرشن صاحب اپنے دلچسپ افسانوں کی وجہ سے اردو دنیا میں جو شہرت رکھتے ہیں اس کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں بڑی خوشی کی بات ہے کہ وہ اب تنہا افسانہ نویسی سے گزر کر ایک مستقل رسالے کے ذریعہ بھی اردو کی خدمت کا ارادہ کر چکے ہیں۔ چندن ان کے ارادے کا عملی جامہ ہے پہلا نمبر بڑی آب و تاب و سلیقے سے نکالا گیا ہے چھوٹے چھوٹے ادبی مضامین، نظمیں اور افسانے سب ہی ہیں خصوصاً سدرشن صاحب کے قلم سے کئی ایک چیزیں ہیں افسانوں کا خاص اہتمام ہے اور دوسرے رسالوں کے مقابلہ زیادہ اور اچھے بھی ہیں سرورق بہت دلفریب ہے اور تصویریں بھی اچھی دی گئی ہیں

حریم مدیرہ آنسہ جمال صاحبہ سالانہ چندہ (للعہ) پتہ جناب نسیم انہونوی ناشر حریم لکھنو۔

یہ ایک چھوٹی تقطیع کا زنانہ رسالہ ہے جو نسیم صاحب انہونوی کی کوشش سے جنوری سے شائع ہونے لگا ہے مختلف نوعیت کے مضامین اس کے پہلے نمبر میں جو ہمارے پیش نظر ہے، درج ہیں اور علم زنانہ رسائل سے زیادہ بلند معیار رسالہ ہے۔ عورتوں کی خاص ضروریات مثلاً بچوں کی پرورش کشیدہ اور کروشیا وغیرہ بھی مختصر مضمون ہیں۔ تصاویر خاص و عام سب ہی قسم کی ہیں کوئی خاص بات نہیں معلوم ہوتی۔

ادبی اور اسلامی ادارہ غلامی از مولوی محمد حمید اللہ صاحب ایم اے ایل ایل بی عثمانیہ قیمت ۴ر پتا بزم قانون عثمانیہ کالج حیدرآباد دکن۔

اس مقالے میں جو بڑی تقطیع کے (۲۴) صفحات پر ہے، لائق مؤلف نے رومیوں اور مسلمانوں کے ہاں غلامی کے جو طریقے تھے ان کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے اور تفصیلی اور دلچسپ موازنہ کیا ہے۔ مولوی حمید اللہ صاحب جامعہ عثمانیہ کے فاضل متعلم اور ریسرچ اسکالر ہیں اس وقت وہ فقہ میں تحقیقاتی کام کر رہے ہیں ریسرچ کے علاوہ ان کے قلم سے کئی ایک دلچسپ مضامین نکل چکے ہیں آپ ہر چیز بڑی تحقیق اور کوشش سے لکھتے ہیں۔

یادِ شمسی مرتبہ سید جلال صاحب مہر قیمت ۸ر پتا مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

مجلہ مکتبہ کے ایک نمبر میں علامہ شمسی مرحوم کی سیرت اور تبحر علمی اور شاعری پر جو مضامین اور تعزیتی نظمیں شائع ہوئی تھیں ان میں چند اور نظموں کا اضافہ کر کے علامہ مرحوم کے بھتیجے مہر صاحب نے یہ رسالہ مرتب کیا ہے علامہ مرحوم کی علمی شخصیت اور شاعری اور تصانیف کے لحاظ ایک ضخیم سوانح عمری ان کی صحیح یادگار ہو سکتی ہے مگر بصورت موجودہ یہ چھوٹا سا رسالہ بھی بسا غنیمت ہے اور عقیدت مندان شمسی کے لئے اس بحر العلوم کی یاد دلانے کے لئے ہر طرح مستحق خیر مقدم ہے

حیدری جنتری شیخ ابوالقاسم صاحب حسام قیمت ۸ر مطبع حیدری چھتہ بازار حیدرآباد دکن

یہ نہایت کارآمد اور ضخیم جنتری ہے جس میں تاریخ اسلام کے مشہور واقعات کی تاریخیں اور مسلمانوں اور عامۃ الناس کے فائدے کی متعدد چیزیں درج ہیں مختصر طور پر دکن کی تاریخ بھی اس میں شریک کی گئی ہے اعلیٰ حضرت بندگان عالی اور چند مشاہیر علماء کی تصاویر بھی دی گئی ہیں۔ زائرین مقامات مقدسہ کے لئے اس میں خاص معلومات پیش کی گئی ہے

پیامِ حق از سوامی بھولاناتھ جی قیمت ۲ر پتا نولکشور لکھنو

یہ چھوٹی تختی کے (۳۶) صفحات کا ایک صوفیانہ رسالہ ہے جس میں سوامی بھولاناتھ جی کی نظمیں مختلف صوفیانہ عنوانات ہمہ اوست، علت عالم وغیرہ پر ہیں نظموں کے سوا دو مختصر سے مضمون بھی نثر میں اسی نوعیت کے اس میں شریک ہیں

مبادیِ نفسیات

یہ اردو میں نفسیات پر نہایت معقول اور محققانہ تالیف ہے۔ انگریزی میں اس مضمون کی جو معتبر کتابیں ہیں ان کا مطالعہ اور باہمی مقابلہ کر کے مولوی شیخ عبدالحمید صاحب شوق نے سلیس اردو میں یہ نچوڑ مرتب کیا ہے جو نفسیات جیسے دلچسپ اور اہم مضمون پر اپنی نوعیت کی یہ ایک ہی کتاب ثابت ہوگی قیمت ۸ر

مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

کی

خریداری میں مزید سہولت

جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپیہ کے مطبوعات مکتبہ یا ساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائیں گے، ان کے نام رسالہ سال بھر کے لئے بلاقیمت جاری ہوسکے گا۔ اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی درسی و دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خرید کریں گے۔ ان کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کے لئے مجلہ مکتبہ بلاقیمت حاضر ہوگا۔ یکمشت خریدنیوالے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کردیا جائے گا۔ جو حضرات بدفعات کتابیں خریدیں گے، ان کو ایک رسید دیجائیگی۔ جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔

خریدار صاحبین کو چاہیے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب صراحت بالا رقم معینہ کی تکمیل ہوجائے وہ رسیدیں منتظم مجلہ مکتبہ کے پاس بھیجدیں رسالہ ان کے نام جاری کردیا جائے گا۔ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہوسکتی ہیں۔ اس طرح کئی اشخاص مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

مطبوعہ
مطبع مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ
حیدرآباد دکن